جلد دوم

نام کتاب	:	زین المحافل شرح الشمائل للامام الترمذی
افادات	:	شیخ الحدیث حضرت مولانا سمیع الحق صاحب مدظلہ
		استاذ الحدیث و مہتمم جامعہ دارالعلوم حقانیہ اکوڑہ خٹک
ضبط وترتیب	:	مولانا اصلاح الدین حقانی
		استاذ الحدیث جامعہ اسلامیہ لکی مروت
نظر ثانی وحاشیہ	:	مولانا مفتی مختار اللہ حقانی
		مفتی واستاد شعبہ تخصص فی الفقہ والافتاء جامعہ دارالعلوم حقانیہ اکوڑہ خٹک
کمپوزنگ	:	محمد اکمل، بابر حنیف جامعہ دارالعلوم حقانیہ اکوڑہ خٹک
صفحات	:	جلد اول:532 جلد دوم:526
طبع اول	:	اپریل ۲۰۰۷ء
ناشر	:	مؤتمر المصنفین جامعہ دارالعلوم حقانیہ اکوڑہ خٹک
طابع	:	المطبعة العربیہ، لیک روڈ پرانی انارکلی لاہور

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

فہرست

۳۴. باب کیف کان کلام رسول اللہ ﷺ

حضور اقدس ﷺ کے اسلوب کلام کے بیان میں

اس باب میں نبی کریم ﷺ کی باتیں کرنے کے بارے میں احادیث لا کر واضح کیا جاتا ہے کہ آپ ﷺ کا گفتار اور لہجہ کیسا تھا۔ ہر شخص کا اپنا طرز تکلم ہوتا ہے۔ بعض لوگ تیز بولتے ہیں۔ بعض آہستہ آہستہ بولتے ہیں۔ بعض لوگ جملے درمیان میں کاٹ کر بولتے ہیں ایسے لوگوں کا کلام عموما مبہم اور مغلق ہوتا ہے۔

داعی کے طرز تکلم کے خصوصیات: بہر حال چونکہ بات سمجھانا بولنے پر موقوف ہوتا ہے۔ اور پیغمبر داعی ہوتا ہے۔ تو ہر داعی کے لیے ہر دور میں کلام پر عبور ہونا چاہیے۔ تا کہ اس کا طرز تکلم مؤثر ہو۔ اس کی تعبیر فصاحت و بلاغت سے بھی کر سکتا ہو۔ گویا داعی کو فصیح اللسان ہونا چاہیے(۱)۔ اس لیے کہ دعوت کی عمارت زبان و کلام اور وعظ و تبلیغ پر کھڑی ہے۔ عوام سے تعلق کی بنا پر نبی کریم ﷺ کو بھی اللہ تعالیٰ نے دعوت کے بہترین طرز تکلم اور ادائے مراد کی ساری خوبیاں عطا فرمائی تھیں۔ فصاحت و بلاغت کے درجہ علیا پر آپ ﷺ فائز تھے۔ حتیٰ کہ آپ ﷺ کے مخاطبین میں سے جاہل سے جاہل اور غبی سے غبی بھی آپ ﷺ کی بات کو آسانی سے سمجھ لیتا تھا۔ اور سیئی الحفظ (کم حافظے والا) آدمی کو آپ ﷺ کی بات یاد ہو جاتی تھی۔ آپ ﷺ کا کلام اتنا واضح ہوتا تھا کہ ہر ان پڑھ آدمی کے دل و دماغ تک پہنچ جاتا تھا۔ دوسری طرف اللہ تعالیٰ کو یہ بھی منظور تھا کہ آپ ﷺ کی ہر بات قیامت تک محفوظ بھی رہے۔ یہ فقط نبی کریم ﷺ کی خصوصیت تھی۔ حفاظت حدیث کے دیگر انتظامات کے ساتھ ساتھ ایک بڑا حصہ اس بات کا بھی ہے کہ نبی کریم ﷺ کے کلام کا اسلوب جداگانہ اور فصاحت درجہ کمال پر ہے۔ آپ ﷺ ہمارے زمانے کے مقررین کی طرح چر چر کرنے والے نہیں تھے بلکہ ٹھہر ٹھہر کر بولتے تھے۔

---

(۱) اسی لیے حضرت موسیٰ نے جب ہارونؑ کے لیے نبوت طلب فرمائی۔ تو فصاحت کو بھی اپنی طلب کا مدار بنایا فرمایا "واخی هارون هوا فصح منی لسانا فارسله معی ردأ یصدقنی انی اخاف ان یکذبون(قصص آیت ۳۴)مرتب.

آپ ﷺ کا کلام سمجھ میں بہت جلد آتا تھا۔ اور اسی وجہ سے علم ادب کے علماء نے آپ ﷺ کا کلام ادب اعلیٰ کے لیے منتخب کیا ہے اور متحیر ہیں۔

حضور اقدس ﷺ کے کلام کا ادبی معیار: نثری ادب میں نبی کریم ﷺ کا کلام جتنا مؤثر و دلنشین ہے۔ اور جتنا ادبی جواہر پاروں پر مشتمل ہے۔

زمانہ جاہلیت سے لے کر آج تک کسی بھی ادیب کا کلام اس کا مقابلہ نہیں کرسکتا۔ مولانا ابوالحسن علی ندویؒ اور عرب کے بعض علماء نے بھی آپ ﷺ کے کلام واحادیث کا اس تناظر میں استقراء اور تتبع کیا۔ اور اس عنوان پر مستقل کتابیں لکھی ہیں۔ جن کو دیکھ کر یہ بات خوب عیاں ہو جاتی ہے کہ آپ ﷺ کا طرز کلام اور بات کرنے کا انداز کتنا خوبصورت تھا۔ علماء میں بھی وہی علماء کامیاب ہوتے ہیں جو زمانہ کے انداز اور تقاضوں کے مطابق بات کرسکیں۔ دلنشین اور مؤثر انداز کلام ہمارے اکابر کا شعار رہا ہے۔ شاہ ولی اللہؒ، مولانا نانوتویؒ اور دوسرے اکابر کو دیکھیں۔ جن کے فصیحانہ اور ادیبانہ خطبے آج بھی موجود اور مشعل راہ ہیں۔ تو گویا یہ باب کیفیۃ کلام رسول اللہ ﷺ یا اسلوب کلام رسول اللہ ﷺ کی وضاحت کرتا ہے۔

(۱) حدثنا حميد بن مسعدة البصري ثنا حميد بن الأسود عن أسامة بن زيد عن الزهريّ عن عروة عن عائشةؓ قالت ما كان رسول الله ﷺ يسرد سردكم هذا ولكنّه كان يتكلّم بكلام بين فصلٍ يحفظه من جلس إليه(۱).

ترجمہ: حضرت عائشہؓ کہتی ہیں کہ نبی کریم ﷺ تمہاری طرح مسلسل جلدی جلدی باتیں نہیں کرتے تھے۔ بلکہ آپ ﷺ واضح اور جدا جدا الفاظ بولا کرتے تھے۔ آپ ﷺ کا کلام ہر سامع کو یاد ہو جاتا تھا۔

---

(۱) سنن ابی داؤد ۲/۷۱۳ کتاب الادب باب الهدی فی الکلام، جامع ترمذی ۲/۲۰۵ کتاب المناقب باب فی صفة رسول الله ﷺ، السنن الکبریٰ للنسائی ۶/۱۰۹ کتاب عمل الیوم واللیلة باب سرد الحدیث (مختار)

ماکان رسول اللّٰہ ﷺ یسرد کلامکم ھذا سَرَد یسرد تسلسل کے ساتھ کسی چیز کو ایک دوسرے کے ساتھ ملانے کو کہا جاتا ہے۔اگر بغیر تحقیق وتشریح کے تیزی کے ساتھ حدیث کی قراءت ہوتی ہے۔تو اسے بھی **سرد الحدیث** کہتے ہیں۔جس طرح کہ ہمارے اکابر کے زمانے تک حدیث کے درس کا طرز یہی تھا۔بہر حال جو شخص تیزی سے درمیان میں سانس لئے بغیر تسلسل کے ساتھ بولے۔اس کے بارے میں ہم کہتے ہیں **فلانٌ یسردُ سرداً**۔

نبی کریم ﷺ کے بارے میں حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ وہ تمہاری طرح تیز تیز باتیں نہیں کرتے تھے(۱)۔لگاتار بغیر وقفے کے نہیں بولتے تھے۔کہ بعض الفاظ سامع بالکل نہ سمجھ پائے۔جس طرح رمضان میں بعض حافظ لوگ تلاوت کرتے ہیں۔ان کی ایک آیت بھی پوری نہیں سمجھی جاسکتی۔**ولکنّہ کان یتکلّم بکلام الخ** یعنی آپ ﷺ واضح اور بیّن کلام کیا کرتے تھے۔جدا جدا اور مفصول کلام کے ساتھ وقفوں میں بولتے تھے۔قرآن کے بارے میں بھی اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ **انه لقول فصل** یعنی یہ کلام فصل ہے۔

اسی طرح قرآن کی آیات کو آیات مفصلات کہا گیا ہے۔

یحفظه من جلس الیه الیٰ اس مقام پر عند کے معنی میں ہے۔یعنی **من جلس عنده** اور جلوس سے بھی حقیقی معنی مراد نہیں ہے۔بلکہ مراد یہ ہے کہ جو بھی شخص ان کے کلام کو سنتا۔اگر چہ وہ کافر نامراد کیوں نہ ہو۔سنتے ہی وہ آپ ﷺ کے کلام کی تہہ تک پہنچ جاتا۔گویا آپ ﷺ کے ہاں کا متعلم جیسے بھی ہوتا ذہین یا متوسط یا غبی ہر کسی کو آپ ﷺ کی بات یاد ہو جاتی تھی۔جو شخص آرام سے بولتا ہے اس کی بات مخاطبین کو یاد ہو جاتی ہے۔یہی وجہ ہے کہ احادیث تمام کی تمام محفوظ ہو چکی ہیں۔

(۲) حدّثنا محمّد بن یحیٰی ثنا أبو قتیبة سلم بن قتیبة عن عبداللّٰه ابن المثنٰی عن ثمامة عن أنس بن مالک قال کان رسول اللّٰه ﷺ یعید الکلمة ثلاثاً لتعقل عنه(۲).

---

(۱) صحیحین میں حضرت عائشہؓ کی ایک حدیث ہے۔فرماتی ہیں **کان یحدث حدیثا لو عدا لعاد لاحصاه.(مختار)**

(۲) صحیح بخاری ۱/۲۰ کتاب العلم باب من اعادالحدیث ثلاثاً الخ، جامع ترمذی ۲/۱۰۱ کتاب الاستیذان باب ماجاء فی کراھیة ان یقول علیک السلام، المستدرک للحاکم ۴/۲۷۳ (مختار)

ترجمہ: حضرت انسؓ فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ (اہم) بات کو تین مرتبہ دہراتے تھے۔تا کہ بات ذہن نشین ہوسکے۔

داعی کے کلام میں تکرار کی اہمیت: **یعید الکلمة ثلثا** یہ عموماً خطبوں اور وعظ وتقریر کے دوران ہوتا تھا۔آپ ﷺ بات کو کئی بار اس لیے دہراتے تھے تا کہ سب لوگ اسے سمجھ لیں۔اور اس میں غور وتدبر کریں(۱) گاہے گاہے مضمون ایسا ہوتا ہے کہ اس کا دماغ میں اہتمام کے ساتھ بٹھانا مقصود ہوتا ہے۔مثلاً ایک بار کبائر کا ذکر کرتے ہوئے آپ ﷺ نے جب **شھادة الزور** (جھوٹی گواہی) کا ذکر کیا۔تو اس کی اہمیت کی بناء پر بار بار فرمایا **وشهادة الزور، وشهادة الزور.** راوی کہتے ہیں کہ حتیٰ کہ ہم آپ ﷺ کے خاموش ہونے کی تمنا کرنے لگے۔تو حسبِ ضرورت آپ ﷺ کبھی دوبار اور کبھی تین مرتبہ جملے کا تکرار فرما لیتے تھے۔اس لیے کہ ہادی، مبلغ اور داعی کا مقام شفیق باپ جیسے ہوتا ہے۔جو اپنی اولاد کی خیر خواہی کے لیے تکرار واصرار تو کیا اس سے بھی آگے چلا جاتا ہے۔اس کے برعکس قانون کی زبان اور طرح کی ہوتی ہے۔ وہ تو مجمل سے مجمل الفاظ ذکر کرتا ہے۔اور وہ بھی صرف ایک بار اس کے بعد جبر وتشدد کا نمبر آتا ہے۔لیکن جو سمجھانا چاہتا ہے۔وہ تکرار سے تھکتا نہیں۔بار بار سمجھانے کی کوشش کرتا ہے۔اسی تکرار کی تعبیر قرآن میں یوں ہوتی ہے کہ **وصرّفنا الآیات لعلهم یرجعون**(احقاف ۲۷) ترجمہ: اور ہم نے بار بار نشانیاں بیان کردیں تا کہ وہ رجوع کریں۔

كذالک نصرف الآیات لقوم یشکرون.(اعراف ۵۷)

ترجمہ: اسی طرح ہم طرح طرح کی نشانیاں بار بار بیان کرتے ہیں۔ان لوگوں کے لیے جو شکر ادا کرتے ہیں۔

تصریف آیات کی حکمتیں: **تصریف الآیات** قرآن کے موضوعات میں سے ایک مستقل موضوع ہے۔اور بکثرت ایسے امور ہیں۔جنہیں اسی حکمت کے تحت بار بار دہرایا گیا ہے۔مثلاً حضرت آدمؑ کا قصہ بار بار مختلف پیرایوں میں ذکر کیا جاتا ہے۔موسیٰؑ اور فرعون کا قصہ متعدد مقامات میں مذکور ہے۔

---

(۱) قال البیجوریؒ وحکمته انّ الاولیٰ للاستماع والثانیة للوعی وقیل للتنبیه والثالثة للتفکر وقیل للامر (المواهب اللدنیة ص ۱۶۱)(مختار)

تکرار کی اہمیت: ظاہر بین لوگ تو اس تکرار پر اعتراض کریں گے کہ یہ شنیع ہے۔لیکن اس کا جواب وہی ہے کہ تکرار اصول وقوانین کی ترتیب میں شنیع ہو۔تو ہولیکن مبلغ کے لیے اس میں کوئی عیب نہیں۔وہ تو چاہتا ہے کہ مخاطب میں انقلاب آئے۔اور بات اس کے دماغ میں بیٹھ جائے۔تو وہ اگر سو بار بھی مناسب سمجھے اپنی بات دہراتا رہے گا۔اس سلسلے میں قرآن کا بھی دوسرے کتب سے موازنہ کرنا غلط ہوگا۔کیونکہ یہاں تو دعوت وہدایت مقصود ہے۔اس لیے تکرار کی یہاں گنجائش بلکہ ضرورت ہے۔اوراسی لئے نبی کریم ﷺ بھی تکرار کیا کرتے تھے۔حضرت تھانویؒ نے بعض مواعظ میں ایک مثال کے ذریعے یہ بات واضح فرمائی ہے۔ فرماتے ہیں کہ ایک بار ایک بوڑھے شخص کا ایک جوان بیٹا تھااور حسب عادت بڑھاپے کی حالت میں جوان بیٹے والدین سے نالاں رہتے ہیں۔بے حوصلہ ہو جاتے ہیں۔بات بات پر ان کو دھتکارتے رہتے ہیں۔ ایک دن ایک کوّا کہیں بیٹھا تھا۔باپ نے بیٹے سے پوچھا کہ بیٹا یہ کیا ہے؟ بیٹا بولا کوّا ہے۔اس نے پھر پوچھا تو بیٹے نے ذرا زور سے جواب دیا کہ کوّا ہے۔تیسری بار پھر پوچھا تو اس نے کہا کہ بات سمجھتے نہیں بس شور مچا رکھا ہے کیا ہے؟ کیا ہے؟ بیسیوں مرتبہ تو کہہ چکا ہوں کہ کوّا ہے۔پھر جب اگلی مرتبہ اس نے پوچھا تو خوب ڈانٹا۔باپ نے یہ سنا تو بیٹے کو ایک چابی دیدی اور کہا کہ جاؤ وہاں ایک صندوق میں ایک تختی پڑی ہے وہ لے آؤ۔بیٹا تختی لے آیا۔اس پر ایک سو لکیریں تھیں۔باپ نے کہا کہ بیٹا جب تم چھوٹے تھے تو ایک دن میرے ساتھ بیٹھے تھے ایک کوّا آ کر سامنے بیٹھا تو تم نے پوچھا یہ کیا ہے میں نے کہا کوّا ہے تم نے پھر پوچھا میں نے پھر بتایا۔اس طرح تم نے سو مرتبہ پوچھا اور میں اسی طرح محبت سے جواب دیتا رہا ساتھ ساتھ ہر جواب کے ساتھ اس تختی پر ایک لکیر بھی کھینچتا رہا۔لیکن آج میں نے تم سے صرف تین بار پوچھا تو چوتھی مرتبہ تم مارنے پر تل گئے۔

بہر حال جب والدین کی شفقت اتنی ہے کہ ایک سو مرتبہ سمجھانے سے نہیں تھکتے۔تو اللہ تعالیٰ کی محبت تو مخلوق کے ساتھ کروڑوں درجہ بڑھ کر ہے۔اسی طرح رسول ﷺ کی شفقت بھی بے مثال ہے۔وہ بھی تو داعی تھے۔اور داعی اپنی دعوت میں بہت حریص ہوتا ہے۔

حضرت شاہ اسماعیل شہیدؒ کا جذبہ دعوت: حضرت شاہ اسماعیل شہیدؒ کے بارے میں آیا ہے کہ ایک

مرتبہ دہلی میں ایک عظیم اجتماع سے خطاب فرمایا۔تقریر ختم ہوئی تو ایک آدمی انہیں ملا۔اس نے بتایا کہ وہ میلوں دور سے صرف آپؒ کی تقریر سننے کے لیے پیدل آیا تھا۔لیکن یہاں پہنچا تو آپؒ کی تقریر ختم ہو چکی تھی۔اس لئے بہت دکھ ہوا۔شاہ صاحب سمجھ گئے کہ دور سے آئے ہیں اور سچے طالب ہیں۔لہٰذا آپؒ نے فرمایا کہ پریشانی کی کوئی بات نہیں۔میرے ساتھ آؤ۔چنانچہ جب سب لوگ چلے گئے۔تو آپؒ دوبارہ منبر پر بیٹھ گئے اور وہ ساری تقریر جو ابھی کی تھی اسی ایک آدمی کے سامنے اسی لہجے اسی تفصیل اور اسی محبت کے ساتھ دہرائی۔ دعوت کے تقاضوں کو پورا کرنے کی جو مثال ان بزرگوں نے قائم کی تھی۔اس کی نظیر آج کے مقرروں میں کب ملتی ہے۔

یہ مسئلہ ایک ولولہ اور تڑپ کا متقاضی ہے۔دین اور دعوتِ دین کے ساتھ عشق ہو، مشن سے لگاؤ اور جذبہ ہو، تب یہ بات ممکن ہے تو دعوت کی غرض سے نبی کریم ﷺ کا بھی یہی انداز تھا کہ کلمہ کو تین بار دہراتے۔

(۳) حدّثنا سفیان بن وکیع أنبانا جمیع بن عمرو بن عبدالرحمٰن العجلی ثنی رجل من بنی تمیم من ولد ابی هالة زوج خدیجة یکنٰی أبا عبداللّٰه عن إبن لأبی هالة عن الحسن بن علی قال سالت خالی هند ابن أبی هالة وکان وصّافاً قلت صف لی منطق رسول اللّٰه ﷺ قال کان رسول اللّٰه ﷺ متواصل الاحزان دائم الفکرة لیست له راحة طویل السکت لا یتکلّم فی غیر حاجة یفتتح الکلام و یختمه با شداقه و یتکلّم بجوامع الکلم کلامه فصل لا فضول و لا تقصیر لیس بالجا فی ولا المهین یعظّم النعمة ان دقّت لا یذمّ منها شیئا غیر أنّه لم یکن یذمّ ذواقا ولا یمدحه ولا تغضبه الدنیا ولا ما کان لها فاذا تعدیٰ الحق لم یقم لغضبه شئی حتی ینتصرله لا یغضب لنفسه ولا ینتصر لها اذا اشار اشار بکفه کلها واذا تعجب قلّبها واذا تحدّث اتّصل بها وضرب براحته الیمنیٰ بطن ابهامه الیسری وإذا غضب اعرض

واشاح وإذا فرح غض طرفه جلّ ضحكه التبّسم يفترسن مثل حب الغمام(۱).

ترجمہ: حضرت حسن بن علیؓ کہتے ہیں کہ میں نے اپنے ماموں ہند بن ابی ہالہؓ سے جو نبی کریم ﷺ کے اوصاف کثرت سے بیان کرنے والے تھے۔عرض کیا کہ مجھے نبی کریم ﷺ کی گفتگو کے انداز کے بارے میں بتایئے۔ انہوں نے فرمایا کہ نبی کریم ﷺ (امور آخرت کیلئے) بکثرت غم میں مبتلا رہنے والے تھے۔اور ہمیشہ امت کے لیے فکرمند رہتے تھے۔(دنیوی نعمتوں سے) آپ ﷺ کو راحت نہیں ملتی تھی۔ طویل خاموش رہنے والے تھے بلا ضرورت بات نہیں کرتے تھے۔ بھرے منہ سے بات شروع اور بھرے منہ سے ختم کرتے تھے۔متکبرین کی طرح ہونٹوں کے نوک پر نہیں بولتے تھے۔یا یہ کہ اللہ تعالیٰ کے نام سے بات شروع اور اسی پر ختم کرتے تھے۔ کما فی نسخۃ۔(زیادہ معانی پر مشتمل) جامع الفاظ بولتے تھے۔آپ ﷺ کے بولے ہوئے الفاظ اور جملے ایک دوسرے سے ممتاز اور الگ الگ ہوتے تھے۔باتوں میں (بے مقصد) زائد الفاظ ہوتے نہ الفاظ مقصد سے کم تر ہوتے تھے۔درشت وسخت مزاج نہیں تھے۔نہ کسی کی تذلیل فرماتے تھے کسی بھی نعمت کو اگر چہ وہ تھوڑی ہو بہت بڑی نعمت سمجھتے تھے۔اس کی مذمت نہیں کرتے تھے (بلکہ مدح کرتے تھے) البتہ کھانے کی چیزوں کی مذمت کرتے نہ (زیادہ) تعریف۔دنیا اور نہ دنیاوی اشیاء آپ ﷺ کو غصہ دلاتی تھیں۔مگر جب حق سے تجاوز کیا جاتا تو اس وقت آپ ﷺ کے غصہ کے سامنے کوئی چیز نہیں ٹکتی تھی۔جب تک آپ ﷺ اس کا انتقام نہ لیتے تھے۔ اپنی ذات کے لیے نہ غصہ فرماتے تھے نہ اپنی ذات کے لیے انتقام لیتے تھے۔جب اشارہ فرماتے تو پورے ہاتھ سے اشارہ فرماتے تھے۔جب تعجب کا اظہار فرماتے تو

(۱)سبق تخریجه رقم حدیث ۷

ہاتھ پلٹ لیتے تھے۔ جب بات کرتے تو (کبھی بات کے ساتھ) ہاتھ کو ہلایا کرتے تھے اور داہنی ہتھیلی کو بائیں ہاتھ کے انگوٹھے کے اندرونی حصہ سے لگا لیتے تھے۔ جب (کسی سے) ناراض ہوتے تو (حیا اور کرامت نفس کے وجہ سے) اعراض فرماتے تھے۔ اور اس میں مبالغہ کرتے تھے۔ جب خوش ہوجاتے تھے تو آنکھیں (گویا تواضعاً) بند فرماتے تھے۔ آپ ﷺ کی زیادہ تر ہنسی تبسم ہوتی تھی۔ (اس وقت) دانت مبارک اولوں کی طرح (سفید آبگین) دکھائی دیتے تھے۔

عن ابن لابی هالة یہاں ابن سے ابن الابن مراد ہے جیسا کہ باب اول کی ساتویں حدیث کی سند کی تشریح میں ذکر کر چکے ہیں۔ ان کا نام ہند تھا۔ سند کی مزید تشریح پہلے بیان کی جا چکی ہے۔

قلت صف لی منطق الخ یعنی نبی کریم ﷺ کے طرز تکلم کے بارے میں مجھے بتائیں کہ کس موقع پر وہ بولتے تھے اور کیسے بولتے تھے۔ کس موقع پر خاموش رہتے تھے۔ اور خاموشی کی کیفیت کیا تھی۔

<u>نبی کریم ﷺ اور احساس ذمہ داری:</u> **دائم الاحزان الخ** یعنی اول تو یہ سمجھ لینا چاہیے کہ نبی کریم ﷺ بے فکر آدمی اور غیر ذمہ دار نہ تھے۔ جو شخص زیادہ بے فکر ہو۔ اسے اپنی ذمہ داریوں اور فرائض کا احساس نہیں ہوتا۔ وہ ہر وقت ہنستا رہتا ہے، تالیاں بجاتا ہے گپ شپ لگاتا ہے۔ بڑے لوگ ایسی باتوں کے لیے فارغ نہیں ہوتے۔ بلکہ ان کی بات بھی حساب سے، اٹھنا بیٹھنا اور ملاقات کرنا سب کام ایک ٹائم ٹیبل کے تحت ہوتے ہیں۔ پھر پیغمبر کا ہر قول ایک قانون بنتا جاتا ہے۔ اور ہر قول ہدایت اور تبلیغ کا ذریعہ ہوتا ہے۔ تو ایسی باتیں جن میں دین و دنیا کا کوئی فائدہ نہ ہو۔ ان سے صادر نہیں ہوتی۔ وہ فکر مند رہتے ہیں ان کو اپنے مشن اور اپنی امت کا غم ہوتا ہے۔ خصوصاً نبی کریم ﷺ کے ساتھ امت کی فکر حد سے زیادہ تھی۔ رات کے وقت روتے رہتے تھے۔ حتیٰ کہ اللہ تعالیٰ نے اس پر تنبیہ فرمادی۔ **لعلک باخع نفسک علی آثارهم ان لم یؤمنوا بهذا الحدیث اسفا (کهف ٦)** یعنی تجھے ان کی اتنی فکر ہے کہ شاید خود کو ہلاک کردو گے۔ اور گھٹ کر مر جاؤ گے۔

بہر حال آپ ﷺ کی فکر مندی کا سبب اپنی ذمہ داری کا احساس اور امت کا غم تھا۔ علامہ ابن قیمؒ

اور ابن تیمیہؒ نے اسی تشریح کو ترجیح دی ہے۔اور ظاہر غمزدگی سے انکار کرتے ہوئے متعدد وجوہ اظہار غم کو رد کیا ہے۔حتیٰ کہ حدیث پر بھی جرح کی ہے۔کیونکہ نبی کریم ﷺ کو اللہ تعالیٰ نے دنیوی اور اخروی غموں سے محفوظ رکھا تھا۔ساتھ ساتھ روایات سے ثابت ہوتا ہے کہ آپ ﷺ ہنس مکھ اور خوش وخرم دکھائی دیتے تھے۔ جیسا کہ اگلے باب میں بھی آرہا ہے۔جبکہ دیگر شراح نے تو اصل احزان کو حقیقت پر محمول کیا ہے۔اور حدیث کی توجیہ یوں کی ہے کہ آپ ﷺ دل ہی دل میں ہمیشہ غمزدہ رہتے تھے۔اس لیے کہ ذات وصفات الٰہی کا مشاہدہ جتنا بھی بڑھتا جاتا ہے۔اتنا ہی استغراق بلکہ خوف میں اضافہ ہوتا جاتا ہے۔چنانچہ آپ ﷺ بھی مسلسل ایک گونہ غم اور خوف کی کیفیت میں غرق رہتے تھے۔اگرچہ یہ غم اور فکر چہرۂ اقدس پر کم ظاہر ہوتا تھا۔کیونکہ روایات میں آپ ﷺ کی طلاقتِ وجہ اور کشادہ روئی کا واضح بیان موجود ہے۔

لیست له راحة یہ گزشتہ صفات کا ایک لازمی نتیجہ بیان کرتے ہیں۔کیونکہ فکرمندی اور اشتغال قلب، راحت وفرحت کے ساتھ جمع نہیں ہوتے۔یعنی آپ ﷺ ان لوگوں کی طرح نہ تھے جن کو دنیاوی آسائشوں مثلاً باغ، بنگلہ، موٹر، ہوٹل، سینما اور تفریح گاہ میں خوشی اور راحت محسوس ہوتی ہے۔البتہ آخرت کے کاموں سے آپ ﷺ کو مسرت ضرور ہوتی تھی۔تو گویا معنی یہ ہوا کہ **لیست له راحة من امور الدنیا** یعنی دنیاوی آسائشیں آپ ﷺ کی راحت کا باعث نہیں تھی عبادات سے سرور ملتا تھا۔فرماتے ہیں کہ ''**جعلت قرّة عینی فی الصلوٰة**(۱) '' میری آنکھوں کی ٹھنڈک نماز میں ہے۔نیز فرمایا ''**اقم الصلوٰة یا بلال ارحنا بها**(۲) '' اے بلال نماز کے لیے بلاؤ۔اور نماز سے ہمیں راحت دلواؤ۔

<u>بزرگانِ دین کا انہماک فی الدین:</u> آج بھی بعض بزرگ ایسے ہوتے ہیں کہ وہ امریکہ، ہالینڈ کے عیاشیوں سے بھرے بازاروں میں پھرتے ہیں۔اور ان کو اس بات کی پرواہ تک نہیں ہوتی کہ یہ بازار ہیں۔عورتیں ہیں مناظر ہیں اور سیر سپاٹوں کا مقام ہے۔وہ اپنے بستر ے کو کندھے پر رکھے اپنی دنیا میں مستغرق ہوتے ہیں۔دنیا کے امور سے انہیں کوئی راحت کوئی دلچسپی نہیں ہوتی۔وہ چاہتے ہیں کہ اپنا مشن

(۱)نسائی ج۲ ص ۹۲ باب حب النساء(مختار)

(۲)مشکوٰۃ ص ۱۱۹ کتاب الصلواۃ باب القصد فی العمل (مختار)

کسی کے پاس پہنچا دیں۔ جس طرح کسی طالبعلم کو امتحانات تدریس اور تبلیغ دین وغیرہ کی ذمہ داریوں کا احساس، زیب وزینت اور ٹھاٹ بھاٹ سے دور رکھتا ہے۔ جلسے جلوسوں اور احتجاج اور ایجی ٹیشنوں سے کتراتا ہے۔ کتابوں میں محو اور علمی مشاغل میں مگن رہتا ہے اور فضول مشغلوں میں تسکین محسوس نہیں کرتا۔ قرآن میں بھی آتا ہے کہ **ان اللّٰہ لا یحبّ الفرحین** یعنی دنیا سے تلذذ حاصل کرنے والوں کو اللہ تعالیٰ نا پسند کرتا ہے۔ یہ مطلب نہیں کہ نبی کریم ﷺ ہر وقت ترش رو رہتے تھے۔ بلکہ آپ ﷺ ملاقات اور باتوں کے دوران نہایت کشادہ رو نظر آتے تھے۔ لیکن وہ کیفیت بھی نہیں تھی جو دنیا داروں اور فرحین کا خاصہ ہے(۱)۔ آپ ﷺ ایسی بے لگام خوشی کو نا پسند فرماتے تھے۔

فلیضحکوا قلیلا ولیبکوا کثیراً ان کو ہنسنا کم اور رونا زیادہ چاہیے۔

طویل السکت ماقبل سے ضمناً آپ ﷺ کی خاموشی معلوم ہوتی ہے۔ کیونکہ فکرمندی میں سکوت لازمی ہوتی ہے۔ لیکن پھر بھی صراحۃ اسے ذکر کردیا۔ اس لیے کہ اصل مقصد اسی بات کا بیان ہے کہ عموماً آپ ﷺ خاموش رہتے تھے۔ اور سکوت غالب تھی بلکہ آپ ﷺ خاموشی کی بہت تاکید کے ساتھ تلقین کیا کرتے تھے۔ چنانچہ فرماتے ہیں کہ **من کان یؤمن باللّٰہ والیوم الآخر فلیقل خیراً اولیسکت** (متفق علیہ) نیز ارشاد ہے "**من صمت نجا**" (ترمذی) جو خاموش رہا وہ چھوٹ گیا۔

بہرحال آپ ﷺ کی طویل خاموشی سے یہ استبعاد بھی دور ہو جاتا ہے کہ اتنے سارے احادیث عام لوگوں کو کیسے یاد ہوئے۔ وہ یوں کہ جب کوئی شخص اکثر خاموش رہتا ہے۔ کبھی کبھی بولتا ہے۔ تو بولتے ہوئے اس کی طرف زیادہ توجہ دی جاتی ہے۔ سامعین کو بات اہم لگتی ہے اور اس طرح اس کی باتیں دلوں میں بیٹھتی جاتی ہیں۔

---

(۱) بعض شراح نے **لیست لہ راحۃ** کی تفصیل کرتے ہوئے لکھا ہے کہ آپ ﷺ پر کوئی وقت بغیر اطاعت الٰہی کے نہ گزرتا تھا۔ اور آپ ﷺ ہمیشہ عبادت میں مشغول ہوتے تھے۔ اس پر مستزاد یہ کہ اصلاح امت اور حق کی علمبرداری کی ذمہ داریاں اور دین کی سربلندی کے لیے تگ و دو بھی کرنی تھی۔ تو گویا آپ ﷺ ظاہری اور باطنی طور پر مصروف رہتے تھے۔ فراغت اور آرام و راحت کا موقعہ ہی نہیں تھا۔ (اتحافات ص ۲۷۴) (اصلاح الدین)

یختمه باشداقه بعض نسخوں میں **یختمه باسم اللّٰه** مذکور ہے۔اللہ تعالیٰ کے نام سے شروع کرنے سے کلام میں برکت اور تاثیر میں اضافہ مقصود ہوتا ہے۔لیکن یہاں بالخصوص بسم اللہ کی جگہ ذکر اللہ سے ابتداء مراد ہونا چاہیے۔جبکہ موجودہ نسخوں میں **باشداقه** کا ذکر ہے۔**اشداق شدق** کی جمع ہے۔

شدق باچھ کو کہتے ہیں مگر **اشداق** جمع سے مراد یہاں پر تثنیہ یعنی **شدقین** لی گئی ہے۔اور مراد یہ ہوگی کہ آپ ﷺ بھرے باچھوں سے بات شروع اور ختم فرماتے تھے۔

بعض اوقات مقرر یا مدرس ابتداء کلام آہستہ اور مدہم لہجے میں کرتا ہے۔حتیٰ کہ پانچ چھ منٹ تک اس کی بات سمجھی ہی نہیں جاتی۔اور بعض لوگ آخر میں بات کو کمزور اور سست لہجے میں کرتے ہیں۔کہ سمجھنا دوبھر ہو جاتا ہے۔یا پھر درمیان میں انداز بیان کو بدل کر بلاضرورت محض تنوع پیدا کرنے کی کوشش کرتے ہیں جو اکثر مضر ہوتا ہے اور کبھی کبھی محض تکبر اور رعونت کی وجہ سے باتیں کرنے والا منہ کھولنے کی تکلیف نہیں کرتا۔اور بہت دھیمے انداز سے بولتا ہے۔یہ بھی سامع پر بوجھ بنتا ہے۔آپ ﷺ کی بات ایسی نہیں تھی۔بلکہ آپ ﷺ کے کلام کی خوبی یہ تھی کہ ٹھہر ٹھہر کر اول سے لیکر آخر تک بات کرتے تھے۔جس کی وجہ سے کلام میں ابہام نہیں رہتا تھا۔اور یہی فصاحت کا تقاضا ہے۔لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ ایسا کرنے میں آپ ﷺ مبالغہ سے کام لیتے تھے۔اور بتکلف جوش پیدا کرتے تھے۔جسے تشدق کہتے ہیں۔اور جو بعض مقررین کا انداز ہوتا ہے۔حدیث میں اس سے نہی اور کراہت مذکور ہے۔خلاصہ یہ ہے کہ آپ ﷺ کا کلام طبعی فصاحت وبلاغت کا حامل ہوتا تھا۔

بجوامع الکلم یعنی آپ ﷺ ایسے کلمات اور جملوں کا اپنے کلام میں استعمال فرماتے تھے۔جن میں نہایت درجہ کی جامعیت اور کثرت معانی ہوتا تھا۔آپ ﷺ کے جوامع الکلم کے کئی مجموعے محدثین حضرات نے جمع فرمائے ہیں۔اس سلسلے میں متعدد تالیفات بھی موجود ہیں۔ایک چھوٹا سا جملہ اتنے دقائق اور باریک نکتوں پر مشتمل ہوتا ہے۔کہ درجنوں احکام ومعانی اور مسائل وحکم اس سے مستنبط ہو سکتے ہیں۔

بعض لوگوں نے لکھا ہے کہ جوامع الکلم سے قرآن مجید مراد ہے۔جس طرح کہ دوسری جگہ **اوتیت جوامع الکلم** کی ایک توجیہ یہی ہے کہ قرآن مجید مراد ہے۔لیکن ملا علی قاریؒ فرماتے ہیں کہ

والا ظهر انّ المراد بها اعم فان المدح بها اتم یعنی ظاہر یہ ہوتا ہے کہ قرآن کی طرح احادیث بھی جوامع الکلم کا مصداق ہیں۔ کیونکہ نبی کریم ﷺ کی مدح احادیث کی جامعیت میں زیادہ ہے۔قرآن مجید تو کلام اللہ ہے۔اس کی جامعیت اور حسن میں تو کلام نہیں ہے۔

لا فضول و لا تقصیر نہ آپ ﷺ کے کلام میں حشو وطویل ہوتا تھا کہ دل اچٹ جائے۔اور ملال کا سبب بن جائے۔اور نہ اتنا ایجاز واختصار ہوتا جو مقصد میں مخل ہو۔اور اظہار مدعا سے قاصر رہے۔ اس جملے کے اعراب میں پانچ احتمالات ہیں۔جیسا کہ لاحول ولاقوۃ میں بیان کیا جاتا ہے۔

لیس بالجافی جفاء سے اسم فاعل ہے جو براور وفاء کی ضد ہے۔تو معنی یہ ہوگا کہ آپ ﷺ سنگ دل اور بدسلوکی کرنے والے نہ تھے۔ بلکہ آپ ﷺ کا حسن سلوک اور نرم دلی اقرباء اور مؤمنین تک بھی محدود نہ تھی۔آپ ﷺ کی رعایتوں اور حسن سلوک نے تو دشمن کفار کے دل جیت لیے تھے۔ اور یہی داعی کا بڑا وصف ہے۔اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ **فبما رحمة من الله لنت لهم ولو كنت فظّا غليظ القلب لا نفضّوا من حولك (آل عمران ۱۵۹)**

اور اس قسم کی دوسری صفتیں اگر چہ کلام کی صفتیں نہیں ہیں لیکن اخلاق سے تعلق کی بنا پر یہ کلام پر ضرور اثر انداز ہوتی ہیں۔ کیونکہ جو آدمی ان اخلاق کا حامل ہوتا ہے اس کے کلام میں درشتی اور خشکی وخشونت نہیں ہوگی۔آپ ﷺ خشک مزاج نہیں تھے۔اس لیے کلام میں بھی درشتی نہیں تھی۔**ولا بالمهين الخ** میم مضموم ہوتو مطلب یہ ہوگا کہ آپ ﷺ تحقیر واہانت کرنے والے نہ تھے۔اپنے ہم مجلسوں کے، گویا باتوں میں بھی ایسے الفاظ سے گریز کرتے جن سے کسی کی اہانت ہوتی ہو۔اور اگر میم مفتوح ہوتو پھر معنی یہ ہوگا کہ آپ ﷺ ہلکی اور بے وقار شخصیت کے مالک نہ تھے۔ بلکہ آپ ﷺ کی طبیعت میں وقار اور حزم واحتیاط ہوتا تھا۔حقیر نہ تھے۔ بلکہ عظمت نفس سے متصف تھے۔اس صورت میں **لیس بالجافی** کے بعد یہ اضافہ بہت مناسب لگتا ہے۔ کیونکہ کبھی یہ تو ہم ہو جاتا ہے کہ جب آپ ﷺ جافی نہ تھے تو معاذ اللہ وقار سے بھی خالی ہونگے۔

یعظّم النعمة الخ معمولی نعمت کی بھی بڑائی بیان کرتے تھے۔مثلاً اگر معمولی کھانا ملتا تو اس کی صفت بیان فرماتے اور اس پر اللہ تعالیٰ کا شکر ادا فرماتے تا کہ یہ ظاہر ہو کہ یہ نعمت جو مجھے ملی ہے بعض دوسرے لوگوں کو نہیں ملتی۔کسی نعمت کی تحقیر نہیں فرماتے تھے۔ہماری حالت اس کے برعکس ہے۔ہمیں تو اللہ

تعالیٰ نے بڑی نعمتوں سے نوازا ہے۔ پھر بھی اپنے سے اونچے معیار زندگی کے لوگوں پر نظر رہتی ہے۔ اور اس وجہ سے دی ہوئی عظیم نعمتوں کی بے قدری کرتے ہیں۔

اسی طرح اگر کوئی عقیدت مند بہت زیادہ تکلفات کے ساتھ بھی کھانا یا ہدایا پیش کرے۔ ہم کہتے ہیں یہ ٹھیک نہیں تھا وہ ٹھیک نہیں تھا۔ کھانے میں خوبیوں کی بجائے خامیاں تلاش کرتے ہیں۔ مگر نبی کریم ﷺ ایک شکر گزار بندے کی حیثیت سے ہر چھوٹی بڑی نعمت کا شکریہ ادا فرماتے تھے۔

تمام نعمتیں قابل قدر ہیں: لا یذمّ منھا شیئاً یعنی نعمت میں سے کسی چیز کی مذمت نہیں کرتے تھے۔ دنیاوی ہو یا اخروی اپنی ہو یا پرائی ہر نعمت کو قابل قدر اور وجوب شکر کا موجب سمجھتے تھے۔ کفرانِ نعمت متکبر و متجبر لوگوں کا شیوہ ہے۔ جن سے آپ ﷺ کوسوں دور تھے۔

غیر انّہ لم یکن یذمّ ذواقًا ذواق ذوق سے فعل کا صیغہ ہے جو مفعول یعنی مذوق کے معنی میں ہے اور یہ ماکول و مشروب دونوں کو شامل ہے۔ یعنی اگر چہ دیگر نعمتوں کی آپ ﷺ حتی الوسع مدح کرتے تھے لیکن کھانوں کے سلسلے میں آپ ﷺ کا رویہ مختلف تھا۔ ان کی مذمت سے تو آپ ﷺ اجتناب کرتے ہی تھے۔ کیونکہ کھانے نعم خداوندی میں سے عظیم ترین نعمت ہیں۔ اور ان کی تحقیر متکبرین ہی کا کام ہوسکتا ہے۔ مگر دوسری نعمتوں کے برعکس کھانوں کی مدح سرائی سے آپ ﷺ کتراتے تھے کیونکہ کھانوں کی مدح حریص لوگ کرتے ہیں۔ اور لذائذ دنیاوی میں رغبت کے موقعہ پر میزبان کی تطیب خاطر کے لیے کبھی کبھی کھانے کے بارے میں تعریفی کلمات بول لیتے تھے۔ لیکن ہر لحہ روٹی، سالن، کھیر، حلوا، پلاؤ، مرغ اور مینڈھے کی باتیں نہیں کرتے تھے۔ جو حرص اور شکم پرستی کی علامت ہے۔ اگر چہ کفران نعمت اور کھلانے والوں کی دل شکنی کے خوف سے کھانوں کی مذمت سے بھی اجتناب فرماتے تھے۔ تو گویا آپ ﷺ کا کلام کھانوں کے حق میں حریصوں اور شکم پرستوں یا ناشکروں اور ناقدروں کا کلام نہ تھا۔

و لا تغضبہ الدنیا الخ دنیا اور دنیاداری کے امور نبی کریم ﷺ کے لیے غیظ وغضب کا سبب نہیں بنتے تھے۔ ہم تھوڑی سی چیز اور ایک ٹکے کا نقصان برداشت نہیں کرسکتے اور جلد ہی آپے سے باہر ہوجاتے ہیں۔ اس کے برعکس نبی کریم ﷺ کو اگر پتہ چلتا کہ ایک بڑی دولت ہاتھ سے گئی اور عظیم دنیوی راحت اور فائدے سے بھی محروم ہوگیا تو بھی کوئی پرواہ نہیں ہوتی تھی۔ آپ ﷺ فرمایا کرتے تھے کہ مالی

ولـلدنيا مااتا في الدنيا الاکراکب استظل تحت الشجرة ثم راح وترکها(۱)۔ مجھے دنیا سے کیاواسطہ میں تو صرف ایک راہ روجیسا ہوں جو کسی درخت کے سائے میں ستانے کے لیے (تھوڑی دیر کے لیے) آ کھڑا ہو۔ پھراسے چھوڑ کر چلا جائے۔ بہرحال آپ ﷺ میں دنیاپرستی نہ تھی بلکہ دنیا سے بیزاری تھی فرماتے ہیں **تعس عبدالدینار و الدرهم**(۲)۔ دینار کا بندہ ہلاک ہوا اور درہم کا بندہ ہلاک ہو۔

و اذا تعدی الحق الخ دنیا کے مقابلے میں دینی حمیت کا بیان ہے کہ اگر حق سے عملاً یا قولاً تجاوز ہوتا تو پھر آپ ﷺ بے قابو ہو جاتے۔ اور آپ ﷺ کے غصہ کے سامنے کوئی چیز نہیں ٹھہرتی تھی جب تک حق کے لیے انتقام نہ لیتے قرار نہ آتا۔ احقاقِ حق اور اعطائے حق کے بعد ہی دم لیتے تھے۔ **لا یغضب لنفسه الـــخ** اپنے ذاتی نقصان کے لیے انتقام کے طور پر کبھی غصہ نہیں آتا تھا۔ بلکہ عفو و درگزر سے کام لیتے تھے۔ انانیت سے پاک تھے۔ ہماری حالت تو یہ ہے کہ نفس وانا کی بندگی میں لگے ہیں۔ اور یہ ایک ایسا بت ہے جو سیدھا جہنم میں لے جاتا ہے۔

یہ قتل وقتال، یہ جھگڑے سب اسی بنیاد پر ہوتے ہیں۔ **و اذا اشـار اشـار بـکـفه الخ** یعنی جب افہام تفہیم اور رفع ابہام کے لیے اشارہ کا ارادہ فرماتے تھے تو اس وقت آنکھوں سے یا صرف انگلی سے اشارہ کی بجائے پورے ہاتھ سے اشارہ فرماتے۔ نبی کریم ﷺ متکبرین کی طرح آنکھوں آنکھوں میں اشارہ نہیں کرتے تھے۔ اس طرح بے موقعہ و محل اشاروں سے بھی پرہیز کرتے تھے۔ جو کہ وقار و تمکنت کے منافی ہے۔ بلکہ آپ ﷺ اشارہ فرماتے تو انگلیوں کی بجائے ہاتھ سے اشارہ فرماتے کیونکہ یہ عرفاً ایک تو تواضع کے قریب تر ہے۔ دوسری یہ کہ ایک انگلی ایک چیز کے لیے مختص تھی۔ کہ غیر اللہ کو ایک انگلی سے اشارہ بھی گوارا نہ تھا اس سے بھی آپ ﷺ کو شرک کی بو محسوس ہوتی تھی۔ کیونکہ سبابہ سے اشارہ عموماً صرف توحید الٰہی کی طرف ہوتا تھا۔

و اذا تـعـجّـب الـخ جب آپ ﷺ کو کسی بات پر تعجب ہوتا تو اظہارِ تعجب کے لیے ہاتھ الٹا کر

---

(۱) جامع ترمذی ۲/۶۳ ابواب الزهد. باب بعد ما جاء فی اخذا لمال (مختار)

(۲) صحیح بخاری کتاب الرقاق ج۲ ص ۹۵۲ باب ما یتقی من فتنة المال و فی روایة الترمذیؒ لعن عبدالدینارو لعن عبدالدرهم جامع ترمذی ۲/۶۳ (مختار)

دیتے تھے یعنی خلاف معمول ہتھیلی کو نیچے سے اوپر کی جانب کر لیتے تھے جیسا کہ عموماً تعجب کے دوران کیا جاتا ہے۔تو یہ آپ ﷺ کی ایک عادت شریفہ کی تصویر ہے۔**اتصل بھا الخ** یعنی بات کرنے کے دوران تاکیداً اشارہ مناسب خیال فرماتے۔تو چونکہ بات کی تاکید مقصود ہوتی۔لہٰذا آپ ﷺ کی عادت مبارک یہ تھی کہ کلام کے ساتھ ہی اشارہ اور ہاتھوں کی حرکت ہوتی تھی۔

وضرب براحته الیمنی الخ یہ اسی اشارہ کی توضیح ہے جسے پہلے ذکر کیا۔یا پھر ایک اور عادت کا بیان ہے جس کی توضیح یہ ہے کہ عموماً متکلم کسی بات کی اہمیت کا اجاگر کرنا چاہے یا اپنے آپ سے فتور ودر ماندگی دفع کرنا مقصود ہو یا کوئی کلام اس کے ذوق وشوق کو تحریک دیدے۔تو ایسی حالت میں مختلف قسم کے حرکات کا متکلم سے صادر ہونا طبعی امر ہے۔یہ حرکات کبھی تو شعور واختیار کے تحت ہوتی ہیں۔اور کبھی انسان ایسے مواقع میں بے قابو ہو جاتا ہے۔مثلاً مقرر تقریر کے دوران حرکات کرتا ہے۔قاری تلاوت کے دوران سر دھنتا ہے۔اور گانا اور اشعار گانے والا اور سننے والا جھومتا ہے۔یونہی بات کی تاکید کے لیے کبھی متکلم ران پر ہاتھ مارتا ہے۔کبھی میز بجاتا ہے۔کبھی مخاطب پر ہاتھ رکھ لیتا ہے۔ان تمام حرکات میں مناسب ترین حرکت نبی کریم ﷺ کی عادت مبارکہ تھی جو یہاں بیان ہے کہ آپ ﷺ دائیں ہاتھ کی ہتھیلی کو بائیں ہاتھ کے انگوٹھے کے باطن پر مارتے تھے۔اس سے خود متکلم اور دوسری طرف مخاطب دونوں کی توجہ، استحضار اور پُر وقار انداز سے تاکید کا مقصد حاصل ہو جاتا ہے۔

اعرض واشاح اعراض کے معنی منہ پھیر لینے کے ہیں اور **اشاحة** کے معنی ایک جانب ہونا، پھرنا اور منہ پر انقباض کی کیفیت طاری کرنا ہے۔لیکن شراح کے مطابق یہاں پر اعراض سے عفو ودر گزر کرنا مراد ہے۔جیسے کہ نبی کریم ﷺ کو حکم ہوا ہے۔**واعرض عن الجاھلین** اور **اشاحة** سے مراد اعراض اور عفو وصفح میں مبالغہ کرنا مراد ہے۔مراد یہ ہے کہ آپ ﷺ غصہ ہو جاتے تو غیظ وغضب کے اظہار کی بجائے عفو ودر گزر سے کام لیتے۔اور کمال حلم وکرم اور صفحِ جمیل کا یہ حال تھا کہ مجرم کو آپ ﷺ کے غصہ کا کم احساس ہوتا تھا۔

یا پھر یہاں پر اس حسی عمل کا بیان ہے جو غصہ کے وقت آپ ﷺ فرماتے تھے۔یعنی اظہار غضب کے لیے سیخ پا ہونے کی بجائے آپ ﷺ صرف منہ پھیر لیتے تھے۔اور مجرم سے آنکھیں نہیں ملاتے تھے۔

وفورِ حیاء کی وجہ سے صرف بے توجہی پر اکتفا فرماتے۔ بایں ہمہ یہ عشاق کے لیے بہت بڑی سزا ہوتی تھی۔ صحابہؓ ایسی بے رخی پر بھی تڑپتے رہ جاتے۔

مثلاً تبوک سے رہ جانے پر حضرت کعب بن مالکؓ جب آپﷺ کی ناراضگی کا نقشہ کھینچتے ہیں تو کہتے ہیں کہ میں آ کر سلام کہتا تو آپﷺ جواب میں کوئی بات نہیں کرتے تھے۔ آنکھیں نہیں ملاتے تھے۔ میں مسجد کے گوشے میں بیٹھ جاتا۔ پھر کبھی موقع ملتا تو آپﷺ چپکے سے میری طرف کنکھیوں سے دیکھتے بھی تھے مگر میں دیکھتا تو اعراض فرماتے۔ یہ ان کے لئے ہجر و وصال کا ایک عجیب عالم ہوتا۔ مولانا ابوالکلام آزادؒ نے ترجمان القرآن میں اس صورتحال کا عجیب نقشہ کھینچ کر یہ شعر لکھا

بہر تسکین دل نے رکھ لی ہے غنیمت جان کر وہ بوقتِ ناز جو جنبش تیری آبرو میں ہے

بلکہ ’’وعلى الثلاثة الذين خلّفوا‘‘ کی تفسیر میں مفسرین نے جو نقشہ کھینچا ہے۔ اس کو دیکھ کر رونا آتا ہے۔ امام احمدؒ فرماتے ہیں کہ میں کبھی بھی اس آیت پر ایسے نہیں گزرا کہ میں چیخ چیخ کر نہ رویا ہوں۔

بہرحال آپﷺ کے غصہ کی حالت کا بیان تھا کسی کو ڈانٹ پلانا تو عادتِ شریفہ میں تھی ہی نہیں۔

واذا فرح غضّ طرفه. جب زیادہ خوش ہوتے تو تواضع اور نہایت حیا کی وجہ سے آنکھیں نیچی کر لیتے۔ گویا خوشی کی حالت میں بھی آپﷺ اپنے آپ کو آپے سے باہر نہیں ہونے دیتے۔

جل ضحكه التبسم آپﷺ کی زیادہ ہنسی تبسم ہوتی تھی ٹھٹھہ مار کر ہنسنے کی عادت نہ تھی۔ کیونکہ اسے آپﷺ نے قلب کی موت کا سبب بتایا ہے۔ مزید تفصیل آئندہ باب میں آ رہی ہے۔

يفترّ عن مثل حبّ الغمام افترّ يفترّ جب عن کے ساتھ متعدی ہو تو اس کا معنی خوبصورت ہنسی ہنسنا ہوتا ہے۔ اور ظاہر ہے کہ جب دانت خوبصورت ہوں تو ہنسی میں دلکشی ہوتی ہے۔ اور **حب الغمام** کا ترجمہ بعض شراح نے موتیوں سے کیا ہے۔ لیکن راجح یہ ہے کہ اس سے اولے مراد ہیں اس کا لغوی معنی ہے بادل کے دانے جو اولوں پر صادق آتا ہے۔

مطلب یہ ہے کہ ہنستے وقت آپﷺ کے دانت مبارک ظاہر ہوتے تو یوں نظر آتا جیسے یہ سفید اولے ہیں۔ گویا سفیدی، صفائی اور چمک میں دانتوں کو اولوں سے تشبیہ دی ہے۔ جو نہایت ہی مناسب ہے۔

(اللهمّ صلّى على حبيبك محمّد وعلى آله وصحبه وسلم)

خلاصہ باب

اس باب میں نبی کریم ﷺ کے طرز کلام کو اجاگر کیا گیا ہے۔ داعی برحق کو فصاحت و بلاغت بہ حدکمال بخشی جا چکی تھی۔ اور باوجود امی ہونے کے آپ ﷺ کا نثری کلام اتنا دلنشین، معیاری اور انداز اتنا خوبصورت تھا کہ غبی سے غبی کے لیے قابل فہم اور ذہین سے ذہین کے لیے کافی ہوتا تھا۔ کسی کو سمجھنے میں الجھن نہیں ہوتی تھی۔ بلکہ بات دل میں اترتی تھی۔

حتیٰ کہ حضرت عمرؓ کو تعجباً کہنا پڑا **امالک افصحنا ولم تخرج من بین اظھرنا**. یعنی یہ کیا ہے کہ ہمارے درمیان پل بڑھ کر تم ہم سب سے فصاحت میں آگے نکل گئے۔ آپ نے فرمایا **کانت لغة اسماعیل درست فجاء نی بھا جبرئیل فحفظتھا(طبرانی .بیھقی)** یعنی اسماعیلؑ کی فصیح ترین لغت جو کھولا جا چکا تھا کو جبرئیلؑ میرے پاس لائے اور میں نے اسے یاد کرلیا۔

آپ ﷺ کا کلام نہ تو جوشیلے مقررین کی طرح الجھا ہوا متداخل اور نا قابل تحلیل کلام ہوتا تھا۔ نہ اظہار بلاغت میں تکلف سے کام لیتے اور نہ متکبرین کی طرح دھیمے دھیمے بولتے تھے۔ بلکہ کانوں میں گھلنے والے الفاظ، ادراک و خیال کو مسخر کرنے والے جملے، اور حافظے پر چھا جانے والا بیان مناسب ترین اشارات سے مزین ہو کر دل سے نکل کر سمع کو چیرتا ہوا دل میں بیٹھتا تھا۔

بایں ہمہ تاکید اور تکرار کر کے مزید شفقت فرماتے۔ فضول گوئی کی بجائے خاموشی اور لایعنی مشاغل کی بجائے فکر و تدبر کو ترجیح حاصل تھی۔

<u>شخصیت کیا تھی؟</u> ایک دردمند مبلغ، ایک فکرمند ہادی، مرقع اخلاص، شکرگزار ہوتے ہوئے لذائذ دنیا سے لذت اندوزی سے کنارہ کش، درشتی اور سخت مزاجی سے دور، جس کا غصہ اس کے قابو میں ہو۔ جذبہ انتقام کا نام ونشان نہ ہو مگر نصرت حق پر مرمٹنا جانتا ہو۔ عفو و درگزر فطرت بن چکی ہو۔ نکتہ چینی کی بجائے ناراضگی کا بھی منفرد مشفقانہ انداز ہو۔ غم سے مغلوب ہو۔ نہ خوشی سے طبیعت سرشار اور حسن وہ جو نظر کی ہر پیاس بجھائے۔

ایک ایسی شخصیت سے جس شیریں کلامی کی توقع کی جاسکتی ہے اس پر وحی فصاحت و بلاغت، اخلاص، شفقت، رأفۃ ورحمۃ اور بھرپور پُرکشش اداؤں کی مزید مٹھاس یہ سب جمع کی جائیں تو آپ ﷺ کے کلام کی حقیقی تصویر ابھر کر سامنے آتی ہے۔

ے　فدا ہوں آپ کی کس کس ادا پر　　ادائیں لاکھ اور بے تاب دل اک

خلاصہ باب

اس باب میں نبی کریم ﷺ کے طرز کلام کو اجاگر کیا گیا ہے۔داعی برحق کو فصاحت و بلاغت بہ حد کمال بخشی جا چکی تھی۔اور باوجود امی ہونے کے آپ ﷺ کا نثری کلام اتنا دلنشین، معیاری اور انداز اتنا خوبصورت تھا کہ غبی سے غبی کے لیے قابل فہم اور ذہین سے ذہین کے لیے کافی ہوتا تھا۔کسی کو سمجھنے میں الجھن نہیں ہوتی تھی۔بلکہ بات دل میں اترتی تھی۔

حتیٰ کہ حضرت عمرؓ کو تعجباً کہنا پڑا **امالک افصحنا ولم تخرج من بین اظهرنا.** یعنی یہ کیا ہے کہ ہمارے درمیان پل بڑھ کر تم ہم سب سے فصاحت میں آگے نکل گئے۔آپ نے فرمایا **کانت لغة اسماعیل درست فجاء نی بها جبرئیل فحفظتها(طبرانی .بیهقی)** یعنی اسماعیلؑ کی فصیح ترین لغت جو کھولا جا چکا تھا کو جبرئیلؑ میرے پاس لائے اور میں نے اسے یاد کرلیا۔

آپ ﷺ کا کلام نہ تو جوشیلے مقررین کی طرح الجھا ہوا متداخل اور نا قابل تحلیل کلام ہوتا تھا۔نہ اظہار بلاغت میں تکلف سے کام لیتے اور نہ متکبرین کی طرح دھیمے دھیمے بولتے تھے۔بلکہ کانوں میں گھلنے والے الفاظ، ادراک و خیال کو مسخر کرنے والے جملے، اور حافظے پر چھا جانے والا بیان مناسب ترین اشارات سے مزین ہو کر دل سے نکل کر سمع کو چیرتا ہوا دل میں بیٹھتا تھا۔

بایں ہمہ تاکید اور تکرار کر کے مزید شفقت فرماتے۔فضول گوئی کی بجائے خاموشی اور لایعنی مشاغل کی بجائے فکر و تدبر کو ترجیح حاصل تھی۔

<u>شخصیت کیا تھی؟</u> ایک دردمند مبلغ، ایک فکرمند ہادی، مرقع اخلاص، شکرگزار ہوتے ہوئے لذائذ دنیا سے لذت اندوزی سے کنارہ کش، درشتی اور سخت مزاجی سے دور، جس کا غصہ اس کے قابو میں ہو۔جذبہ انتقام کا نام ونشان نہ ہو مگر نصرت حق پر مر مٹنا جانتا ہو۔عفو و درگزر فطرت بن چکی ہو۔نکتہ چینی کی بجائے ناراضگی کا بھی منفرد مشفقانہ انداز ہو۔غم سے مغلوب ہو۔نہ خوشی سے طبیعت سرشار اور حسن وہ جو نظر کی ہر پیاس بجھائے۔

ایک ایسی شخصیت سے جس شیریں کلامی کی توقع کی جا سکتی ہے اس پر وہی فصاحت و بلاغت، اخلاص، شفقت، رأفۃ ورحمۃ اور بھرپور پُرکشش اداؤں کی مزید مٹھاس یہ سب جمع کی جائیں تو آپ ﷺ کے کلام کی حقیقی تصویر ابھر کر سامنے آتی ہے۔

ے فدا ہوں آپ کی کس کس ادا پر ادائیں لاکھ اور بے تاب دل اک

۳۵. باب ماجاء فی ضحک النبیؐ ﷺ

حضور اقدس ﷺ کے ہنسنے کا بیان

ضحک ضاد کے کسرہ اور فتح کے ساتھ جبکہ حاء ساکن ہو یا مکسور، ہنسنے کو کہتے ہیں(۱)۔ ہنسنے کے تین مراتب ہیں۔ سب سے ادنیٰ تبسم ہے۔ پھر ضحک اور اس کے بعد قہقہہ کی باری آتی ہے۔ ضحک یہ ہے کہ خود ہنسنے والا اور اس کے ساتھ موجود لوگ ہنسنے والے کی آواز سن لیں۔

یہاں ترجمۃ الباب میں جس ضحک کا ذکر ہے۔ اس سے کیا مراد ہے؟

رسول اللہ ﷺ صرف تبسم فرماتے تھے: گزشتہ باب کی آخری حدیث میں بھی آیا ہے کہ نبی کریم ﷺ کی عام عادت تبسم کی تھی۔ قہقہوں کی آپ ﷺ کو عادت نہ تھی۔ بلکہ کئی احادیث میں تو کثرت ضحک سے منع کیا گیا ہے۔ خود اس باب کی پہلی حدیث میں آپ ﷺ کی ہنسی کو تبسم میں منحصر کر کے آپ ﷺ سے ضحک کی نفی کی گئی ہے۔

لہٰذا یہاں پر ضحک سے مراد تبسم میں مبالغہ ہوگا۔ جو کہ ضحک کے قریب ہو۔ اور نفی ضحک سے وہ ضحک مراد ہوگی جس میں غافلین اور فرحین لوگ مبتلا رہتے ہیں۔ لیکن بعض محدثین کے ہاں اس تاویل کی ضرورت بھی نہیں ہے۔ کیونکہ آپ ﷺ سے ضحک کا صدور بلکہ خوب زور سے ہنسنا بھی ثابت ہے۔ البتہ آپ ﷺ کی ہنسی دنیاوی امور کے بارے میں نہیں ہوتی تھی۔ بلکہ دین کے حق میں کبھی مسرت یا قابل تعجب بات کے ادراک کے موقع پر آپ ﷺ خوب ہنسے ہیں۔

مثلاً جب کبھی اسلام کو غلبہ حاصل ہوا ہے باطل ذلیل خوار ہوا ہے یا آخرت میں رحمت وفضل الٰہی کی بے پایانی کا ذکر ہے۔ ربّ ذوالجلال کی جانب سے بندے پر نوازشوں کا فیضان ہوا ہے۔ اتنا کہ تعجب آئے۔ تو آپ ﷺ خوش ہو کر زور سے ہنسے ہیں۔ اسی طرح آپ ﷺ صحابہؓ کی دلداری کی خاطر بھی ہنسا کرتے تھے۔ ہاں سیر سپاٹوں کے وقت جو بے قابو طور پر ہنسا جاتا ہے۔ اور دل کا خون کیا جاتا ہے۔ غفلت کی ایسی کیفیات سے آپ ﷺ منزہ تھے۔

---

(۱) علامہ مناویؒ نے لکھا ہے والضحک خاصة للانسان واصله من سرور يعرض القلب وقد يضحک غير المسرور (المناوی علی هامش جمع الوسائل ۱۸/۲) (اصلاح الدین)

(۱) حدّثنا أحمد بن منیع ثنا عبّاد بن العوام أنا الحجّاج وھوإبن أرطاة عن سماک بن حرب عن جابر بن سمرة قال کان فی ساقی رسول اللّٰہ ﷺ حموشة وکان لایضحک الاّ تبسّماً فکنت إذا نظرت إلیه قلت أکحل العینین و لیس بأکحل(۱).

ترجمہ: حضرت جابر بن سمرہؓ کہتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ کی پنڈلیاں (کسی قدر) باریک تھیں۔آپ ﷺ صرف تبسم کی ہنسی ہنسا کرتے تھے۔میں جب نبی کریم ﷺ کو دیکھتا۔تو دل میں یہ گزرتا کہ آپ ﷺ سرمہ استعمال کر چکے ہیں۔مگر درحقیقت آپ ﷺ سرمہ لگائے ہوئے نہیں ہوتے تھے۔

کان فی ساقی الخ یعنی آپ ﷺ کی پنڈلیاں موٹی نہیں تھیں بلکہ ان میں پتلا پن تھا۔ اگرچہ جسم مضبوط تھا۔اور علم قیافہ والوں نے اس صفت کوانسانی محاسن میں سے شمار کیا ہے۔**حمش دقة** یعنی باریکی کو کہتے ہیں۔بعض لوگوں نے خموشة کوخاء معجمہ کے ساتھ بھی پڑھا ہے۔لیکن شرّاح نے اس پر رد کیا ہے۔

وکان لا یضحک الّا تبسماً. یہاں تقدیر عبارت یوں ہے کہ وکان لا یضحک ضحکا إلاّ تبسّما۔اس طرح تبسم کوضحک میں داخل کیا گیا ہے(۲)۔اس کی ایک توجیہ تو یہ ہے کہ

---

(۱)جامع ترمذی ۲/۶۸۳ کتاب المناقب باب فی صفة النبیّ ﷺ، شرح السنة للبغوی ۱۳/۲۲۲، کتاب المناقب باب صفة النبی ﷺ،المستدرک للحاکم ۲/۶۰۶،(مختار)

(۲)ہنسنے کی صورتیں: ہنسنے کے تین صورتیں ہیں (۱) تبسم: ہنسنے کی اس صورت میں صرف ہونٹ کھل کر دانت نظر آتے ہیں۔ مگر آواز نہیں نکلتی۔(۲) ضحک: اس صورت میں منہ کھل کر نواجذ نظر آنے کے ساتھ ہلکی سی ہنسنے کی آواز بھی نکل آتی ہے۔(۳) قہقہ: ہنسنے کی اس صورت میں انسان کا پورا منہ بھی کھل جاتا ہے۔اور ہنسنے کی زوردار آواز نکلتی ہے۔ہنسنے کے اس قسم کو ناپسندیدہ قرار دیا گیا ہے۔اور اگر کوئی عاقل بالغ شخص دوران نماز قہقہ لگائے تو نماز فاسد ہونے کے ساتھ ساتھ اس کا وضو بھی ٹوٹ جاتا ہے۔ اور ایسا ہنسنا قساوت قلبی اور غفلت کا سبب ہے۔ رسول اللہ ﷺ سے روایت ہے لاتکثر الضحک فإنّ کثرة الضحک تمیت القلب(جامع ترمذی)اس لئے رسول اللہ ﷺ سے تبسم اور ضحک تو ثابت ہے مگر قہقہ ثابت نہیں۔(مختار)

ضحک کے لیے مبدا ہونے کی وجہ سے ضحک تبسم کو بھی شامل ہے۔لیکن اگر ضحک کو عام معنی میں لیا جائے جو ہنسی کے تینوں قسموں یعنی تبسم، ضحک، بالمعنی الاخص اور قہقہہ کو شامل ہوتو پھر اشکال ہی نہیں رہتا۔

بہرحال مراد یہ ہے کہ آپ ﷺ غالب اوقات میں تبسم پر ہی اکتفاء فرماتے تھے۔اور یہ بھی صحابہؓ کی دلداری اور حسن معاشرت کی وجہ سے وہ بشاشت تھی جو ہر لمحہ رخ انور پر عیاں ہوتی تھی۔تعلقاتِ عامہ کا تقاضا ہوتا ہے کہ ملاقات کرنے والوں کا استقبال خندہ روئی سے کیا جائے۔

فکنتُ اذا نظرتُ مسکراتے وقت آنکھوں میں چمک اور خوبصورتی دکھائی دیتی ہے اس کا بیان ہے۔یہاں **کنت** میں تاء مضموم (بصیغہ متکلم) اور تاء مفتوح (بصیغہ خطاب) دونوں جائز ہے۔اسی طرح بعد کے نظرت اور قلت میں بھی دونوں احتمال درست ہیں۔**قلت أكحل العينين الخ** ۔یعنی جب ان کی سرگین آنکھیں نظر آتیں تو ان پر سرمہ استعمال کرنے کا گمان ہوتا تھا۔جبکہ درحقیقت آپ ﷺ نے سرمہ استعمال نہیں کیا ہوتا تھا۔بلکہ فطری طور پر آپ ﷺ کی آنکھیں سرگین تھیں۔تو بادی النظر کے اعتبار سے تو سرمہ کا اثبات ہوتا تھا۔لیکن نفس الامر میں یہ مفصی ہیں۔اول مصنوعی طور پر آنکھوں کا سرگیں کرنا، دوم قدرتی طور پر آنکھوں کا سرگین ہونا۔تو یہاں پر اول الذکر کی نفی اور مؤخر الذکر کا اثبات مقصود ہے۔

(۲) حدّثنا قتيبة بن سعيدأنا ابن لهيعة عن عبيدالله بن المغيرة عن عبدالله بن الحارث بن جزء قال مارأيت احداأكثر تبسّما من رسول الله ﷺ (۱).

ترجمہ: عبداللہ بن حارث بن جزءؓ کہتے ہیں کہ میں نے نبی کریم ﷺ سے زیادہ تبسم کرنے والا کوئی نہیں دیکھا تھا۔

مارأيت الخ صحابہ کرامؓ کے ساتھ معاشرت اور نشست و برخاست میں نبی کریم ﷺ بہت شفیق اور ہشاش بشاش تھے۔لہٰذا عمومی حالت یہ ہوتی تھی کہ آپ ﷺ سب سے زیادہ تبسم کرنے والے ہوتے تھے۔یہ بھی اللہ تعالیٰ کی مومنین پر خصوصی رحمت تھی۔

---

(۱)جامع ترمذی ۲/۶۸۳ کتاب المناقب باب فی بشاشة النبی ﷺ ، مسنداحمد ۴/۱۹۰ (مختار)

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے **فبما رحمة من اللّٰه لنت لهم ولو كنت فظاً غليظ القلب لانفضّوا من حولک**(آل عمران ۱۵۹) پس اللہ تعالیٰ کی رحمت کے سبب آپ ﷺ ان کے لیے نرم ہو گئے اور اگر آپ ﷺ (خدانخواستہ) تندخو، سخت دل ہوتے تو یہ لوگ آپ ﷺ کے پاس سے منتشر ہو جاتے۔

یا پھر یہاں کثرتِ تبسم آپ ﷺ کے ضحک کی نسبت ہے۔اور مراد یہ ہے کہ میں نے حضور ﷺ کے سوا کسی کو بھی نہیں دیکھا جس کا ضحک کم اور تبسم اس کی نسبت زیادہ ہو۔اس طرح اس حدیث میں اور گزشتہ باب کی اس حدیث میں جس میں کہا گیا ہے کہ آپ ﷺ "**متواصل الاحزان**" تھے۔تعارض نہیں ہوگا۔

(۳) حدّثنا أحمد بن خالد الخلّال ثنا يحيٰى بن إسحاق السيلحاني ثنا ليث بن سعد عن يزيد بن أبي حبيب عن عبداللّٰه ابن الحارث قال ما كان ضحک رسول اللّٰه ﷺ إلاّ تبسّما قال ابوعيسٰى هذا حديث غريب من حديث ليث بن سعد(۱).

ترجمہ: عبداللہ بن حارث کہتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ کی ہنسی صرف تبسم ہی ہوا کرتی تھی۔

إلاّ تبسّماً الخ یعنی ضحک کی نسبت غالب اوقات میں آپ ﷺ کی ہنسی تبسم ہوتی تھی اگرچہ ضحک بھی بعض اوقات میں ثابت ہے۔

قال أبوعيسىؒ الخ امام ترمذیؒ اس حدیث کی غرابت بیان کرتے ہیں اور وجہ یہ ہے کہ لیث بن سعدؒ اس میں متفرد ہیں۔لیکن اس کے باوجود حدیث اس لیے صحیح ہے کہ لیثؒ جلیل القدر امام ہیں۔ان کا تفرد صحتِ حدیث کے منافی نہیں۔

(۴) حدّثنا أبو عمّار الحسين بن حريث أنبانا وكيع ثنا الأعمش عن المعرور ابن سويد عن أبي ذرؓ قال قال رسول اللّٰه ﷺ إنّي لأعلم اوّل رجل يدخل الجنّة وآخر رجل يخرج من النار يؤتى بالرجل يوم القيامة فيقال اعرضوا عليه صغار ذنوبه وتخبا عنه كبارها فيقال له

---

(۱)جامع ترمذی ۲/۶۸۳ کتاب المناقب باب فی بشاشة النبی ﷺ(مختار)

عملت یوم کذا کذا و کذا وهو مقرّلا ینکرو هو مشفق من کبار ها فیقال اعطوه مکان کل سیّئۃٍعملهاحسنة فیقول إنّ لی ذنوبا لا اراها ههنا قال ابو ذرؓ فلقدرأیت رسول اللهﷺ ضحک حتی بدت نواجذه(۱).

ترجمہ: حضرت ابوذرؓ فرماتے ہیں کہ نبی کریمﷺ نے فرمایا کہ میں اس شخص کو جانتا ہوں جو سب سے اول جنت میں جائے گا۔اوراس کو بھی جسے جہنم سے سب سے آخر میں نکالا جائے گا۔قیامت کے دن (اس مؤخر الذکر یا کسی اور) آدمی کو(اللہ تعالیٰ کے دربار میں) لایا جائے گا۔پھر فرشتوں سے کہا جائے گا کہ اس آدمی پر اس کے چھوٹے چھوٹے گناہ پیش کردو۔اوراس کے بڑے گناہ (حسبِ ارشادالٰہی) چھپائے جائیں گے۔چنانچہ اس کو کہا جائے گا کہ تم نے فلاں فلاں دن فلاں فلاں گناہ کئے ہیں۔وہ آدمی اقراری ہوگا۔(اپنے گناہوں سے) انکار نہیں کرے گا۔حالانکہ وہ بڑے گناہوں کے پیش ہونے سے خوفزدہ ہوگا۔پھر حکم ہوگا کہ اس کے ہر کردہ گناہ کے بدلے اسے ایک نیکی دے دیں تب یہ شخص بول اٹھے گا کہ میرے تو (اور بھی) بہت سے گناہ ہیں جو میں یہاں دیکھ نہیں رہا۔حضرت ابوذرؓ کہتے ہیں کہ پھر خدا کی قسم میں نے نبی کریمﷺ کو دیکھا کہ آپﷺ خوب ہنسے حتیٰ کہ آپﷺ کے دانت مبارک ظاہر ہوگئے۔

<u>حضرت ابوذرغفاریؓ:</u> ابوذرؓ کے نام میں اختلاف ہے لیکن مشہور نام جذب بن خبادہ ہے۔ بنوغفار سے تعلق تھا۔اسلام لانے سے پہلے بھی آپؓ کا شمار عبادت گزار لوگوں میں ہوتا تھا۔نبی کریمﷺ کی بعثت کا علم ہوا تو اپنے بھائی حضرت انیسؓ کو مکہ بھیجا تا کہ صحیح حالات کا پتہ چلے حضرت انیسؓ نے واپس آ کر

(۱)صحیح مسلم کتاب الایمان باب اثبات الشفاعة واخراج الموحدین من النار، مسنداحمد۵/۱۵۷، شرح السنة للبغوی۱۵/۱۹۲ کتاب الفتن باب اخر من یکرض من النار، السنن الکبریٰ للبهیقی۱۰/۱۹۰ (مختار)

حضورا کرم ﷺ کے متعلق کچھ بتایا مگر آپؓ نے فرمایا "ماشفیتنی" تم نے میری تشفی نہیں کی لہٰذا زاداور پانی لے کرخود مکہ تشریف لائے مکہ والوں کی مخالفت کا علم تھا۔اس لیے کسی سے نبی کریم ﷺ کے بارے میں پوچھنا مناسب نہیں سمجھا۔رات ہوگئی تو مسجد حرام آئے۔حضرت علیؓ نے انہیں دیکھا تو انہیں ساتھ لے گئے ۔دوسرادن بھی نبی کریم ﷺ کی تلاش میں گزرا۔مگران کونہیں پہچانا۔پھر حضرت علیؓ نے ان کی مہمان نوازی کی،تیسری رات جب حضرت علیؓ انہیں گھر لے گئے تو ان سے مکہ مکرمہ آنے کا مقصددریافت کیا۔آپؓ نے کہا کہ اگر یہ عہد کروگے کہ میری صحیح رہنمائی کروگے تو بتادوں گا۔انہوں نے وعدہ کیا جس پرآپؓ نے مدعا بیان کردیا کہ یہاں جس شخص نے نبوت کا دعویٰ کیا ہےاس سے ملنے آیا ہوں لیکن تاحال اسے پہچان نہ سکا۔ حضرت علیؓ نے کہا کہ دیکھومیرے پیچھے پیچھے آنا اور اگر کسی کافرکو دیکھ کر مجھے کچھ خطرہ محسوس ہوا تو میں پیشاب کے بہانے بیٹھ جاؤنگا۔اورتم میراانتظار کئے بغیر آگے گزرجانا۔اس طرح حضرت علیؓ آپؓ کولے کر نبی کریم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے ۔اس وقت تک صرف چارآدمی مسلمان ہوچکے تھے۔ نبی کریم ﷺ نے اسلام پیش کردیا۔اورآپؓ نے کلمہ شہادت پڑھا۔اس کے بعد نبی کریم ﷺ نے نصیحت کی کہ فی الحال اہل مکہ پراسلام ظاہر کئے بغیر سیدھے گھر چلے جانا۔جب تیرے پاس میرادوسراامر(حکم) آجائے تو آجانا۔مگرآپؓ نے کہا کہ خدا کی قسم میں ان کافروں کے بیچ اسلام کا اعلان کروں گا۔چنانچہ مسجد حرام تشریف لائے اور بلند آواز سے کلمہ شہادت کا اعلان کیا قریش نے اس پرآپؓ کوخوب مارا۔حتیٰ کہ حضرت عباسؓ نے انہیں بچالیا۔دوسرے روز پھراعلان کیا۔اور ماربھی پڑی۔پھراپنے گھرآکراپنے بھائی اوروالدین کواسلام کی دعوت دی۔وہ سب مسلمان ہوئے۔قوم میں سے بھی کچھ لوگ آپؓ کی دعوت پر مسلمان ہوگئے۔

غزوۂ احداورایک قول کے مطابق غزوہ خندق کے بعدمدینہ تشریف لائے۔اس کے بعد کے تمام غزوات میں شرکت کی۔نبی کریم ﷺ آپؓ کے بارے میں فرماتے کہ زمین وآسمان کے درمیان ابوذرؓ سے زیادہ سچا آدمی نہیں ہے۔حضرت علیؓ فرماتے ہیں کہ ابوذرؓ وہ برتن ہے جسے علم سے بھردیا گیا ہے۔چونکہ انتہائی درجہ کے زاہد تھے۔لہٰذا اہل ثروت لوگوں پر ہمیشہ نکیر فرماتے تھے۔چنانچہ حضرت عثمانؓ نے مدینہ سے باہر ربذہ کے مقام پر گھر بنا کر وہاں منتقل ہونے کی درخواست کی۔چنانچہ امیر کے حکم پر وہیں سکونت اختیار کی۔

اور ۱۳۱ھ میں اور ایک قول کے مطابق ۳۲ھ میں وہیں وفات ہوئے۔ بہت سے صحابہ بھی آپؓ سے روایت کرتے ہیں۔

إنّی لا علم اوّل رجل یدخل الجنة جنت میں علی الاطلاق پہلے داخل ہونے والے شخص خود نبی کریم ﷺ ہیں۔ جیسا کہ دوسری روایات میں صراحتاً مذکور ہے(۱)۔ لیکن ممکن ہے کہ یہاں اول رجل یدخل الجنة من عصاة المؤمنین مراد ہو۔ یعنی گناہ گار جہنمی مومنوں میں سے جنت میں پہلا داخل ہونے والا شخص بھی مجھے معلوم ہے۔ جس طرح کہ آخری داخل ہونے والا شخص کا قصہ یہاں ذکر کیا جاتا ہے۔ اس صورت میں پہلے شخص کا ذکر صرف اس لیے ہوگا کہ بعد کا قصہ موثق ہو جائے۔ کہ یہ وحی پر مبنی ہے۔

لیکن امام مسلمؒ وغیرہ نے حضرت ابوذرؓ کی یہی حدیث ان الفاظ سے روایت کی ہے ''انّی لا علم آخر اهل الجنة دخولا الجنة و آخر اهل النار خروجا منها رجل یؤتیٰ (الحدیث)(۲)'' اس لیے ملا علی قاریؒ کہتے ہیں کہ یہاں امام ترمذیؒ کو وہم ہوا ہے کیونکہ درست ''آخر رجل یدخل الجنّة'' ہے۔ اس طرح دونوں جملوں کے مصداق ایک ہی شخص ہوگا۔

یؤتی بالرجل یہاں ''رجل'' سے مراد میں تین احتمال ہیں۔ یا تو اس سے ''اول رجل یدخل الجنة'' مراد ہے لیکن پھر اسے اول رجل من المذنبین سے مقید کرنا پڑے گا نہ کہ علی الاطلاق۔ یا پھر آخر رجل یخرج من النار علی الاطلاق مراد ہوگا۔ جیسے کہ حضرت ابن مسعودؓ کی روایت میں اس کا ذکر ہے یا پھر یہ ایک تیسرا شخص ہے نہ کہ جنت میں داخل ہونے والا پہلا گناہ گار۔ نہ جہنم سے نکلنے والا آخری آدمی۔ بلکہ دونوں کے درمیان جنت میں داخل ہونے والا شخص ہے۔ ملا علی قاریؒ اور مناویؒ وغیرہ نے اس آخری احتمال کو ترجیح دی ہے۔ اور کہا ہے کہ یہ کلام مستأنف ہے اور ایک تیسرے شخص کا بیان مقصود ہے۔

---

(۱) ملا علی قاریؒ نے لکھا ہے وحاصله اول رجل یدخل الجنة ممّن یخرج من النار لأنّ اوّل من یدخل الجنّة علی الاطلاق إنّما هو النبی ﷺ (جمع الوسائل ۲/۲۰) اور یہی بات علامہ عبدالجواد الرومی نے بھی لکھی ہے (الاتحافات ۲۸۰) (مختار)

(۲) مسلم ج ۱ ص ۱۰۶ کتاب الایمان باب إثبات الشفاعة و اخراج الموحدین من النار (مختار)

اعطوہ مکان کل سیئة عملها حسنةً یعنی جتنے بھی صغائر ہوں سب کونیکیوں سے بدل دو۔ اس تبدیل کے حق میں اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ **إلاّمن تاب و آمن وعمل عملاً صالحا فاولئک یبدل اللّٰہ سیأتهم حسنات(فرقان ۷۰)** مگر جن لوگوں نے توبہ کیا، ایمان لائے اور نیکیاں کیں۔ پس یہ وہ لوگ ہیں جن کے گناہوں کو اللہ تعالیٰ نیکیوں سے بدل دینگے۔

<u>کفر کی وجہ سے نیکیوں کا ضائع ہونا:</u> اللہ تعالیٰ کے ہاں جس طرح حبط اعمال کا قانون ہے کہ کفر جیسے کسی جرم عظیم کے سبب اعمال اور نیکیاں ضائع ہو جاتی ہیں۔اس طرح اللہ تعالیٰ کے ہاں تبدیل سیّئات بالحسنات کا بھی قانون ہے۔کہ کبھی اللہ تعالیٰ کسی دوسرے بڑے عمل کی وجہ سے ''گاہے بدشنام مے بخشد'' کے مصداق بندہ کے گناہوں کو نیکیوں سے بدل دیتے ہیں۔

إنّ لی ذنوباً ما اراهاهنا جب بندہ رحمت خداوندی کے وفور کو دیکھے گا۔اور خوف زائل ہو جائے گا تو وہ کہے گا کہ میں نے تو اور بھی عظیم عظیم گناہ کئے ہیں۔وہ کہاں چھپا لیے گئے ہیں۔ان کو بھی نیکیوں میں تبدیل کر دیا جائے۔

قال أبوذرؓ فلقد الخ یعنی نبی کریم ﷺ نے جب اللہ تعالیٰ کے رحم وکرم اور اس کے مقابلے میں بندے کا یہ حرص بیان کر دیا۔تو نبی کریم ﷺ کو میں نے دیکھا کہ ہنستے ہوئے ان کی داڑھیں دکھائی دینے لگیں۔**نواجذ** آخر کے دانتوں کو کہتے ہیں لیکن کبھی کبھی اس کا اطلاق آخری سے سامنے والے دانتوں پر بھی ہوتا ہے۔اب یہ دراصل مبالغہ فی الضحک سے کنایہ ہوگا۔ یعنی آپ ﷺ خوب ہنسے۔اتنا کہ جہاں تک دانت دکھائی دے سکتے ہیں وہ سب ظاہر ہو گئے۔البتہ اس قسم کی ہنسی آپ ﷺ کی عادتِ مستمرہ نہ تھی بلکہ بصورت ندرت کبھی کبھی آپ ﷺ سے صادر ہوتی تھی۔اور جس روایت میں نہی آئی ہے ''**لاتکثر الضحک**'' تو اس حدیث میں ایسے ہنسی کی اکثار سے منع کیا گیا ہے۔یعنی کہ ہر وقت آدمی زور سے ہنستا رہے۔یہ منع ہے کیونکہ اس سے قلب کی موت ہوتی ہے۔**فان کثرة الضحک تمیت القلب**

(۵) حدّثنا أحمد بن منیع ثنا معاویة بن عمر و ثنا زائدة عن بیان عن قیس بن أبی حازم عن جریر بن عبداللّٰه قال ما حجبنی

رسول اللّٰہ ﷺ منذا سلمت ولا رآنی الّاضحک(۱).

ترجمہ: حضرت جریر بن عبداللہؓ فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے میرے مسلمان ہونے کے بعد کبھی بھی مجھے حاضری سے نہیں روکا۔ اور کبھی بھی مجھے نہیں دیکھا مگر آپ ﷺ ہنس دیتے تھے۔

قال ما حجبنی گزشتہ ابواب میں حضرت جریرؓ کے حالات مفصل طور پر بیان ہو چکے ہیں۔ وہ فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ کی مجلس میں آنے جانے کی کوئی پابندی مجھ پر نہیں تھی۔ لیکن یہاں گھر میں آنا مراد نہیں بلکہ مقصد یہ ہے کہ مجلس نبوی ﷺ میں مجھے کھلی اجازت تھی۔ اور ممکن ہے کہ **حجبنی** سے مراد **مَنَعنی** مراد ہو یعنی آپ ﷺ نے میری کوئی درخواست اور گزارش رد نہیں فرمائی۔ **الاضحک** یعنی مجھے دیکھتے تو ضرور مسکراہٹ اور ہنسی سے میرا استقبال فرماتے(۲)۔

(۲) حدّثنا أحمد بن منیع ثنا معاویة بن عمر و ثنا زائدةعن إسماعیل بن أبی خالد عن قیس عن جریر قال ما حجبنی رسول اللّٰہ ﷺ منذ اسلمت ولا رانی إلاّ تبسّم(۳) .

ترجمہ: حضرت جریرؓ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے میرے اسلام لانے کے بعد کبھی بھی مجھے حاضری سے نہیں روکا۔ اور کبھی بھی مجھے نہیں دیکھا مگر آپ ﷺ نے تبسم ضرور فرمایا۔

إلاّ تبسّم یہ جریرؓ کی گزشتہ حدیث ہی ہے۔ صرف **ضحک** کی بجائے تبسم کا ذکر ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ گزشتہ حدیث میں بھی ضحک سے تبسم مراد ہے۔ اور اس تبسم کی وجہ شرّاح نے یہ لکھی ہے کہ

---

(۱) صحیح مسلم ۲/۲۹۷ کتاب فضائل الصحابة باب فضائل جریر بن عبداللّٰہ، جامع ترمذی ۲/۲۰۷ کتاب المناقب باب مناقب جریر بن عبداللّٰہ، (مختار)

(۲) اوراس کی وجہ ملاعلی قاریؒ نے یہ لکھی ہے لعل وجه التبسم له کل مرة فی رؤیته إنّه رأه مظهر الجمال فإنّه کان له صورة حسنة علی وجه الکمال حتی قال عمرؓ فی حقه إنّه یوسف هذه الامة (جمع الوسائل ۲/۲۳)(مختار)

(۳) جامع الترمذی ۲/۲۰۷ کتاب المناقب مناقب جریر بن عبداللّٰہؓ سنن ابن ماجه ص۱۵ مناقب جریر بن عبداللہ(مختار)

چونکہ جریرؓ نہائی خوبصورت تھے۔حضرت عمرؓ اسی وجہ سے آپؓ کو"یوسف هذه الامة" کہتے تھے۔لہٰذا آپ ﷺ ان کو دیکھ کر بے اختیار تبسم فرماتے تھے۔

(۷) حدّثنا هنّاد بن السری ثنا ابو معاوية عن الأعمش عن ابراهيم عن عبيدة السلمانی عن عبدالله بن مسعودؓ قال قال رسول اللهﷺ إنّی لا عرف اخراهل النار خروجارجل يخرج منها زحفا فيقال له انطلق فادخل الجنّة قال فيذهب ليدخل الجنّة فيجد الناس قد اخذوا المنازل فيرجع فيقول يا رب قد اخذ النّاس المنازل فيقال له أتذكر الزمان الذی كنت فيه فيقول نعم قال فيقال له تمن قال فيتمنیٰ فيقال له فانّ لک الذی تمّنيت و عشرة اضعاف الدّنيا قال فيقول اتسخرنی وانت الملک و قال فلقد رأيت رسول اللهﷺ ضحک حتّیٰ بدت نواجذه(۱).

ترجمہ: حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کہتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا کہ میں اس شخص کو جانتا ہوں جو سب سے آخر میں جہنم سے نکلنے والا ہے۔وہ ایک ایسا آدمی ہے جو زمین پر سرین کے بل گھسٹتا ہوا جہنم سے نکلے گا۔اسے حکم دیا جائے گا کہ جاؤ جنت میں داخل ہو جاؤ۔وہ جنت میں داخل ہونے کے لیے وہاں جائے گا۔وہاں لوگوں کو جنت کی منزلوں پر قبضہ کئے ہوئے پائے گا۔وہاں سے لوٹ کر کہے گا کہ اے رب لوگوں نے تمام مقامات پر قبضہ جمائے رکھا ہے۔تو اس کو کہا جائے گا کہ کیا تجھ کو دنیا یاد آرہی ہے(جہاں تنگی تھی۔یا مراد یہ کہ تم دنیا کی وسعت کو یاد کرو) وہ عرض کرے گا

(۱)صحيح بخاری ۲/۹۷۲ كتاب الرقاق باب صفة الجنة والنار، صحيح مسلم ۱/۱۰۵ كتاب الايمان اثبات الشفاعة واخراج الموحدين من النار باب آخر اهل النار خروجاً، جامع ترمذی ۲/۸۴۰ كتاب صفة جهنم، عن رسول الله باب ماجاء ان النّار،سنن ابن ماجة ص ۳۲۱باب صفة الجنة كتاب الزهد باب صفة الجنة(مختار)

ہاں (یاد ہے) تو اسے کہا جائے گا کہ تو اپنی تمنائیں ظاہر کر۔ تو وہ (اپنی خواہشات) کی تمنا کرے گا پھر اسے کہا جائے گا کہ تمہیں وہ سب تمنائیں اور خواہشات بھی دی جاتی ہیں۔ جو تم نے ظاہر کر دی اور تمام دنیا سے دس گنا زائد بھی دیا جاتا ہے۔ وہ عرض کرے گا۔ کہ اے رب! آپ بادشاہ ہو کر بھی مجھ سے تمسخر کرتے ہیں۔ (حضرت ابن مسعودؓ) کہتے ہیں کہ تب میں نے نبی کریم ﷺ کو دیکھا کہ وہ اتنا ہنسے کہ آپ ﷺ کے دانت مبارک ظاہر ہو گئے۔

إنّي لأعرف آخر أهل النار خروجاً. آخری آدمی جو جہنم سے نکل کر جنت میں آئے گا۔ اس کے بارے میں نبی کریم ﷺ کا بیان ہے کہ وہ ایک ایسا آدمی ہوگا جو جہنم سے گھسٹتا ہوا نکلے گا(۱)۔ وہ جہنم کا اتنا مارا ہوگا کہ مفلوج آدمی کی طرح اٹھنے کی سکت نہیں ہوگی۔ **فیقال له انطلق الخ** اسے جنت میں جانے کا کہا جائے گا۔ دروازے میں آ کر وہ محسوس کرے گا کہ جنت کے تمام گھر تو لوگوں سے بھرے ہیں۔ اس لیے وہ واپس ہوگا۔ اور کہے گا کہ اے رب! لوگوں نے تمام گھروں پر قبضہ کر رکھا ہے۔

اتذکر الزمان الذی کنت فیه کا مطلب: اس کے دو مطلب ہو سکتے ہیں۔ ایک یہ کہ وہ دنیا اور اس کی وسعتیں جہاں تم رہتے تھے۔ اگر یاد نہ ہو تو یاد کر لو۔ دنیا میں ہفت اقلیم کی وسعت کا تصور ذہن نشین کروا کر اسی کے مطابق احسان کرتا ہے۔ کہ اس سے بھی بڑھ کر میں دوں گا۔ اس صورت میں استفہام امر کے معنی کو متضمن ہوگا۔

اور ایک اور معنی یہ ہے کہ کیا تم کو دنیا یاد آ گئی جہاں کی بڑی سے بڑی عمارت اور جگہ بھی زیادہ ہجوم کی وجہ سے بھر جاتی تھی۔ تو کیا تمہارے خیال میں عالم آخرت بھی ایسا ہے کیا جنت کو بھی اتنا تنگ سمجھ رکھا ہے(۲)؟ حالانکہ یہ نہیں بھرتا۔ جس طرح جہنم نہیں بھرتا۔ جس کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا **یوم نقول**

---

(۱) ایک روایت میں زحفاً کی جگہ حبواً کا لفظ آیا ہے۔ یعنی بچوں کی طرح ہاتھ پاؤں لگاتا ہوا نکلے گا شراح کے مطابق دونوں روایتوں میں تعارض نہیں ہے۔ کیونکہ ممکن ہے کہ بعض اوقات میں سرین کے بل سے چلے۔ اور بعض اوقات میں ہاتھ پاؤں لگا کر چلے۔ (اصلاح الدین)

(۲) یہ احتمال راجح معلوم ہوتا ہے کیونکہ بعد میں ''نعم'' کے کلمہ سے جواب ملتا ہے۔ جو کہ استفہام کے جواب میں آتا ہے۔ نہ کہ امر کے جواب میں۔ علاوہ ازیں استفہام کو حقیقت پر محمول کرنا بھی اولیٰ ہے۔ (اصلاح الدین)

لجهنّم هل امتلأت وتقول هل من مزید(ق ۳۰) اس دن ہم جہنم سے کہیں گے۔کیا تو بھر گیا۔وہ کہے گا۔کیا اور ہے۔

بہر حال جنت کی وسعتیں زیادہ ہیں۔اللہ تعالیٰ نے فرمایاو سارعوا إلیٰ مغفرة من ربّکم وجنّة عرضها کعرض السمٰوات والأرض اعدت للمتقین(آل عمران ۲۳۳) اوراللہ کی بخشش اوراس جنت کی طرف تیزی سے آؤ۔جس کی وسعت آسمانوں اورزمین کی وسعت جیسی ہے۔وہ اللہ سے ڈرنے والوں کے لیے بنائی گئی ہے۔

<u>کائنات کی وسعت پر سائنسدانوں کا اعتراف:</u> زمین اورآسمانوں کے عرض کا پتہ کوئی نہیں چلا سکتا۔تو اس کا طول کب معلوم کیا جا سکتا ہے۔سائنس دان کہتے ہیں کہ بعض ستارے ایسے ہیں جن کی روشنی یوم تخلیق سے لے کراب تک زمین پر نہیں پہنچی۔حالانکہ ایک لاکھ چھیاسی ہزار میل فی سیکنڈ کی رفتار سے روشنی سفر کرتی ہے۔اس سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ ہماری یہ کائنات کتنی وسیع ہے۔جبکہ اس میں موجود ستاروں کی تعداد سمندروں کے کنارے ریت سے بھی زیادہ ہے۔اور سب کے سب ان سائنس دانوں کے نزدیک پہلے آسمان کے نیچے ہیں۔ہماری یہ وسیع زمین اس کائنات کا ایک حقیر سیارہ ہے۔خلائی جہازوں سے اس کی تصویر کھینچی جاتی ہے۔تو یہ بہت معمولی سی مخلوق دکھائی دیتی ہے۔اور سورج سے نسبت لی جائے تو ایک بڑے تنور کے اندر ایک تنکے کی نسبت بھی نہیں بنتی۔پھر کائنات میں فرشتے ہیں۔جن کے بارے میں قرآن کا ارشاد ہے کہ وما یعلم جنود ربک الا هو(مدثر ۳۱)اورتیرے رب کے لشکروں کا علم صرف تیرے رب کے پاس ہے۔

حضرت عبداللہ بن عباسؓ کی ایک روایت ہے کہ عرش کے نیچے ۱۰۰ قنادیل معلق ہیں۔اورآسمان وزمین اوراس کے اندر سب کچھ ایک فانوس میں سمائے ہیں۔باقی ننانوے قنادیل کی تو ہمیں کوئی خبر نہیں۔اس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ جنت کتنی وسیع ہوگی۔فیقال له تمّن الخ یعنی اس سے کہا جائے گا کہ اپنی تمنا اورخواہش کو ظاہر کر دے۔تو جو بھی وہ چاہے گا۔جس کی خواہش بھی اس کے دل میں ابھرے گی اس کو بتایا جائے گا کہ تیری یہ خواہش تو پوری کر دی گئی ہے۔

وعشرة اضعاف الدنیا اور پھر اس دنیا کا جس کا استحضار ابھی ابھی تم نے کیا۔اس سے دس

گنا جنت تجھے دی گئی۔ یہ تضاعف یا تو باعتبار قیمت ہوگی۔ یعنی جنت کی نعمتیں مقدر میں کم بھی ہوں۔لیکن قیمت کے لحاظ سے بہت بڑھ کر ہونگیں۔ جیسے کہتے ہیں کہ موتی گھوڑے سے کئی گنا زیادہ ہے۔علامہ بیجوریؒ نے یہ توجیہ ذکر کرنے کے بعد کہا ہے کہ مساحت کے اعتبار سے دس گنا وسیع جنت کا بھی احتمال ہے۔اور یہی راجح معلوم ہوتا ہے۔ کیونکہ بات تنگی اور وسعت میں چل رہی ہے۔ نیز خود متعدد روایات میں جنت کی وسعت مذکور ہے۔

فیقول أتسخربی ایک نسخہ میں **أتسخرنی** نون کے ساتھ بھی آیا ہے۔یہ شخص جو جہنم کی مار کھا چکا ہے۔اچانک یہ کرم اور مہربانی اس کے تصور سے بالاتر ہے۔اس لیے وہ کہتا ہے کہ کیا تم میرے سے تمسخر کرتے ہو حالانکہ تیرے ساتھ تمسخر لائق نہیں تیری عظیم ہستی سے ایسا تمسخر مستبعد ہے۔جبکہ تو تو بادشاہ ہے۔

ایک اشکال اور اس کا جواب: یہاں یہ اشکال ہوتا ہے کہ تمسخر اللہ تعالیٰ کے حق میں متعذر ہے۔ نیز یہ تو آخرت اور جنت میں دخول کا موقع ہے۔لہٰذا یہ عذر بھی معقول نہیں کہ بندہ کو اللہ کی صفات کا علم نہیں ہوگا۔اس کا جواب یہ دیا جاتا ہے کہ یہ شخص غیر متوقع انعامات کے حصول اور رب کریم کے کرم سے اتنا خوش ہوگا کہ خوشی سے بدحواس ہو کر بے اختیار یہ جملہ بول پڑے گا۔اگر چہ تمسخر اس کا عقیدہ نہیں ہے۔جیسا کہ نبی کریم ﷺ ایک ایسے شخص کے بارے میں فرماتے ہیں جس نے لق ودق صحراء میں اپنی سواری اور اس پر موجود کھانا، پانی کھو دیا ہو۔تلاش بسیار کے بعد زندگی سے مایوس ہو چکا ہو۔ پھر اچانک اپنی سواری کو پالیا ہو۔ تو وہ بدحواس ہو کر کہتا ہے **اللھم انت عبدی و انا ربک**(۱) اے اللہ تو میرا بندہ اور میں تیرا رب ہوں۔

---

(۱) مسلم کتاب التوبہ ج۲ ص۳۵۵ کتاب التوبۃ، واضح رہے کہ امام نوویؒ نے اس مقام پر دو اور جواب بھی ذکر کئے ہیں۔اول یہ کہ چونکہ یہ شخص اس موقع پر کچھ بدعہدیوں کا مرتکب ہو چکا ہوگا۔جیسا کہ بعض روایات میں ان کی تفصیل ہے۔لہٰذا وہ خیال کرے گا کہ میں جنت کا اہل نہیں ہو۔پھر تضاعف مذکور کا اہل کیونکر ہوں گا۔ یہ تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے میری وعدہ شکنیوں کی سزا کے طور پر محض اطماع ہے۔اور خلاف واقع لالچ دے کر سزا دی جارہی ہے۔جسے اس نے استہزاء سے تعبیر کردیا۔دوم یہ ہمزہ استفہام انکار کے لیے ہو۔تو معنی یہ ہوگا کہ تم تو یقیناً استہزاء نہیں کررہے۔لیکن بندہ کی نااہلیت اور انعام کی عظمت قابل تعجب اور تمسخر سے مشابہ ہے۔

ملاعلی قاریؒ نے یہ بھی لکھا ہے کہ اس جملے سے اس شخص کا مخاطب کوئی فرشتہ ہو۔اس تقدیر و **انت الملک بفتح لام** ہونا چاہیے۔لیکن روایت **ملک بکسر اللام** کی ہے۔(اصلاح الدین)

فلقد رأیت رسول اللّٰہ ﷺ ضحک لام یہاں بھی موطئہ للقسم ہے۔یعنی خدا کی قسم میں نے نبی کریم ﷺ کوزور سے ہنستے ہوئے دیکھا۔آپ ﷺ کی یہ ہنسی یا تو بندے کی کوتاہ اندیشی سے تعجب کی بنا پر ہے کہ جہنم اور جنت کو دیکھ کر بھی اس کے عقل میں قدرت الٰہی کی بے پایانی کما حقہ نہ سموسکی۔یا پھر بندے کی تواضع اور بدحواسی پر آپ ﷺ کو تعجب ہوا۔یا پھر رب کریم کی رضا اور غلبہ رحمت سے آپ ﷺ خوش ہوکر ہنسے۔

(۸) حدّثنا قتیبة بن سعیدأنبانا أبو الأحوص عن أبی إسحاق عن علیّ بن ربیعة قال شهدت علیاً ؓ اتی بدابة لیرکبها فلمّا وضع رجله فی الرکاب قال بسم اللّٰه فلما استوی علی ظهرها قال الحمد للّٰه ثمّ قال سبحان الّذی سخّر لنا هذا وما کنّا له مقرنین وإنّا إلی ربّنا لمنقلبون ثمّ قال الحمد للّٰه ثلاثا واللّٰه اکبر ثلاثا سبحانک إنّی ظلمت نفسی فاغفر لی فانّه لا یغفر الذنوب إلّا انت ثم ضحک فقلت له من أیّ شئی ضحکت یاامیر المؤمنین قال رأیت رسول اللّٰه ﷺ صنع کما صنعت ثمّ ضحک فقلت من ایّ شئی ضحکت یارسول اللّٰه ﷺ قال إنّ ربّک لیعجب من عبده إذا قال ربّ إغفرلی ذنوبی یعلم إنّه لا یغفرالذنوب احد غیری(۱).

ترجمہ: علی بن ربیعہ ؒ کہتے ہیں کہ میں حضرت علی ؓ کے پاس آیا۔(اسی اثنا میں)ان کے پاس ایک جانور(گھوڑا یا خچر)سواری کے لیے لایا گیا۔جب آپ نے اپنا پاؤں رکاب میں رکھا تو بسم اللّٰہ پڑھی پھر جب پوری طرح سواری کی پیٹھ پر بیٹھ گئے۔تو

(۱)سنن ابی داؤد ۱/۳۴۷ کتاب الجهاد باب مایقول الرجل اذارکب، جامع ترمذی ۲/۶۵۷ کتاب الدعوات باب مایقول إذا رکب الناقة، السنن الکبریٰ للبیهقی ۵/۲۵۲، مسندابی داؤد الطیالسی ص ۱۳۲ (مختار)

الحمدللّٰه کہاپھر یہ دعاپڑھی ''سبحان الّذی سخّر الخ ''ترجمہ: پاک ہے وہ ذات جس نے اس سواری کو ہمارے لیے مسخر کردیا ہے اور ہم (تو) اس کو مطیع بنانے والے نہیں (ہوسکتے) تھے۔ اور بے شک ہم اپنے رب کی طرف لوٹ کر جانے والے ہیں۔ اس کے بعد تین مرتبہ الحمدللہ کہا اور تین مرتبہ اللہ اکبر کہا۔ پھر یہ دعا کی ''سبحانک إنّی ظلمت نفسی الخ ''ترجمہ: پاک ہے تو بیشک میں نے اپنے نفس پر ظلم کیا ہے۔ پس اے اللہ میری مغفرت فرما کیونکہ آپ کے سوا کوئی بھی گناہوں کی مغفرت نہیں کرتا۔ اس دعا کے بعد حضرت علیؓ ہنسے۔ میں نے عرض کیا۔ اے امیر المؤمنین آپ کیوں ہنسے۔ انہوں نے کہا کہ میں نے نبی کریم ﷺ کو دیکھا تھا کہ آپ نے میرے جیسا قول وعمل کیا اور پھر ہنسے۔ میں نے عرض کیا آپ کیوں ہنسے۔ تو انہوں نے فرمایا کہ بیشک اللہ تعالیٰ بندے کے اس قول پر کہ ''اے میرے رب میرے گناہوں کو بخش دے'' بہت خوش ہوتا ہے۔ حالانکہ وہ جانتا ہے کہ میرے سوا کوئی بھی گناہوں کو معاف نہیں کرسکتا۔

اُتی بدابة دابة کل ما یدبّ علی الارض یعنی زمین کے اوپر حرکت کرنے والے ہر جاندار کا نام ہے جیسا کہ ''ومامن دابة فی الأرض إلّا علی اللّٰه رزقها'' میں مستعمل ہے لیکن عرفاً یہ گھوڑے، خچر اور گدھے پر بولا جاتا ہے(۱)۔

قال بسم اللّٰه الخ حضرت علیؓ کا یہ عمل نبی کریم ﷺ کے عمل پر مبنی ہے۔ اور نبی کریم ﷺ نے شاید نوحؑ کے عمل کو اپنے عمل کا مبنی علیہ بنایا ہے۔ انہوں نے بھی کشتی میں سوار ہونے کے بعد اس قسم کی دعائیں پڑھی تھیں۔ وماکنا له مقرنین یعنی ہم میں یہ قدرت کہاں کہ ہم اپنی طاقت سے اسے قابو کردیں۔ اگر ایک گھوڑا سرکش ہوجائے۔ تو لوگوں کی ایک بڑی تعداد کو عاجز کردے ایک بے قابو اونٹ مسخر کرنا کئی آدمیوں کے لیے مشکل ہے۔ مگر اونٹوں کی ایک لمبی قطار کو ایک چھوٹا بچہ ایک رسی سے قابو کررہا

(۱) ملاعلی قاریؒ نے لکھا ہے ثم خصّها العرف العام بذوات الاربع (جمع الوسائل ۲۵/۲) (مختار)

ہے۔وہ آگے جاتا ہے اور بہت سے اونٹ اپنے ساتھ کھینچتا جاتا ہے۔تو اس مٹھی بھر حیثیت والے ضعیف البنیان انسان کی اتنی طاقت کہاں کہ اتنے جانوروں کو مسخر کر سکے۔ بلکہ آگے جا کر اجرام عالم کو تابع بنادے۔دریا چیرے، پہاڑوں کو ریزہ ریزہ کرے،ستاروں پر کمند ڈالے،لوہا اڑائے اور خلاؤں پر حکمرانی کرے،تو بہر حال یہ اللہ تعالیٰ کی دی ہوئی طاقت ہے۔جس کی وجہ سے یہ سب کام انسان کرتا ہے اور اللہ تعالیٰ کائنات کی چیزوں سے استفادے کی اجازت بلکہ ترغیب دیتا ہے۔ہاں اتنا ضرور حکم دیتا ہے کہ یہ سوچ لو کہ یہ طاقت کس کی دی ہوئی ہے۔کائنات کی جو چیز بھی مسخّر ہو کر تیرے استعمال میں آئے۔اس کے ساتھ اتنا کہو کہ **سبحان الّذی سخّرلنا ھذا۔**

یوں اپنے کمالات کو خالق کی معرفت کا ذریعہ بنادو۔لیکن آج کے لوگوں نے سائنس کو معرفت الٰہی کا ذریعہ بنانے کے بجائے رب سے دوری کا ذریعہ بنادیا ہے۔وہ چاند پر گئے تو کہنے لگے کہ ہمیں تو وہاں خدا نظر نہیں آیا۔حق یہ ہے کہ جو یہاں اندھا ہو وہ چاند پر بھی اندھا ہے۔بلکہ **فھو فی الآخرۃ اعمٰی** کے مصداق قیامت کے روز بھی اندھا ہے۔جبکہ بعض لوگ تو ایسے بھی ہیں جو چاند پر گئے تو ایمان لے آئے۔کہنے لگے ہم نے وہاں اذان کی آواز سنی۔ایک کا بیان ہے کہ عالم اتنا عجیب تھا کہ ہم اللہ تعالیٰ کی وحدانیت اور خالقیت کے خود بخود قائل ہو گئے۔اور اسلام کی حقانیت دل میں سما گئی۔

بہر حال یہی اصل مقصد ہے کہ انسان تسخیر کائنات کے وقت یہ سوچ لے کہ یہ سب کچھ اللہ تعالیٰ نے ہمارے لیے مسخر کردیا ہے۔کیونکہ یہ قوت نظری اور تحلیل وترکیب عناصر کا علم اگر انسان کو حاصل نہ ہوتا تو انسان کچھ بھی نہیں کرسکتا تھا۔یہ تو انسان ہی ہے جو علم کے سبب ترقی کرتا جاتا ہے ورنہ گدھا وہی گدھا ہے۔ کہیں کچا سا کمرہ بھی اپنے لئے نہ بنا سکا۔شیر وہی شیر ہے۔انسان بھی وہی حیوان ہے جو تھا۔لیکن اللہ تعالیٰ کی دی ہوئی صلاحیتوں نے اسے اشرف المخلوقات بنادیا۔اور روز نئی نئی چیزوں سے کام لیتا جاتا ہے۔

وانّا إلیٰ ربّنا الخ مبدا کے بعد معاد کا ذکر ہے۔اور اس پر تنبیہ ہے کہ دنیا میں تو اللہ تعالیٰ کی دی ہوئی طاقت کا استعمال ہے اور پھر واپس اسی کے پاس جانا ہے۔اس استمتاع کی ایک حد بھی ہے۔یہ سفر آخری نہیں بلکہ ایک اور سفر بھی ہے۔خدا کی طرف،آخرت کو رجوع کا سفر،یہ دعا سفر میں ابتداء کرتے وقت

بھی مسنون ہے۔ظلمت نفسی الخ حضرت علیؓ بھی فرماتے تھے کہ میں نے بھی ظلم کیا ہے کیونکہ کون ہے جو نعمتوں کا حق ادا کر سکے۔انسان کو اتنی عجیب نعمتیں اور منافع دئے گئے ہیں جس کا شکریہ ادا کرنا ناممکن ہے۔اسی وجہ سے فرمایاانی ظلمت نفسی.قال رأیت الخ یعنی میں نے اس عمل میں نبی کریم ﷺ کا اتباع کیا ہے جنہیں میں نے ایسا کرتے ہوئے دیکھا تھا۔اور صحابہ کرام تو اتباع سنت میں قول و عمل کا اہتمام کے ساتھ پیروی کرتے تھے۔بہر حال حضرت علیؓ نے فرمایا کہ بالکل اس طرح نبی کریم ﷺ بھی ہنسے تھے اور میں نے بھی ان سے پوچھا تھا کہ وہ کیوں ہنسے۔تو انہوں نے فرمایاانّ ربّک لیعجب من عبده اذاقال الخ یعنی اللہ تعالیٰ بندے کی اس بات سے بہت خوش ہوتا ہے کہ وہ رب سے مغفرت مانگے۔اور وہ اس لیے کہ بندہ مغفرت مانگتے ہوئے یہ اقرار کرتا ہے کہ گناہوں کا بخشنے والا فقط اللہ تعالیٰ ہی ہے۔

اور اللہ تعالیٰ اس کے گناہوں سے باخبر بھی ہے۔یہ بات اسے خوش کر دیتی ہے گویا نبی کریم ﷺ نے فرمایا کہ رب العالمین میرے استغفار سے خوش ہوا۔اس لئے میں ہنسا۔حضرت علیؓ کے بیان کے مطابق حضرت علیؓ بھی اسی وجہ سے ہنسے۔اور ان سے روایت کرنے والے دوسرے راوی بھی اس موقع پر اسی طرح ہنس دیئے۔

علم انّه لا یغفر الذنوب الخ یہ جملہ قال کی ضمیر فاعل سے حال واقع ہوا ہے۔اور معنی یہ ہے کہ بندہ مغفرت طلب کرتا ہے لیکن غفلت جہالت اور بے یقینی کے ساتھ نہیں بلکہ ''عالماإنّه لایغفر الخ'' یعنی اس یقین کے ساتھ طلب مغفرت کرتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی معاف کرنے والا نہیں ہے۔

اور ممکن ہے کہ یہ جملہ یعجب ضمیر فاعل سے حال ہو۔اور معنی یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ بندے کی مغفرت سے خوش ہوتا ہے۔یہ جانتے ہوئے کہ مغفرت کرنے والا میں ہی ہوں۔میرا بندہ اور کس کے سامنے ہاتھ پھیلائے۔

یا پھر قائلاً کی تقدیر کے ساتھ یہ یعجب کی ضمیر سے حال ہوگا۔تقدیر یوں ہوگی کہ یعجب ربّک قائلاً ''إنّه یعلم عبدی أنّه لا یغفر الذنوب غیری ''یعنی اللہ تعالیٰ خوش ہوتا ہے یہ کہتے ہوئے کہ میرا موحد بندہ جانتا ہے کہ میرے سوا کوئی بخشش کرنے والا نہیں۔اس لئے اس کو میں بخش دیتا ہوں۔

تنبیہ: یہ حدیث مسلسل بالضحک کہلاتی ہے مجھے اس کی سند ضحک کے ساتھ مولانا قاری محمد طیب مہتمم دارالعلوم دیو بند کے واسطے سے ملی ہے۔ اوران کو سند مولانا سہارنپوریؒ سے ملی تھی۔ مسلسلات کی اور بھی مثالیں ہیں۔ مثلاً مسلسل بالماء والتمر وغیرہ۔ بہرحال یہاں پر یہ سلسلہ حضرت علیؓ سے شروع ہوا۔ پھران کے شاگرد یکے بعد دیگرے یہ حدیث بیان کرتے ہوئے ہنستے ہیں۔

(۹) حدّثنا محمّد بن بشار أنبانا محمّد بن عبداللّٰه الأنصاری ثنا إبن عون عن محمّدبن محمّد بن الأسود عن عامر بن سعد قال قال سعد لقد رأیت رسول اللّٰه ﷺ ضحک یوم الخندق حتّیٰ بدت نواجذه قال قلت کیف کان قال کان رجل معه ترس و کان سعد رامیاو کان یقول کذا و کذابالترس یغطّی جبهته فنزع له سعد بسهم فلمّا رفع راسه رما ه فلم یخطئی هذه منه یعنی جبهته وانقلب و شال برجله فضحک رسو ل اللّٰه ﷺ حتی بدت نواجذه قال قلت من ایّ شئی ضحک قال من فعله بالرّجل(۱).

ترجمہ: عامر بن سعدؓ کہتے ہیں کہ میرے والد سعد بن ابی وقاصؓ نے فرمایا کہ نبی کریم ﷺ غزوۂ خندق کے موقع پرزور سے ہنسے تھے۔ میں نے پوچھا کہ کس بات پر ہنسے تھے۔ انہوں نے کہا ایک (کافر) آدمی کے پاس ڈھال تھی اور سعدؓ مشہور تیر انداز تھے۔ لیکن کافر ڈھال کو ادھر ادھر کر کے خود کو (ان کی تیروں سے) بچا تا تھا حضرت سعدؓ نے ایک مرتبہ تیر نکالا۔ پس جونہی اس (کافر) نے (ڈھال سے) سر اٹھایا۔ حضرت سعدؓ نے تیر مارا۔ تو اس کی پیشانی تیر سے بچ نہ سکی۔ وہ شخص الٹا ہو گیا۔ پاؤں اوپر کو اٹھایا (یہ دیکھ کر) نبی کریم ﷺ (اتنے زور سے) ہنسے کہ آپ ﷺ کے دانت مبارک ظاہر ہو گئے۔ راوی کہتے ہیں میں نے پوچھا کہ نبی کریم ﷺ کس بات سے ہنسے تھے انہوں نے کہا کہ حضرت سعدؓ کا اس کافر کا کام تمام کرنے سے۔

---

(۱) مسند احمد ۱/۱۸۶ (مختار)

ضحک یوم الخندق حتی بدت نواجذه یعنی غزوہ خندق کے موقع پر آپ ﷺ بہت زور سے ہنسے تھے۔قال قلت کیف کان قال کے قائل یا محمد بن محمد ہیں۔جو عامر بن سعدؓ سے پوچھ رہے ہیں۔یا پھر عامر اپنے والد سعدؓ سے پوچھتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ کیوں ہنسے تھے۔یوں قال کے قائل عامرؒ ہونگے۔وکان سعد رامیاً اگر سائل محمد بن محمدؒ ہو پھر تو معنی ظاہر ہے۔صرف اتنا کیا ہے کہ عامر نے ''کان ابی'' کی بجائے ''کان سعد'' کہا ہے۔اور اگر سائل عامر اور جواب دینے والا سعدؓ ہو تو حضرت سعدؓ نے ''کنت رامیا'' کی بجائے اظہار کی بجائے اضمار کر کے اپنا نام لیا ہے۔یا حضرت عامر نے یہ تبدیلی کر کے روایت بالمعنی کی ہوگی۔بہر حال سند حدیث میں اس قسم کے تصرفات بکثرت موجود ہیں۔مطلب یہ ہے کہ ایک طرف تو یہ کافر اپنی دفاع کرتے ہوئے مسلمانوں کی نگرانی کرتا رہا۔دوسری طرف مشہور تیر انداز حضرت سعدؓ اس تاک میں تھے کہ کس طرح موقعہ ملے تو اس کا کام تمام کر دے اور اسے جہنم رسید کر۔یقول کذا وکذا بالترس بظاہر یہاں یقول کا معنی یفعل کیا جاتا ہے۔وہ ڈھال کے ذریعہ یوں یوں کرتا ہے یعنی ڈھال کو دائیں بائیں اوپر نیچے ہلا کر حضرت سعدؓ کی تیروں سے بچتا رہا۔کوئی تیر آتا تو سر اور پیشانی کو ڈھال سے چھپا دیتا تھا۔قول کا استعمال فعل کے معنی میں بکثرت موجود ہے۔

لیکن یہ احتمال بھی ہے کہ قول اپنے معنی میں ہو۔اور مراد یہ ہو کہ وہ کافر نبی کریم ﷺ اور مسلمانوں کے حق میں یوں یوں کہتا تھا یعنی گالیاں بکتا تھا۔حضرت سعدؓ نے اس کے قبیح کلام کو کنایۃً ذکر کیا اور ''بالترس'' بعد کے ''یغطی'' کے ساتھ متعلق ہوگا یعنی ''وہ شخص ڈھال سے اپنی پیشانی کو چھپا دیتا تھا۔فنزع له سعد بسهم حضرت سعدؓ نے شست لگائی جونہی اس نے ڈھال سرکایا پیشانی تھوڑی سی ظاہر ہوئی حضرت سعدؓ نے تیر چھوڑا۔فلم یخطئی هذه منه ''هذه'' سے اشارہ پیشانی کو ہے جیسے کہ خود روای اس کی تفسیر کرتے ہیں۔تو معنی یہ ہوا کہ پیشانی تیر سے خطا نہ ہوئی یہاں لفظ میں قلب ہوا ہے معنی یہ ہے کہ تیر پیشانی سے خطا نہ ہوا۔نشانے پر لگا کافر گرا، پاؤں اٹھا برہنہ ہوگیا اور مر گیا۔

دوسری طرف نبی کریم ﷺ تماشہ دیکھ رہے تھے۔کافر کی عیاری و چالاکی کے مقابلے میں حضرت سعدؓ کی بیداری اور کامیابی سے آپ ﷺ خوش ہو کر زور سے ہنسے۔

شال برجله شول دراصل دم اٹھانے کو کہتے ہیں ''**شال الفرس بذنبه** ''یعنی گھوڑے نے بھاگتے ہوئے دم اٹھادیا۔ یہاں پر پاؤں کے لیے یہ لفظ استعارۃ مستعمل ہے۔

من ایّ شئی ضحک اس سوال کا مقصد یہ ہے کہ یہاں پر کئی احتمال ہے۔کافر کی موت و بدحالی اور ذلت اس کی عورت کا ظاہر ہونا، اس کے سر کا نیچے اور پاؤں کا اوپر ہونا۔اور حضرت سعدؓ کی مہارت اور تیراندازی میں اصابت۔تو آپ ﷺ ان میں سے کس بات پر ہنسے تھے ظاہر ہے کہ سائل کو یہ بات مستبعد لگی ہے کہ نبی کریم ﷺ کسی کی شرمگاہ ظاہر ہونے کی وجہ سے ہنسے تھے۔چنانچہ پوچھ لیا **من فعله بالرجل** جواب کا حاصل یہ ہے کہ آپ ﷺ حضرت سعدؓ کی حذاقت اور تیراندازی میں مہارت سے ہنسے تھے کہ اس نے کافر کے ساتھ عجیب معاملہ کیا۔جیسے آج کل کھیلوں میں دیکھا جاتا ہے کہ کوئی کھلاڑی جو ایک گیند بھی صحیح پھینک دیتا ہے تو سارا مجمع اور تماشبین ایک شور برپا کر کے اس کی مہارت کی داد دیتے ہے۔ یہاں بھی ایسا ہی ہوا۔مزید یہ کہ ایک مسلمان کی کامیابی اور کفر کی شکست بھی خوشی کا باعث تھی۔بہرحال آپ ﷺ کشف عورت یا کسی اور وجہ سے نہیں ہنسے تھے۔

خلاصہ باب

اس باب میں نبی کریم ﷺ کے ہنسی کی کیفیت اوراس کے محل کا بیان ہے۔مجموعی طور پر احادیث سے ظاہر ہوتا ہے کہ آپ ﷺ کی ہنسی کا سبب یا تو رحمت خداوندی کا وفور اور بندے کی عاجزی و بےبسی جیسے کھری حقیقت ہے یا وہ خوشی اور مسرت ہے جو باطل کی شکست اور غلبۂ حق کی وجہ سے آپ ﷺ کو حاصل ہوئی۔ یا پھر حسن معاشرت اور صحابہ کی دلداری کی وجہ سے آپ ﷺ ہنسے ہیں۔ دنیوی مفرحات،لذائذ، مفادات اور عجائب آپ ﷺ کے وقار کو ہلا نہ سکتی تھی اور نہ مسرتوں سے بے قابو ہو کر بدمست لوگوں کی طرح آپ ﷺ قہقہے لگایا کرتے تھے۔ہنسی ہوتی تو محدود ہوتی اور وہ بھی اکثر و بیشتر تبسم کی صورت میں۔ہاں کبھی خوشی زیادہ ہوتی تو مسکراہٹ سے کچھ آگے بھی بڑھ جاتے تھے۔

بہرحال ہنسی آپ ﷺ کی ترجیحات میں سے نہیں ہے۔اسی لئے اکثر آپ ﷺ اس کی کثرت سے منع بھی فرماتے ہیں۔اور اوروں کو ہنسانے پر تو بری طرح نکیر بھی فرماتے ہیں۔

(اللّٰھمّ ارنا ضحک سنان الحبیب ﷺ یوم القیامة)

۳۶. باب ما جاء فی صفة مزاح رسول اللهﷺ
حضور اقدسﷺ کے مزاح کرنے کا بیان

نبی کریمﷺ کا مزاج بالکل خشک اور درشت نہ تھا۔اس لیے آپﷺ خوش طبعی بھی فرماتے تھے۔آپﷺ کی خوش طبعی میں اس بات کی تعلیم بھی تھی کہ غم،فکر اور بوجھ کے باوجود انسان کو چاہیے کہ وہ کشادہ روئی کے ساتھ لوگوں سے تعلقات نبھائے۔اسی وجہ سے آپﷺ سے گپ شپ کے علاوہ مذاق بھی ثابت ہے جس میں ایذاء نہ تھی۔صحابہ سے انبساط بھی فرماتے تھے اسی کو مزاح کہتے ہیں۔اور عموماً ایسا مزاح ہنسی کا سبب بنتا ہے۔لہٰذا پچھلے باب کے ساتھ مناسبت بھی ظاہر ہے۔

آج کل تو مزاح کو بے قید آزادی دی جاچکی ہے۔ہر قسم کے گپ شپ بلکہ تمسخر کو جائز قرار دیا گیا ہے۔خصوصاً یکم اپریل کو تو اس میں بہت زیادہ ایذاء رسانی ہوتی ہے۔مثلاً کسی کو فون پر بتایا جاتا ہے کہ تیرا بچہ جل گیا ہے،گھر گر گیا ہے یا باپ مرگیا ہے۔اس بیچارے پر قیامت آجاتی ہے اور فون کرنے والے کی جھوٹ بولنے کی شکایت کی جائے تو وہ کہتا ہے کہ میں تو اپریل فول کر رہا تھا۔

<u>جائز مزاح کی شرائط:</u> لیکن اسلام میں ہر قسم کا مذاق اڑانا جائز نہیں۔جس مزاح میں افراط ہو،کسی کی تذلیل وتحقیر ہو یا دوسری طرح کی ایذاء رسانی پر مشتمل ہو،اسلامی نقطۂ نگاہ سے وہ ناجائز ہے۔اسی طرح اسلام میں مزاح پر مداومت اور اس کی کثرت کو بھی قبیح تصور کیا جاتا ہے۔کیونکہ اس طرح ہر وقت ہنسنا پڑتا ہے اور کثرتِ ضحک سے مردہ دلی جنم لیتی ہے۔نیز ضروری مقاصد مثلاً علم،عبادت اور ذکر میں مخل گپ شپ سے احتراز بھی ضروری قرار دیا گیا ہے۔آج کل تو بعض بے لگام قسم کے واعظین ان شرائط کو ملحوظ نہیں رکھتے۔

بہر حال ان منہیات کی وجہ سے نبی کریمﷺ نے فرمایا کہ **لا تمار اخاک ولا تمازحه و لا تعدّه موعداً فتخلفهٔ** یعنی اپنے مسلمان بھائی سے جھگڑا نہ کرو۔نہ اس کا مذاق اُڑاؤ اور نہ اس کے ساتھ ایسا وعدہ کرو جس کو تم پورا نہ کرسکو۔

حضرت سفیان بن عیینہؒ سے کسی نے کہا کہ مزاح تو قابل گرفت عمل ہے۔آپؒ نے کہا **بل سنة**

ولکن لمن یحسنه ویضعه مواضعه. نہیں مزاح سنت ہے لیکن ان لوگوں کے لیے جو اسے اچھے طریقے سے کرسکیں اور اپنے محل میں نبھا سکیں۔

چنانچہ اسلام میں حدود کے اندر گپ شپ لگانا جائز ہے جسے مزاح لطیف کہتے ہیں۔ نبی کریمﷺ سے خود مزاح ثابت ہے۔لیکن ایسا مزاح ثابت نہیں جو وقار اور تمکنت کے خلاف ہو۔جو مزاح کیا ہے وہ کم ہونے کے ساتھ ساتھ بے لاگ حقائق اور حکمتوں سے بھرپور ہے جو محض بظاہر مزاح دکھائی دیتا ہے۔

عرفاً مزاح وہ ہوتا ہے جس کا مفہوم کھوکھلا اور بے حقیقت ہو لیکن آپﷺ کا مزاح اس نوعیت کا نہ تھا بلکہ آپﷺ کے بقول ''**انی لااقول الاحقا**'' آپﷺ نے اگر گپ لگائی ہے تو درست اور نفس الامری بات میں لگائی ہے(۱)۔

(۱) حدثنا محمود بن غیلان أنبانا أبو أسامة عن شریک عن عاصم الأحول عن أنس بن مالک قال أنّ النبیّﷺ قال له یاذا الأذنین قال محمود قال أبو أسامة یعنی یمازحه(۲).

ترجمہ: حضرت انسؓ کہتے ہیں کہ نبی کریمﷺ نے اسے مخاطب کرکے فرمایا ''**یاذا الأذنین**'' (اے دو کانوں والے) محمود بن غیلانؒ کہتے ہیں کہ ابواسامہؒ نے کہا کہ حضرت انسؓ کا مقصد یہ ہے کہ نبی کریمﷺ ان کے ساتھ مزاح کرتے تھے۔

---

(۱) علامہ عبدالجواد الرومیؒ نے رسول اللہﷺ کے مزاح کی وجہ بیان کرتے ہوئے لکھا ہے **سئل بعض السلف عن مزاحهﷺ فقال کانت له المهابة العظمیٰ فلولم یمازح النّاس لماأطاقوا الاجتماع به والتلقی عنه(الاتحافات ۲۸۴)** یہی وجہ تھی کہ آپﷺ تہجد کے بعد اپنے اہل خانہ سے کچھ دل لگی کی باتیں فرمایا کرتے تھے۔ امام غزالیؒ نے اس سلسلہ میں فرمایا ہے کہ آنحضرتﷺ کا تہجد کے بعد اہل خانہ سے باتیں کرنا اس لئے تھے تاکہ ان تجلیات کا اثر زائل ہو جائے جن کا تحمل عامۃ الناس نہیں کرسکتے تھے۔(تقریر ترمذی حضرت مدنیؒ ص۸۵۱) امام غزالیؒ کے اس قول سے اگرچہ بظاہر معلوم ہوتا ہے کہ آنحضرتﷺ کا مزاح کرنا ضرورۃً تھا۔اس لئے اس پر قیاس نہ کیا جائے۔ مگر جمہور فقہاء کرام کے ہاں مزاح کرنا ضرورۃً جائز ہے اگرچہ اس کو عادت بنانا درست نہیں (مختار)

(۲) **سنن ابی داؤد ۲/۳۳۵ کتاب الادب باب ماجاء فی المزاح، جامع ترمذی ۲/۴۶۳ کتاب البروالصلة باب ماجاء فی المزاح، شرح السنة للبغوی رقم حدیث ۳۶۰۶(مختار)**

ذالاذنين کا مطلب: یاذا الاذنین یعنی آپ ﷺ نے بطوردل لگی فرمایا "یاذالأذنین" اگر چہ ہر شخص کے دو کان ہوتے ہیں۔لیکن آپ ﷺ کے اس مزاح میں مخاطب کا استیناس یعنی مخاطب پر چھا جانے والے رعب کوکم کرنا مقصود تھا۔اور مانوس کرانا تھا۔جس سے مزاح کا جواز بھی معلوم ہوتا ہے۔اور ہوسکتا ہے کہ حضرت انسؓ کا سامعہ تیز ہونے کی وجہ سے آپ ﷺ نے اسے ذوالاذنین کہا ہو۔جیسا کہ علامہ بیجوریؒ کہتے ہیں کہ وصفه بذالک مدحاً له لذکاء ہ و فطنته۔چنانچہ یہ کلام حسنِ استماع سے کنایہ ہوگا۔جبکہ بعض علماء نے یہ لکھا ہے کہ حضرت انسؓ کانوں کے طول یا کوتاہی یا کسی دوسرے عیب کی وجہ سے ممتاز تھے۔اس لیے ان کو اس نام سے پکارا ہے۔

لیکن اس کے ساتھ ساتھ اس تعبیر میں بھی بڑا درس ہے۔اس میں اس بات پر تنبیہ ہے کہ اے مخاطب اللہ تعالیٰ نے تجھے دو کان دیئے ہیں تا کہ تم حق سنو اور اس میں غفلت نہ برتو۔تیرے دماغ کو دو راستے جاتے ہیں۔تدبر اور تفہم کے بہترین اسباب دیئے گئے ہیں ان سے کام لو۔اور سنی ہوئی بات کو سماعِ تدبر سے سن کر اس سے استفادے کے مواقع ضائع نہ کرو۔

(۲) حدّثنا هنّاد بن السرىّ ثنا وكيع عن شعبة عن أبى التيّاح عن أنس ابن مالک قال ان كان النبىّ ﷺ ليخالطنا حتّى يقول لاخ لى صغير يـاأ بـاعـمـيـر مـا فعل النّغير قال أبو عيسىٰ وفقه هذا الحديث أنّ النبىّ ﷺ كـان يـمـازح وفيه انّه كنّى غلاماً صغيراً فقال له يا أبا عمير وفيه انّ لا بـاس ان يعطى الصّبىّ الطّير ليلعب به وإنّما قال له النبىّ ﷺ يأبا عمير مافعل النغير لأنّه كان له نغير فيلعب به فمات فحزن الغلام عليه فمازحه النبىّ ﷺ فقال ياأبا عمير ما فعل النغير(۱).

---

(۱)صحيح بخارى ۲/۹۰۵ كتاب الادب باب الاستنباط إلى الناس وصحيح مسلم ۲/۲۱۰ كتاب الادب باب ماجاء استحباب نخيل ولمولدعندولادته الخ، جامع ترمذى ۱/۱۸۵ كتاب الصلوٰة باب ماجاء فى الصلوٰة على السبط، سنن الكبرىٰ للنسائى كتاب عمل اليوم الليلة، سنن ابن ماجة ۱/۲۷۲ كتاب الادب باب المزاح،(مختار)

ترجمہ: حضرت انسؓ کہتے ہیں کہ نبی کریمﷺ ہم (چھوٹے بڑوں) سے میل جول رکھتے تھے۔حتیٰ کہ آپﷺ میرے ایک چھوٹے بھائی سے (بطور انبساط) فرماتے کہ ''اے ابوعمیر تیرے بلبل کو کیا ہو گیا''

مزاحی جملوں میں بھی حقائق کا سمندر: امام ترمذیؒ کہتے ہیں کہ اس حدیث سے مستنبط ہونے والے احکام یہ ہیں کہ نبی کریمﷺ مزاح کیا کرتے تھے۔اس میں یہ بھی ہے کہ آپﷺ نے چھوٹے بچے کو بھی کنیت سے پکارتے ہوئے ''ابوعمیر'' کہا۔اس میں یہ بھی ہے کہ چھوٹے بچے کو کھیلنے کے لیے پرندہ دینے میں کوئی حرج نہیں ہے۔اور نبی کریمﷺ نے اس بچے کو ''**یا أبا عمیر ما فعل النغیر**'' اس لیے کہا کہ اس بچے کا ایک بلبل تھا جس سے وہ کھیلا کرتا تھا۔اس کی موت سے وہ بچہ بہت غمزدہ ہوا تو رسول اللہﷺ نے اس سے دل لگی کرتے ہوئے کہا کہ ابوعمیر تیرا بلبل کہاں چلا گیا۔

حضرت ابوعمیر: **أبو عمیرؓ** یہ حضرت انسؓ کے اخیافی بھائی تھے۔ان کے والد حضرت ابوطلحہ زید بن سہل انصاریؓ ہیں۔علامہ ابن حجرؒ نے ان کا نام حفص بتایا ہے۔جبکہ علامہ بیجوریؒ نے کبشہ لکھا ہے۔کم سنی میں نبی کریمﷺ کے زمانہ میں وفات پائی۔ان کی وفات کے بعد ان کی والدہ ام سلیمؓ نے گھر والوں کو کہا کہ اس کے والد ابوطلحہؓ کو میرے سوا کوئی وفات کی خبر نہ دے۔چنانچہ شام کو جب ابوطلحہ نے بچے کے بارے میں پوچھا تو ام سلیمؓ نے بتایا کہ آرام سے ہے۔انہوں نے کھانا کھایا۔رات کو بیوی ام سلیمؓ کے ساتھ ہمبستری بھی کی تو صبح کے وقت ام سلیمؓ نے بتلا دیا کہ بچے کی وفات ہو چکی ہے۔لیکن ثواب کی نیت سے صبر کرنا۔نبی کریمﷺ کو اس بات کا علم ہوا تو دعائیں دیں اور ابوعمیرؓ کے بدلے اللہ تعالیٰ نے عبداللہ بن ابی طلحہ کو پیدا کیا جس میں بڑی برکتیں عطا کی گئی تھیں۔

لیخا لطنا یعنی نبی کریمﷺ ہمارے ساتھ بے تکلف رہتے تھے۔گپ شپ میں شریک ہوتے تھے۔ابوعمیرؓ سے مزاح کا قصہ امام ترمذیؒ کے بیان کے مطابق یوں تھا کہ اس بچے نے ایک پرندہ پال رکھا تھا۔جو مر گیا تھا۔اس کی موت سے اسے دکھ ہوا تھا۔نبی کریمﷺ نے اس کی خاطر داری کے لیے فرمایا ''اے ابوعمیر تیری بلبل کو کیا ہو گیا ہے'' یعنی کیا وہ تم سے روٹھ کر مر گیا ہے۔

نغیر چڑیا کی طرح کا ایک چھوٹا سا پرندہ ہے بعض نے چڑیا کے بچے ہی کو نغیر کہا ہے۔کچھ شراح

کہتے ہیں کہ یہ چھوٹے چونچ اور سرخ سروالا ایک چھوٹا سا پرندہ ہے جسے لال یا بلبل کہتے ہیں۔

قال أبو عیسیٰ الخ امام ترمذیؒ فقہ الحدیث کے عنوان سے اس حدیث کی باریکیاں بیان کرتے ہیں کہ اس مقام پر اس کم سن بچے کے ساتھ مزاح میں متعدد امور کو اشارہ ہے۔ مثلاً یہ کہ نبی کریمﷺ بھی مزاح کیا کرتے تھے اور یہ کہ چھوٹے بچے کو کنیت سے پکارنا جائز ہے(۱)۔ نیز پرندوں کے ساتھ کھیلنا بچوں کا کام ہے۔ اوران کے لیے جائز بھی ہے۔ بڑوں کو اس سے احتراز کرنا چاہیے۔

بعض مسائل مستنبطہ: بہرحال نبی کریمﷺ کے جوامع الکلم کا اعجاز تھا کہ آپﷺ کے کلام کے لفظ لفظ میں دقائق موجود ہیں۔ بلکہ اس جملہ کے بارے میں بعض علماء کا خیال ہے کہ اس سے سو سے زائد مسائل کا استخراج کیا جاتا ہے(۲)۔ بعض فوائد کو حواشی میں بھی نقل کیا گیا ہے مثلاً

(۱) تکنیۃ الصغیر جائز ہے۔

(۲) چھوٹے بچوں کے لیے پرندوں کے ساتھ کھیلنا جائز ہے بشرطیکہ وہ اسے اذیت نہ دیں۔

(۳) مدینہ منورہ کے شکار کا حکم وہ نہیں جو حرم پاک کے شکار کا ہے یہی جمہور کا مذہب ہے۔

(۴) استفہام کے ادات استعلام کی بجائے دوسرے اغراض کے لیے بھی درست ہیں۔

(۵) تصغیر الاسماء جائز ہے۔

(۶) مسجع کلام کرنا ممنوع نہیں البتہ اس میں تکلف سے بچنا چاہیے۔

(۷) چھوٹے اور عمر رسیدہ لوگوں کی دلجوئی کے لیے ان سے دل لگی کرنا جائز ہے۔

اس طرح ضعفاء کی کمالِ رعایت کی ترغیب دی گئی ہے۔

---

(۱) یاد رہے کہ کنیت کے لئے حقیقت ضروری نہیں۔ کبھی کبھار تفاؤلاً بھی کنیت رکھی جاتی ہے۔ جیسے ابوالکلام، ابوالحسنات وغیرہ۔ ان دونوں مثالوں سے بالکل واضح ہے۔ اس لئے نہ کلام کا تو باپ ہوتا ہے اور نہ حسنات۔ چونکہ اب کا ایک معنی صاحب یعنی ساتھی کے بھی آتا ہے۔ اس لئے ابوالکلام سے مراد صاحب الکلام اور ابوالحسنات سے صاحب الحسنات مراد ہے۔ امام اعظم ابوحنیفہؒ کی کنیت بھی اسی قبیل سے ہے۔ اس لئے کہ امام ابوحنیفہؒ کی کوئی بیٹی نہیں تھی یہ کنیت تفاؤلاً رکھی گئی تھی۔ تو یہاں پر بھی اس بچے کے لئے آنحضرتﷺ نے تفاؤلاً کنیت استعمال کی۔ علامہ بیجوریؒ نے لکھا ہے وهو لابأس به لأن الكنيّة قد تكون للتفاول بانّه يعيش ويصير اباً لكونه يولدله(المواهب اللدنية ۱۵۱)(مختار)

(۲)قال البيجوريؒ افردها(يعني فوائد هذاالبحث) ابن القاصؒ بجزء ۱۲ المواهب اللدنية(مختار)

(۳) حدّثنا عباس بن محمّد الدوریّ قال أنا علیّ بن الحسن ابن شقیق أنا عبداللّٰہ بن المبارک عن أسامة بن زید من سعید المقبری عن أبی هریرة قال قالوا یا رسول اللّٰہ ﷺ إنّک تداعبنا قال إنّی لا اقول إلّاحقا تداعبنا یعنی تماز حنا(۱).

ترجمہ: ابوھریرۃؓ کہتے ہیں کہ صحابہؓ نے عرض کیا۔ یارسول اللہ ﷺ آپ تو ہمارے ساتھ مزاح کرتے ہیں۔ تو آپ ﷺ نے فرمایا۔ میں تو حق بات ہی کہتا ہوں۔ امام ترمذیؒ کہتے ہیں کہ ''تداعبنا'' سے مراد مزاح کرنا ہے۔

انّک تداعبنا چونکہ نبی کریم ﷺ نے کثرتِ مزاح سے صحابہ کو منع فرمایا تھا اس لیے ان کو یہ بات عجیب لگی کہ خود آپ ﷺ مزاح فرماتے ہیں۔ مگر نبی کریم ﷺ نے جواباً یہ توجیہ پیش کردی کہ میں نے تو اس مزاح سے منع کیا ہے جس میں خلافِ حقیقت باتیں، دروغ گوئی، یا تمسخر ہو۔ جبکہ میں ایسی سچی باتوں سے دل لگی کرتا ہوں جس میں مذکورہ عیوب نہیں ہوتے۔ چنانچہ آپ ﷺ کا مزاح حق وراستی کا مظہر ہوتا تھا۔ اوراس میں سینکڑوں حکمتیں پنہاں ہوتی تھیں۔

تداعبنا یعنی تماز حنا مداعبه کسی کی دلجوئی کے لیے دل لگی کرنے اور ملیح اور میٹھے بول بولنے کو کہتے ہیں۔

(۴) حدّثنا قتیبة بن سعیدثنا خالد بن عبداللّٰہ عن حمید عن أنس ابن مالک إنّ رجلا استحمل رسول اللّٰہ ﷺ فقال إنّی حاملک علی ولدناقة فقال یارسول اللّٰہ ﷺ ما اصنع بولدالنّاقة فقال رسول اللّٰہ ﷺ وهل تلدالابل إلاّالنوق(۲).

---

(۱)الادب المفردللبخاری۷۷ رقم الحدیث۲۶۵ باب المزاح، السنن الکبریٰ للبیهقی۱۰/۲۴۸،شرح السنة رقم الحدیث۲۶۰۲،مسنداحمد۲/۳۶۰(مختار)

(۲)سنن ابی داؤد۲/۳۳۴ کتاب الادب باب ماجاء فی المزاح، جامع الترمذی ۲/۴۶۳ کتاب البروالصلة باب ماجاء فی المزاح، السنن الکبریٰ ۱۰/۲۴۸(مختار)

ترجمہ: حضرت انسؓ کہتے ہیں کہ ایک آدمی نے نبی کریم ﷺ سے سواری (کیلئے اونٹنی) طلب کی آپ ﷺ نے فرمایا کہ میں اونٹنی کا بچہ سواری کے لیے دے دیتا ہوں۔ اس شخص نے عرض کیا کہ میں اونٹنی کا بچہ لے کر کیا کروں گا۔تو آپ ﷺ نے فرمایا کہ اونٹوں کو اونٹیاں ہی جنتی ہیں۔

ان رجلاً استحمل "حملوه" یعنی سواری طلب کرنے کو کہتے ہیں۔**ما اصنع بولدالخ** یہاں سائل کو یہ وہم لاحق ہوا ہے کہ نبی کریم ﷺ اونٹنی کا چھوٹا بچہ دے رہے ہیں۔ حالانکہ اسے سوچنا چاہیے تھا کہ کہیں اس عام کے ضمن میں خاص وَلَد تو مراد نہیں ہے۔ نبی کریم ﷺ نے مذاق میں اسے تنبیہ کر دی کہ کسی بات سے کوئی نتیجہ اخذ کرنے سے قبل عقلمند آدمی کو اس پر سوچنا چاہیے۔ اور تمام پہلوؤں پر غور وفکر کرنے کے بعد اگر کوئی اشکال باقی رہے تو اس کی وضاحت کے پیچھے پڑنا چاہیے۔

(۵) حدّثنا إسحاق بن منصور ثنا عبدالرزاق ثنا معمر عن ثابت عن أنس بن مالک إنّ رجلا من أهل البادية كان إسمه زاهراً وكان يهدى إلى النبىّ ﷺ هديّة من البادية فيجهّزه النبىّ ﷺ إذا أرادان يخرج فقال النبىّ ﷺ إنّ زاهراً باديتنا و نحن حاضروه وكان رسول اللّٰه ﷺ يحبّه و كان رجلا دميما فاتاه النبىّ ﷺ يوماً وهو يبيع متاعه واحتضنه من خلفه ولا يبصره فقال من هذا أرسلنى فالتفت فعرف النبىّ ﷺ فجعل لا يالوما الصق ظهره بصدر النبىّ ﷺ حين عرفه فجعل النبىّ ﷺ يقول من يشترى هذا العبد فقال الرجل يا رسول اللّٰه ﷺ إذا واللّٰه تجدنى كاسداً فقال رسول اللّٰه ﷺ لكن عنداللّٰه لست بكاسدٍاو قال أنت عنداللّٰه غال(۱).

ترجمہ: حضرت انس بن مالکؓ سے روایت ہے کہ زاہر نامی ایک دیہاتی شخص تھا۔

---

(۱)شرح السنة للبغوی۱۳/۱۸۱ کتاب الرقاق باب المزاح رقم الحدیث۳۶۰۴، مصنف عبدالرزاق،مسنداحمد۳/۱۶۱(مختار)

وہ نبی کریمﷺ کو دیہات کے ہدایا (سبزی، پھل اور شہد وغیرہ) لایا کرتے تھے۔اور جب مدینہ سے واپس جانے کا ارادہ کرتے تو نبی کریمﷺ کچھ (شہری چیزیں) عطیہ کرکے رخصت فرماتے تھے۔ (ایک بار) نبی کریمﷺ نے فرمایا کہ زاہر ہمارا دیہات اور ہم اس کے شہر ہیں۔ نبی کریمﷺ کو اس کے ساتھ محبت تھی ۔ زاہر بدصورت بھی تھے۔ایک دن نبی کریمﷺ اس کے پاس اس حال میں آئے جب وہ اپنا (دیہاتی) سامان فروخت کررہے تھے۔آپﷺ نے اسے پیچھے سے آکر گود میں لیا۔ یوں کہ نبی کریمﷺ کو دیکھ نہ سکے۔ حضرت زاہر بولے کون ہے؟ مجھے چھوڑ دے۔ پھر تھوڑا منہ پھیر کر دیکھا تو نبی کریمﷺ کو پہچان لیا۔ پھر پہچان لینے کے بعد کوئی کسر نہ چھوڑی۔ اپنی پیٹھ کو نبی کریمﷺ کے سینے سے ملنے ملانے میں۔ پس نبی کریمﷺ نے (اعلان کے انداز میں) کہا کون ہے جو اس غلام کو خرید لے۔اس شخص نے کہا کہ یارسول اللہﷺ خدا کی قسم بیچتے ہوئے تم مجھے کم قیمت کا پاؤ گے۔ نبی کریمﷺ نے فرمایا لیکن اللہ تعالیٰ کے ہاں تو تیری قیمت کم نہیں ہے۔ یا یوں فرمایا کہ تو اللہ تعالیٰ کے ہاں بیش قیمت ہے۔

حضرت زاھرؓ اور حضور اقدسﷺ کی بے تکلفی: زاہر بن حرام الاشجعی حجاز کے دیہات میں رہنے والے تھے۔ابن عبدالبرؒ نے استیعاب میں اسے بدری صحابی بتایا ہے۔جبکہ دوسرے علماء ان کے بدری ہونے سے انکار کرتے ہیں۔وہ کہتے ہیں کہ یہ دراصل بدوی کی تصحیف ہے۔حضرت زاہرؓ نبی کریمﷺ کے پاس آتے ہوئے کچھ نہ کچھ دیہاتی ہدیہ ضرور لاتے۔اور آپﷺ بھی ان کو عطایا سے نوازتے تھے۔اس لیے نبی کریمﷺ انکو ''بـادیة آل مـحـمّـد'' کے نام سے پکارتے تھے۔عمر کے آخری حصہ میں کوفہ منتقل ہوگئے تھے۔

نبی کریمﷺ کے ساتھ بے تکلفی کی وجہ سے دونوں طرف سے مزاح کا سلسلہ چلتا رہتا تھا۔اکثر دیہات کے ہدایا پیش کرتے رہتے تھے۔کبھی کبھی بازار میں کوئی چیز پسند آتی تو خرید کر نبی کریمﷺ کی

خدمت میں پیش کردیتے تھے۔اور پھر جب بیچنے والا رقم کا تقاضا کرتا۔تو نبی کریمﷺ سے کہہ دیتے کہ اس چیز کی قیمت دے دو۔آپﷺ فرماتے کہ تم نے تو مجھے ہدیہ دیا ہے۔تو کہہ دیتے کہ میرے پاس کچھ نہیں ہے۔آپﷺ ہنس کرخود قیمت چکا دیتے تھے۔

__بادیۃ اورحاضرہ:__ ھدیة من البادیة دیہات کا ہدیہ عموماً معمولی ہوتا ہے۔اکثراوقات میں پھل، پھول،سبزی،مرغی،شہد،انڈوں وغیرہ کی شکل میں ہوتا ہے۔فیجھزہ النبیﷺ نبی کریمﷺ بہت غیور اور سخی تھے(۱)۔اس لیے رخصت کرتے وقت شہر کی قیمتی چیزیں بطور عطیہ دے کر رخصت فرماتے۔ان زاھراً بادیتنا یہاں پر یا تو حرف تشبیہ محذوف ہے۔تقدیر یوں ہوگی''کبادیتنا''یعنی وہ ہمارے لیے دیہات کی طرح ہے یا مضاف مقدر ہوگا یعنی''ان زاھراً اھل بادیتنا''یا پھر تاء مبالغہ کے لئے ہے اور بادی بمعنی بدوی کو مبالغة بادیة کہہ دیا ہے۔جیسے راوی کو راویۃ کہا جاتا ہے۔

ونحن حاضروه. یعنی زاہرؓ دیہات کی چیزیں ہمارے پاس لاتے ہیں اور ہم ان کی شہری ضروریات پوری کرتے ہیں۔رجلا دمیما دمیم دمامة سے صفت مشبہ ہے بدصورت کو کہتے ہیں یعنی آپؓ خوبصورت نہیں تھے۔پھر بھی نبی کریمﷺ کو آپؓ کے اخلاص کی وجہ سے آپؓ سے محبت تھی۔

وھو یبیع متاعه اس قصہ کو علامہ بیجوریؒ نے کچھ تفصیل کے ساتھ ذکر کیا ہے وہ یوں کہ حضرت زاہر ایک بار بازار میں دو مشک لئے ہوئے کچھ فروخت کر رہے تھے کہ نبی کریمﷺ کا وہاں سے گزر ہوا۔آپﷺ نے آکر ایک مشک کھولنے کی فرمائش کی۔اوراس میں انگلی ڈبو کر اس (کے گھی یا شہد وغیرہ) کو دیکھ لیا۔اورزاہر سے کہا کہ اس کو پکڑ لو۔پھر دوسر مشک کھلوا کر اسے دیکھا۔اورزاہر کے دوسرے ہاتھ میں تھما دیا۔اس کے بعد جب زاہر کا دھیان نہیں رہا۔آپﷺ چھپ کر پیچھے سے آئے۔اوراس کو گود میں لے کر آنکھوں پر ہاتھ رکھ دیا تاکہ زاہر کچھ دیکھ نہ سکے۔حضرت زاہرؓ نے خود کو چھڑانے کی کوشش کی مگر جب پتہ چلا کہ نبی کریمﷺ نے ان کو پکڑ رکھا ہے۔تو مزید تقرب کی کوشش کرنے لگے۔اوراپنی پیٹھ کو نبی کریمﷺ کے سینے کے ساتھ ملنے لگے۔اس سے آگے حدیث میں یہاں مذکور ہے۔ولا یالو الخ یعنی پہچان لینے کے بعد زاہر نے اپنی پیٹھ نبی کریمﷺ کے سینے کے ساتھ ملنے میں کوئی کوتاہی نہ کی (ألی یألو

(۱)کان النبیﷺ یقبل الهدیة و یثیب علیها (بخاری کتاب الهبة ۱/۳۵۲) (مختار)

ألوا کوتاہی کرنے کو کہتے ہیں) یہ اس لیے تا کہ اس قرب سے برکتیں حاصل ہوں۔ جو حسن اتفاق سے آج مل گیا ہے۔ نیز اس قربت میں جو لذت ہے وہ تادیر قائم رہے۔ مـا الصق ظهره ماصدر یہ ہے الصاق ظهر کے معنی میں ہے۔

من يشترى هذا العبد اگر چہ حضرت زاہرؓ غلام نہ تھے لیکن آپ ﷺ نے ازراہِ مزاح کہا کہ اس غلام کو کون خریدے گا۔ حضرت زاہرؓ گویا تو اس کی بدصورتی کی وجہ سے غلام کہا ہے یا اس کی قابلِ قدر خدمات کی وجہ سے خادم کی جگہ عبد کا لفظ استعمال کیا ہے یا عبد کا لفظ ان کا کاروبارِ دنیا میں محو ہونے اور غیر اللہ میں مشغولیت سے کنایہ ہے۔ اس طرح مزاح کے ساتھ ساتھ اس جملے میں حضرت زاہرؓ کو اس بات پر تنبیہ بھی ہے کہ وہ بازار میں سودا سلف میں یوں منہمک ہے جیسے کہ دنیا کا بندہ بنا ہوا ہے۔ حالانکہ میرے عشاق کو دنیا میں جی نہیں لگانا چاہیے۔ تا کہ اللہ تعالیٰ سے بُعد لازم نہ آئے۔

لكن عندالله لست بكاسد كسدا لشئي کھوٹا ہونے کو کہتے ہیں۔ اسی طرح کسی چیز کی بازار میں بےقدری اور قیمت میں کمی کو بھی کساد کہتے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ آپ کا خیال ہے کہ میری قیمت نہیں لگے گی۔ میرا بیچنا خسارے کا ہوگا۔ تمہارے لیے یہ گھاٹے کا سودا ہوگا۔ لیکن اللہ تعالیٰ کے ہاں ایسا نہیں ہے۔ بلکہ عنداللہ تم ایک قیمتی انسان ہو کیونکہ اللہ تعالیٰ بندے کی صورت اور اس کے مال کو نہیں دیکھتے۔ بلکہ دل اور عمل اللہ تعالیٰ کے ہاں ملحوظ ہوتے ہیں۔ اس لیے گھاٹے کی سودا کا سوال پیدا نہیں ہوتا۔

(٢) حدثنا عبد بن حميدثنا مصعب بن المقدام ثنا المبارک ابن فضالة عن الحسن قال اتت عجوز النبى ﷺ فقالت يا رسول اللهﷺ ادع الله ان يدخلنى الجنّة فقال ياامّ فلان إنّ الجنّة لا تدخلها عجوز قال فولّت تبكى فقال اخبروها إنّها لا تدخلها وهى عجوز إنّ الله تعالىٰ يقول إنّاانشأنا هن انشاءً فجعلنا هن ابكارًا(١).

ترجمہ: حضرت حسن بصریؒ کہتے ہیں کہ ایک بوڑھی عورت نبی کریم ﷺ کے پاس

(١) مصنف ابن ابی شیبۃ مجمع الزوائد ١٠/٣١٩ (مختار)

آئیں اور عرض کیا یا رسول اللہ ﷺ دعا کیجئے کہ اللہ تعالیٰ مجھے جنت میں داخل فرمائیں۔ آپ ﷺ نے فرمایا کہ اے ام فلاں جنت میں بوڑھی عورتیں نہیں جائیں گی۔ راوی کہتے ہیں کہ وہ عورت روتی ہوئی لوٹنے لگیں۔ تو آپ ﷺ نے (صحابہ سے) فرمایا کہ اس عورت کو بتادو کہ وہ بڑھاپے کی حالت میں جنت میں نہیں جائیگی کیونکہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں "ہم (جنت کی) ان عورتوں کو ایک خاص طرح کی خلقت سے پیدا کریں گے۔ پس ہم ان کو (ہمیشہ کے لیے) کنواری رہنے کی صفت سے پیدا کریں گے۔

الحسن البصری: یہ روایت حسن بصریؒ سے مرسل مروی ہے حضرت حسن بن ابی الحسن یسار بصریؒ اپنے زمانے کے امام اور تابعین کے سرخیل ہیں۔ حضرت عمرؓ کی شہادت سے دو سال قبل ولادت ہوئی۔ حضرت علیؓ کو خلافت کی سپردگی کے موقع پر آپؒ کی عمر چودہ برس تھی۔ آپؒ نے حضرت علیؓ سے علوم سیکھے۔ نیز حضرت عثمانؓ، حضرت طلحہؓ اور حضرت عائشہؓ کے علاوہ صحابہ کی ایک بڑی جماعت سے ملاقات کا شرف حاصل کیا۔ انتہائی فصیح اور صاحب مناقب وکمالات تھے ان کے والد یسارؒ حضرت زید بن ثابتؓ کے غلام اور والدہ خیرہ ام المؤمنین حضرت ام سلمہؓ کی باندی رہ چکی تھیں۔ بچپن میں جب ان کی والدہ مصروف ہوتی تھی تو آپ کو ام المومنین ام سلمہؓ بہلاتی تھیں بلکہ روتے وقت آپؒ کے منہ میں اپنا پستان دے دیتی تھیں کہا جاتا ہے کہ اسی کی برکت سے آپؒ کو علوم ومعارف اور فصاحت میں بڑا مقام ملا تھا حتیٰ کہ آپ کا کلام انبیاء کے کلام کے مشابہ ہوتا تھا۔ دنیوی مباحث آپ کی مجلس میں نہیں ہوتے تھے۔

صورت کے لحاظ سے بھی آپ بہت حسین تھے۔ حجاج بن یوسف نے آپ کو قتل کرنے کی کوشش کی مگر ہر بار ناکام رہا۔ ۱۱۰ھ میں بصرہ میں وفات پائی۔ تمام لوگ جنازہ کے لیے نکلے۔ حتیٰ کہ اسلامی تاریخ میں پہلی مرتبہ بصرہ کی جامع مسجد میں عصر کی نماز نہیں پڑھی گئی۔

اتت عجوز الخ ایک قول کے مطابق یہ بڑھیا آپ ﷺ کی پھوپھی حضرت صفیہؓ تھیں۔

یا ام فلان الخ نبی کریم ﷺ نے بیٹے کی طرف نسبت کر کے ان کو پکارا۔ اور قول مذکور کے

مطابق ''ام زبیر'' سے پکارا ہوگا۔مگر راوی سے نام بھول گیا۔اس لئے اس نے ذکر کرتے وقت ام فلاں کہہ دیا۔**فولت تبکی** نبی کریم ﷺ کے مزاح کا مطلب نہ سمجھنے کے سبب وہ عورت منہ پھیر کر رونے لگیں۔ **فقال اخبروھا.** نبی کریم ﷺ نے اس بڑھیا کو تسلی دلوانے کا صحابہ کو حکم دیا کہ اللہ تعالیٰ ان کو جنت میں داخل کرائیں گے۔مگر بڑھاپے کی حالت میں نہیں۔ بلکہ جوان اور ہمیشہ کے لیے کنواری بنوا کر وہ جنت میں داخل فرمائیں گے۔اور ساتھ ساتھ وہ خاوند کی محبوب ان سے محبت کرنے والی اور ہم عمر بھی ہونگیں۔

خلاصۂ باب

نبی کریم ﷺ کو اللہ تعالیٰ نے بہت رعب بخشا تھا خود فرماتے ہیں نصرت بالرعب مسیرة شھر یعنی ایک مہینے کے سفر کے فاصلے تک میرا رعب چھایا رہتا ہے۔

شمائل میں یہ حدیث بھی گزری ہے کہ "من رآه بداهةً هابهٗ" یعنی اچانک دیکھنے والے شخص پر آپ ﷺ کی ہیبت چھا جاتی تھی۔ ایسی حالت میں ایک ہادی کے لیے لوگوں کو مانوس کرنا اور ان کے اور دیگر لوگوں کے درمیاں حجاب کو زائل کرنا ضروری ہوتا ہے۔ تاکہ فیض کا اکتساب ہو سکے اور ہدایت کا سلسلہ آگے بڑھے۔ اور اسی لیے آپ ﷺ انبساط سے کام لیا کرتے تھے۔

خوش طبعی اور کشادہ روئی کوئی عیب نہیں۔ بلکہ دینی مقاصد کے حصول کے لیے اور عوام کو دین کی طرف ترغیب دلانے کے لیے ضروری ہے اسی وجہ سے صحابہ کرامؓ اور ائمہ کرام میں بھی مزاح بکثرت پایا جاتا ہے حضرت علیؓ اس سلسلے میں مشہور تھے حضرت عبداللہ بن حذافہؓ سے بھی مزاح بکثرت منقول ہے حضرت سویبطؓ اور حضرت نعمانؓ کے ایک مزاحیہ قصہ کو یاد کر کے نبی کریم ﷺ ایک سال تک ہنسا کرتے تھے۔ امام شعبیؒ اور ابن سیرینؒ بھی مزاح کیا کرتے تھے اس باب میں نبی کریم ﷺ کا عمل مذکور ہے مگر آپ ﷺ کے مزاح کے واقعات صرف انہی واقعات میں منحصر نہیں ہے حضرت عائشہؓ سے ایک قولی روایت بھی مروی ہے وہ کہتی ہیں کہ "انه ﷺ کان یمزح و یقول إنّ اللّٰه تعالیٰ لا یؤخذ المزاح الصادق فی مزاحه" (بیجوری و مناوی) لیکن پھر بھی شریعت نے مزاح کو چند شروط سے مشروط کیا ہوا ہے جو یہ ہیں:

(۱) اسمیں افراط اور مداومت نہ ہو کیونکہ کثرتِ مزاح قساوت قلبی کا باعث بنتا ہے نیز ذکر الٰہی کے لیے رکاوٹ ہوتا ہے۔

(۲) کسی کی ایذاء پر مشتمل نہ ہو ورنہ ناجائز ہے۔

(۳) وقار و تمکنت کے خلاف نہ ہو۔

(۴) جھوٹ، بہتان اور غیبت وغیرہ ممنوعات و محذورات شرعیہ سے خالی ہو۔

۳۷. باب ما جاء فی صفة کلام رسول اللہﷺ فی الشعر

رسول اللہﷺ کا شعر وشاعری سے تعلق کے بیان میں

اس سے قبل مطلق کلام اوراس کے متعلقات جیسے مذاق وغیرہ کا ذکر تھا۔اب شعر وشاعری کے ساتھ آپﷺ کے تعلق کو بیان کیا جاتا ہے جو کہ کلام کی ایک قسم ہے تا کہ یہ واضح ہو جائے کہ آپﷺ نے شعر کہے ہیں یا نہیں۔اور دوسروں کے اشعار اپنے کلام میں مستعمل فرمائے ہیں یا نہیں۔

شعر کے معنی ہیں ''**کلام مقفیً موزون قصداً**''یعنی وہ کلام جسے قصداً قافیہ اوروزن کا پابند کر دیا گیا ہو۔قافیہ اس کلمہ کو کہتے ہیں جس پر شعر ختم ہو،اوروزن ان خاص بحور کا نام ہے۔جن کے مطابق اشعار کہے جاتے ہیں۔ہاں اس میں قصد واختیار کو دخل ہونا چاہیے۔لہٰذا اگر کسی شخص کی زبان سے بے اختیار کوئی موزوں اور مقفی کلام نکلے تو نہ کلام شعر ہوگا نہ کہنے والا شاعر کہلانے کا مستحق ہوگا۔

<u>حکمت الٰہی کی وجہ سے آپﷺ کا شعر وشاعری سے دور رہنا:</u> نبی کریمﷺ کا شاعر نہ ہونا قطعی دلائل سے ثابت ہے۔اللہ تعالیٰ نے ان الفاظ میں اس کا فیصلہ کرتے ہوئے فرمایا ہے''**وما علّمناہ الشعر و ما ینبغی لہ**''یعنی نہ اس پیغمبر کو ہم نے شعر کی تعلیم دی ہے نہ شعر کہنا اسے زیب دیتا ہے۔

کیونکہ شعر میں عموماً مبالغہ آرائی،جھوٹ اور خلاف حقیقت باتیں آتی ہیں۔شعراء کے بارے میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ **والشعراء یتبعهم الغاوون الم تر أنّهم فی کل وادٍ یهیمون (الشعراء)**

ترجمہ: اور شاعروں کی اتباع گمراہ لوگ ہی کرتے ہیں کیا تو نہیں دیکھتا کہ وہ کلام کی ہر صنف کی وادی میں متحیر ہو کر پھرتے ہیں۔(طبع آزمائی کرتے ہیں)

یہی وجہ ہے کہ نبی کریمﷺ کو اللہ تعالیٰ نے شعر سے دور رکھا۔علاوہ ازیں شعر وشاعری اور کتابت امّیۃ کی صفت کے منافی ہے۔اس لئے آپﷺ شاعر نہیں ہو سکتے تھے۔اب اگر نبی کریمﷺ کے کلام میں کچھ ایسے جملے آئے ہیں جو شعر میں داخل ہیں تو وہ یا تو استشہاد اور اقتباس کے طور پر آئے ہیں یعنی آپﷺ نے کسی مقصد کے لیے دوسرے شعراء کا کلام نقل کیا ہے اور چونکہ نبی کریمﷺ کو اللہ تعالیٰ نے بہت بلند ادبی ذوق بخشا تھا شعر کی باریکیوں،بلاغت اور حسن وقبح کو سمجھتے تھے۔اس لیے مضمون کے لحاظ سے اچھے اشعار کو

اپنے خطاب میں استعمال فرماتے تھے اور اگر کسی موقع پر خود نبی کریم ﷺ کی باتوں میں موزوں ومقفی کلام وارد ہوا ہے تو وہ شعر اور وزن کے قصد سے نہ تھا ور نہ ایسے جملے تو اتفاقی طور پر ہر شخص کی زبان وقلم سے تقریر و تحریر کے موقع پر نکلتے ہیں۔ جو وزن پر پورا اترتے ہیں لیکن قصد وارادہ نہ ہونے کے سبب ہم اسے شاعر نہیں کہتے۔ درحقیقت اللہ تعالیٰ کے کلام میں اس بات کی طرف بھی اشارہ ہے کہ آپ ﷺ کا شاعر نہ ہونا بوجہ عجز نہیں کیونکہ جب بلا قصد آپ ﷺ سے ایسے کلمات نکلتے ہیں جو وزن وقافیہ پر پورا اتریں تو اگر قصد وارادہ اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے تائید ہوتی تو پھر آپ ﷺ کے اشعار کی نظیر نہ ہوتی۔ لہٰذا آپ ﷺ کا شاعری سے دور رکھنا حکمتِ الٰہی کے سبب ہے۔ کہ یہ چیز پیغمبر ﷺ کے شایان شان نہیں۔

<u>شعر کا حسن مرتبہ اس کے مضمون پر منحصر ہے:</u> رہی یہ بات کہ شعر وشاعری کا شریعت میں ہمارے لیے کیا حکم ہے۔ اس کا اصل جواب یہ ہے کہ تقریباً ہر چیز میں حسن بھی ہوتا ہے۔ اور دوسری جہت سے قبح بھی ہوتی ہے اگر حسن کی جہت سے استعمال ہو تو وہ حَسَن اور اچھا ہے لیکن قبح کی جہت سے یہی چیز بُری بھی ہوسکتی ہے تو شعر کے بارے میں بھی علماء کا فیصلہ وہی ہے کہ ''حَسَنہ حسن و قبیحہ قبیح (۱) '' جو اچھے اشعار ہیں۔ مثلاً جن سے اللہ تعالیٰ کی وحدانیت، رسالت اور دین کا دفاع ہو وہ حسن ہے۔ یا پھر محض منظر کشی ہے، مبالغہ آرائی، جھوٹ اور فحاشی نہیں تو وہ اشعار بھی جائز ہیں۔ لیکن جو خرافات ہیں جیسے امراُ القیس یا متنبّی کے بعض رومانی یا ہجویہ کلام، تو وہ قبیح ہیں۔ اسی کے بارے میں نبی کریم ﷺ نے فرمایا کہ

لان یمتلی جوف رجل قیحایریہ خیر من ان یمتلی شعراً(۲)

کسی آدمی کا دل پیپ سے بھر کر اس کا زہر اس کے دل کو فاسد کر کے کھا جائے یہ بہتر ہے اس سے کہ اس کا دل شعر سے بھر جائے۔

حضرت عمرؓ نے اس قسم کے بعض شعراء کو جلا وطن کر دیا تھا۔ گویا شعر ایک ہتھیار ہے جسے دشمن کی سرکوبی اور اپنے دفاع کے لیے بھی استعمال کیا جاسکتا ہے۔ اور ایک بے گناہ پر ظلم کرنے کے لیے بھی

---

(۱) اور ایسا ہی علامہ عبدالجواد الدومیؒ نے حضرت عائشہؓ کے حوالہ سے کہا ہے کہ حضرت اقدس ﷺ سے شعر کے بارے میں پوچھا گیا تو آپ ﷺ نے فرمایا کہ الشعر کلام حسنہ حسن قبیحہ قبیح (الاتحافات ص ۲۹۰)(مختار)

(۲) رواہ مسلم عن ابی ہریرۃؓ وابی سعید الخدریؓ ج ۲ ص ۲۴۸ (۱۲ مرتب)

استعمال کیا جاسکتا ہے۔حاصل یہ کہ شعر کے حسن وقبح کا فیصلہ کلام کے دوسرے اصناف کی طرح مضمون کے اعتبار سے ہوگا۔تو اس میں حرام،مکروہ،خلاف اولیٰ اور باعث اجروثواب ہر قسم پایا جاتا ہے۔

حضوراقدس ﷺ کی بعض شعراء کی قدر افزائی: خود نبی کریم ﷺ نے بھی بعض شعراء کی تحسین فرمائی ہے۔حضرت حسان بن ثابتؓ کی آپ ﷺ بڑی قدر کرتے تھے بلکہ حکم دیتے تھے کہ اُھجھم۔یعنی کافروں کی ہجو کرو۔ نیز فرمایا کہ جب تک تم رسول اللہ ﷺ کی جانب سے دفاع کرتے ہو اللہ تعالیٰ جبرئیلؑ کے ذریعے تیری تائید کرتا ہے۔ نیز فرمایا کہ رزمیہ اشعار کافروں پر تیروں کی بارش سے بھی زیادہ سخت لگتے ہیں۔آپ ﷺ کے بہت سے صحابہؓ نے شعر کہے ہیں۔خلفائے راشدین سب کے سب شعر کہتے تھے(۱)۔ حضرت علیؓ تو ان سب میں بڑھے ہوئے ہیں۔حضرت تھانویؒ نے صحابہؓ کے اشعار ایک مستقل کتاب کی شکل میں جمع کئے ہیں۔جس کا نام کلام الملوک رکھا ہے۔اس کا نسخہ دیوان حماسہ اور دیوان متنبی کے قریب ہے۔ اور اس میں حضرت عائشہؓ کے بھی اشعار ہیں۔حضرت امام شافعیؒ کا اپنا مستقل دیوان ہے۔یہ شعر بھی انہی کی طرف منسوب کیا جاتا ہے کہ ۔

ولو الشعر بالعلماء یزری لکنت الیوم اشعر من لبیدؓ

ہمارے اکابر میں حضرت نانوتویؒ،حضرت شیخ الہندؒ،حضرت شاہ کشمیریؒ اور حضرت گنگوہیؒ سب کے اشعار اردو، فارسی اور عربی میں پائے جاتے ہیں۔

(۱) حدّثنا علیّ بن حجرثنا شریک عن المقدام بن شریح عن أبیه عن عائشة قالت قیل لها هل کان النبیّ ﷺ یتمثّل بشیئی من الشعر قالت کان یتمثل بشعر ابن رواحة و یتمثّل ویقول و یاتیک بالاخبار من لم تزوّد(۲).

---

(۱)الاتحافات میں حضرت عمرؓ کا یہ مقولہ مذکور ہے کہ تعلموا الشعر فانّ فیه محاسن تبتغی ومساوی تتقی(الاتحافات ص ۲۹۰)(مختار)

(۲)الادب المفرد للبخاری ۲۲۴ رقم الحدیث۸۶۷، جامع ترمذی ۲/۵۷۳ کتاب الاستئذان والادب باب ماجاء فی انشاء الشعر، شرح السنة للبغوی ۱۲/۳۷۳ کتاب الاستیذان باب الشعر الرجز رقم الحدیث ۳۴۰۲(مختار)

ترجمہ: حضرت عائشہؓ سے کسی نے پوچھا کہ کیا نبی کریمﷺ کبھی کسی دوسرے شخص کے شعر کو بطور استشہاد پڑھتے تھے؟ حضرت عائشہؓ نے فرمایا کہ (ہاں کبھی کبھی) ابن رواحہؓ کے شعر کو مثال میں پیش فرماتے تھے اور کبھی (شاعر کے) اس قول سے تمثل فرماتے۔ "ویأتیک بالأخبار من لم تزوّد" (یعنی کبھی وہ شخص تیرے پاس خبریں لائے گا۔ جسے تم نے کوئی راستے کا خرچہ نہیں دیا ہوگا۔

<u>عبداللہ ابن رواحہؓ:</u> عبداللہ بن رواحہ بن ثعلبہ انصاریؓ خزرجی صحابی ہیں۔ بیعت عقبہ میں شریک ہوئے۔ اس کے بعد بدر اور غزوۂ موتہ تک کے تمام غزوات میں شرکت کی۔ صلح حدیبیہ اور عمرۃ القضاء میں بھی شریک رہے۔ جاہلیت میں بھی آپ کو سردار کی نظر سے دیکھا جاتا تھا۔ اسلام میں آپ کا شمار ان عظیم شعراء میں ہوتا ہے جو کہ کافر شعراء کا مقابلہ اپنے اشعار سے کرتے تھے۔ "والشعراء یتبعھم الغاوون" سے آپ کی اور آپ کے دو ساتھیوں حضرت حسانؓ اور کعب بن مالکؓ کی استثناء کے لیے اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل کی "إلا الذین آمنوا و عملوا الصالحت و ذکر واللّٰہ کثیراً الآیة" جرأت اور دلیری میں بھی آپ بے مثال تھے۔ جنگ میں سب سے پہلے جاتے تھے اور سب سے آخر میں لوٹتے تھے۔ ۸ھ میں شامیوں کے ساتھ لڑی جانے والی جنگ غزوۂ موتہ میں جعفر بن ابی طالبؓ اور زید بن حارثؓ کی شہادت کے بعد فوج کی قیادت سنبھالی اور درج ذیل اشعار پڑھے

یانفس ان لم تقتلی تموتی　　　هذا حمام الموت قد صلیتِ

وماتمنیت فقدا عطیتِ　　　ان تفعلی فعلهما هدیتِ

اے مری جان اگر تو قتل نہ کی جائے تو مرنا تو ہوگا ہی　　　یہ موت کی حمام ہے جس میں تو داخل ہو چکی ہے

مری جان تیری ہر تمنا پوری کی جا چکی ہے

اب اگر تو نے ان دونوں (جعفرؓ اور زیدؓ) جیسا کام کیا تب ہی تو ہدایت یافتہ ہوگی

پھر تلوار لے کر خوب لڑے۔ درمیان میں تھوڑی دیر ستانے کے لیے گھوڑے سے اترے تو چچا زاد بھائی نے گوشت پیش کیا تا کہ کھا کر کچھ جان میں جان آئے۔ گوشت کو منہ سے لگایا۔ ادھر ایک جگہ لشکر

میں مڈ بھیڑ نظر آئی پھر کہا ''تعجب ہے تو ابھی دنیا میں رہتا ہے'' یہ کہتے ہوئے گوشت پھینک کر دشمن میں گھس گئے اور لڑتے ہوئے شہادت سے سرفراز ہوئے۔

آپ فی البدیہہ شعر کہا کرتے تھے اور ایسے بہت سے واقعات ہیں جب نبی کریمﷺ کی فرمائش پر آپ نے بڑا قابل فخر کلام پیش کر دیا۔ ایک مرتبہ اپنی ایک باندی کے پاس بیوی سے چھپ کر آئے اور اس کے ساتھ مجامعت کی۔ بیوی نے ہمبستری کرتے دیکھ لیا تو فراغت کے بعد اس کو ملامت کرنے لگیں۔ آپؓ نے ہمبستری سے انکار کر دیا تا کہ بیوی ناراض نہ ہو۔ بیوی نے کہا کہ اگر تم سچے ہو تو قرآن کریم کی تلاوت کرو(کیونکہ جُنُبْ شخص کے لیے قرآن کی تلاوت کرنا جائز نہیں ہے) آپؓ نے فوراً یہ اشعار پڑھے۔

شهدت بان وعدالله حق وإنّ النار مثوى الكافرينا

وإنّ العرش فوق الماء حق وفوق العرش رب العالمينا

و تحملهٗ ملا ئكة غلاظٌ ملائكة الاله مسوّمينا

چونکہ بیوی کو قرآنی آیات یاد نہیں تھیں اور مذکورہ اشعار قرآنی آیات ہی میں تھوڑی تغیر کر کے بنائے گئے تھے۔ لہٰذا بیوی کو تسلی ہوئی اور بولیں ''صدق الله وكذبت عينى'' اللہ تعالیٰ سچ فرماتے ہیں اور میری آنکھ ہی دھوکہ کھا چکی ہے۔ آپؓ کے مناقب بے شمار ہیں۔

تمثّل بشئ کسی کے کلام کو اپنے مقصد کے ثبوت اور شہادت کے طور پر پیش کرنے کو تمثّل کہتے ہیں یعنی آپﷺ کسی مقصد کی وضاحت اور ثبوت کے لیے شعر کو بطور مثال پیش کرتے تھے۔

ويتمثّل ويقول یعنی عبداللہ بن رواحہؓ کے شعر کے علاوہ بھی آپﷺ بطور تمثّل شعر نقل کرتے تھے۔ مثلاً اس شعر سے بھی تمثّل کرتے تھے ''ويأتيك الخ''۔ بعض نسخوں میں ''ويتمثّل بقوله'' لکھا ہے اس میں بقولہ کا ضمیر عبداللہ بن رواحہؓ کو راجع نہیں ہے بلکہ مطلقاً شاعر کو راجع ہے۔ یعنی وہ دوسرے شاعر کے اس قول کو بھی استشہاداً پیش فرماتے تھے۔ اور یہ توجیہ اس لئے ضروری ہے کہ مذکورہ شعر عبداللہ بن رواحہؓ کا نہیں ہے بلکہ طرفہ بن عبد بکری جاہلی شاعر کا ہے جو اس کے معلقہ ہی سے ماخوذ ہے۔ اور حضرت عائشہؓ کو عرب کے جاہلی شعراء کے کلام کا بہترین علم حاصل تھا(۱)۔ اس لیے یہ بعید از امکان ہے کہ خانہ کعبہ میں لٹکے

---

(۱)عن عائشةؓ قالت رويتُ للبيد اثنى عشر الف بيت(الاستيعاب على هامش الاصابة ج۳ ص ۳۲۸)

ہوئے مشہور معلّقہ کے اشعار کی نسبت عبداللہ بن رواحہؓ کی طرف کریں۔

ستُبدی لک الایام ما کنت جاھلاً   ویاتیک بالاخبار من لم تزّود

یہ شعر طرفۃ بن العبد جاہلی شاعر کا ہے جس کا سبعہ معلقہ میں دوسرا قصیدہ ہے اور وفور معانی کی وجہ سے آپ ﷺ اس کو پڑھا کرتے تھے۔

زمانہ بڑا معلم ہے: اس شعر کے پہلے مصرع کا مقصد یہ ہے کہ زمانہ بڑا معلم ہے وہ اپنے تجربات سے تجھے وہ چیزیں بتادے گا جو تجھے معلوم نہ تھیں۔انسان کے علم وتجربہ میں اضافہ ہوتا ہے۔مثلاً آج تو وہ توحید کونہیں مانتا آخرت اور رسول کی رسالت کا منکر ہے لیکن قبر میں اور آخرت میں بلکہ دنیا ہی میں ایک دن اس پر یہ ظاہر ہو جائے گا اوران حقائق پر یقین ہو جائے گا۔اس شعر میں اس حقیقت کو اشارہ کیا گیا ہے اور نبی کریم ﷺ بھی اسی مقصد کے لیے اس شعر کو پیش کرتے تھے۔

بغیر زادواجرۃ خبر رسانی:

دوسرے مصرع کا مطلب یہ ہے کہ ایسے لوگ تجھے خبر دیں گے جن کو تم نے زادراہ نہیں دیا ہوگا۔یہ فتنہ وفساد کا دور ہوگا۔بغیر مطلب اور درخواست کے تیرے ہاں خبریں پہنچائی جائیں گی۔جس طرح آج ہم دیکھ رہے ہیں کہ ذرائع ابلاغ مختلف قسم کی خبریں بغیر درخواست کے پہنچا کر پریشانی کا سبب بنتی ہیں۔ ریڈیو، ٹیلی وژن، اخبار اور ٹیلی فون وغیرہ سب تجھے پریشان کررہے ہیں۔آدھے فساد، شر اور ہنگامے اسی روز ختم ہوجائیں گے جب اعلان ہوگا کہ کل سے کوئی اخبار نہیں چھپے گا۔مولانا عبدالماجد دریا آبادیؒ نے لکھا ہے کہ ساری دنیا میں اگر اخبار بند ہوجائیں تو کافی امن ہو جائے گا۔اور یہ بات ڈھکی چھپی نہیں پہلے تو مہینوں بعد کسی مصیبت کا علم ہوتا اور اس وقت تک یقین ہو چکا ہوتا کہ سب کچھ ٹل چکا ہے لیکن اب تو اعصابی نظام اس وجہ سے مختل ہو چکے ہیں کہ گھر میں پرائے غموں کے انبار پڑے ہوتے ہیں۔بٹن دباتے ہی میڈیا آپ کو براہ راست خبریں دکھاتا ہے اور میڈیا میں فساد کی دوڑ لگی ہوئی ہے۔

یہ احتمال بھی ہے کہ دوسرے مصرع سے تمثیل کا مقصد یہ ہو کہ حضور نبی کریم ﷺ اپنے بارے میں وضاحت کررہے ہوں کہ دیکھو تمہارے پاس اللہ تعالیٰ نے ایک ایسے مخبر صادق کو نبی بنا کر بھیجا ہے جسے تم کوئی بھی زادِراہ اجرت اور فیس وغیرہ نہیں دیتے۔اور وہ عالم آخرت تک کی خبریں لاتے ہیں۔دنیا کی

فلاح ونجات اور عروج وزوال کی بنیادیں بھی وضاحت کے ساتھ بیان کرتے ہیں پھر وہ تمہارا نوکر بھی نہیں ہے ان کی اس خیرخواہی کا اس کو کوئی بدلہ تمہاری طرف سے نہیں ملتا۔ اور وہ یہی صدا لگاتا پھرتا ہے "ان اجری الا علی اللہ "بعض روایات میں آتا ہے کہ آپ ﷺ نے اس شعر کو پڑھتے ہوئے ترتیب بدل دی اور یوں پڑھا کہ "ویأتیک من لم تزوّد بالاخبار"

ابوبکر صدیقؓ نے تصحیح کر کے صحیح ترتیب بنائی تو آپ ﷺ نے فرمایا "ما انا بشاعر "یعنی میں شاعر نہیں ہوں۔

(۲) حدّثنا محمّد بن بشّار ثنا عبدالرحمٰن بن مهدی قال ثنا سفیان عن عبدالملک بن عمیر ثنا أبو سلمة عن أبی هریرة قال قال رسول اللّٰه ﷺ إنّ أصدق کلمة قالها الشاعر کلمة لبید الاکلُّ شئی ما خلا اللّٰه باطل و کاد امیّة بن أبی الصلت ان یسلم(۱).

ترجمہ: حضرت ابوھریرۃؓ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے ارشادفرمایا کہ سب سے زیادہ سچی بات جو کسی شاعر نے کہی ہو لبیدؓ کی یہ بات ہے "**الاکل شئی ما خلا اللّٰه باطل** (۲) "(یعنی خبردار کہ اللہ تعالیٰ کے سوا ہر چیز فانی ہے) اور قریب تھا کہ امیہ بن الصلت اسلام لے آتے۔

<u>لبیدؓ اور اس کی حق شناسی:</u> **أصدق کلمة الخ** کلمہ سے کلام مراد ہے یعنی شعراء کے کلام میں سب سے سچا کلام لبیدؓ کا مذکورہ قول ہے کیونکہ اگرچہ شعراء اور بالخصوص جاہلی شعراء کے کلام میں جھوٹ اور مبالغہ ہوتا ہے لیکن اس سے بڑی سچائی بھی ان کے کلام میں نہیں جو کہ شاعر نے بیان کی ہے کہ صرف اللہ تعالیٰ کی

---

(۱)صحیح بخاری ۱/۵۴۱ کتاب المناقب باب ایام الجاهلیة، صحیح مسلم ۲/۲۴۷ کتاب الشعر، جامع ترمذی ۲/۵۷۳ کتاب الاستذان والادب باب ماجاء فی انشاء الشعر، سنن ابن ماجة ص ۲۶۶ کتاب الادب باب الشعر .(مختار)

(۲) مکمل شعر کچھ اس طرح ہے

ألا کل شئ ماخلا اللّٰه باطل	و کل نعیم لامحالة زائل
نعیمک فی الدنیا غرور وحسرة	وأنت قریباً عن مقیلک راحلُ (مختار)

ذات کو بقاء حاصل ہے(۱)۔ دنیا کی تمام نعمتیں اور تمام باقی ممکنات زوال پذیر ہیں۔ نبی کریم ﷺ کی شان پر غلبۂ توحید کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ جس شعر میں توحید کا مغز اور حاصل ہے آپ ﷺ اس کی تحسین فرمارہے ہیں۔

لبید بن ربیعہؓ بڑے شاعر تھے۔ سبعہ معلقہ میں چوتھا معلقہ انہی کا ہے۔ نبی کریم ﷺ کے ہاتھ پر مسلمان ہوئے۔ جاہلیت کے دور میں مایہ ناز شاعری کرتے تھے لیکن اسلام لانے کے بعد قرآن مجید کے اعجاز اور فصاحت و بلاغت کے سامنے گردن نہاد ہوئے۔ قلم توڑ دیا اور شاعری چھوڑ دی۔ کیونکہ وہی لوگ قرآن کے اعجاز کو خوب سمجھتے تھے۔ اسی وجہ سے لبیدؓ نے اسلام لانے کے بعد شعر نہیں کہے۔ وہ فرماتے تھے کہ اعجاز تفہیم معانی اور فصاحت و بلاغت کے لحاظ سے میرے لئے قرآن مجید کافی ہے۔

حضرت عمرؓ نے ایک بار کوفہ کے عامل کو آپؓ کے پاس بھیجا تا کہ اسلام کے زمانہ میں ان کے کسی شعر کا پوچھے تو فرمایا کہ أبدلني الله بالشعر سورة البقرة وال عمران. ''اللہ نے مجھے اشعار کے بدلے سورۃ بقرۃ اور آل عمران یعنی قرآن دیدیا۔ اب شعر و شاعری سے کیا سروکار''

ایک سو چالیس سال تک زندہ رہے(۲)۔

غیر مسلم شاعر کی مؤمنانہ کلام کی تحسین: وقال الخ یعنی شاعروں پر تبصرہ اوران کے کلام کی تحسین کے سلسلے میں آپ ﷺ نے امیہ بن صلت کی بھی تعریف کی۔ نبی کریم ﷺ کا ادبی ذوق بہت بلند تھا۔ عرب کے شعر و شاعری سے بے خبر نہ تھے۔ امیہ بن صلت کے اشعار میں توحید اور بعث بعد الموت کے بارے میں حکیمانہ کلام ملتا تھا۔ علاوہ ازیں وہ ایک عبادت گزار کی حیثیت سے پہچانا جاتا تھا۔ اس لئے فرمایا کہ قریب تھا کہ وہ مسلمان ہو جائے لیکن اللہ تعالیٰ کی توفیق شامل نہ تھی۔ نبی کریم ﷺ کا زمانہ پایا لیکن اسلام نہیں لایا۔ اور طائف کے محاصرے کے دوران کفر کی حالت میں مرا۔ ایمان کے قریب ہوتے ہوئے

(۱) یہی کچھ قرآن پاک نے بیان کیا ہے کل من علیها فان ويبقى وجه ربك ذو الجلال والاكرام(الرحمن) اوردوسرے مقام پر ہے کل شیٔ هالک الا وجهه (الآیة)(مختار)

(۲) بعض روایات میں ۱۵۴ اور بعض میں ۱۵۷ سال کا ذکر ہے۔ انتہائی بہادر شہسوار اور سخی شخص تھے۔ ہر سال بڑی تعداد میں اونٹ ذبح کر کے لوگوں کو کھلاتے تھے۔ (اصلاح الدین)

بھی بدبختی آڑے آئی(۱)۔

(۳) حدّثنا محمّد بن المثنیٰ قال أنبانا محمّد بن جعفر ثنا شعبة عن الأسود بن قیس عن جندب بن سفیان البجلیّ قال أصاب حجرٌ إصبع رسول اللہ ﷺ فدمیت فقال.

هل أنت إلاّ إصبع دمیت و فی سبیل اللّٰہ مالقیت(۲).

(۴) حدّثنا ابن ابی عمرؒ ثنا سفیان ابن عیینة عن الأسود بن قیس عن جندب بن عبداللّٰہ البجلیّ.

ترجمہ: حضرت جندب بن (عبداللہ بن) سفیان بجلیؓ کہتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ کی انگلی کوایک پتھر لگ گیا جس کی وجہ سے وہ (زخمی ہوکر) خون آلود ہوگئی تو آپ ﷺ نے کہا کہ تو ایک خون آلود ہونے والی انگلی ہی تو ہے اور جو مصیبت تجھے پہنچی ہے وہ بھی اللہ کے راستے میں پہنچی ہے۔

جندب بن سفیان یہ دراصل جندب بن عبداللہ بن سفیان بجلیؓ ہیں یہاں دادا کی طرف اور اگلی سند میں والد کی طرح منسوب ہیں۔ بجلیہ قبیلہ سے تعلق ہے۔ ابتداء میں کوفہ میں رہتے تھے۔ جہاں آپؓ کو جندب بن سفیان کہاجاتا تھا پھر بصرہ میں سکونت اختیار کی۔ بصری لوگ آپؓ کو جندب بن عبداللہ کہا کرتے تھے۔ اس کے علاوہ ان کو جندب الخیر اور جندب الفاروق بھی کہا جاتا ہے۔ وہ خود کہتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ کے زمانے میں میں نوجوانی کی ابتدائی ایام میں تھا۔ حضرت ابی بن کعبؓ اور حذیفہؓ سے بھی آپؓ روایت کرتے ہیں۔

---

(۱) بعض روایات میں ہے آمن شعرہ و کفر قلبه (الاتحافات ۲۹۲) کہ اس کے اشعار تو اسلام لائے مگر یہ خود مسلمان نہیں ہوا۔ اس کی وجہ علامہ عبدالجواد الدومیؒ نے لکھا ہے کہ کان یطمع ان یکون نبی الامة (الاتحافات ۲۹۲) کہ نبوت تو میرا حق تھا محمد ﷺ کیسے نبی ہے۔(مختار)

(۲) صحیح بخاری ۱/۳۹۳ کتاب الجهاد باب من ینکب فی سبیل اللّٰہ، صحیح مسلم ۲/۱۱۶ کتاب الجهاد والسیر باب مالقی النبیّ ﷺ من اذی المشرکین والمنافقین، جامع ترمذی ۲/۶۴۵ کتاب تفسیر القرآن باب ومن سورة الضحیٰ، (مختار)

اصاب حجر الخ یہ جنگ احد کا واقعہ ہے۔اور بعض کی رائے میں ہجرت سے پہلے کا واقعہ ہے جب آپﷺ کو ایذائیں پہنچائی گئیں اور مختلف طریقوں سے لوگ آپﷺ کو تنگ کرتے تھے۔ بہر حال اس جہاد میں یا کسی دوسرے موقع پر آپﷺ کے پاؤں مبارک کی انگلی مبارک کو پتھر لگا وہ خون آلودہ ہوئی تو نبی کریمﷺ نے یہ کہا کہ هل انت الاّ اصبع دميتِ وفی وسبيل الله مالقيتِ

گویا خود کو تسلی دیتے ہوئے آپﷺ نے فرمایا کہ انبیاء تو تبلیغ حق میں ٹکڑے ٹکڑے ہو گئے تھے۔ انہیں آروں سے چیرا گیا۔مختلف عذاب دیئے گئے اور یہ تو ایک انگلی ہے تو اگر کٹ جائے پھر بھی حق ادا نہ ہوا۔ابھی تو صرف خون بہا ہے

جان دی دی ہوئی اسی کی تھی حق تو یہ ہے کہ حق ادا نہ ہوا

پھر جو تکلیف ملی ہے وہ بھی تو اللہ کے راستے میں ہے جس کا ثواب ملے گا خون بیکار نہیں بہا۔

<u>آپﷺ کے کلام کو موزون یا شعر کہنے کے توجیہات:</u> لیکن اس مقام پر یہ اعتراض ہوتا ہے کہ یہ تو ایک شعر ہے جو نبی کریمﷺ نے کہا ہے حالانکہ آپﷺ کو شاعر کہنا ٹھیک نہیں ہے۔اس کے متعدد جواب دیئے گئے ہیں۔

اول یہ کہ اگر بلا قصد وارادہ کوئی موزوں و مقفّی کلام کسی کی زبان پر آئے تو اسے شعر نہیں کہتے۔

دوم یہ کہ اگر شعر بھی ہو تو ایک آدھ شعر کہنے سے کوئی شاعر نہیں کہلایا جا سکتا۔شعر کا تو مستقل ملکہ ہوتا ہے جس کے حاصل ہونے کے بعد شعر کہنے والے کو شاعر کہتے ہیں۔

سوم یہ کہ بعض لوگ کہتے ہیں یہ شعر نہیں بلکہ ایک رجز ہے جو جنگی آواز یا ترانے کو کہتے ہیں۔جس طرح سیاسی تحریکوں میں نعرہ بازی ہوتی ہے۔اور مختلف آوازوں اور ترانوں کے ذریعے لوگوں کے جذبات کو ابھارنے کی کوشش کی جاتی ہے۔

چہارم یہ کہ یہاں دمیت اور لقیت کی تاء کو ساکن پڑھا گیا ہے جس سے وزن ٹوٹ جاتا ہے اور یہ کلام شعر نہیں رہتا۔

پانچواں جواب یہ ہے کہ بعض مؤرخین کی رائے کے مطابق یہ خود نبی کریمﷺ کا کلام نہ تھا بلکہ بطور تمثل آپﷺ نے کسی دوسرے شاعر کا کلام نقل کیا ہے۔چنانچہ واقدیؒ کے قول کے مطابق یہ ولید بن

ولید کا شعر ہے اور ابن ابی الدینار کے قول کے مطابق یہ ابن رواحہؓ کا کلام ہے(۱)۔ جس کے بارے میں پہلے آیا ہے کہ آپ ﷺ ان کے کلام سے تمثل کیا کرتے تھے۔ کہا جاتا ہے کہ غزوۂ موتہ میں انہوں نے اپنی شہادت سے قبل جو اشعار کہے تھے ان میں سے یہ شعر بھی ہے۔ ان اشعار کو ہم اس باب کی ابتداء میں ابن رواحہؓ کے احوال بیان کرتے ہوئے ذکر کر چکے ہیں۔ البتہ اس سے یہ لازم آئے گا کہ انگلی کٹنے کا واقعہ غزوہ موتہ کے بعد ہو۔

حدثنا ابن أبی عمر الخ امام ترمذیؒ اس حدیث کے لیے دوسری سند لا رہے ہیں۔ اس سند کے مطابق حضرت جندب کی نسبت اپنے والد کی طرف ہو چکی ہے جبکہ گزشتہ سند میں دادا کی طرف نسبت کی گئی تھی۔

(۵) حدّثنا محمّد بن بشارثنا یحییٰ بن سعید ثنا سفیان الثوری ثنا أبو إسحاق عن البراء بن عازب قال قال له رجل أفررتم عن رسول اللّٰہ ﷺ یاأباعمارة فقال لا واللّٰہ ما ولّی رسول اللّٰہ ﷺ ولکن سرعان النّاس تلقّهم هوازن بالنّبل ورسول اللّٰہ ﷺ علی بغله وأبو سفیان بن الحارث بن عبدالمطلب اٰخذ بلجامها ورسول اللّٰہ ﷺ یقول.

أنا النّبیّ لا کذب أنا ابن عبدالمطلب(۲).

---

(۱) علامہ عبدالجواد الدومیؒ نے لکھا ہے اخرج ابن أبی الدنیا فی کتاب محاسبة النفس أنّ جعفراً حین قتل بمؤتة دعاالنّاس بابن رواحة فأقبل وقاتل فأصیب فی إصبعه فارتجزو جعل یقول.

هل أنت إلاّ إصبع دمیت وفی سبیل اللّٰہ مالقیت

یانفس إلاّ تقتلی تموتی هذاحیاض الموت قدصلیت

وماتمنیت فقدلقیت ان تفعلی فعلهماهدیت

ثم ثبت حتّیٰ استشهدوتمثّل النبیّ ﷺ بقوله(الاتحافات ۲۹۳)(مختار)

(۲) صحیح بخاری ۱/۴۰۲ کتاب الجهاد باب بغلة النبیّ البیضاء، صحیح مسلم ۲/۱۰۷ کتاب الجهاد والسیر باب فی غزوة حنین، جامع ترمذی ۱/۴۳۰ کتاب الجهاد باب ماجاء فی الشباب عندالقتال(مختار)

ترجمہ: حضرت براء بن عازبؓ سے کسی شخص نے پوچھا کہ اے ابوعمارۃ! کیا تم لوگ نبی کریم ﷺ کو چھوڑ کر (جنگ حنین میں) بھاگ چکے تھے۔انہوں نے جواب دیا کہ نہیں خدا کی قسم نبی کریم ﷺ نے جنگ میں پیٹھ نہیں پھیری تھی۔ بلکہ لشکر کے کچھ جلد باز لوگ بھاگ نکلے تھے۔جن کا استقبال بنو ہوازن نے تیروں سے کیا تھا۔اس وقت نبی کریم ﷺ اپنے خچر پر سوار تھے۔ابوسفیان بن الحارث بن عبدالمطلب نے خچر کے لگام کو پکڑا تھا اور نبی کریم ﷺ یہ رجز پڑھتے تھے ''**أنا النبیّ لا کذب أنا ابن عبدالمطلب**'' یعنی میں نبی ہوں۔اس میں کوئی شبہ نہیں اور میں عبدالمطلب کا بیٹا (پوتا) ہوں۔

<u>غزوۂ حنین میں آپ ﷺ کا کلام رزمیہ:</u> **لا واللّٰہ الخ** یعنی مسلمانوں کی وہ پسپائی جو حنین میں ہوئی تھی ہماری یعنی قدیم صحابہ کی پسپائی نہیں ہوئی تھی بلکہ کچھ دن پہلے کے یہ نومسلم صحابہ کے سبب ہوئی جو کہ غیر تربیت یافتہ تھے۔کمانڈروں اور امیروں کے امر کا لحاظ نہیں رکھتے تھے۔جذباتی لیکن بے ترتیب اور غیر منظم تھے۔حوصلہ اور پختگی دماغ میں نہ تھی۔قربانی پیش کرنے کے جذبہ میں ڈسپلن کا لحاظ نہ رکھا جائے اور بدنظمی پیدا ہو جائے وہاں نتیجہ شکست کے طور پر نکل ہی آتا ہے۔جیسے کہ احد میں بھی شکست کی وجہ یہی تھی۔کہ بعض صحابہ کرامؓ نے امیر کی اطاعت نہیں کی تھی اور نہایت اہم جنگی مقام سے غفلت برت کر اسے چھوڑ دیا۔یہاں بھی ادھر نومسلم جذباتی لوگ تھے دوسری طرف مقابلے میں بنو ہوازن تھے جن کی تیراندازی کی دھاک بیٹھی ہوئی تھی ۔ انہوں نے تیر پھینکے تو اس طرف بعض مسلمانوں میں افراتفری پھیلی لیکن نبی کریم ﷺ اپنے خچر پر اسی طرح سوار تھے بھاگے نہیں۔لگام حضرت سفیانؓ کے ہاتھ میں تھی اور بڑے حوصلہ اور شجاعت کے ساتھ یہ رجز کہتے جاتے تھے کہ

أنا النبیّ لا کذب　　أنا ابن عبدالمطلب

<u>غزوۂ حنین کی مجموعی حالت:</u> فتح مکہ کے بعد قبیلہ بنو ہوازن نے اپنے حلیفوں کو جمع کیا اور مسلمانوں کا مقابلہ کرنا چاہا۔مکہ سے طائف کی طرف دس میل کے فاصلے پر حنین کی وادی ہے۔وہاں پر بیس ہزار سے

زائد لشکر جمع کر کے مسلمانوں کو للکارا۔ وہ اپنی عورتیں، بچے اور مال میدان میں لائے تھے۔ تاکہ فرار کی بجائے بے جگری سے لڑیں۔ ۶ شوال ۸ھ کو بارہ ہزار اسلامی فوج لے کر نبی کریم ﷺ بھی ان کی سرکوبی کے لیے نکلے اس فوج میں اکثریت نومسلم افراد کی تھی بلکہ بعض لوگ کفر کی حالت میں محض غنیمت کے حصول کے لیے یا تماشائی بن کر شامل ہوئے۔ چند دن قبل رمضان میں مکہ معظّمہ فتح ہوا تھا۔ ابھی شاید نومسلموں پر بیس دن بھی نہیں گزرے تھے۔ ایک تنگ گھاٹی سے گزر کر اسلامی فوج کا مقدمۃ الجیش جس میں بنوسلیم اور مکہ کے نومسلم جوانوں کی اکثریت تھی جب حنین کے میدان میں داخل ہوا تو بنوہوازن نے بظاہر پسپائی کا مظاہرہ کرتے ہوئے ان کو آگے بڑھنے دیا۔ جب یہ لوگ پہاڑی چوٹیوں کے حصار میں آ گئے تو ہوازن کے ماہر تیراندازوں نے پہاڑی پناہ گاہوں سے نکل کر اچانک تیروں کی بوچھاڑ شروع کر دی جس سے مقدمۃ الجیش کے مجاہدین بوکھلا کر ادھر ادھر بھاگنے لگے۔ اس وقت تک جیش کا مرکزی حصہ ''قلب'' بھی میدان میں آ گیا تھا۔ جس میں خود نبی کریم ﷺ بھی موجود تھے مقدمۃ الجیش کے انتشار کی وجہ سے قلب کا لشکر بھی انتشار کا شکار ہوا لوگ ادھر ادھر بھاگ رہے تھے کسی کو کچھ سجھائی نہ دیا کہ کیا کیا جائے کیونکہ دشمن دور ہی سے صرف تیروں کی بارش کر رہا تھا۔ یہاں تک کہ نبی کریم ﷺ کے ساتھ تقریباً ایک سو صحابہؓ رہ گئے۔ مگر آپ ﷺ نے پیش قدمی جاری رکھی ادھر بنوہوازن نے بھی پلٹ کر پیش قدمی شروع کر دی جن کو مورچہ زن تیراندازوں کی مدد حاصل تھی۔ افراتفری کی وجہ سے مسلمانوں کی پیش قدمی رک گئی صرف نبی کریم ﷺ ہی تھے جو حضرت عمرؓ حضرت عباسؓ اور حضرت ابوسفیان بن الحارثؓ کی معیت میں آگے بڑھتے رہے۔ اور حدیث میں مذکور رزمیہ اشعار بھی لب پر وارد ہو رہے تھے۔ دیگر ساتھیوں کی تعداد کم ہوتی گئی حتی کہ ایک موقع ایسا آیا کہ نبی کریم ﷺ اپنے خچر جس کا نام بیضاء یا دلدل تھا سے اتر گئے اور تن تنہا آگے بڑھے کنکریوں اور ریت سے مٹھی بھر کر ''شاهت الوجوه ارجعوا '' کہتے ہوئے کفار کی فوج پر پھینک دی۔ انتشار کی اس کیفیت میں کسی کو یہ معلوم نہ ہو سکا کہ نبی کریم ﷺ کہاں ہیں اور کیا کر رہے ہیں صرف چند فدائین ہی آپ ﷺ کے پاس رہ گئے تھے اس لئے تجربہ کار پرانے مسلمان بھی بدحواسی کے عالم میں تھے۔ نومسلم اور جذباتی مسلمان میدان سے ہٹ چکے تھے۔ اس دوران حضرت عباسؓ کو حکم دیا کہ وہ مہاجرین،

انصار اور اصحابِ بیعت صحابہ کو آواز دیکر میدان میں بلائیں۔ چنانچہ انہوں نے ایسا کیا تب ہی مسلمانوں کو نبی کریم ﷺ کے مقام کا پتہ چلا۔ اور انصار و مہاجرین کی جماعت نے آگے بڑھ کر بنو ہوازن کو آڑے ہاتھوں لیا۔ بنو ہوازن اس ضرب کاری کا مقابلہ نہ کر سکے اور بہت سا مالِ غنیمت، عورتوں اور بچوں کو چھوڑ کر بھاگ نکلے۔

اس تفصیل سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ مخلص سرفروش صحابہ کرامؓ نبی کریم ﷺ کو چھوڑ کر بھاگے نہیں تھے بدحواسی کی وجہ سے بعض منتشر ضرور ہوئے تھے اور نظم میں نقصان کے سبب نبی کریم ﷺ ان سے بچھڑ گئے تھے جبکہ خود نبی کریم ﷺ کی مسلسل، دلیرانہ اور تیز پیش قدمی جاری رہی(۱)۔

لہٰذا حضرت براءؓ کے جواب کا خلاصہ یہی ہے کہ صحابہ کرامؓ نے اس روز نبی کریم ﷺ کو چھوڑ کر پیٹھ نہیں دکھائی تھی البتہ نومسلم جذباتی مسلمان انتشار کا شکار ضرور ہوئے تھے۔

انا النبی لا کذب　　　انا ابن عبدالمطلب

یہ کلام بھی وزن و قافیہ سے مقید تھا۔ لیکن اس سے آپ ﷺ کا شاعر ہونا لازم نہیں ہوتا جس طرح کہ ہم آگے بیان کریں گے۔

تفاخر بالنسب کی حقیقت: لیکن یہ وہم ہوتا ہے کہ نبی کریم ﷺ نے یہاں نسب اور نبوت سے تفاخر کیا ہے۔ جس کا جواب یہ ہے کہ اس کلام میں ایک حقیقت کا بیان محض توثیق کے لیے کیا گیا تھا۔ گویا نبی کریم ﷺ یہ کہنا چاہتے تھے کہ میں سچا پیغمبر ہوں یہ عارضی شکست حق کو مٹا نہیں سکتی۔ اس کی پرواہ نہیں۔ نیز ''میں عبدالمطلب کا بیٹا ہوں'' یہ حقیقت بھی اسی لئے بیان ہوئی تھی کہ اس سے یہ تنبیہ ہو کہ میں سچا پیغمبر ہوں کیونکہ بعض کتب سماویہ میں آپ ﷺ کے دادا کا نام موجود تھا۔ علامہ ابن حجرؒ فرماتے ہیں کہ بشارات

---

(۱) ملا علی قاریؒ، علامہ بیجوریؒ اور مناویؒ نے لکھا ہے کہ اس پر اجماع ہے کہ آپ ﷺ کبھی شکست کھا کر نہیں بھاگے ہیں۔ اور اگر کوئی شخص آپ ﷺ کی تنقیص کرتے ہوئے کہے کہ نبی کریم ﷺ جنگ سے بھاگے ہیں تو وہ کافر ہو جاتا ہے۔ اور تنقیص کے طور پر نہ کہے تو امام شافعیؒ کے ہاں اس کو تعزیر دی جائے گی۔ جبکہ امام مالکؒ کے ہاں اسے قتل کر دیا جائے گا۔(اصلاح الدین)

میں اس کا ذکر آیا تھا گویا آپ ﷺ نے بھی ان بشارات کی طرف اشارہ کیا کہ میں عبدالمطلب کا بیٹا ہوں۔اور بشارۃ کا مصداق سچائی ہو۔

نیز یہ بھی ہوسکتا ہے کہ والد کی بجائے دادا کی طرف نسبت کرنے کی وجہ یہ ہو کہ آپ ﷺ کے والد عرب میں مشہور نہیں تھے بلکہ جوانی میں وفات پائے تھے جبکہ دادا قریش کے سرداراور مکہ کے رئیس تھے۔اسی وجہ سے لوگ بھی آپ ﷺ کو ابن عبدالمطلب کہتے تھے۔اور ممکن ہے کہ صرف سجع کی رعایت کے لیے ابن عبداللہ کی بجائے آپ ﷺ نے ابن عبدالمطلب کہا ہو۔

اب اس شعر کے کہنے پر آپ ﷺ کا شاعر ہونا لازم نہیں آتا۔بعض لوگوں نے کہا ہے کہ اس لئے کہ یہ شعر نہیں رجز ہے جو جذباتی نثر میں سے شمار ہوتا ہے۔بعض کہتے ہیں اس لئے کہ یہ شعر بھی دراصل ایک اور شخص کا ہے جنہوں نے آپ ﷺ کو مخاطب کر کے کہا تھا کہ

''انت النبیّ لا کذب انت ابن عبدالمطلب''

آپ ﷺ نے صرف انت کی ضمیر انا سے بدل دی تھی لیکن سب سے بہتر جواب یہ ہے کہ شعر کی تعریف میں ہم پڑھ چکے ہیں کہ قصدیت شرط ہے اگر بالقصد وزن وقافیہ کے تحت کلام کو لایا جائے تو شعر ہوگا ورنہ نہیں۔جبکہ یہاں یہ شرط مفقود ہے کیونکہ نبی کریم ﷺ صرف اپنے جذبات واحساسات کا مظاہرہ کرتے ہیں مقفیٰ کلام اتفاقاً زبان پر وارد ہوا ہے اس کا قصد نہیں کیا گیا۔

(۲) حدثنا إسحاق بن منصور عبدالرزاق ثنا جعفر بن سليمان أنبانا ثابت عن أنس إنّ النبیّ ﷺ دخل مكة فی عمرة القضاء و ابن رواحة يمشى بين يديه و هو يقول.

خلّوا بنی الكفار عن سبيله. اليوم نضربكم على تنزيله

ضربا يزيل الهام عن مقيله و يذ هل الخليل عن خليله

فقال له عمر يا ابن رواحة بين يدى رسول اللّٰہ ﷺ و فی حرم اللّٰہ تعالیٰ تقول شعراً فقال النبیّ ﷺ خلّ عنه يا عمر فلهی أسرع فيهم

من نضح النّبل(۱).

ترجمہ: حضرت انسؓ کہتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ عمرۃ القضاء (کے سفر) میں مکہ مکرمہ داخل ہوئے اس حال میں عبداللہ بن رواحہؓ یہ کہتے ہوئے آپ ﷺ کے آگے آگے جا رہے تھے ''خلّوا بنی الکفار الخ'' یعنی ''اے کفار کے بیٹو! نبی کریم ﷺ کے راستے سے ہٹ جاؤ۔ آج ہم تمہیں نبی کریم ﷺ پر نازل ہونے والے قرآن (کے حکم) سے ایسی ضرب لگائیں گے۔ جو کھوپڑیوں کو اپنی قرارگاہوں سے جدا کردے گی۔ اور جو دوست کو اپنے دوست سے غافل کردے گی۔'' اس پر حضرت عمرؓ نے اسے کہا کہ اے ابن رواحہؓ کیا تم نبی کریم ﷺ کے سامنے اور (پھر) اللہ تعالیٰ کے حرم میں شعر پڑھتے ہو۔ تب نبی کریم ﷺ نے فرمایا اے عمرؓ! ابن رواحہ کو منع نہ کرو۔ کیونکہ اس کے اشعار کفار پر اثرانداز ہونے میں تیر برسانے سے بھی زیادہ سخت ہیں۔

عمرۃ القضاء اور ابن رواحہؓ کے اشعار: فی عمرۃ القضاء الخ ذی القعدہ ۷ھ میں نبی کریم ﷺ نے عمرہ ادا کرنے کی غرض سے مکہ کا سفر کیا کیونکہ ۶ھ میں قریش نے آپ ﷺ کو عمرہ ادا کرنے سے روکا تھا تو ۷ھ کا عمرہ دراصل اسی چھوٹے ہوئے عمرہ کی قضاء ہی ہے۔ اسی لئے اسے عمرۃ القضاء کہا جاتا ہے۔ چونکہ شوافع کے نزدیک نفل نماز اور روزہ توڑنے کی قضاء لازم نہیں ہوتی۔ اسی طرح محصر پر حج یا عمرہ کی قضاء لازم نہیں ہوتی۔ اگر احصار کی وجہ سے وہ عمرہ یا حج کا احرام کھول دے۔ اس لئے وہ ''عمرۃ القضاء'' کی وجہ تسمیہ میں کہتے ہیں کہ قضاء ''مقاضاۃ'' یعنی مصالحت کے معنی میں ہے اور چونکہ ۷ھ کا یہ عمرہ مصالحت کے بعد ادا کیا گیا تھا اس لئے اسے عمرۃ القضاء کہتے ہیں۔ لیکن یہ تاویل اس لئے بعید لگتی ہے کہ اس میں قضاء کو ایک غیر معروف معنی میں لیا گیا ہے۔ جبکہ ہمارے نزدیک قضاء سے معروف معنی یعنی ادا کی ضد مراد ہے۔ اور یہ نام ہی اس پر بخوبی دلالت کرتا ہے کہ بصورت احصار عمرہ اور حج کی قضاء واجب ہوتی ہے۔

---

(۱) جامع ترمذی ۲/۵۷۳ کتاب الادب باب ماجاء فی إنشاء الشعر، سنن النسائی ۲/۶۹ کتاب مناسک الحج باب انشاء الشعر فی الحرم والمشی بین یدی الامام، السنن الکبریٰ للبیہقی ۱۰/۲۲۸ کتاب الشهادات باب لاباس باستماع الحداء ونشید الاعراب کثرا وقل (مختار)

خلّوا بنی الکفار الخ چونکہ اس عمرہ کے دوران کفار مکہ پہلے سے مکہ چھوڑ کر نزدیک کی پہاڑیوں پر جابیٹھے تھے۔اس لئے یہاں پر **خلّوا بنی الکفار** سے مراد یہ ہوگی کہ اس ترکِ مکہ پر ثابت وقائم رہو۔ ہمارے لیے رکاوٹ بننے کی کوشش نہ کرنا۔

الیوم نضربکم یہ محض ایک دھمکی اور حضرت عبداللہ بن رواحہؓ کے جذبات کا مظاہرہ تھا ورنہ **عمرة القضاء** کے سفر میں مسلمانوں کے ہاتھوں کسی کو ذرہ برابر تکلیف نہیں پہنچی۔وعدہ کے مطابق پرامن طریقے سے آئے عمرہ ادا کیا اور واپس تشریف لے گئے۔

علی تنزیلہ ضمیر نبی کریم ﷺ کو راجع ہے۔یعنی اگر تم لوگوں نے نقض عہد کر کے نبی کریم ﷺ کو مکہ نازل ہونے کے باوجود عمرہ سے روکنے کی کوشش کی تو اس تنزیل پر ہم تمہاری خبر لیں گے۔اس بار گزشتہ برس کی طرح ناکام واپس نہیں ہونگے۔یوں ''**علی**'' کا لفظ تعلیلیہ ہوگا۔یعنی **بناء علی تنزیلکم ایاہ**۔۔یا پھر **تنزیل** سے قرآن مراد ہوگا۔اور مضاف مقدر ہوگا یعنی ''**بناءً علی حکم تنزیلہ ای قر آنہ**''۔مطلب یہ ہوگا کہ اس پر نازل شدہ قرآن کے حکم کی بناء پر تمہاری پٹائی کریں گے۔

یزیل الھام ہام ہامۃ کی جمع ہے۔جو کھوپڑی کو کہتے ہیں۔

عن مقیلہ **مقیل قال یقیل قیلولۃ** سے مصدر میمی ہے۔جس کے معنی ہے آرام اور نیند۔تو معنی یہ ہوگا کہ ایسی ضرب سے ماریں گے کہ کھوپڑیاں آرام بھول جائیں گی یا پھر یہ ظرف کا صیغہ ہے جائے قرار اور آرام گاہ کے معنی میں ہے۔یعنی سروں کو ان کی آرام گاہ یعنی گردنوں سے جدا کر کے گرادیں گے۔

أفی حرم اللّٰہ تقول الشعر حضرت عمرؓ کی اس بات کا مطلب یہ ہے کہ آپ کے جذبات تو قابل قدر ہیں لیکن احترام حرم اور احترام رسول ﷺ کا تقاضا کچھ اور ہے۔اللہ تعالیٰ تو فرماتے ہیں **لاترفعوا اصواتکم فوق صوت النبیّ** ﷺ **(الآیة)** گویا ان کے خیال میں نبی کریم ﷺ کے سامنے اور پھر حرم کے اندر اشعار کہنا سوء ادب تھا۔علاوہ ازیں یہ وجہ بھی ہوسکتی ہے کہ ابھی تو امن سے عمرہ ادا کرنے کا موقعہ ملا ہے اگر تیرے اشعار سے کفار کے جذبات بھڑک اٹھے تو پھر ممکن ہے کہ ہم کفار کے حملے کی وجہ سے عمرہ تسلی کے ساتھ ادا نہ کرسکیں۔

مگر نبی کریم ﷺ نے عمرؓ کو منع فرمایا اور کہا کہ اسے چھوڑ دو۔کہ اپنے جذبات کا اظہار کرتا رہے ان

کا یہ کام جہاد لسانی ہے کیونکہ جس طرح تلوار کے ذریعے جہاد ہوتا ہے قلم اور زبان سے بھی جہاد ہوسکتا ہے۔ رہے کفار تو وہ ہمارے جہاد اور ان کے اشعار سے ایسے مرعوب ہو چکے ہیں کہ ان کو سامنے آنے کی جرأت نہیں ہوگی۔

بہر حال یہاں پر نبی کریم ﷺ نے جو اجازت فرمائی ہے اس سے واضح ہوتا ہے کہ اشعار سارے قبیح نہیں ہوتے بلکہ مضمون اچھا ہو تو ان میں حسن بھی ہوتا ہے۔

أسرع من نضح النبل الخ النبل تیروں کے پھینکنے کو کہتے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ تیروں کی برسات ان کو اتنا زخمی اور بے قرار نہیں کرسکتی جتنا کہ یہ کلمات اور ابیات ان کا ستیاناس کر رہی ہیں(۱) جیسا کہ ایک شاعر کہتا ہے کہ جراحات السنان لها التیام ولا یلتام ما جرح اللسان

(۷) حدّثنا علیّ ابن حجر أنبانا شریک عن سماک ابن حرب عن جابر بن سمرة قال جالست رسول اللہ ﷺ اکثر من مائة مرة و کان أصحابه یتنا شدون الشعر و یتذاکرون أشیاء من أمر الجاهلیة وهو ساکت و ربّما تبسّم معهم(۲).

ترجمہ: حضرت جابر بن سمرہؓ کہتے ہیں کہ میں سو بار سے زیادہ نبی کریم ﷺ کی (ایسی) مجلسوں میں بیٹھا ہوں جبکہ آپ ﷺ کے صحابہ (ان مجالس میں) ایک دوسرے سے اشعار سنتے تھے۔ اور جاہلیت کے قصے سناتے تھے۔ نبی کریم ﷺ خاموش (ہوکر سنتے) تھے۔ اور کبھی کبھی ان کے ساتھ تبسم بھی فرماتے تھے۔

حضور اقدس ﷺ کے مجالس میں شعر وشاعری: یتناشدون الشعر تناشد ایک دوسرے کے سامنے شعر کہنے اور ایک دوسرے سے سننے کو کہتے ہیں۔ تو گویا نبی کریم ﷺ کی مجلس خشک اور

(۱) کفار کو ایذاء رسائی کے لئے فقہاء اسلام نے یہاں تک لکھا ہے کہ لشکر اسلام دار الحرب کے سانپوں اور بچھوؤں کو بھی قتل نہ کرے تاکہ وہ کفار کی ایذا رسائی کے لئے موجود رہیں۔ (مختار)

(۲) جامع ترمذی ۱۵۷۳/۲ ابواب الاستئذان والادب باب ماجاء فی إنشاء الشعر، مسنداحمد ۸۶/۵، السنن الکبریٰ للبیهقی ۲۴۰/۱۰، صحیح ابن حبان ۱۵/۷ (مختار)

بے لچک نہ تھی۔ ہر وقت عقل وحکمت اور احکام شریعت کا ذکر نہیں ہوتا تھا۔ بلکہ کبھی کبار دل لگی اور گپ شپ بھی ہوتی تھی۔شعر گوئی ہوتی تھی اور آپ ﷺ منع کرنے کی بجائے سنتے رہتے تھے۔ بلکہ کبھی مسکرا کران کی طبع آزمائی کی تحسین بھی فرماتے تھے۔

ظاہر ہے کہ ان اشعار میں جھوٹ، غیبت، اور فضول گوئی، ہجواور مبالغہ آرائی نہیں ہوتی تھی۔ورنہ آپ ﷺ ضرور منع فرماتے۔ یہ صحابہؓ کی دلداری ان کی تالیف قلبی اور ان کے ساتھ اختلاط اور بے تکلفی تھی جو کہ ایک داعی کے لیے ضروری امر ہے۔گویا آپ ﷺ اپنی مجلسوں میں تحمیض پیدا فرماتے تھے۔تفریح طبع کے امور میں مشغول ہو جاتے تھے۔ جبکہ شعر گوئی عربوں کے لیے فطری طور پر محبوب چیز تھی۔حمضو امجالسکم.

من امر الجاهلية الخ یعنی جاہلیت کے زمانے کے واقعات کا بھی ذکر ہوتا تھا۔ظاہر ہے اس سے تاریخی مباحث چھڑ جاتے تھے۔کہ فلاں واقعہ کب اور کیونکر ہوا۔اور فلاں واقعہ کیسے ہوا۔وتبسم معهم آپ ﷺ کی تحسین کا یہی انداز ہوتا تھا۔آج کل کے مشاعروں کی طرح واہ واہ۔مکرر مکرر اور نعروں سے نہیں۔بس مسکراہٹ سے ہی سمجھ جاتے تھے کہ یہ شعر آپ ﷺ کو پسند آیا ہے اور یہ بات بار خاطر نہیں ہے

(۸) حدّثنا عليّ ابن حجر انبانا شريک عن عبدالملک بن عمير عن أبی سلمة عن أبی هريرة عن النبی ﷺ قال اشعر کلمة تکلّمت بها العرب کلمة لبيد ألا کلّ شئی ما خلا اللّٰه باطل(۱).

ترجمہ: حضرت ابو ہریرہؓ نبی کریم ﷺ سے روایت کرتے ہیں۔کہ آپ ﷺ نے فرمایا کہ عرب کے کلام میں سب سے زیادہ پُر حکمت کلام لبیدؓ کا یہ جملہ ہے

ع **الا کلّ شی ما خلا اللّٰه باطل(۲)**

---

(۱)علامہ بیجوریؒ نے لکھا ہے ويؤخذ منه جوازبل ندب انشاء الشعر واستماعه اذاکان فيه مدح الاسلام والحث علی صدق اللقاء مبايعة النفس للّٰه تعالیٰ (المواهب اللدنية ۱۵۹)(مختار)

(۲)صحيح بخاری ۲/۵۷۳ کتاب المناقب باب ايّام الجاهلية، صحيح مسلم ۲/۲۴۷ کتاب الشعر، جامع ترمذی ۲/۵۷۳ کتاب الاستذان والادب باب ماجاء فی إنشاء الشعر، سنن ابن ماجة ص۲۶۶ کتاب الادب باب الشعر.(مختار)

اشعـر کـلمة اشعر شعور سے ہے جو علم کو کہتے ہیں۔لہٰذا معنی یہ ہوا کہ بڑی عقلمندی اوردانائی کی بات جو عربوں کے ہاں کہی گئی ہے۔وہ جملہ ہے جو حسن اور وقتِ لفظی کے ساتھ ساتھ ایک بہترین اورنفس الامری کو سمیٹے ہوئے ہے۔یہ حدیث اس باب میں دوسرے نمبر پر گزر چکی ہے۔

(۹) حدّثنا أحمد بن منیع ثنا مروان بن معاویة عن عبداللّٰه ابن عبدالرحمٰن الطائفیّ عن عمر وبن الشرید عن أبیه قال کنت ردف رسول اللّٰه ﷺ فانشدته مائة قافیة من قول امیّة بن ابی الصلت کلّما انشدته بیتا قال لی النبی ﷺ هیه حتیّ انشدته مائة یعنی بیتا فقال النبیّ ﷺ ان کا دلیسلم(۱).

ترجمہ: حضرت شریدؓ سے روایت ہے کہ میں نبی کریم ﷺ کے ساتھ سواری پر آپ ﷺ کے پیچھے بیٹھا تھا (اس دوران) میں نے نبی کریم ﷺ کو امیۃ بن الصلت کے ایک سو اشعار سنائے۔جب بھی کوئی شعر سناتا۔نبی کریم ﷺ فرماتے ''ھیـــــہ'' اور سناؤ۔یہاں تک کہ میں نے ایک سو اشعار ان کو سنا دیئے۔تو آپ ﷺ نے فرمایا کہ قریب تھا کہ امیہ مسلمان ہو جائے۔

الشـــریـد شرید بن سوید ثقفیؓ مشہور صحابی ہیں۔طائف میں رہتے تھے۔مدینہ میں بھی رہ چکے ہیں۔بیجوریؒ اور ملا علی قاریؒ نے اصل نام عبدالملک بن سوید لکھا ہے۔لیکن علامہ ابن حجرؒ کے ہاں اصل نام مالک بن سوید ہے۔شرید لقب ہے۔بیعتِ رضوان میں شریک ہو چکے تھے۔

مأة قافیة اس سے یا تو کامل قصیدہ مراد ہے لیکن راجح یہ ہے کہ اس سے مراد سو شعر ہیں اور قافیہ جو جزء ہے کا ذکر کر کے اس کا کل یعنی بیت مراد ہے۔

---

(۱)السنن الکبریٰ للنسائی ۲۴۸/۶ کتاب العمل الیوم واللیلة باب مایقول اذااسترات الخبر، سنن ابن ماجة۲۶۶ کتاب الادب باب الشعر، مصنف ابن ابی شیبة۴۰۴/۸ السنن الکبریٰ للبیهقی ۲۲۶/۱۰ کتاب الشهادة باب لابأس باستماع الحداء ونشید الاعراب(مختار)

غیر مسلم شاعر امیۃ بن صلت کے ایمان افروز کلام کی تحسین: من امیّة بن أبی الصلت یعنی من قصائد امیّة بن أبی الصلت یہ بنوثقیف کے مایہ ناز شعراء میں سے تھا۔ رسول اللہﷺ کا زمانہ پایا۔ مگر ایمان سے محروم رہے۔ حقائق اور عقائد صحیحہ سے اس کے اشعار بھرے پڑے ہیں۔ توحید اور بعثت کی حقانیت دنیا کی بے ثباتی اس کے کلام کی روح ہے حتی کہ نبی کریمﷺ نے اس کے بارے میں فرمایا ''آمن لسانه و کفر قلبه '' یعنی اس کی زبان مؤمن کی زبان ہے لیکن دل کافر ہے۔ تورات اور انجیل کے عالم ہونے کی وجہ سے اس کو آخری نبی کے علامات کا بھی بخوبی علم تھا۔ بلکہ کہا جاتا ہے کہ وہ اسی طمع میں عبادت اور تصوف میں مشغول رہتا مگر جب نبی کریمﷺ کو نبوت بخشی گئی تو وہ حسد کی آگ میں جلنے لگا اور یقین کے باوجود کفر کرنے لگا۔ سب سے پہلے ''باسمک اللهمّ'' کا استعمال بھی اسی سے منقول ہے۔

هیـه: یہ کلمہ اسم فعل ہے اور کسی کلام کے استحسان کے بعد مزید مطالبہ کے لیے بولا جاتا ہے۔ اس لئے اس کا معنی ہے ''زد'' یعنی اور سناؤ۔ اس کی وجہ ہم پہلے لکھ چکے ہیں کہ امیہ کا کلام توحید بعثت اور دیگر عقائد اسلامیہ پر مشتمل ہوتا تھا۔ علاوہ ازیں دقیق معانی اور فصاحت میں بھی ممتاز تھا۔

ان کـاد لیسـلـم ان مخفف من المثقل ہے۔ ضمیر شان محذوف ہے جو اسم انّ ہے یعنی انــه کـاد لیسـلـم۔ قریب تھا کہ وہ مسلمان ہو جائے کیونکہ زبان تو اسلامی ہے۔ بس دل سے انانیت نکل جاتی تو کفر باقی نہ رہتا کہتے ہیں کہ آپﷺ نے اس کا یہ شعر سن کر یہ تبصرہ فرمایا تھا

لک الحمد و النعماء و الفضل ربنا فلا شئی اعلی منک حمداً و لا مجدا

(اے ہمارے رب تیرے لئے ہی تمام تعریفیں ہیں۔ تیری طرف سے تمام نعمتیں اور تیرے لیے ہی سب فضیلتیں ہیں بس تجھ سے زیادہ کوئی تعریف کے قابل ہے نہ تجھ سے کوئی بزرگ تر۔)

(۱۰) حدّثنا إسماعیل بن موسیٰ الفزاریّ و علیّ بن حجر و المعنی واحد قالا أنبانا عبدالرحمان بن أبی الزناد عن هشام بن عروة عن أبیه عن عائشةؓ قالت کان رسول اللهﷺ یضع لحسان بن ثابت منبراً فی المسجد یقوم علیه قائماً یفاخر عن رسول اللهﷺ اوقال ینافح عن رسول اللهﷺ ویقول رسول اللهﷺ إنّ الله یؤید حسّان بروح

القدس ما ینافع او یفاخر عن رسول اللهﷺ(۱)۔

ترجمہ: حضرت عائشہؓ سے روایت ہے کہ نبی کریمﷺ حضرت حسان بن ثابتؓ کے لیے مسجد میں منبر رکھوا دیتے تھے۔ جس پر وہ بیٹھ جاتے تھے اور نبی کریمﷺ کی طرف سے فخریہ اشعار پڑھتے تھے یا (یہ کہا کہ) نبی کریمﷺ کی مدافعت میں (قریش کے اشعار کے جواب میں) اشعار پڑھتے تھے۔ نبی کریمﷺ ایسے موقع پر فرماتے کہ اللہ تعالیٰ روح القدس سے حضرت حسانؓ کی امداد فرماتے ہیں جب تک وہ رسول اللہﷺ کی طرف سے دفاع کرتے ہیں۔ یا یہ کہا کہ ان کی طرف سے مفاخرہ کرتے ہیں۔

حسان بن ثابت اور ان کی جہادی شاعری کی تحسین: حسان بن ثابت ابوالولید حسان بن ثابت انصاری خزرجیؓ مشہور صحابی ہیں۔ شعراء اسلام میں سب سے ممتاز حیثیت کے حامل ہیں۔ حضرت ابو عبیدہؒ کا قول ہے کہ عرب کا اس پر اجماع ہے کہ حسانؓ ''**اشعر اهل المدر**'' ہیں۔ یعنی شہری علاقوں میں رہنے والے شعراء میں سب سے بہترین شاعر ہیں۔ نیز یہ بھی ابو عبیدہؒ کا قول ہے کہ حسانؓ کی فضیلت دیگر شعراء پر تین وجوہ سے ہیں۔

(۱)　وہ جاہلیت میں شاعر الانصار تھے۔

(۲)　زمانہ نبوت میں شاعر رسول اللہﷺ تھے۔

(۳)　اسلام کے زمانہ میں شاعر یمن تھے۔

جب قریش کے بعض منہ پھٹ شاعروں نے نبی کریمﷺ اور مسلمانوں کی ہجو میں اشعار کہے تو لوگوں نے حضرت علیؓ سے جواب کہنے کی درخواست کی۔ انہوں نے کہا کہ نبی کریمﷺ اگر اجازت دیں تو جواب دوں گا تو لوگوں نے نبی کریمﷺ سے حضرت علیؓ کے لیے اجازت طلب کی۔ آپﷺ نے فرمایا

---

(۱) سنن ابی داؤد ۲/۳۳۵ کتاب الادب باب ماجاء فی الشعر، جامع ترمذی ۲/۵۷۳ کتاب الاستئذان والادب باب ماجاء فی الشعر، المستدرک للحاکم ۳/۴۸۷، مسنداحمد ۶/۷۲ (مختار)

کہ جوقوم نبی کریم ﷺ کی تلواروں سے مدد کرتی آئی ہے وہ زبانوں سے اس کی نصرت کیوں نہیں کرتی۔ اس پر حضرت حسانؓ نے حامی بھرلی کہ یہ کام میں کروں گا۔ نبی کریم ﷺ نے دریافت فرمایا کہ تم قریش کی ہجو کیونکر کروگے حالانکہ میں انہی میں سے ہوں اور وہ میرے بھائی بندے ہیں۔ حضرت حسانؓ نے کہا کہ میں آپ ﷺ کو اس طرح ان سے نکال لونگا جیسے گندھے ہوئے آٹے سے بال کو نکالا جاتا ہے۔ چنانچہ آپؓ نے حضرت ابوبکرؓ کے پاس جا کر قریش کے انساب کا پتہ لگایا اور پھر بنوہاشم اور مسلمان خاندانوں کو چھوڑ کر دیگر قریش کی خوب درگت بنائی۔

آپؓ کو بڑی طویل عمر بخشی گئی تھی۔ ایک سوبیس سال تک زندہ رہے۔ اس میں ۶۰ سال کفر میں اور ۶۰ سال اسلام میں گزارے۔ بلکہ ان کے والد، دادا اور پردادا بھی ایک سوبیس سال تک زندہ رہے تھے۔

آپؓ کی تاریخ وفات کے بارے میں مختلف اقوال ہیں۔ ۴۰ھ، یا ۵۰ھ، یا ۵۴ھ کو وفات پائے۔

یضع لحسان یعنی آپ ﷺ کسی کو حکم دے کر مسجد میں منبر رکھواتے تھے تا کہ حسانؓ اس پر چڑھ کر قریش کے اشعار کا مقابلہ کریں۔

او قال ینافح راوی کو شک ہوا ہے کہ حضرت عائشہؓ نے **یفاخر** کا لفظ بولا تھا۔ یا **ینافح**. **یفاخر** معنی تو واضح ہے اور ینافح کا معنی یخاصم اور یدافع ہے۔ یعنی آپؓ قریش کی ہجو کا جواب دیکر نبی کریم ﷺ کی مدافعت فرماتے تھے اور مقابلے میں ہجو کرنے والوں کی ہجو کرتے تھے۔

نبی کریم ﷺ کا یہ اہتمام فخر وتکبر کی بنیاد پر نہ تھا(۱) بلکہ چونکہ کفار سے ہر میدان میں مقابلہ مقصود ہوتا تھا۔ ان کی حوصلہ شکنی اور زبان بندی بھی جہاد کا حصہ تھی۔ اس لئے حضرت حسانؓ کے اس عمل کو جہاد باللسان قرار دیکر آپ ﷺ ان کی حوصلہ افزائی فرماتے تھے اور مدحیہ اشعار کہلواتے تھے۔

یؤیّد حسان بروح القدس روح القدس جبرئیلؑ کا لقب ہے اور اس کی تائید کا معنی یہ ہے کہ وہ حسان بن ثابتؓ کو بلیغ کلام اور منہ توڑ جواب کا الہام فرماتے ہیں۔ نیز دشمنوں اور دیگر آفات وبلیات سے ان کی حفاظت فرماتے ہیں۔

---

(۱) فإنّ التکبر علی الکافرین قربة و علی سائر المتکبرین صدقة(جمع الوسائل ج ۲ ص ۵۶)(مختار)

بہرحال اس حدیث سے یہ بات بخوبی واضح ہوجاتی ہے کہ اشعار کا کہنا ناجائز نہیں بلکہ اگر نبی کریمﷺ کی مدح، کفر کی ہجو، اسلام کی حمایت اور کفر کی مذمت پر مشتمل ہوتو موجب ثواب ہے حتی کہ مسجد میں برسرِ منبر کہنے سے نبی کریمﷺ راضی ہوتے ہیں۔

(۱۱) حدّثنا إسماعیل بن موسیٰ و علی بن حجر قالا ثنا ابن ابی الزناد عن ابیہ عن عروۃ عن عائشةؓ عن النبیﷺ مثله(۱).

ترجمہ: حضرت عائشہؓ کی سابقہ روایت لفظاً و معنیً ایک دوسری سند سے مذکور ہے۔

مثله یعنی انہی الفاظ کو دوسری سند سے بھی روایت کیا گیا ہے۔امام ترمذیؒ محض سابقہ روایت کی تائید وتقویت کے لیے یہ دوسری سند لا رہے ہیں۔

---

(۱)سنن ابی داؤد ۲/ ۳۳۵ کتاب الادب باب ماجاء فی الشعر، جامع ترمذی ۲/ ۵۷۳ کتاب الاستذان والادب باب ماجاء فی الشعر، مسند احمد ۶/ ۷۲، المستدرک للحاکم ۳/ ۴۸۷(مختار)

خلاصۂ باب

نبی کریمﷺ شاعرنہیں تھے۔مگر شعرفہمی کے ملکہ اورادبی ذوق سے بہرہ مند تھے۔خودشعرگوئی کے بارے میں آپﷺ سے مختلف قسم کی روایات مروی ہیں۔چنانچہ بعض روایات میں شعرکوزہر سے بھی بدتر کہا گیا ہے۔قرآن نے تو شعراء کو گمراہوں کے لیڈروں کا خطاب دیا ہے۔ملاعلی قاریؒ نے ایک حدیث بیان کی ہے کہ ابلیس لعین کو جب زمین پراتارا گیا تو اللہ تعالیٰ سے درخواست کی کہ اے رب مجھے بھی ایک قرآن (یعنی کتاب پڑھنے کے لیے) عطا فرما۔تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ ''قرآنک الشعر '' کہ تیرا قرآن شعر ہے۔ایک دفعہ نبی کریمﷺ نے ایک شاعر کو گاتے ہوئے دیکھا تو فرمایا ''خذوا الشیطان اوقال امسکوا الشیطان ''یعنی اس شیطان کوروکو۔اسی طرح مسجد میں اشعار کہنے سے آپﷺ نے منع فرمایا ہے۔

دوسری طرف یہ بھی ثابت ہے کہ صحابہ کرامؓ آپﷺ کی مجلس میں اشعار کہتے تھے۔آپﷺ سنتے تھے تقریراً مسکراتے تھے۔پرحکمت اشعار سنانے کی خودفرمائش بھی کرتے تھے۔اورشعر کہنے والے کو دعائیں دیتے تھے۔جبرئیل امینؑ کی مدد کا یقین دلاتے تھے۔خودمسجد ہی میں بڑے اہتمام کے ساتھ منبر لگوا کرشاعرِ رسولﷺ کو کلام پیش کرنے کی دعوت دیتے تھے۔بلکہ ہجو بالشعر کومؤمن کا جہاد کہا کرتے تھے۔اور کافروں کی تذلیل سے خوش ہوتے تھے۔خودبطور تمثیل واستشہادشعراءِ جاہلیت کا کلام نقل کرتے تھے۔اور کافرشعراء کے اچھے کلام کوحکیمانہ کہہ کراس کی مدح بھی کرتے تھے۔

تصویر کے دونوں رخ دیکھ کر یہ فیصلہ کرنا مشکل نہیں رہتا کہ شعر دوقسم کے ہوتے ہیں۔اول زہر میں بجھے ہوئے اشعارقبیح اشعار،جن میں ناجائزجنسی اوررومانی مضامین،تغزل یامدح وہجو سے متعلق جھوٹ ہو۔یا پھرعصبیت اورقوم پرستی اور اختلافات کوہوا دینے والی رزمیہ باتیں ہوں۔اول الذکر احکام ایسے اشعار سے متعلق ہیں جبکہ مؤخرالذکراحکام ان اشعار کے بارہ میں ہیں۔جوحسن ہوتے ہیں۔ان میں حق کی حمایت،اللہ اوررسول کی مدح سرائی اورخدا کے دشمنوں کی زبان بندی،جھوٹ،مسلمانوں کی اذیت،بیہودہ

اور فحش مضامین سے یہ پاک ہوتے ہیں۔

اس باب میں جتنے بھی احادیث وارد ہوئے ہیں۔اس میں شعر کے ساتھ مثبت تعلق معلوم ہوتا ہے۔اس طرح کہ مستحسن اشعار کی تحسین کی گئی ہے اور اچھے اشعار سنانے کی فرمائش آپ ﷺ نے صحابہ کرام سے فرمائی ہے۔

پھر جو اشعار خود آپ ﷺ کی زبان مبارک پر وارد ہوئے ہیں۔وہ یا تو دوسرے شعراء کے اشعار ہیں جو بطور تمثل آپ ﷺ نے پیش فرمائے ہیں۔یا پھر ایک ایسا کلام آپ ﷺ کی زبان پر بلا قصد وارد ہوا ہے جو اتفاق سے موزوں بھی ہے۔لہٰذا عدم قصد کی وجہ سے وہ شعر کی تعریف میں داخل نہیں ہے اور بعض الفاظ رجز کے قبیلے سے ہے جو نثر میں داخل مانا جاتا ہے۔

(اللهم صلی علی افصح العرب صاحب جوامع الکلم بعدد من تکلم)

۳۸. باب ما ء جاء فی کلام رسول اللہﷺ فی السمر

رسول اللہﷺ کے قصہ سنے اورسنانے کے بیان میں

اس سے قبل نبی کریمﷺ کے مطلق کلام کا ذکر ہوا۔ پھر نبی کریمﷺ کی بشاشت، حسن خلق اور اس کے بعد شعروشاعری کے ساتھ آپﷺ کے کلام کا تعلق بیان ہوا۔اب نبی کریمﷺ کے کلام کے ایک دوسرے صنف مسامرہ کا ذکر ہے جو کہ حدیث اللیل یعنی رات کے وقت یاروں دوستوں یا بیوی بچوں کے ساتھ گپ شپ کو کہتے ہیں۔

یہ سمر سکون میم یاسمر میم مفتوحہ سے ہے۔اوراس کے اصل معنی چاندنی کے ہوتے ہیں چونکہ عرب لوگ عموماً صحراؤں اور خیموں میں رہا کرتے تھے۔اس لئے ان کی رات کی مجلسیں عموماً چاند کی روشنی میں منعقد ہوتی تھیں۔آج کل بھی دیہاتی پٹھان لوگ گاؤں سے باہر کشادہ فضا میں گپ شپ کیلئے نکلتے ہیں کیونکہ چاند کی روشنی میں یہ مجالس بہت دلچسپ اور پر لطف ہوتی ہیں۔اور چونکہ رات یا چاندنی کا وقت اس مخصوص قصہ گوئی اور گپ شپ کیلئے ظرف زمان ہوتا ہے۔اس لئے ظرفیت کے اس علاقہ کی بنا پر سمر کا اطلاق خودان مجلسوں پر ہونے لگا۔

رات کی قصہ گوئی اورحدیث اللیل کی کراہیت میں تطبیق: اس باب میں یہ بیان کیا جارہا ہے کہ نبی کریمﷺ نے رات کو باتیں کی ہیں اوردوسروں سے سنی ہیں۔لہٰذا یہ جائز ہے۔لیکن یہاں یہ اشکال ضرور وارد ہوتا ہے کہ بعض روایات میں حدیث اللیل کی کراہت بھی مذکور ہے۔حدیث میں آتا ہے کہ **و کان(النبیﷺ)یکرہ النوم قبلھا(یعنی قبل صلوٰۃ العشاء) والحدیث بعدھا**(۱).

تو نبی کریمﷺ نے خوداس کا ارتکاب کیوں کیا؟اس کا جواب یہ ہے کہ وہ مسامرہ ممنوع ہے جو خرافات لغو باتوں،فضول گوئی یا غیر شرعی اور مذموم اقوال وافعال پر مشتمل ہو۔یا پھراس حد تک اس میں منہمک ہوجائے کہ نیند کا سارا وقت اس میں صرف ہو۔اور پھر نماز تہجد کیلئے اٹھنا تو درکنار صبح کی نماز کیلئے اٹھنے میں بھی تکلیف ہو۔دن کو تعلیم وتعلم اور دوسرے واجبات کیلئے رکاوٹ بنے۔چونکہ اس طرح کی قصہ

(۱)متفق علیہ بحوالہ مشکوٰۃ جلد۱صفحہ۶۲

گوئی دینی امور میں حرج کا باعث ہے اس لئے ممنوع ہے۔ بہتر صورت یہ ہے کہ رات کو جلدی سو یا جائے اور صبح سویرے اٹھا جائے۔ یہ صحت، دماغ اور دیگر مقاصد کیلئے بہت مفید ہے۔ بعض دیہاتوں میں جہاں رات کو کھانا کھانے کے بعد جلد ہی نماز عشاء پڑھی جاتی ہے اور پھر لوگ سو جاتے ہیں۔ وہاں لوگوں کی صحتیں قابل رشک ہوتی ہیں۔ صبح سویرے اٹھنا بھی مشکل نہیں ہوتا۔ اس کے برعکس نئی تہذیب وتمدن کے مطابق لوگ ساری رات سینماؤں، کلبوں اور بیٹھکوں میں جاگ کر گزار دیتے ہیں۔ اور صبح قریب ہوتے ہی سو جاتے ہیں۔ پھر دوپہر دس گیارہ بجے تک نیند پوری نہیں ہوتی۔ اس سے ایک طرف تو ترک فرائض کے سبب سارا دن نحوست کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ علاوہ ازیں جسمانی طور پر بھی بشاشت، نشاط اور تازگی مفقود ہوتی ہے۔

<u>سمر میں اعتدال:</u> ان تمام حکمتوں کے سبب رسول اللہﷺ نے سمر سے منع فرمایا۔ لہٰذا وہ ساری گپ شپ جو تھکاوٹ اور ملال کا سبب ہوگی اور دین واخلاق کیلئے مضر ہوگی جائز نہیں۔ لیکن دراصل اس باب میں نفس جواز کی طرف اشارہ ہے۔ اور اس کی صورت یہ ہے کہ کوئی شخص تھوڑی دیر کیلئے اپنی بیوی بچوں کے ساتھ ان کی دلجوئی کیلئے گپ شپ اور دل لگی کرے۔ یا دوست آپس میں عمومی گفتگو یعنی غیر باطل کلام کے ذریعے گپ شپ لگائیں تو کوئی حرج نہیں۔ علاوہ ازیں دینی مجالس اور مذہبی تقاریر پر بھی مسامرہ کا اطلاق نہیں ہوگا۔ اگر چہ وہ جلسے جو رات گئے تک منعقد ہوتے ہیں مضرات سے خالی نہیں کیونکہ اس طرح آدمی دن کے وقت کسی کام کا نہیں رہتا۔ بلکہ تجربہ یہ ہے کہ اگر ایک رات جاگ کر کسی جلسے اور پھر خصوصاً سیاسی جلسے میں گزار دی جائے تو دس دن تک دماغ کو اعتدال نصیب نہیں ہوتا اور طبیعت نہیں کھلتی۔ لہٰذا افراط تو بہر حال ممنوع ہے۔ لیکن حدود کے اندر اور شرعی پابندیوں کے اندر سونے سے قبل خوش طبعی کیلئے باتیں کرنا جائز ہے بلکہ بعض علماء نے حسن معاشرت کے انداز میں بیوی یا دیگر گھر والوں کی تفریح طبع کیلئے اسے مسنون کہا ہے۔ اس بارے میں دو حدیث اس باب میں بیان کئے جاتے ہیں۔ جن میں اس بات پر تنبیہ ہے کہ نبی کریمﷺ کی زندگی میں رہبانیت اور کلّی طور پر دنیا سے انقطاع نہیں بلکہ آپﷺ کبھی کبھی گپ شپ بھی لگایا کرتے تھے۔

(۱) حدّثنا الحسن بن صبّاح البزّار ثنا أبوالنصر ثنا أبوعقيل الثقفيّ عبداللّٰه بن عقيل عن مجالد عن الشعبی عن مسروق عن عائشة قالت حدّث رسول اللّٰهﷺ ذات (۱) ليلة نساء ه حديثا فقالت امرءة منهنّ كان الحديث حديث خرافة فقال أتدرون ما خرافة إنّ خرافة كان رجلا من عذرة أشرته الجنّ فی الجاهليّة فمكث فيهم دهرا ثمّ ردّوه إلى الإنس فكان يحدّث الناس بما رأى فيهم من الاعاجيب فقال الناس حديث خرافة(۲).

ترجمہ: حضرت عائشہ رضی اللہ عنہ کہتی ہیں کہ ایک رات کو نبیﷺ نے اپنی بیویوں کوایک قصہ سنایا۔ان بیبیوں میں سے ایک نے کہا کہ یہ قصہ تو حیرت اور چاشنی میں بالکل خرافہ کی باتوں جیسا ہے۔ نبی کریمﷺ نے فرمایا کہ کیا تم جانتی ہو کہ خرافہ کون تھا (پھر بتاتے ہوئے فرمایا) خرافہ بنوعذرہ کا ایک آدمی تھا۔ جسے جاہلیت کے زمانہ میں جنات پکڑ کر لے گئے تھے۔ایک عرصہ تک وہ جنات کے درمیان ٹھہرا رہا۔پھر جنات نے اسے لوگوں میں واپس کردیا۔پھر وہ لوگوں کو وہ عجیب وغریب باتیں جو اس نے جنات میں دیکھی تھیں سنایا کرتا تھا۔اسی وجہ سے لوگ (کسی عجیب بات کو سن کر) کہتے ہیں کہ یہ خرافہ کی بات ہے۔

حدّث رسول اللّٰهﷺ الخ اس حدیث میں جس واقعہ کی طرف اشارہ ہے وہ یا تو امم ماضیہ کا کوئی قصہ تھا یا جنت دوزخ یا دیگر اقوام وملل کا کوئی دلچسپ واقعہ تھا۔اس مجلس میں بہت سی بیبیاں بیٹھی ہوتی تھیں۔اس سے معلوم ہوتا ہے کہ آپﷺ ساری بیویوں کی دلجوئی بھی فرمایا کرتے تھے اور اجتماعی طور پر بھی ان کے ساتھ نشست وبرخاست اور گپ شپ لگایا کرتے تھے۔جس طرح کہ اس موقع پر ساری

(۱) عربی لغت میں ذات کے متعدد معانی ہیں (۱) ذات بمعنی حال (۲) بمعنی شب وروز کا کوئی سا لحہ (۳) بمعنی انسان (۴) بمعنی نفس (۵) بمعنی ارادہ وعزائم۔ یہاں پر دوسرا معنی یعنی دن ورات میں سے کوئی لحہ (مختار)

(۲) مسنداحمد ۱۵۷/۶

بیویاں اس قصہ کو سن رہی تھی۔

<u>خرافۃ اوراس کی باتیں:</u> کان الحدیث حدیث خرافة ان ازواج مطہرات میں سے ایک نے کہا کہ یہ قصہ تو خرافہ کے قصوں کی طرح معلوم ہوتا ہے اور خرافہ کے قصوں سے تشبیہ محض عجیب اور حیران کن ہونے کے لحاظ سے ہے۔ دلچسپ وعجیب اور غیر مانوس بات کو خرافہ کی بات سے تشبیہ دے سکتے ہیں کیونکہ خرافہ ایسی باتیں کیا کرتا تھا جو کہ انسانوں کی باتیں نہ تھیں بلکہ عجیب اور بے سروپا باتیں ہوتی تھیں۔ تو یہ بی بی بھی آپ ﷺ کی باتوں کو محض عجیب ہونے کے سبب خرافہ کی بات سے تشبیہ دے رہی ہیں۔ جھوٹ ،افسانویت، یا بیہودگی میں تشبیہ مقصود نہیں ہے کیونکہ نبی کریم ﷺ کا کلام ان امور سے پاک ہوتا تھا۔

<u>عورتوں کو صیغۂ مذکر سے خطاب:</u> اتدرون ماخرافة الخ نبی کریم ﷺ نے فرمایا کہ تم نے تشبیہ تو دی لیکن کیا تمہیں خرافہ کا کچھ پتہ بھی ہے کہ خرافہ کون تھا۔ بیبیوں کو خطاب کی وجہ سے یہاں أتدرین چاہیے تھا۔ لیکن عورتوں کو مردوں کے صیغہ تخاطب کے ساتھ خطاب کیا جو کبھی کبھی کیا جاتا ہے۔ قرآن مجید اور حدیث میں اس کی نظیریں موجود ہیں۔ مجد و شرف اور اعزاز کے طور پر عورتوں کو مردوں کے خطاب سے بھی پکارا جاتا ہے۔ یہ کبھی تو تغلیب کی وجہ سے کیا جاتا ہے یعنی عورتوں اور مردوں کی مخلوط جماعت کو مخاطب کیا جاتا ہے اور مردوں کو تغلیب دینے کی بناء پر مذکر کا صیغہ لایا جاتا ہے۔ اور یہ نہ بھی ہو تو صرف عورتوں کو بھی اعزاز واکرام کے طور پر اس قسم کا خطاب ناجائز نہیں۔ اس بات پر تنبیہ کیلئے کہ عورتیں اگر چہ ناقصات العقل والدّین ہیں۔ لیکن تم مخاطب کامل العقل والدّین ہو۔ اور اس مقام پر تو خصوصی طور پر یہ بات زیادہ ملحوظ ہوگی کیونکہ عائشہ رضی اللہ عنہ وغیرہا کو کون ناقصۃ العقل کہہ سکتا ہے؟ تو آپ نے شرف، کمال علم اور شرف ملازمہ کیوجہ سے ان کو مردوں کا درجہ دیگر مردوں کے صیغہ سے مخاطب کیا ہے۔ اور یہ احتمال بھی ہے کہ ان عورتوں کی جماعت کی تاویل اشخاص سے کر کے آپ ﷺ نے جمع مذکر کا صیغہ استعمال فرمایا۔ قرآن میں بھی اس کی مثالیں ملتی ہیں۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے"و کانت من القانتین" اس میں حضرت مریم علیہ السلام کو قانتات کی بجائے قانتین سے گنا گیا ہے۔ دوسری جگہ ازواج مطہرات کو خطاب کرتے ہوئے فرمایا انّما یرید اللّٰہ لیذھب عنکم الرجس أھل البیت ویطھّرکم تطھیرا حالانکہ یہاں پر عنکن اور یطھّرکن

چاہیے تھا۔سورۃ القصص میں موسیٰ علیہ السلام کی ماں کے بارے میں فرمایا ان کادت لتبدی به لو لا ان ربطنا علی قلبها لتکون من المؤمنین.(الآیة)

چنانچہ مؤمنات کی جگہ مؤمنین کا ذکر ہوا۔ایک شاعر اپنی بیویوں کو مخاطب کر کے کہتا ہے کہ

ع ولو شئت طلقت النساء سواکم. اگر میں چاہوں تو تمہارے سوا سب عورتوں کو چھوڑ دوں

حالانکہ یہاں سواکن چاہیئے تھا(۱)۔

<u>قبیلہ عذرہ:</u> من عذرہ الخ عذرہ یمن کے ایک قبیلہ کا مقام ہے۔اس قبیلہ کی عورتیں اپنے مردوں کے ساتھ بہت محبت کرتی تھیں۔ایک مؤرخ لکھتا ہے کہ میں عذرہ قبیلہ میں گیا تو وہاں کوئی بوڑھا مجھے نظر نہ آیا۔مجھے تعجب ہوا میں نے پوچھا تو لوگ کہنے لگے کہ ہماری بیویاں بہت حسین وجمیل ہیں اور خاوندوں کے ساتھ ایسی محبت سے پیش آتی ہیں کہ آدمی کو سرے سے بوڑھا نہیں ہونے دیتیں۔حقیقت بھی یہی ہے کہ بیوی اگر ٹھیک نہ ہو تو مرد کو بہت جلد بوڑھا کر دیتی ہے۔جب پریشانیاں زیادہ ہوتی ہیں تو بڑھاپا جلدی آتا ہے(۲)۔

عربوں میں محاورہ کے طور پر یہ بات بھی مستعمل ہے کہ ''فی العذر معذرۃ''اس میں بھی عذر سے یہی عذرہ کا قبیلہ مراد ہے۔اور مطلب یہ ہے کہ اگر کوئی بنوعذرہ میں کہیں دل لگا بیٹھے تو وہ قابل ملامت نہیں بلکہ افراط حسن اور کثرۃ خلوص کے باعث معذور سمجھا جائے گا۔قصیدہ بردہ کے ایک شعر میں

---

(۱)اس طرح حضرت موسیٰ علیہ السلام مصر آتے ہوئے کوہ طور آئے۔تو اپنی بیوی سے فرمایا کہ امکثوا إنّی آنست ناراً لعلی آتیکم بخبرٍ (الآیة) حالانکہ امکثی اور آتیک کہنا چاہیے تھا۔بخاری شریف میں آتا ہے إنّ بعض ازواج النّبیّ ﷺ قلن للنّبیّ ﷺ اینا أسرع طوقاقال أطولکن یداً فاخذوا قصبةً یذرعونها فکانت سورۃ الحدیث . حالانکہ یہاں فاخذن قصبةً یذرعن ہونا چاہیے تھا۔(۱۲اصلاح الدین)

(۲)قصیدہ بردہ کے شارحین نے اس حکایت کو قدرے تغیر کے ساتھ تحریر کیا ہے۔وہ لکھتے ہیں کہ اس قبیلے کے لوگ عموماً جوانی کے ایام میں فرط عشق کی وجہ سے مرجاتے تھے تو ایک عذری سے اس کے متعلق پوچھا گیا۔اس نے جواباً کہا''فی قلوبنا خفة و فی نساء ناعفة''(شیخ زادہ) یعنی ہمارے دلوں میں وفور عشق کی وجہ سے میلان زیادہ ہوتا ہے۔اور کمال حسن کے باوجود ہماری عورتیں فحش وزنا سے عفیف اور پاکدامن رہتی ہیں۔

(شرح عمر الخرپوتی وشرح شیخ زادہ علی البردہ ص۲۴)(اصلاح الدین)

علامہ شرف الدین محمد بن سعید بوصیریؒ نے عذرہ قبیلہ کی اسی محبت کی طرف اشارہ فرمایا ہے(۱)۔

أسـرتـه الـجـن الخ جنات کا وجود حق ہے۔ جاہلیت کے زمانے میں جنات کا غلبہ زیادہ ہوتا تھا۔ اسلام کے بعد ان کے فاسد اثرات کا سلسلہ بہت حد تک رک گیا۔ اگر چہ اب بھی کچھ کچھ باقی ہے لیکن اب وہ اسلامی مارشل لاء کے تحت ہیں تا کہ وہ اسلامی نظریات وتعلیمات میں گڑ بڑ نہ کرسکیں۔ اور چونکہ اللہ تعالیٰ نے ہر قسم کی تدلیس وتلبیس سے اس دین حق کو محفوظ رکھنا تھا۔ اس لئے اللہ تعالیٰ نے جنات پر پہرے بٹھا دیئے۔ سورۃ الجن میں اس پابندی کا تفصیلی ذکر موجود ہے۔

بـمـا رأیٰ فیهـم من الاعا جیب الخ جنات سے چھٹکارا حاصل کرنے کے بعد وہ وہاں کے عجیب مشاہدات مرچ مصالحہ لگا کر بیان کرتا تھا۔ اس قسم کی عجیب روایات راوی کے نام کی وجہ سے خرافات کہلانے لگیں۔ **فـقـال الـنـاس حدیث خرافة الخ** یعنی پھر جو بے سند لایعنی اور فضول سی باتیں ہوتی تھیں۔ لوگ کہتے کہ یہ خرافہ کی بات ہے۔ گویا تشبیہ کے سبب حیرت انگیز واقعات پر اس کا اطلاق ہونے لگا۔ مثلاً اگر کوئی کہے کہ میں نے ایک گھوڑا دیکھا جس کے دس کان بیس پاؤں اور پانچ دم تھے۔ میں اس پر سوار ہو گیا وغیرہ وغیرہ۔

ابوالعلاء مصری عظیم شاعر گزرے ہیں متقدمین میں علم ادب کے امام ہیں۔ مادرزاد اندھے تھے۔ کہتے ہیں کہ وہ ملحد بھی تھا اور آخرت کا منکر تھا۔ اپنی بیوی کو مخاطب کر کے وہ کہتے ہیں۔

حیاة ثم موت ثم بعث　　　حدیث خرافة یا امّ عمرو

---

(۱) فرماتے ہیں **یالائمی فی الهویٰ العذری معذرة　　منیّ الیک ولوانصفت لم تلم**

ترجمہ: ای عذری محبت میں مجھے ملامت کرنے والے میری طرف سے تجھے عذر پیش ہے اور اگر تو انصاف کرتا تو مجھے ملامت نہ کرتا۔

قصیدہ بردہ کے شارحین نے لکھا ہے کہ اصمعیؒ اس قبیلہ کے بارے میں جانتے تھے۔ اس کی روایت کے بارے میں عذرہ کا ایک عاشق اس وقت مر گیا جب اس نے محبوبہ کے قافلے کی گرد دیکھی۔ مولانا افتخار علی دیوبندی عطر الوردہ میں لکھتے ہیں کہ بنو عذرہ کی عمریں فرط عشق کی بناء پر تیس سال سے تجاوز نہیں کرتیں اور جب ایک عذری سے اس بارے میں دریافت کیا گیا تو وہ کہنے لگا فی قلوبنا رقة و فی نساء ناجمال و عفة ترجمہ: ہمارے دلوں میں رقت اور عورتوں میں خوبصورتی اور پاکدامنی ہے۔ (اصلاح الدین)

یعنی کیا زندگی اس کے بعد موت اور پھر دوبارہ زندہ ہونا حق ہے۔اے ام عمرو یہ تو خرافہ والی بات ہے یعنی بے سروپا اور غیر متوزان سی بات ہے۔بعد میں خرافہ کے نام سے مشتق افعال بھی استعمال ہونے لگے اور اسی وجہ سے اس مادے میں دماغی عدم توازن کا مفہوم پایا جاتا ہے کہتے ہیں کہ خَرِفَ الرجُلُ جب وہ الٹی سیدھی اور بے سروپا باتیں کرنے لگے(۱)۔

اس کے بعد حدیث ام زرع کا بیان ہے۔

<u>حدیث ام زرعٍ:</u> یہ حدیث اس باب کی دوسری حدیث ہے اور اس میں بھی رات کو قصہ گوئی کا ذکر ہے مگر اس حدیث کو مستقل عنوان دیا گیا ہے کیونکہ اس میں گیارہ عورتوں کا اپنے شوہروں کے بارے میں بیان ہے خوب فصیح و بلیغ انداز سے وہ شوہروں کے ساتھ انداز معاشرت کا اظہار کرتی ہیں اور خصوصا آخری عورت ام زرع کا بیان نہایت اہم ہے اس حدیث پر مستقل کتابیں بھی لکھی گئی ہیں اور شارحین نے اپنے اپنے ذوق کے مطابق اسکی تشریحات کی ہیں۔عربی ادب اور لغت کے اعتبار سے اسمیں بہت اہم مواد موجود ہے۔ گیارہ عورتوں میں سے آخری عورت ام زرع کا بیان چونکہ نہایت مفصل اور جامع مانع ہے پھر نبی کریم ﷺ نے بھی حضرت عائشہ رضی اللہ عنہ کی تشبیہ ام زرع سے دی تھی۔یعنی ابوزرع کے ہاں ام زرع کا جو مقام تھا اور جو حیثیت تھی اسی طرح کی محبت آپ ﷺ کو حضرت عائشہ رضی اللہ سے تھی تو اس خصوصیت اور اہتمام کی

(۱) شیخ عبدالجوادالدومیؒ نے حدیث مبارک سے عشاء کے بعد اپنے اہل وعیال سے اچھی اور دلجوئی کی باتیں کرنے اور دل لگی کرنے کے جواز کا استدلال کرتے ہوئے لکھا ہے ویؤخذ من الحدیث حسن معاشر الرجل لاھله وسمرة معھم واخبارہ لھم بالخفیف من الامور وقصته علیھم القصص المفیدة اقتداء به ﷺ فإنّ التشبه باھل الفلاح فلاح(الاتحافات۲۹۸،۲۹۹)البتہ جن روایات میں عشاء کے بعد قصہ گوئی اور گفتگو سے منع وارد ہے۔اس سے مراد بیہودہ کلام ہے۔علامہ بیجوریؒ نے لکھا ہے والنھی الوارد عن الکلام بعدالعشاء محمول علی مالایعنی عن الکلام بعدالعشاء ولذالک قال فی المنھج وکرہ نوم قبلھا وحدیث بعدھا الافی خیر(المواھب اللدنیة ۱۶۲) اور علامہ ملاعلی قاریؒ نے دونوں متعارض روایات کے مابین تطبیق کرتے ہوئے لکھا ہے۔فالنھی الوارد محمول علی کلام الدنیا مالایعنی فی العبقیٰ والحکمة ان یکون خاتمة فعله وقوله بالحسنیٰ ومکفرة لما وقع له فیما مضیٰ(جمع الوسائل ۵۸/۲)(مختار)

وجہ سے اس کے نام سے اس حدیث کو معنون کر دیا گیا ورنہ یہاں تو گیارہ عورتیں ہیں سب نے شوہروں کا بیان کیا ہے۔

قطعی طور پر ان عورتوں کے نام معلوم نہیں ہو سکے اگر چہ بعض مورخین نے ان کے ناموں اور شجروں پر بحث کی ہے کہ یہ عورت فلاں قبیلے کی فلاں خاتون تھیں۔ خطیب بغدادی تو ان کے اسماء کا مسئلہ مھّمات میں سے شمار کرتے ہیں جنہوں نے آٹھ عورتوں کے ناموں کی تعین کی ہے ام زرع کا نام عاتکہ بتایا ہے عرب صحرائی اور خانہ بدوش زندگی گزارنے کے عادی تھے یہ عورت بھی ایک دیہاتی عورت تھی جس کا تعلق مکہ، یمن یا جمار کے دیہاتی علاقوں سے تھا۔ مزید تفصیل آگے آرہی ہے۔

(۲) حدّثنا علیّ بن حجر قال أنا عیسٰی بن یونس عن هشام ابن عروة عن أخیه عبداللّٰه بن عروة عن عروة عن عائشةؓ قالت جلست احدیٰ عشرة امرأةً فتعاهدن و تعاقدن ان لاّ یکتمن من أخبار ازواجهنّ شیئاً (۱) فقالت الاولی زوجی لحم جمل غث علی راس جبل وعرٍ لا سهلٍ فیرتقیٰ ولاسمینٌ فینتقیٰ (۲) قالت الثانیة زوجی لا ابثّ خبره إنّی أخاف ان لا اذره ان اذکره اذکر عجره وبجره (۳) قالت الثالثة زوجی العشنق ان انطق أُطلق فان اسکت اعلّق (۴) قالت الرابعة زوجی کلیل تهامة لاحرّ ولا قرّ ولامخافة ولاسامة (۵) قالت الخامسة زوجی ان دخل فهدوان خرج اسد ولایسال عمّا عهد (۶) قالت السادسة زوجی ان اکل لفّ وان شرب اشتّف وان اضطجع التّف ولایولج الکفّ لیعلم البث (۷) قالت السابعة زوجی عیا یاء اوغیایاً طباقاء کل داء له داءٌ شجّک او فلّک اوجمع کلّالک (۸) قالت الثامنة زوجی المسُّ مسّ ارنب والریح ریح زرنب (۹) قالت التاسعة زوجی رفیع العماد عظیم الرّماد طویل

النّجاد قریب البیت من النّاد(۱۰) قالت العاشرۃزوجی مالک وما مالک مالک خیرٌ من ذلک لہ ابل کثیرات المبارک قلیلات المسارح اذا سمعن صوت المزھر ایقنَّ إنّھنّ ھوالک (۱۱)قالت الحادیۃعشرۃ زوجی أبوزرع و ما أبو زرع اناس من حلیّ اذنیّ وملاءمن شحم عضدیّ وبحجنی فبجحت إلیّ نفسی وجدنی فی اھل غنیمۃ بشقٍ فجعلنی فی اھل صھیل واطیط ودآئس ومنقٍ فعندہ اقول فلا اقبّح وارقد فاتصبّح واشرب فاتقمّح امّ أبی زرع فما امّ أبی زرع عکومھا رِداح وبیتھا فساح ابن أبی زرع فما ابن أبی زرع مضجعہ کمسل شطبۃ و تشبعہ ذراع الجفرۃ بنت أبی زرع فما بنت أبی زرع طوع ابیھا وطوع امّھا وملاکسائھا و غیظ جارتھا جاریۃ أبی زرع فما جاریۃ أبی زرع لاتبثّ حدیثنا تبثیثا ولاتنقث میرتنا تنقیثا ولا تملأ بیتنا تغشیشا قالت خرج أبوزرع والاوطاب تمغض فلقی امراۃً معھا ولدان لھا کالفھدین یلعبان من تحت خصرھابرمّانتین فطلّقنی فنکحتُ بعدہ رجلا سریّارکب شریّا واخذ خطّیّا واراح علّی نعما ثریّا واعطانی من کلّ رائحۃ زوجا وقال کلی امّ زرع و میری اھلک فلو جمعت کلّ شئی اعطانیہ مابلغ اصغرانیۃ أبی زرع قالت عائشۃ فقال لی رسول اللّٰہﷺ کنت لک کأبی زرع لامّ زرع(۱).

ترجمہ: حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کہتی ہیں کہ گیارہ عورتیں اکٹھی بیٹھ گئیں اور اپنے درمیان اس معاہدہ اور عہد پر اتفاق کرلیا کہ وہ اپنے خاوندوں کے حالات میں سے کچھ بھی نہیں چھپائیں گی (بلکہ ٹھیک ٹھیک بیان کریں گی) حضرت عائشہ رضی اللہ عنہ

(۱)صحیح بخاری ۲/۷۷۹ کتاب النکاح باب حسن المعاشرہ مع الاھل، السنن الکبریٰ للنسائی ۶/۳۵۴ کتاب عشرۃ النساء ابواب حقوق الزوج باب شکر المرأۃ لزوجھا(مختار)

کہتی ہیں کہ تب (پہلی عورت بولی) کہ میرا خاوند کمزور ناکارہ اونٹ کے گوشت جیسا ہے (اور وہ بھی) پہاڑ کی چوٹی پر رکھا ہو نہ اس پہاڑ کا راستہ ہموار اور آسان ہے تاکہ اس پر چڑھ کر گوشت سے مستفید ہو سکیں اور نہ گوشت چربی والا ہے تاکہ (رغبت کی وجہ سے) اسے کھانے کیلئے چنا جائے (یا پہاڑ کی چوٹی سے اتار کر کھایا جائے)۔ (دوسری کہنے لگی) کہ میں اپنے خاوند کی خبریں فاش نہیں کرتی میں ڈرتی ہوں کہ میں اسے (خاوند یا اس کی بات کو) نہ چھوڑ سکوں گی۔ اگر میں اس کا ذکر کروں گی تو اس کے ظاہری اور باطن عیوب سب کچھ ہی ذکر کروں گی۔ (تیسری بولی) میرا خاوند لمبا تڑنگا آدمی ہے اگر میں بولتی ہوں تو مجھے طلاق دی جاتی ہے۔ اور اگر چپ رہتی ہوں تو (ضروریات زندگی سے محروم رہ کر گویا) معلق رہتی ہوں۔ (چوتھی بولی) میرا خاوند تہامہ کی رات کی طرح معتدل مزاج ہے نہ اس میں گرمی زیادہ ہے نہ ٹھنڈک۔ نہ اس سے خوف لاحق ہوتا ہے نہ دل اچاٹ ہوتا ہے۔ (پانچویں بولی) میرا خاوند جب گھر میں داخل ہوتا ہے تو چیتا بن جاتا ہے اور جب باہر جاتا ہے تو شیر بن جاتا ہے۔ اور (گھر میں) جو کام اس سے متعلق ہوتا ہے اس کا نہیں پوچھتا اگر سوتا ہے تو (کپڑے یا لحاف میں) سمٹ کر سو جاتا ہے اور (میری طرف) ہاتھ بھی نہیں بڑھاتا تاکہ اسے میری کچھ پراگندگی معلوم ہو سکے۔ (چھٹی بولی) کہ میرا خاوند اگر کھاتا ہے تو سب نمٹا دیتا ہے۔ اور جب پیتا ہے تو سب چڑھا دیتا ہے۔ اور جب سوتا ہے تو اکیلے ہی کپڑے میں لپٹ جاتا ہے۔ میری طرف ہاتھ بھی نہیں بڑھاتا۔ جسے میری پراگندگی معلوم ہو سکے۔ ساتویں بولی کہ میرا شوہر سست و درماندہ یا نامرد ہے یا یوں کہا کہ احمق وگمراہ ہے بھاری بھرکم (یا انتہائی سردمہر) ہے ہر بیماری اس میں موجود ہے (جب مارنے پر آئے) تو تیرا سر پھوڑ دے یا ہڈیاں توڑ دے یا دونوں کام کر ڈالے۔ (آٹھویں بولی) میرا خاوند چھونے میں خرگوش کی طرح نرم اندام ہے اور اس کی

خوشبو(خوشبودار بوٹی) زرنب جیسی ہے۔(نویں بولی) میرا خاوند(حسب وشرافت میں) بلند ستونوں والا(سردار) ہے بہت زیادہ راکھ کا مالک (سخی) ہے (تلوار کی) لمبی کاٹھی والا ہے۔ اس کا مکان مجلس (قومی جائے مشاورت) کے قریب ہے۔(دسویں بولی) میرا خاوند مالک(نامی شخص) ہے اور مالک کیا ہے؟ وہ اس (نویں عورت کے شوہر سے یا مذکورہ تمام شوہروں سے یا میری طرف سے آگے بیان ہونے والی صفات) سے بہتر ہے اس کے اونٹ ہیں جو اکثر مکان کے قریب بندے ہوئے اور کم ہی چراگاہ میں چرنے والے ہیں جب وہ اونٹ ساز کی آواز سن لیتے ہیں تو ان کو یقین ہوجاتا ہے کہ وہ ذبح کئے جانے والے ہیں۔ (گیارویں بولی) میرا خاوند ابوزرع تھا ابوزرع کیا تھا؟(ایک عظیم شخص تھا) اس نے زیوروں سے (پہنا کر) میرے دونوں کان جھکادیئے تھے اور میرے دونوں بازو چربی سے بھر دیئے تھے مجھے اتنا خوش وخرم رکھا کہ میں خودکو پسند کرنے لگی۔اس نے مجھے جفاکش بکریوں والے(غریب) خاندان میں پایا جو تنگی کے دن رات بسر کرتا تھا پھر وہ مجھے ایسے خوشحال خاندان میں لے آیا جہاں ہنہناتے گھوڑے، بلبلاتے اونٹ، فصل کو گاہنے والے بیل اور اسے صاف کرنے والے نوکر چاکر(بکثرت) تھے(ان کی ناز برداری کی وجہ سے) میں ان کے ہاں جو بھی کہتی مجھے کوئی برا نہیں کہتا تھا۔ میں سوتی تو دن چڑھے تک سوتی رہتی تھی، پیتی تو خوب سیر ہونے کے بعد بھی بتکلف پیتی تھی۔ (میری ساس) ابوزرع کی ماں بھلا وہ کون تھی اس کے کھانے کے بڑے برتن ہمیشہ بھرے رہتے تھے۔ اس کا گھر نہایت وسیع تھا۔ ابوزرع کا بیٹا وہ کون تھا (دبلا پتلا نوجوان) کہ اس کے سونے کی جگہ باریک چھڑی کی طرح تھی بکری کے بچے کا ایک دست اس کے پیٹ بھرنے کے لئے کافی ہے۔ابوزرع کی بیٹی بھلا وہ کون تھی؟ وہ اپنے باپ کی تابعدار اور اپنی ماں کی فرمانبردار تھی اور (موٹائی کے باعث) اپنے

کپڑوں کو بھرنے والی تھی (حسن و جمال اور کمال کی وجہ سے) اپنی سوکن کو غیظ وغضب میں مبتلا کرنے والی تھی۔ ابوزرع کی باندی کیا تھا وہ ہماری باتیں گھر کے باہر ظاہر نہیں کرتی تھی اور کھانے کی اشیاء میں ہیر پھیر نہیں کرتی تھی۔ ہمارے گھر کو (چغلخوری کر کے یا گندگی پھیلا کر) کھوٹ سے نہیں بھرتی تھی۔

ام زرع بولی کہ (لطف کی ایسی حالت میں) ایک دن ابوزرع (صبح سویرے) جبکہ دودھ کے برتن بلوئے جا رہے تھے۔ گھر سے نکلا تو ایک عورت سے ملا جس کے ساتھ چیتوں جیسے (پھرتیلے) دو بچے تھے، دونوں بچے (لیٹی ہوئی) ماں کے پہلو کے نیچے سے دو انار لڑھکا کر آپس میں کھیل رہے تھے (یا اس کے انار جیسے پستانوں سے کھیل رہے تھے) تو (اس عورت کو دل دے کر) ابوزرع نے مجھے طلاق دیدی اور اس عورت سے نکاح کر لیا (اس سے طلاق لے کر) میں نے اس کے بعد ایک سردار شخص سے نکاح کیا جو ایک تیز رو گھوڑے پر شہسواری کرتا تھا اور نیزے کا حامل (جنگجو) تھا۔ اس نے مجھے بہت جانور دیکر مالا مال کر دیا اور ہر شام کو گھر آنے والے (اونٹ، بیل، بھیڑ اور بکریوں) سے ڈبل ڈبل مہیا کر دیئے۔ مجھے (اجازت دیتے ہوئے) کہا کہ اے ام زرع خود بھی کھاؤ اور اپنے میکے کو بھی کھلاؤ۔ مگر پھر بھی اگر وہ تمام مال اور نعمتیں جو اس شخص نے مجھے دے دیں جمع کر دوں تو بھی ابوزرع کے چھوٹے سے چھوٹے برتن کو نہ بھر سکیں گے۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہ کہتی ہیں کہ (اس قصہ کو سننے یا سنانے کے بعد) نبی کریم ﷺ نے مجھے فرمایا کہ میں تیرے لئے ایسا ہی ہوں جیسا کہ ابوزرع ام زرع کیلئے تھا۔

عن عائشہ رضی اللہ عنہا مصنف رحمۃ اللہ نے اس مقام پر اور اسی طرح بخاریؒ و مسلمؒ نے اس حدیث کو موقوف ذکر کیا ہے لیکن علامہ طبرانیؒ نے اسے مرفوع بھی روایت کیا ہے۔ چنانچہ ان کی روایت کے مطابق حضرت عائشہ رضی اللہ عنہ کہتی ہیں کہ نبی کریم ﷺ میرے پاس ایک رات تشریف لائے

اور فرمایا کہ میں تیرے لئے ایسا ہوں جیسے ابوزرع ام زرع کیلئے تھا۔ میں نے عرض کیا کہ یارسول اللہﷺ ابوزرع اورام زرع کی کیابات تھی تو آپﷺ نے فرمایا کہ "جلست احدیٰ عشرۃ امرأۃ الخ"(۱)

اسی طرح اس حدیث کے آخر میں "کنت لک کابی زرع لامّ زرع" سے بھی حدیث کا مرفوع ہونا معلوم ہورہا ہے"

جلست احدیٰ عشر ا مرأۃ الخ عورتوں کی عادت ہوتی ہے کہ وہ جب بھی موقع پاتی ہیں ایک دوسرے کوخاوندوں کے قصے،ان کے عیوب یاان کے محاسن بیان کرتی ہیں۔تو یہ عورتیں بھی ایسی تھیں کہ اکثر اپنے شوہروں سے تنگ تھیں۔

<u>عورتوں کے جبلّی خواہش کی پاسداری:</u> ان کے خاوند اپنے کسب معاش کیلئے یا جنگوں اور لوٹ مار کیلئے مہینوں غائب رہتے۔جیسے آج کل لوگ اکثر ابوظہبی، دبئی،قطر وغیرہ مما لک میں جاکر برسوں رہتے ہیں ادھر عورتیں بیچاریاں پریشانی اور فراق کی زندگی بسر کرتی ہیں ۔روزگار کی تلاش اور عرب کے پٹرول کے خزانوں کی وجہ سے آج بھی ہزاروں معاشرتی، اخلاقی اور معاشی برائیاں پیدا ہوگئی ہیں۔خصوصاً مردوں کی غیر حاضری سے یہ مسائل جنم لیتے ہیں۔سلف صالحین نے اس مسئلہ کو بڑی سنجیدگی سے لیا ہے۔ ایک روز حضرت عمر رضی اللہ عنہ ایک گھر کے قریب سے گزرے اندر سے عورت کی آواز سنی جو کچھ اشعار گارہی تھی جن کا مفہوم یہ تھا کہ اگر خدا کا خوف نہ ہوتا میں یہ چارپائی توڑ دیتی۔حضرت عمر رضی اللہ عنہ یہ سن کر گلی میں کھڑے ہوگئے۔خاتون کی بات سے حیرت ہوئی۔پتہ چلا کہ یہ ایک نوجوان عورت ہے جس کا خاوند جہاد کو گیا ہے۔فطری طلب نے اسے یہ اشعار کہنے پر مجبور کیا ہے۔آپ رضی اللہ عنہ کو بہت دکھ ہوا۔ سوچا کہ یہ تو عظیم مسئلہ ہے۔اس کے بعد تفتیش کی کہ ایک عورت کتنے دنوں تک خاوند کا فراق گوارا کرسکتی ہے۔معلوم ہوا کہ تین ماہ تک گزارہ کیا جاسکتا ہے۔اس کے بعد آپ رضی اللہ عنہ نے اعلان فرمایا کہ تین ماہ میں ہر شادی شدہ مجاہد کو لازماً گھر جانا ہوگا۔انسانی حقوق کی اس انداز سے پاسداری جدید نظام میں ہرگز موجود نہیں نہ روس میں نہ امریکہ میں نہ کسی اور ملک میں ہے۔

---

(۱)المواھب اللدنیه ص ۱۸۶ وکذا ذکرہ النسائی مرفوعاً کما نقل عنه علی القاری فی الجمع ج۲ ص ۷۳ (اصلاح الدین)

بہرحال یہ عورتیں جو مکہ اور حجاز کی رہنے والی تھیں یا ایک قول کے مطابق یمن کے بنو خثعم قبیلہ سے تعلق رکھتی تھیں جمع ہوئیں اور اس قسم کی پریشانیوں میں غم غلط کرنے کیلئے آپس میں طے کیا کہ آؤ اپنے شوہروں کے بارے میں باتیں کریں۔ لیکن پہلے آپس میں قسمیں کھائیں کہ اپنے مردوں کے حالات نہیں چھپائیں گی ہر ایک اپنا راز ضرور ظاہر کریں گی۔ خاوندوں کی اچھائی اور برائی میں سے جو بھی حقیقت ہو بیان کریں گی۔

<u>پہلی عورت کا جامع تبصرہ</u>: زوجی لحم جمل غث الخ پہلی عورت اپنے خاوند کا ذکر کرتی ہے۔ غثٌّ سخت کمزور چیز کو کہتے ہیں۔ غث اللّحم کا معنی ہے فسد اللحم یعنی گوشت سڑ گیا۔ غثت الشاۃ کا معنی ہے نحفت وضعفت یعنی کمزور اور ضعیف ہو گیا۔ لہٰذا غــثٌ فاسد، ردی اور بیکار یا نحیف اور لاغر کے معنی میں مستعمل ہوتا ہے۔ اس مقام پر اسے جر سے پڑھا جائے تو یہ جمل کی صفت ہوگا۔ یعنی ایسے اونٹ کا گوشت ہے جو کمزور اور لاغر ہے۔ اسکو ملا علی قاریؒ نے روایت مشہورہ، اور علامہ بیجوریؒ اور مناویؒ نے راجح قرار دیا ہے۔ کیونکہ اس طرح غثٌ قریب ترین موصوف کیلئے صفت بن جائیگا اور اگر غث کو مرفوع پڑھا جائے تو یہ لحمٌ کی صفت ہوگا۔ اور فاسد اور ردی گوشت کا معنی دے گا۔ اصل میں غث سمینٌ کی ضد واقع ہوا ہے۔ صحیح اور غلط میں تمیز نہ کرنیوالے کے بارے میں عرب کہتے ہیں ''فلانٌ لایعرف الغث من السمین''

علــی راس جبــل وعر: وعر ضرب، سمع اور کرم تینوں ابواب سے آتا ہے۔ سخت ہونے کے معنی پر مستعمل ہے۔ جبل وعِر اس پہاڑ کو کہتے ہیں جو سخت ہو۔ اس پر بیٹھنا اور چڑھنا دشوار ہو۔ ''علی راس جبل'' اگرچہ جمل کی صفت بھی ہو سکتا ہے لیکن لحم کی صفت ہونا بظاہر راجح معلوم ہوتا ہے۔ لاســمین سمن سے صفت مشبہ ہے جس کا معنی ہے چربی والا ہونا۔ معنی یہ ہے کہ گوشت چربی والا بھی نہیں ہے۔

فیــنتقیٰ انتقاء کے معنی خالص اور صاف چیز چننا۔ جبکہ بعض شراح نے لکھا ہے کہ یہ نقی سے ہے جو ہڈی کے درمیان گودے اور مغز کو کہتے ہیں۔ پھر ترجمہ یوں ہوگا کہ اچھا گوشت نہیں ہے کہ اس کا گودا نکال کر کھایا جا سکے۔ اور بعض روایات میں فیــنــقل مروی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ چربی والا نہیں کہ گھر استعمال کیا جا سکے بلکہ بیکار ہے۔

اس عورت نے مختصر، جامع اور فصیح ادبی الفاظ میں خاوند پر تبصرہ کیا ہے۔ وہ زمانہ ادب کے لحاظ سے عربوں کیلئے سرمایہ افتخار تھا۔ بعد کے دیگر تبصرے بھی بلند ادبی مقام رکھتے ہیں۔

یہ عورت دراصل خاوند کی مذمت کرتی ہے۔ خاوند کو اونٹ کے گوشت سے تشبیہ دی ہے اور کھائے جانے والے جانوروں میں سب سے زیادہ بے کار اور سخت گوشت اونٹ کا گوشت ہوتا ہے۔ نہ آسانی سے پکتا ہے نہ لذت کے لحاظ سے مرغوب ہے مطلب یہ ہے کہ میرا خاوند قابل محبت شخص نہیں۔ اور خصوصاً جب اونٹ بھی کمزور اور بے کار سا ہو۔ تو اس کا گوشت اور بھی بے فائدہ ہوتا ہے۔ علاوہ ازیں اس میں اس بات کی طرف بھی اشارہ ہے کہ میرا خاوند جنسی اعتبار سے بھی کمزور ہے۔ کیونکہ یہاں تشبیہ گوشت کے ساتھ دی ہے اور ذبیحہ کے گوشت میں حیات نہیں ہوتا مردہ ہوتا ہے۔ گویا وہ حقوق زوجیت کی ادائیگی میں بھی کام کا نہیں۔ اس میں کچھ بھی ذوق وشوق اور محبت وگرمی نہیں۔ رڈی بے خیر مردہ اور جامد سا ہے۔ اور اس پر مستزاد یہ کہ وہ مجھ سے دور رہتا ہے پھر بھی اچھا ہوتا اگر کبھی ہاتھ آتا مگر ایسا بھی نہیں وہ تو گویا دشوار گزار چڑھائی والے پہاڑ کے سرے پر ہے۔ ہماری رسائی وہاں نہیں ہوسکتی کیونکہ اس پر چڑھنے کا کوئی طریقہ نہیں یا وہ متمرد اور متکبر بھی ہے۔ کیونکہ "فلان علی راس جبل" تکبر اور سرکشی کیلئے بھی بطور کنایہ استعمال ہوتا ہے پھر اونٹ کا گوشت بھی اگر چربی والا ہوتا تو اس سے انتخاب کیا جاسکتا تھا۔ اس کا بہتر حصہ کام میں لایا جاسکتا تھا یا اگر ممکن ہوتا تو بتکلف پہاڑ سے اتار لیا جاتا مگر وہ اس کا بھی اہل نہیں بہت بیکار ہے۔ اس میں گویا خیر کی کوئی جہت نہیں ہے۔

<u>**دوسری عورت کا ذومعنی کلام:**</u>　**قالت الثانیه زوجی لاابثّ خبره الخ**،نصر کے باب سے بث یبث کا معنی ہے اغشاء کر کے پھیلانا اور منتشر کرنا اس کی ضد جمعیت اور اجتماع ہے، سخت بیماری، بدحالی اور غم کو بھی بث کہتے ہیں۔ قرآن مجید میں حضرت یعقوب علیہ السلام کے قول کی حکایت ہے "**انما اشکو بثی وحُزنی الی الله**" یعنی میں اپنی بدحالی اور غم کی شکایت اللہ تعالیٰ ہی سے کرتا ہوں۔ معنی یہ ہے کہ میں اپنے خاوند کی باتیں ظاہر نہیں کرسکتی۔ حضور اقدس ﷺ کی دعا ہے **اللّهم الیک الشکوا بثی وحزنی الخ**۔

إنّی أخاف ان لا أذره الخ　وذر یذر باب سمع سے ترک کے معنی میں ہے۔ ذرنـــــــــی

والمکذبین اور کلاّ لاوذر بھی اسی سے ہے۔معنی یہ ہے کہ مجھے ڈر ہے کہ میں اسے نہیں چھوڑ سکوں گی۔ اذرہ کی ضمیر یا تو زوجہ کوراجع ہے۔شراح کہتے ہیں کہ پھر لا زائدہ ہے اور معنی یہ ہے کہ مجھے ڈر ہے کہ اسے چھوڑ دوں گی۔یعنی اس کی باتیں بتانے کی صورت میں طلاق سے ڈرتی ہوں اور یا یہ ضمیر خبر زوج کوراجع ہے پھر معنی یہ ہوگا کہ مجھے ڈر ہے کہ اس کی بات بتانے لگوں تو اسے چھوڑ نہیں سکوں گی۔کیونکہ اس کے عیوب بہت ہیں اور بیان کرنے سے ختم نہ ہوسکیں گے۔۔

ان أذکرہ الخ ضمیر یا تو زوج کوراجع ہے یا خبر کو۔**أذکر عجرہ وبجرہ عجر عجرۃ** کی جمع ہے۔اور **بجر بجرۃ** کی جمع ہے۔انسانی جسم میں اللہ تعالیٰ نے عجیب بیماریاں اور نقائص بھی پیدا کی ہیں۔چاند بھی بے داغ نہیں۔اس طرح انسانی جسم بھی عیوب سے پاک نہیں۔ان میں سے بعض عیوب نظر بھی آتی ہیں۔مثلاً بعض لوگوں کے گردنوں یا گلوں میں ورم ہوتا ہے گردن کے اس ظاہری ورم کو ہی دراصل عجرۃ کہتے ہیں۔لیکن کبھی بالعموم جسم کے کسی بھی حصہ میں گلٹی یا ورم ہو۔اس پر عجرۃ کا اطلاق ہوتا ہے۔حاصل یہ کہ یہاں تمام جسمانی ظاہری عیوب عجر کے زمرے میں آئیں گی۔جبکہ بعض عیوب چھپے ہوئے ہوتے ہیں۔قمیص شلوار وغیرہ سے مستور ہوتے ہیں۔مثلاً بعض لوگوں کے ناف غلط طریقے سے کٹے ہوئے ہوتے ہیں۔اور ایک گانٹھ کی سی شکل اختیار کرتے ہیں۔جو تمام عمر بدنما دکھائی دیتے ہیں۔ناف،پیٹھ یا اس طرح کے دوسرے پوشیدہ مقامات پر مخفی عیوب بجرۃ کہلاتی ہیں۔بہر حال اس عورت نے اعتراف کیا کہ میرے خاوند میں ظاہری اور مخفی عیوب ہیں۔اگر بیان کرنے لگوں تو وہی بیان کروں گی۔

اکثر شراح(۱) کے نزدیک یہ عورت بھی اپنے خاوند کی عیب جوئی کررہی ہے۔اس کی مذمت میں گویا کہتی ہے کہ میں تو اس کے عیوب شمار نہیں کرسکتی بیان کرونگی تو ڈر ہے کہ ختم ہونے کو نہ آئیں۔یہ بڑی داستان اور نہ ختم ہونے والا موضوع ہے کیونکہ عیوب بہت زیادہ ہیں۔اس تقدیر پر"**ان لا أذرہ**" میں لا زائدہ نہ ہوگا۔

---

(۱)بعض شراح نے اس عورت کے کلام کو مدح پر حمل کرنے کیلئے یہ کہا ہے کہ عجر اور بجر سے عیوب مراد نہیں بلکہ عجر وبجر "الامر کلہ" کے معنی میں ہے اور عورت کا مطلب یہ ہے کہ میرے خاوند میں بے انتہا خوبیاں ہیں بیان کرنے کی صورت میں ختم ہونے کو نہ آئیں گی۔اس لئے میں اس کی بات نہیں کرتی،لیکن شراح نے اس تاویل کو بعید کہا ہے(اصلاح الدین)

اور بعض کہتے ہیں کہ ان لا اذرہ میں حکمۃ لا زائدہ ہے اور عورت یہ کہنا چاہتی ہے کہ میں مجبور ہوں خاوند کو چھوڑ نہیں سکتی۔اس لئے حالات بیان نہیں کرتی۔ میری تو اس سے محبت ہے یا مجھے اس کی ضرورت ہے۔اگر چہ وہ غافل اور معیوب ہے۔اولاد،نفقہ،سکنی یا دل کے تقاضوں کی وجہ سے میں اسے نہ چھوڑ سکنے پر مجبور ہوں اور اگر اسے پتہ چلا کہ میں نے اس کے نقائص بیان کئے ہیں تو وہ مجھے طلاق دے دیگا۔لیکن اس تشریح پر یہ شبہ کیا جاسکتا ہے کہ اس عورت نے تو عہد اور قسم کی مخالفت کی تو اس کا جواب یہ ہے کہ اس عورت نے تو سب سے جامع طرز پر خاوند کے عیوب سے پردہ اٹھایا ہے۔اس کے ہاں تو اس کا زوج مجسمہ عیوب اور سراپا نقائص ہے۔ بقول اس کے اگر گنتی کی جائے تو بات طویل ہو جائے گی۔لہٰذا تصریح کے مقابلے میں اجمال و کنایہ کا سہارا لیا۔

<u>تیسری عورت کی رائے:</u> قالت الثالثة زوجی العشنق الخ عشنق دبلے پتلے اور لمبے تڑنگے شخص کو کہتے ہیں۔جو دبلا ہونے کی وجہ سے بدصورت دکھائی دیتا ہے۔اسے اردو میں لم ڈھینگ بھی کہا جاتا ہے۔اور اس طول کے ساتھ عموماً حماقت بھی ہوتی ہے۔جبکہ بعض شراح کہتے ہیں کہ عشنق بداخلاق آدمی کو کہتے ہیں۔جو عموماً بیوقوفی کی بناء پر ہوتی ہے۔اور اسی کا بیان بعد میں کررہی ہے۔

ان أنطق اطلق یعنی اگر بولوں آہ وفریاد کروں تو طلاق دیتا ہے اور اگر چپ رہوں تو معلق رہ جاتی ہوں۔حاجات کا تقاضا نہ کروں تو بھوکی پیاسی مرتی ہوں۔رزق، نان ونفقہ اور کپڑا وغیرہ ضروریات زندگی کیلئے ترستی ہوں تو گویا بظاہر خاوند ہوتے ہوئے بھی میرا سہارا نہیں ہوتا نہ اس کی بیوی جیسی ہو۔ دوسرے کسی سے نکاح ممکن ہوتا ہے۔قرآن میں ہے"فتذروها كالمعلقة"اس عورت نے بھی خاوند کی تنقیص کی ہے گویا وہ ایک اچھا خاوند نہیں ہے۔حماقت کے ساتھ ساتھ بیوی کے حقوق واجبہ بھی ادا نہیں کرتا۔

<u>چوتھی عورت:</u> قالت الرابعة كليل تهامة الخ تہامہ حجاز کا خاص علاقہ ہے جس میں مکہ بھی واقع ہے۔اس لئے نبی کریم ﷺ کو تہامی بھی کہتے ہیں۔یہ علاقہ نجد کی نسبت زیرین اور سمندر کے قریب واقع ہے۔اس علاقے کی رات بڑی خوشگوار ہوتی ہے۔رات کو معتدل ہوا چلتی ہے۔مچھر وغیرہ موذی چیزیں

بھی نہیں ہوتیں۔مکمل سکون اورراحت ہوتی ہے۔

لاحــرّ و لاقرّ الخ حرّ گرمی اورقرّ فتح قاف کے ساتھ ٹھنڈک اورسردی کو کہتے ہیں۔یہ لیل کا بیان ہے یعنی ایسی معتدل رات کی طرح ہے جس میں گرمی ہونہ سردی۔اور یا یہ زوج کی توصیف ہےاورحرّ سے شدت اورقرّ سے طبعی برودت اور بیوی میں بے رغبتی مرادہو۔تو گویا یہ کہنا چاہتی ہیں کہ مراخاوند ہرلحاظ سے پسندیدہ خاطرمزاج کا مالک ہے۔

و لاسـآمة باب سمع سے سئم سآمۃ دل کی تنگی اوردل اچٹ جانے کو کہتے ہیں۔یہ عورت خاوند کی تعریف کرتی ہے کہ میرا خاوند حسین مزاج مقبول السیر ۃ اورمعتدل طبیعت کا مالک ہے۔اس کی صحبت سے کسی کوملال نہیں ہوتا۔خوش اخلاقی کی وجہ سےاس کی رفاقت اذیت سے پاک ہوتی ہے۔

<u>پانچویں کی معنی خیز باتیں:</u> **قـالـت الخامسة زوجی ان دخل فهد** فہد یا توسمع کےوزن پرفصل کا صیغہ ہے کہتے ہیں کہ فہدالرجل ای صار کالفہد یعنی آدمی چیتے جیسا بنا۔اور یہ بھی ممکن ہے کہ فعل کی بجائے یہ اسم ہو۔اورمبتدامحذوف کی خبر ہو۔ترکیب یوں ہوگی زوجی ان دخل فھوفہد۔یعنی وہ گھر آتا ہےتو شیر ہوتا ہے۔چیتا سست نکاہل اور بہت زیادہ سونے والا جانور ہےلیکن حملے کے دوران اس کی تیز رفتاری اور پھرتی بھی ضرب المثل ہے۔نیز یہ درندوں میں سرکش بھی زیادہ ہے۔

اس عورت کے کلام میں تین جملے ہیں اورتینوں ذوالوجہین ہیں۔ان میں مدح کا پہلوبھی ہے۔اور مذمت کا پہلوبھی۔زیرنظر جملے کواگرمدح کے پہلو سے لیا جائے۔تو یہ عورت اپنے شوہرکی گرمجوشی اور جماع کے وقت پھرتی کو بیان کرتی ہے۔کہ ایسی حالت میں وہ چیتا بن جاتا ہے۔اسی طرح گھر میں کمی بیشی آجائے ان سے بھی تغافل اورتسامح برتتا ہے۔جیسے چیتا عموماً اپنی جگہ میں سویا ہواہوتا ہے۔اسی طرح وہ بھی گھر کے اندرسویا رہتا ہے۔ایسانہیں کہ ٹکے ٹکے کا حساب لیکرگھر والوں کا ناک میں دم کررکھاہو۔

اوراگرمذمت کا پہلولیں تو مطلب یہ ہوگا کہ میرے شوہرمیں بہیمیت کا اتنا غلبہ ہے کہ گھرآکر چیتے جیسا حملہ آورہوجاتا ہے۔کسی تحقیق وتفتیش کے بغیر مجھے پیٹنے لگتا ہے۔اوراگرحقوق زوجیت کی ادائیگی کا وقت ہوتو پھر چیتے کی طرح لمبی تان کرسوجاتا ہے۔گھروالوں سے تعلق اورمحبت میں کوئی گرمی نہیں ہےنہ ان

کے نان ونفقہ کی فکر ہوتی ہے بس سویا پڑا رہتا ہے۔

وان خرج اسد اُسد میں بھی فہد کی طرح دواحتمال ہیں۔ایک یہ کہ فعل ہو بمعنیٰ صار کالاسد اور دوسرا یہ کہ اسم ہو۔مبتدا محذوف کی خبر ہو۔یعنی فہواسد۔معنی یہ کہ گھر کے باہر شیر بن جاتا ہے۔اس جملے کے مراد میں بھی دواحتمال ہیں۔اول یہ کہ مدح پر محمول ہو تو معنی ہوگا کہ گھر میں شرافت اور چشم پوشی کے باوجود باہر جاکر شیر کی طرح جرأت وشجاعت کی داد حاصل کرتا رہتا ہے۔کسی کے سامنے نہیں جھکتا۔شیر کی طرح گھر کے باہر ہی بہادری کا مظاہرہ کرتا ہے۔اور اگر مذمت کی جہت لیں تو مطلب یہ ہوگا کہ وہ گھر میں چیتے جیسا سست اور باہر شیر کی طرح بہادر بن جاتا ہے۔لوگوں کے ساتھ غضب اور تجبّر سے پیش آتا ہے اور حماقت کی بناء پر انجام کی پرواہ نہیں کرتا۔

ولایسال عما عهد عہد یعہد سمع کے باب سے علم کے معنی میں آتا ہے یعنی جس امر کا اس کو علم ہو۔اس کے بارے میں کسی سے دریافت نہیں کرتا۔اس جملے میں بھی دو جہت ہیں۔مدح کی جہت لیں تو مطلب یہ ہوگا کہ میرا شوہر وسیع الظرف اور کریم ہے۔گھر میں اخراجات زیادہ ہوں۔یا کوئی نقصان ہوگیا ہوا سے پتہ چلے تو بھی احتساب اور نکتہ چینی سے کام نہیں لیتا۔گویا گھر کے داخلی امور میں وزیر داخلہ یعنی بیوی کو اختیارات سپرد کی ہیں۔

مذمت کا پہلو لیں تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ میرا شوہر خانگی امور میں باوجود علم کے بے حسی کا مظاہرہ کرتا ہے یہ نہیں پوچھتا کہ گھر والوں پر کیا گزر رہی ہے کسی چیز کی ضرورت تو نہیں؟ بلکہ تغافل وتکاسل کی عادت ہے۔

<u>چھٹی کی ادیبانہ باتیں:</u> تینوں جملوں میں مدح اور مذمت دونوں پہلوؤں کے باوجود بعض شراح نے مدح کے پہلو کو ترجیح دی ہے اور اسے اقرب کہا ہے۔

قالت السادسة زوجی ان اکل لفّ لِفَ یلفّ لفّا(باب سمع) سمیٹنے اور لپیٹنے کو کہتے ہیں۔لفافہ بھی اسی سے ہے اور لفیف کا مادہ بھی یہی ہے۔یہاں مقصود یہ ہے کہ مختلف قسم کے کھانوں کو اکٹھا کھا جاتا ہے کثیر الاکل ہے۔شفّ یہ لفظ شین اور سین دونوں کے ساتھ مروی ہے۔اشف شین کے ساتھ ہو تو

اس کا معنی ہے''شرب الشفافة'' شفافہ اس تھوڑے سے پانی کو کہتے ہیں جو پینے کے بعد برتن میں رہ جاتا ہےتو گویا مطلب یہ ہے کہ پانی وغیرہ آخری قطرے تک پی جاتا ہے۔ برتن میں کچھ رہنے نہیں دیتا۔اور اگر سین کے ساتھ ہوتو معنی یہ ہوگا کہ بہت زیادہ پی لینے کے باوجود سیر نہیں ہوتا مزید تقاضا بھی کرتا ہے۔

وان اضطجع التفّ الخ **التفّ لفّ یلفّ** سے افتعال کا صیغہ ہے جو سمٹ جانے اور جمع ہونے کے معنی میں مستعمل ہے۔

ولایولج الکفّ ۔یولج ولوج سے باب افعال کے مضارع کا صیغہ ہے۔داخل کرنے کے معنی میں ہے۔اور کف کا معنی ہے منع کرنا۔اور ہاتھ چونکہ دوسری چیزوں کے منع کرنے اور دوسری اشیاء سے حفاظت کرنے میں استعمال ہوتا ہے۔اس لئے اس کو بھی کف کہتے ہیں۔

لیعلم البث بث پراگندہ حالی اور پریشانی کو کہتے ہیں نیز بیماری پر بھی اس کا اطلاق ہوتا ہے۔ **قال اللّٰہ تعالیٰ ''انّما اشکو بثیّ وحزنی إلیٰ اللّٰہ''** جیسا کہ پہلے گزر چکا ہے۔یہ عورت عام شراح کے نزدیک شوہر کی مذمت بیان کرتی ہے لیکن بعض کے ہاں اس کے بیان میں تعریف کا پہلو بھی نکلتا ہے۔

اول الذکر صورت میں اس عورت کے مطابق اس کا خاوند پیٹو ہے۔دسترخوان پر جو کچھ ملے اسے کھا جاتا ہے بچوں اور بیوی کیلئے کچھ نہیں چھوڑتا۔اور اگر پیتا ہے تو ہر برتن کو خالی کر کے چھوڑتا ہے سب کچھ پی جاتا ہے خواہ وہ شراب ہو، خواہ وہ دودھ ہو، لسی ہو یا کوئی اور پینے کی چیز کچھ نہیں چھوڑتا۔اور سوتے وقت سمٹا کر سو جاتا ہے کسی کام کا نہیں۔ بیوی کا حق ادا نہیں کرتا۔اس کی طرف ہاتھ بھی نہیں بڑھاتا تا کہ اس کی بے چینی، پریشانی، بدحالی اور تشنگی کا اسے پتہ چل سکے۔اس کی بے چینی اور محبت و پیار کی طلب کا اسے احساس نہیں ہوتا نہ اس کی بیماری میں اس کی طرف ہاتھ بڑھا کر ہمدردی کا اظہار کرتا ہے۔اس تشریح کے مطابق یہ مذمت کا پہلو ہوا۔اور دوسری توجیہ یہ ہے کہ میرا خاوند نہایت سخی مالدار اور باوقار آدمی ہے۔ساتھ ساتھ عظیم اخلاق کا مالک ہے۔گھر کی چھوٹی موٹی باتوں میں نیز بیوی بچوں کے معاملات سے لاتعلق رہنے کی کوشش کرتا ہے۔کھانے کا معاملہ ہو تو ایک قسم کے کھانے پر اکتفاء نہیں کرتا۔ بلکہ مختلف انواع کے کھانے دسترخوان پر چنے جاتے ہیں۔اور وہ کھا پی کر خوب سیر ہو جاتا ہے۔افلاس زدہ آدمی کی طرح بچت کا عادی

نہیں۔ اور سوتا ہے تو بے فکری کی نیند میں سمٹ کر سو جاتا ہے کسی بات کا غم نہیں ہوتا۔ دشمنوں کا خوف نہیں ہوتا کوئی پریشانی اسے نہیں ستاتی۔ ساتھ ساتھ یہ کہ خامیوں کی تفتیش نہیں کرتا تاکہ پریشانی کی کوئی بات معلوم کرلے۔ نکتہ چین اور شکی مزاج شخص ہر وقت گھر میں جھگڑتا رہتا ہے۔ آنے جانے والوں کے بارے میں پوچھتا ہے۔ خرچ و اخراجات کا حساب لیتا ہے۔ اس طرح وہ گھر کے اندر بہت سی کمزوریاں پا کر خواہ مخواہ پریشان رہتا ہے۔ اس کے برعکس یہ شخص اپنی بیوی کے بیان کے مطابق اس طرح کا وہمی مزاج نہیں بلکہ بیوی پر اعتماد ہونے کے سبب بات بات پر نہیں بگڑتا۔ نہ تحقیق و تفتیش اس کی عادت ہے مگر عام شراح نے مذمت کی جہت کو ترجیح دی ہے۔

<u>ساتویں عورت کی دوٹوک باتیں:</u> **قالت السابعة زوجی عیایاء اوقال غیایاء** عیایاء عیؔ سے مبالغہ کا صیغہ ہے۔ یہ مادہ سمع کے باب سے تھکاوٹ کے معنی میں مستعمل ہے۔ قرآن مجید میں ہے **ولم یعیی بخلقھن**۔ یعنی اللہ تعالیٰ آسمانوں کو پیدا کرنے سے تھکا نہیں۔ لہٰذا عیایاء وہ شخص ہوگا جس میں بہت زیادہ درماندگی اور سستی ہے۔ بعض شراح نے اس کا ترجمہ عنین یعنی نامرد سے کیا ہے کیونکہ عیایاء اصل میں اس اونٹ کو کہتے ہیں جو کہ اونٹنی کے ساتھ جفتی پر قادر نہ ہو۔

جبکہ غیایاء غیؔ اور غوایۃ سے ہے۔ جو کہ گمراہی، ضلالت اور جہل کے معنی میں مستعمل ہے۔ اس لئے غیایاء وہ گمراہ اور جاہل ہوگا جو ہر جگہ نامراد ہے۔ یا یہ کلمہ غیایۃ سے ہے جس کا معنی اندھیرا ہے یعنی وہ اندھیرے میں ہے اور جس مقصد کی طرف بڑھے ناکامی کا منہ دیکھے۔ طباقاء ایک چیز کو دوسری چیز پر رکھنے کو طبق کہتے ہیں۔ اسی سے تطبیق مطابقۃ اور انطباق ہے تو طباقاء اس شخص کو کہا جاتا ہے جو نہایت سرد مہر ہو۔ چستی نام کی نہ ہو جہاں بیٹھے گویا اس جگہ سے چپک گیا ہو بعض شراح کے مطابق طباقاء کا معنی ہے "**الذی ینطبق علیہ الامور**" یعنی وہ شخص جس پر امور معاملات میں ابہام آئے۔ کوئی مشکل نہ سمجھا سکے۔ بعض شراح نے طباقاء اس شخص کو کہا ہے جو بھاری ہونے کی وجہ سے جماع کے وقت بیوی سے چپک جائے اور اس پر بوجھ بن جائے۔ بعض نے لکھا ہے کہ جمل طباق اس اونٹ کو کہتے ہیں جو جفتی پر قادر نہ ہو۔ بعض نے لکھا ہے کہ طباقاء وہ شخص ہے جو بات کرنے سے عاجز ہو گویا اس کے ہونٹ آپس میں چپک گئے ہیں۔

کل داء له داء ہر بیماری اس کی بیماری ہے یعنی متعدد بیماریوں کا مریض ہے۔ **شجّکِ الخ** شج زخم اور خصوصاً چہرے اور سر کے زخم کو کہتے ہیں اور **فـلّک** فلول سے ہے جو کہ کُند کرنے کو کہتے ہیں تلوار، چھری اور چاقو وغیرہ کی دھار ٹوٹنے کو فلول کہتے ہیں اور انسان کی نسبت اس کا معنی یہ ہوگا کہ وہ ہڈی یا کوئی عضو توڑ دیتا ہے۔

جمع کلاّ لک یعنی **کلاّ من الشج و الفلّ.** یہ عورت بھی خاوند کی بھر پور مذمت کرتی ہے جس کا حاصل یہ ہوا کہ میرا خاوند ہر وقت تھکا ماندہ، عنین سست اور کاہل ہوتا ہے یا بہت جاہل اور گمراہ ہے۔ اچھے برے کی تمیز نہیں کرتا اس پر مستزادیہ کہ طباقاء ہے جہاں کہیں پڑا رہا تو اٹھنے اور سرکنے کا نام نہیں لیتا۔ گویا جسمانی لحاظ سے بھاری بھرکم اور غیر مناسب ہے۔ یا معنی یہ کہ احمق ہے ہر قسم کے معاملات اس پر پیچیدہ اور الجھے رہتے ہیں۔ معمولی مسئلہ کا سلجھانا بھی اس کے لئے مشکل اور ناقابل حل ہوتا ہے۔ نیز طباقاء کا یہ معنی بھی محتمل ہے کہ ازدواجی تعلق کے وقت بیوی پر بھاری بھرکم ہونے کی وجہ سے بوجھ بنتا ہے۔ جسمانی طور پر بیماریوں اور امراض وعلل کا مجسمہ ہے بدخلق اتنا کہ اگر بات کرو تو سر پھوڑ دے یا ہڈیاں توڑ دے۔ یا دونوں تکلیف پہنچا دے۔

<u>آٹھویں عورت:</u> **قالت الثامنة** اس عورت کا نام ناشرہ بنت اوس بتایا جاتا ہے۔ **زوجی المس مس ارنب** مس اور لمس دونوں کا ایک معنی ہے ہاتھ لگانے کو کہتے ہیں اور ارنب خرگوش کو کہتے ہیں جو کہ بہت نازک وملائم جانور ہے۔ یہاں تقدیر عبارت یوں ہوگی "**له مسّ کمسّ ارنب**" یا "**و مسّه کمسّ ارنب**" اس صورت میں المس کا الف لام مضاف الیہ سے عوض ہے اور اداۃ التشبیہ محذوف ہونے کی بنا پر تشبیہ بلیغ ہے۔

والریح ریح زرنب یعنی "**له ریح کریح زرنب**" یا "**وریحه کریح زرنب**" زرنب بہت خوشبودار بوٹی ہے اس سے مہک اٹھتی ہے۔ اور بعض کے نزدیک اس سے زعفران مراد ہے یہ عورت اپنے خاوند کی مدح کرتی ہے۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ ظاہری اور معنوی لحاظ سے اللہ تعالیٰ نے میرے خاوند کو بہت اچھے صفات سے نوازا ہے۔ حسن و جمال اور ملائمت میں گویا وہ خرگوش ہے۔ یعنی خوش

اندام اور نازک بدن ہے جبکہ اس کا کلام، وضع قطع اور اخلاق زرنب کی مہک جیسی ہیں۔ اور اس کے ساتھ ساتھ مقبول صحبت و معاشرت ہے۔ بعض شراح نے لکھا ہے کہ ریح زرنب سے تشبیہ شہرت اور نیک نامی سے کنایہ ہے۔ اس کے برعکس بعض شراح نے اس عبارت کو مذمت پر حمل کیا ہے گویا یہ عورت اپنے شوہر کو کمزور، مردانی سے محروم اور زنانہ صفات کا مالک بتاتی ہے۔

<u>نویں کی مدحت انگیز رائے:</u> وقالت التاسعة زوجی رفیع العماد عماد بڑے ستون کو کہتے ہیں جس پر عمارت قائم ہو۔ اس کی جمع عمد اور اعمد ہے۔ معنی یہ کہ وہ بلند ستونوں والا ہے۔ کثیر الرماد رماد راکھ کو کہتے ہیں۔ اس کے گھر میں راکھ زیادہ ہوتی ہے۔ کیونکہ مہمانوں کی کثرت ہوتی ہے۔ طویل النجاد نجاد تلوار کی کاٹھی کو کہتے ہیں یہ دراصل رفعتِ قد کیلئے استعارہ ہے کیونکہ تلوار کی کھائی تب طویل ہوتی ہے جب آدمی خود دراز قد ہوتا ہے۔ علاوہ ازیں لمبی تلواروں کا استعمال امیر، سردار اور جنگجو بہادر لوگ کرتے ہیں۔

قریب البیت من الناد یہ اصل میں نادی ہے۔ نادی، نادیہ اور ندوہ تینوں مجلس کے معنی میں مستعمل ہیں۔ دار الندوہ مقام مشاورت واجتماع کو کہتے ہیں یہ یا تو ندیٰ یندو ندوا سے ہے۔ جس کے معنی جمع ہونا اور مجلس میں حاضر ہونا ہیں۔ یا یہ ندی یندی ندیٰ ونداوۃً سے ہے۔ جس کے معنی تر اور گیلا ہونا ہے۔ چونکہ مجلسوں اور اجتماع گاہوں میں عموما خورد ونوش اور شراب کا دور چلتا رہتا تھا اس لئے وہاں زمین نم آلود اور گیلی رہتی تھی۔ اسی سے مقام اجتماع اور مجالس پر نادی کا اطلاق ہونے لگا(۱)۔ اس جملہ کا مطلب یہ ہوگا کہ قوم کے دار المشاورت اسمبلی اور پارلیمنٹ کے قریب ہی میرے خاوند کا گھر ہے جو کہ سیادۃ وحکومت کی علامت ہے۔

یہ عورت بھی خاوند کی مدح کرتی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ میرا خاوند بہت امیر وسردار ہے اور بلند ستونوں والے بڑی عمارتوں کا مالک ہے۔ یا معنی یہ کہ بلند جگہ اور منفرد مقام پر اس کا محل ہے۔ اس جملے میں

(۱) صاحب جلالین نے ایک وجہ تسمیہ یہ بھی ذکر کی ہے کہ "لانـه ینتدیٔ فیه" یعنی مجلس میں چونکہ ایک دوسرے کو بلایا جاتا ہے۔ اور آوازیں دی جاتی ہیں۔ لہذا اسے نادی کہا جانے لگا۔ ولیراجع الی جلالین سورۃ علق. (اصلاح الدین)

عظمت اور خاندانی وجاہت کو بھی اشارہ ہے۔کیونکہ عرب لوگ حسب ونسب کی شرافت اور شہرت سے تعبیر کرتے ہوئے عمود کو کنایۃً استعمال کرتے ہیں۔جس طرح کہ فرزدق کہتا ہے کہ

إنّ الذی سمک السماء بنی لنا　　　بیتا دعائمہُ اعزّ واطول

ترجمہ: اس ذات نے جس نے آسمان کو بلندی عطا کی ہے ہمارے لیے (مجد وشرف کا) ایسا گھر بنایا ہے جس کے ستون مضبوط اور بلند ہیں۔

اس عورت کے بیان کے مطابق مہمانوں کی کثرت کے باعث ہر وقت کھانا پکانے کے لئے آگ جلتی رہتی ہے جس کے سبب راکھ کثرت سے پیدا ہوتی ہے۔علاوہ ازیں عرب کے سخی لوگوں کی یہ بھی عادت تھی کہ رات کو اونچی جگہ آگ روشن کرتے تھے تاکہ مسافر لوگ اس طرف آئیں اور وہ ان کی ضیافت کریں۔اس وجہ سے بھی راکھ کی کثرت ہوتی تھی۔طویل قد وقامت اور جسمانی ساخت کے لحاظ سے ممتاز، بہادر اور شجاع ہے۔نیز یہ لفظ اقتدار اور سلطنۃ سے بھی کنایہ ہوسکتا ہے یعنی وہ لمبی تلوار والا حاکم ہے جیسے ہمارے ہاں کہتے ہیں کہ فلاں کا ہاتھ لمبا ہے یعنی ہر جگہ رسائی ہے۔مجلس اور دار المشورہ کے قریب رہتا ہے۔ جو کہ سربراہی اور سرداری کی علامت ہے کیونکہ اس کے مشورہ کے بغیر فیصلہ نہیں کیا جاتا۔گویا اس بات کو اشارہ ہے کہ سردار اور ذی رائے ہے۔اس کی رائے کو اہمیت دی جاتی ہے اور یہ معنی بھی محتمل ہے کہ مجلس کے قریب گھر ہونے کی وجہ سے تمام مہمانوں کی ضیافت اس کو کرنی پڑتی ہے لیکن سخاوت کا علم چونکہ پہلے ”**کثیر الرماد**“ سے ہو چکا ہے۔لہٰذا پہلا معنی لینا افضل ہے۔

<u>دسویں کی مدح سرائی:</u>　**قالت العاشرة زوجی مالک** مالک اس شخص یعنی دسویں عورت کے خاوند کا نام ہے **وماما لک الخ** یہ اور اس قسم کے دیگر استفہامات تعظیم وتفخیم کیلئے ہوتے ہیں۔یعنی تمہیں کیا پتہ ہے کہ مالک کیا چیز ہے۔جیسے **القارعة ماالقارعة** اور **الحاقة ماالحاقة** میں ہے۔مراد یہ ہے کہ تم اس کی شان وشوکت اور عظمت کو کیا جانتے ہو۔**مالک خیر من ذالک** مالک ان مذکورہ خاوندوں میں سب سے بہتر ہے۔یا پھر ذالک میں اشارہ صرف نویں عورت کے خاوند کو ہے کیونکہ اس سے قبل تو بعض خاوندوں کی مذمت کی گئی تھی۔ان سے افضلیت تو واضح ہے۔لہٰذا صرف زوج تاسع کو اشارہ ہوگا۔یعنی

میرا خاوند اس زوج تاسع سے اچھا ہے(ا)۔له ابلٌ کثیرات المبارک الخ ۔مبارک مبرک کی جمع ہے جو بروک سے ظرف ہے ۔اورسرح یسرح سے ظرف ہے۔جس کے معنی ہیں آزاد چھوڑنا۔ جانوروں کو چراگاہ میں چرنے کیلئے آزاد چھوڑنے کوسرح اور چراگاہ کومسرح کہتے ہیں۔

تو مطلب یہ ہوا کہ ان اونٹوں کا مبارک کے ساتھ تعلق مسارح کے ساتھ تعلق کی نسبت زیادہ ہوتا ہے۔اذا سمعن صوت المزهر الخ مزہر چنگ ورباب اورساز کے آلات کو کہتے ہیں۔یا پھران میں سے ایک خاص قسم کے رباب کو کہتے ہیں۔لیکن مراد یہی آلات طرب ہیں۔اسی طرح مزہر کا اطلاق غلیل کے مانند ایک لکڑی پر بھی ہوتا ہے جس کے ذریعے آگ جلایا کرتے تھے وہ بھی مراد ہوسکتا ہے۔تو معنی یہ ہوگا کہ ساز کی آواز یا آتش دان میں آگ جلانے کی آواز سن کر وہ اونٹنیاں یقین کرلیتی ہیں۔کہ ان کی ہلاکت کا وقت آن پہنچا ہے۔

یہ عورت بھی خاوند کی مدح کرتی ہے۔اس کے بیان کا مطلب یہ ہے کہ میرا خاوند سخی اور مالدار ہے۔اس کے بہت اونٹ ہیں۔جنہیں وہ چراگاہ نہیں بھیجتا بلکہ یہیں باندے رکھتا ہے۔اس لئے کہ وہ گھر میں ان کو پالنے کی خوب استطاعت رکھتا ہے۔صحرائی چراگاہوں میں چرانے کی ضرورت ہی نہیں پڑتی۔اور اس لئے بھی کہ کسی وقت بھی ضرورت پڑسکتی ہے تو پکڑ کر ذبح کرنے میں آسانی ہو۔اور مہمانوں کو دودھ پیش کرنے کیلئے بھی جانور ہر وقت گھر پر موجود ہوں۔

چراگاہوں میں اس شخص کے اونٹ چرتے رہتے ہیں جس کے مہمان نہ ہوں۔اور ذبح کرنے کا موقع نہ آئے بلکہ تجارت اور کمائی کیلئے اونٹ رکھتا ہو۔مالک کی سخاوت کی بناء پر اونٹ بھی اتنا سمجھ چکے ہیں کہ ساز کی تھوڑی سی آواز سن لیں تو سمجھ لیتے ہیں کہ اب وہ ذبح کئے جائیںگے۔گویا کثرت تجربہ کی وجہ سے ان کو اس بات کا شعور ہو چکا ہے۔ساز کا ذکر اس لئے کیا ہے کہ سرداروں کے ہاں مہمان آتے تو مجالس کو نغموں، چنگ ورباب اور مجروں سے خوب گرم کرلیتے تھے۔وہ اپنی داشتہ لونڈیوں کو مہمانوں کی خوشی کی خاطر ہی

(ا) یہ بھی ممکن ہے کہ ذالک میں اشارہ بعد میں آنے والی توصیف کو ہو تو عبارت کی تاویل یوں ہوگی کہ "مالک خیر من ذالک الذی اقوله فی حقه و سنذکره بعد "مطلب یہ ہوگا کہ بعد میں میں جو تعریف کرنے والی ہوں وہ بہت کم ہے۔وہ تو اس سے بھی بڑھ کر ہے۔وقداشارالی ذالک کثیر من الشراح .(اصلاح الدین)

رقص وسرود کی تعلیم دیتے تھے۔ اور دیگر طریقوں کے علاوہ اس لحاظ سے بھی ان کا اکرام کرتے تھے۔ بہر حال ساز کی آواز مہمانوں کی آمد اونٹوں کی ہلاکت کی علامت ہوتی تھی۔ یا پھر مزہر سے آتش دان مراد ہے۔ جس میں آگ جلنے کی آواز کان میں پڑتی۔ اور آگ جلنے لگتی تو اونٹوں کو شعور ہو جاتا تھا کہ اب ہم میں سے کوئی تو ذبح کیا جانے والا ہے۔

<u>گیارویں عورت حدیث کی محور امّ زرع:</u> قالت الحادیة عشرة یہ آخری عورت ام زرع ہے اور یہ بھی خاوند کی مدح کرتی ہے۔ زوجی أبوزرع الخ اس خاوند کا نام ابوزرع ہے اور تفخیم وتجیل کیلئے اس عورت نے بھی وما ابوزرع کا استفہام کیا ہے۔ اس کنیت میں بھی ثروت کی طرف اشارہ ہے کیونکہ زرع فصل کو کہتے ہیں اور اس شخص کی بھی زمینیں، جائداد اور فصلیں تھیں یا یہ معنی کہ یہ شخص کثیر الاولاد تھا۔ اور اولاد بھی ایک قسم کی فصل ہے۔ تو ممکن ہے اس کنیت میں اس بات کی طرف اشارہ ہو۔

اناس من حُلیٍّ اذنیّ اناس ینوس اناسة حرکت دینے اور ہلانے کے معنی میں ہے۔ یہ نوس سے ہے۔ جس کے معنی بھاری چیز کو ہلانے کے ہیں جسطرح کہ کنویں میں بھری بالٹی کو حرکت دی جاتی ہے۔ اسے نوس کہتے ہیں اور حُـلِیّ حاء کے ضم اور لاء مکسور کے ساتھ حَـلْیٌ (حاء مفتوحہ اور سکون لام) کی جمع ہے جو زیور کو کہتے ہیں۔ اُذنَـیّ اَنَاسَ کا مفعول بہ ہے یعنی اس نے بھاری زیور میرے کانوں کیلئے بنوا کر ان کو ہلا کے رکھدیا۔ تو گویا وہ مالدار ہونے کے ساتھ ساتھ مجھ پر مہربان بھی تھا۔ وملأ من شحم الخ یعنی میں گھر سے آئی تھی تو لاغر سی تھی لیکن ان کے ہاں ایسے کھانے ملے کہ میرے بازو چربی سے بھر گئے۔

عـــضـــدیّ عضد کہنی کے اوپر ہاتھ کو کہتے ہیں۔ یہاں تثنیہ متکلم کی یاء کی طرف مضاف ہے اور علامہ زمخشری رحمۃ اللہ علیہ نے لکھا ہے کہ بازوؤں کا ذکر خصوصی طور پر اس لئے کیا ہے کہ ان پر سب سے آخر میں گوشت اور چربی آتی ہے اس لئے مطلب یہ ہوگا کہ میں ساری چربی سے بھر گئی حتیٰ کہ بازو بھی بھر گئے۔

وبجّحنی، بجح فتح کے باب سے فرح اور عظم دونوں کے معنی میں آتا ہے۔ یہاں پر تفضیل کا صیغہ مستعمل ہے۔ جس کا معنی یہ ہے فرحنی یا عظمنی یعنی اس خاوند نے مجھے بے حد خوش کیا۔ یا میری تعظیم کی۔ اور قدرومنزلت بڑھادی۔

حتی بجحت الیٰ نفسی یعنی حتیٰ کہ میں خود پر عاشق ہوگئی۔خود پسندی اورغرور کے سبب قریب تھا کہ اپنی حقیقت بھول جاؤں یااس جملے کا معنی یہ ہوگا کہ **عظّمنی فعظمت الی نفسی** یا **فعظمت الیَّ نفسی۔**

وجدنی فی اھل غنیمة الخ غُنیمۃ غنم کی تصغیر ہے غنم بھیڑ بکریوں کے گلّے کو کہتے ہیں لہذا غُنیمۃ چند بھیڑوں یا بکریوں کو کہا جائیگا۔**بشق** شق یا شین کے فتح کے ساتھ ناحیہ اور طرف کو کہتے ہیں یعنی دوردراز، بادیہ وصحرا کے ایک غریب گھرانے میں مجھے پایا۔یا یہ ایک مخصوص جگہ کا نام بھی ہوسکتا ہے۔اسی طرح شق شین کے کسرہ کے ساتھ مشقت وتکلیف کے معنی میں بھی مستعمل ہے۔جیسے قرآن میں ہے کہ **ولم تکونوا بالغیة الّا بشق الانفس**. دونوں صورتوں میں مطلب یہ ہوگا کہ مجھے اس نے ایک غریب گھرانے میں پایااور پسند آنے پر بیوی بنایا۔**اھل صھیل** صَھِیل گھوڑوں کی آواز کو کہتے ہیں۔**واطیت** اطیت اصوات الابل کو کہتے ہیں یعنی وہاں سے اٹھا کر ایسے گھر میں مجھے لایا۔ جہاں گھوڑے اور اونٹ کثرت سے تھے۔ادھر گھوڑے ہنہناتے تو ادھر اونٹ بلبلاتے جاتے تھے۔**دائس و منق** دائس داس یدوس دوس سے اسم فاعل ہے جو کہ روندنے کو کہتے ہیں۔خصوصاً غلہ صاف کرنے کیلئے فصل اگاھنے کو کہتے ہیں۔اور منقٍ روایت کے مطابق تنقیہ سے اسم فاعل کا صیغہ ہے۔غلہ کو بھوسہ سے صاف کرنے والے جانور یا چھلنی کے ذریعے صاف کرنے والے غلام مراد ہیں۔تو معنی یہ ہوا کہ میں ایسے گھر میں آئی جہاں فصل گاہنے کیلئے بیل اور صاف کرنے کیلئے غلام اور جانور موجود تھے۔گویا یہ گھر بہت مالدار اور زمینداری کا گھر تھا۔صاف ستھرا غلہ کھانے کوملتا تھا۔اس کے علاوہ **نَق** جب فعل مستعمل ہو تو اس کا معنی آواز نکالنا بھی ہے کہتے ہیں۔**نقّت الدجاجة** مرغی نے آواز لگائی گویا کہ اس گھر میں اس کام کیلئے بھی نوکر چاکر موجود تھے کہ فصلوں سے مرغیوں اور دیگر نقصان دہ پرندوں کو بھگائیں یا ذبح کرنے کیلئے مرغیوں کو پکڑیں جس سے مرغیاں شور مچائیں۔الغرض بھرا گھر تھا۔ٹھاٹ بھاٹ اور امیرانہ طرز زندگی میں میں ایک غریب گھرانے سے منتقل ہوگئی۔

فعنده اقول فلا أقبحّ الخ تقبیح سے مضارع مجہول کا صیغہ ہے۔جس کے معنی ہیں کسی کی قباحت بیان کرنا یعنی اگرچہ ایک دیہاتی عورت ہونے کی وجہ سے میری باتیں نامناسب ضرور ہوتی تھیں مگر

وہ لوگ محبت سے پیش آ کر میری سب باتوں کو قبول کر لیتے تھے۔ مجھے برا بھلا نہیں کہا جاتا تھا۔ وارقد فاتصّبح تصّبح کے معنی ہیں صبح دن چڑھے تک نیند کرنا۔ تو معنی یہ ہوا کہ میں سو کر صبح کو دیر سے اٹھتی تھی۔ اور خاوند مجھے نیند سے نہیں جگاتا تھا کیونکہ محبت کی وجہ وہ مجھ سے خدمت نہیں لیتا تھا۔ نیز خدمت کے لئے دیگر نوکر چاکر موجود ہوتے تھے۔

اشرب فاتقمح بخاری اور مسلم کی روایت میں فاتقنح آیا ہے۔ قمح اور قنح دونوں فتح کے باب سے آتے ہیں۔ دونوں کا مفہوم ایک ہے جب پیتے پیتے آدمی کسی مشروب سے سیر ہو جاتا ہے۔ پھر بھی بادل ناخواستہ وہی مشروب پینے لگتا ہے۔ اسی کو قمح الرجل اور قنح کہتے ہیں اور باب تفعل سے ہو کر بھی دونوں کا مطلب لغت کی کتابوں نے یہ لکھا ہے کہ ''تکارہ علی الشّربِ بعد الرّی'' یعنی پانی سے سیر ہونے کے بعد بھی بادل ناخواستہ پیتا رہا۔ یہاں پر نیند اور مشروبات میں توسع اور کثرت کا بیان ہے جیسا کہ کھانوں میں توسع کا بیان پہلے گزر چکا ہے۔

یہاں تک ام زرع نے جو کچھ کہا ہے اس میں اپنے خاوند کی محبت مہربانیاں اور عنایت والتفات کا تذکرہ ہے وہ کہتی ہیں کہ ابوزرع نے مجھے اتنے زیور پہنائے کہ کان جھومنے لگ جاتے کھانوں سے خوب فربہ ہوگئی تھی۔ غریب گھرانے سے اٹھا کر عیاشی کے گھر لے آیا جہاں ہر نعمت موجود تھی اور ہر لحاظ سے مجھ پر فراوانی تھی۔ اس کے ساتھ ساتھ میری ناز برداری بھی کی جاتی تھی۔ خاوند کی چہیتی ہونے کی وجہ سے میری ہر بات قبول کی جاتی تھی۔ آرام اور نیند میں خلل اندازی نہیں ہوتی تھی۔ چنانچہ نہ مجھے ڈانٹا جاتا تھا اور سوتی تو بے فکر سوتی رہتی تھی کوئی جگاتا بھی نہ تھا۔ کیونکہ گھر بار، غلوں اور جانوروں کیلئے نوکر چاکر موجود تھے اور کھانے پینے کو اتنا ملتا کہ خوب پیٹ بھر کر کھاتی پیتی تھی۔ حتیٰ کہ دل بھر جاتا تھا۔ امّ أبی زرع الخ گھر میں ایک عورت کیلئے اس کا خاوند ہی سب کچھ نہیں ہوتا۔ بلکہ اس کا تعلق خاوند کی ماں، اس کی بہن بھائیوں اور اگر اس کی دوسری شادی یا اس کی اولاد ہوان سے بھی ہوتا ہے۔ اس طرح گھر کی کیفیت سے بھی اس کا واسطہ پڑتا ہے۔ کبھی خاوند مہربان اور محبت کرنیوالا ہوتا ہے لیکن ساس اور نندیں جینا حرام کر دیتی ہیں۔ اب وہ اس گھر کی ہر طرح سے توصیف کرتی ہے کہ صرف ابوزرع ہی مہربان نہ تھا بلکہ ایں خانہ ھمہ آفتاب است کے مصداق سب اچھے تھے۔ چنانچہ پہلے وہ اپنی ساس کا ذکر کرتی ہے کہ وہ بھی مہربان اور عظیم عورت تھی۔

فما ام ابی زرع یہ استفہام تعظیم کیلئے ہے جیسا کہ پہلے بھی گزر چکا ہے۔**عکو مها رداح الخ** عکم کی جمع ہے جو طعام اور کھانے کے برتن کو کہتے ہیں۔مختلف قسم کی برتنوں میں کھانے کی چیزیں رکھی جاتی ہیں۔کسی میں آٹا، کسی میں چنا دال کسی بھی آلو ٹماٹر وغیرہ۔تو ان اوعیۃ الطعام کو عکوم کہتے ہیں۔رداح راء کی فتحہ کے ساتھ صفت کا صیغہ ہے مفرد ہے مگر جمع کی خبر اس لئے واقع ہوا ہے کہ مبتداء میں کل عکم مراد ہے۔علاوہ ازیں غیر ذوی العقول کی جمع سے خبر اور صفت مفرد بھی واقع ہوتی ہے جیسے **لقد رأى من آيات ربه الكبرىٰ**۔ردح خوب بھرنے لب ریز ہونے اور ساتھ ساتھ وسعت وعظیم کے معنی کا بھی حامل ہے۔**امرأة رَدَاحٌ ای عظيمة الاكفال و الاليتين** یعنی اس عورت کو کہتے ہیں جس کے کولہے اور سرین پُر گوشت اور خوب بھرے ہوئے ہوں۔

و بيتها فساح فاء مفتوحہ اور مضمومہ دونوں کے ساتھ مروی ہے۔فسح کشادگی اور وسعت کو کہتے ہیں۔اور ایک روایت میں فیاح آتا ہے۔اسکا معنی بھی فراخی اور وسعت ہے چونکہ گھر کی مالکن عموماً ساس ہوتی ہے۔کھانوں وغیرہ پر وہ عموماً اپنا اختیار جتاتی ہے۔اور اسی وجہ سے اکثر بہو کو شکایت بھی ہوتی ہے لیکن یہ عورت ساس کی تعریف کرتے ہوئے کہتی ہے کہ وہ کنجوس نہ تھی۔اس کے کھانے کے برتن بڑے وسیع اور خوب بھرے ہوئے تھے۔گھر بھی کشادہ تھا۔

ابن ابی زرع خاوند کے بیٹے کی تعریف کرتی ہے۔**مضجعه كمسل شطبه مضجع** بستر ے اور خصوصاً اس جگہ کو کہتے ہیں جہاں انسان کا پہلو بستر ے سے ملتا ہے اور **مسل سلّ يسل** سے ہے۔جس کے معنی باہر نکالنے کے ہیں۔**مسل** یہاں **مسلول** کے معنی میں مستعمل ہے۔اور **شطبه** شین کے فتحہ کے ساتھ **شطب يشطب** (نصر) سے اسم ہے جو طولاً کاٹنے کو کہتے ہیں۔**شطبة اور شطيبة "قطعة تقطع طولا"** یعنی کسی چیز کا وہ قطعہ جو لمبائی میں کاٹا جائے۔اس کا اطلاق کھجور کی شاخ سے جدا کئے جانے والے لمبے ٹکڑے پر بھی ہوتا ہے۔اور کھجور کے پتوں پر بھی جو کہ شاخ سے الگ کردی جائیں۔جبکہ تلوار کیلئے بھی یہ لفظ بولا جاتا ہے۔مسل شطبۃ میں صفت کی اضافت موصوف کو ہوئی ہے۔لہٰذا یہ شطبۃ مسلولۃ کے معنی میں ہے۔اور مراد یہ ہے کہ کھجور کی شاخ سے جدا کی جانیوالی ٹہنی کی طرح باریک اور تھوڑی سی جگہ اس کا بستر ہ ہے۔موٹا اور بھاری بھر کم نہیں ہے کہ سارے بستر کو بھر لے۔اور عربوں کے ہاں مردوں

میں یہ صفت ممدوح ہے۔وتشبعــه ذراع جفرة تشبع اشباع سے مضارع کا صیغہ ہے بھرنے اور سیر کردینے کو کہتے ہیں۔ذراع جانور کے اگلے پاؤں کو کہتے ہیں اور جفرہ بکری کے بچے لیلے کو کہتے ہیں جو ماں کا دودھ پینا چھوڑ دے۔بعض شراح کے ہاں جب چار ماہ کا ہوجائے تو اسے جفرہ کہتے ہیں غلامٌ جفرٌ اس بچے کو کہا جاتا ہے جس کے پہلو بڑے ہوجائیں۔یہاں مقصود یہ ہے کہ وہ کم کھانے والا ہے۔لیلے کے صرف ایک ہاتھ سے سیر ہوجاتا ہے۔جس پر گوشت بھی کم ہوتا ہے۔اس کلام کا مطلب یہ ہے کہ ابوزرع کا بیٹا چاک وچوبند نوجوان تھا۔چست اور پھرتیلا تھا کھانا بھی کم کھاتا تھا۔زیادہ کھانا بیداری اور چستی کو ختم کرتا ہے اور سستی پیدا کرتا ہے۔علاوہ ازیں دولتمندی اور تعیش کو بھی اشارہ ہے کہ وہ نفیس اور قیمتی کھانا کھاتا ہے۔

بنت أبی زرع الخ دوسری بیوی سے ابوزرع کی بیٹی کی تعریف کرتی ہے۔فمابنت ابی زرع یہاں بھی استفہام تعظیم کیلئے ہے یعنی وہ بھی عظیم اور شریف عورت تھی۔طوع أبیهاوطوع أمّها الخطوع مصدر ہے مبالغۃ فاعل کے معنی میں مستعمل ہوا ہے۔جیسے زید عدل زید عادل کے معنی میں ہے۔یہاں مطلب یہ ہوگا کہ مطیعةٌ لوالدیها کثیرة الاطاعة۔گویا والدین کے بارے میں سراپا اطاعت تھی نافرمان نہ تھی۔اوراسی مبالغہ کیلئے والدہ کے ساتھ دوبارہ طوع کا لفظ لائی ہے ورنہ ابیها پر عطف کرنا بھی کافی تھا۔وملأ کساء ها ملا یملا سے مصدر ہے۔جس کے معنی بھرنے کے ہوتے ہیں۔یہاں اسم فاعل کے معنی میں ہے یعنی مالئة کساء ها اپنے کپڑوں اور برقعہ کو بھرنے والی یعنی خوب فربہ اندام تھی(۱)۔وغیظ جارتها. غیظ کے معنی کسی کو غصہ دلانا اور ناراض کرنا ہے یعنی مغیظةٌ لجارتها. اور جارة اس مقام پر ضرّةٌ یعنی سوکن کے معنی میں ہے۔ایک روایت میں عقر جارتها آیا ہے۔جس کا معنی ہے کہ وہ سوکن کی موت تھی۔مطلب یہ ہے کہ وہ اتنی حسین فربہ اور خوش اندام تھی کہ اس کی سوکن ہمیشہ اس سے جلتی رہتی تھی۔اسے دیکھنا گوارا نہیں کرتی تھی۔گویا ابوزرع کی بیٹی اس کے لئے غیظ وغضب کا سبب بنی رہتی تھی۔جاریة أبی زرع الخ اب گھر کی خادمہ کی تعریف کرتی ہے کہ وہ بھی بہت اچھی تھی۔

(۱) بعض روایات میں یہاں ایک اور صفت کا اضافہ بھی مروی ہے۔وہ ہے''وصفر رداء ها'' یعنی اس کی رداء خالی ہوتی تھی اس کا مطلب یہ ہوگا کہ اس کا سینہ اور نچھلا حصہ گوشت سے بھرا ہوتا تھا جبکہ پیٹ پتلی تھی جس کی وجہ سے درمیان میں رداء خالی رہتی تھی البتہ رداء کا اوپری حصہ اور ازار فربہی کی وجہ سے بھرا رہتا تھا۔(اصلاح الدین)

لیکن یہاں فرق مراتب کی وجہ سے تعظیم واستفہام کا کلمہ نہیں لائی (۱)۔تو ابوزرع کی خادمہ کی مدح کرتے ہوئے کہتی ہے کہ وہ بھی اللہ تعالیٰ نے ایسے دی تھی کہ لاتبث حدیثنا تبثیثا الخ بث اور تبثیث دونوں نشر کرنے اور پھیلانے کو کہتے ہیں تبثیث مفعول مطلق من غیر باب الفعل ہے۔یعنی وہ ہماری گھر کی بات اور راز کو ظاہر وشائع نہیں کرتی تھی۔ بلکہ راز کو راز رکھتی تھی۔و لاتنقث الخ نقث (باب نصر) ایک چیز کو دوسری جگہ چوری چھپے یا علانیہ طور پر لے جانے کو کہتے ہیں۔گڑھی ہوئی چیز کو نکال کر لے جانے کو بھی کہتے ہیں۔تو لاتنقث کا معنی ہوالا تنقل میرتنا ماریمیر کھانے پینے کی چیزیں لے جانے اور راشن پہنچانے کو کہتے ہیں۔گھی،غلہ،آٹا،نمک،تیل وغیرہ ضرورت کی چیزوں کی رسد کو میرہ کہتے ہیں۔قرآن مجید میں ہے۔"ونمیر اھلنا" یعنی گھر کیلئے راشن لائیں گے۔حاصل کلام یہ ہوا کہ وہ خادمہ خائنہ نہ تھی کہ راشن کی چیزوں میں ہیر پھیر کر کے خیانت کرے۔اور جب کھانے پینے کی چیزوں میں خیانت نہ ہو تو دوسری چیزوں میں بطریق اولیٰ خیانت نہیں کرتی ہوگی۔

و لاتملا بیتنا اور ایک نسخہ میں بیتنا ہے یعنی ہمارے درمیان یا ہمارے گھر میں کھوٹ نہیں ملاتی تھی تغشیش غش سے ہے جو ملاوٹ دھوکہ اور فریب کو کہتے ہیں اور اگر یہ لفظ تعشیش ہو تو عُش سے ہے جس کا معنی گھونسلا ہوتا ہے اور وہ بھی تنکوں، پروں، پتوں وغیرہ سے بنتے ہیں۔تو تعشیش کے معنی ہیں۔کوڑا کرکٹ اور تنکے وغیرہ جمع کرنا پہلی صورت میں مطلب یہ ہوگا کہ عموماً برے خدمتگار گھر میں بڑے بڑے فساد پیدا کرتے ہیں ایک کی باتیں دوسرے تک پہنچا کر گھروں میں جھگڑے پیدا کرتے ہیں رازوں کو فاش کرتے ہیں۔لیکن یہ خادمہ ان نقائص سے پاک تھی۔ساس نندوں اور میرے درمیان آگ نہیں بھڑکاتی تھی۔بعض شراح نے یہ ترجمہ کیا ہے کہ وہ عفیف الفرج تھی اور کسی کو خود پر قابو نہیں دلاتی تھی۔اور تعشیش عین کے ساتھ ہو تو معنی یہ ہوگا کہ ہمارے گھر کو گھاس، پھوس کوڑا کرکٹ سے نہیں بھرتی تھی تاکہ ایک اور خادم صفائی کیلئے رکھنا پڑے۔صاف ستھرا رکھتی تھی۔بہر حال گھر کے تمام افراد بہت اچھے تھے اور گھر جنت کا نمونہ تھا۔

(۱)واضح رہے کہ بخاری، مسلم اور تمام شروح میں "جاریة ابی زرع فما جاریة ابی زرع" آیا ہے۔ البتہ ترمذی کے ساتھ چھپنے والے شمائل کے نسخے میں "فما جاریة ابی زرع" کا کلمہ نہیں ہے اور حضرت شیخ استاد محترم کی توجیہ اسی کیلئے ہے۔(اصلاح الدین)

<u>امّ زرع کادوسرا شوہر:</u>   خـرج أبو زرع الخ اس کے بعد اپنی کامیاب اورخوشحال زندگی کا زوال بیان کرنے لگی ہے۔ والا طاب تمخض الخ اوطاب وطب کی جمع ہے جو دہی اورلسی کے برتن کو کہتے ہیں اس کا ترجمہ اسقیۃ اللبن سے کیا جاتا ہے اورلبن آج کل دہی کو کہتے ہیں۔ جبکہ دودھ کو حلیب۔ مخض جھٹکے اور شدت سے کسی چیز کو ہلانے کا نام ہے عورت کا جس وقت بچہ پیدا ہوتا ہے تو اس کو جھٹکے لگتے ہیں۔ ان جھٹکوں کے بعد بچے کی ولادت ہوتی ہے۔ اس وجہ سے دردزہ کو بھی مخاض کہتے ہیں اور دہی بلونے کو بھی مخض اس لئے کہتے ہیں کہ دہی بلوتے وقت اوطاب کو دھچکے دیئے جاتے ہیں۔ وہ فصیح وبلیغ لوگ تھے سویرے نکلنے کیلئے یہ جملہ بطور کنایۃ استعمال کرتی ہے اور دراصل یہ سفر پر نکلنے سے کنایہ ہے کیونکہ سفر پر جاتے وقت آدمی کو سویرے اٹھ کر گھر سے جانا ہوتا ہے ایک شاعر کہتا ہے۔

مسافر شب کو اٹھتے ہیں جو جانا دور ہوتا ہے   جوانی میں عدم کے واسطے سامان کر غافل

اس کے ساتھ اس جملے میں اس طرف بھی اشارہ ہے کہ وہ ایسے دنوں میں نکلا جب دودھ زیادہ ہوتا ہے۔ یہ عموماً عربوں کے تجارت کے ایام ہوتے تھے۔ پرانے زمانے میں عورتیں سویرے اٹھتی تھیں تاکہ صبح سویرے جب دہی ٹھنڈا ٹھنڈا ہوتا ہے اسے بلوئے۔ اس طرح مکھن زیادہ نکلتا ہے۔ اس لئے فجر سے بھی پہلے یہ عورتیں اٹھ کر دہی بلوتی تھیں۔ اب تو مغربی تہذیب نے عورتوں کو محنت اور کام کاج سے آزاد کردیا۔ سورج چڑھنے تک سارے لوگ سوئے رہتے ہیں۔ بہرحال ابو زرع صبح سویرے جب کہ عورتیں ابھی دہی بلونے میں لگی ہوئی تھیں گھر سے نکلا۔

فـلـقــی امـرأۃ الخ یعنی میری شامت جو آئی تو اس سفر میں اسے ایک عورت ملی جس کے ہمراہ دو بچے تھے۔ کـالـفـهـدیـن وہ ایسے چست اور چاک و چوبند تھے جیسے کہ چیتے ہوں اچھلتے اور کودتے تھے گویا چیتوں کے ساتھ کھیل اور پھرتی میں تشبیہ ہے۔

یـلـعـبـان مـن تحت الخصر برما نتین الخ اس جملے میں منظر کی دلکشی کے بیان کے ساتھ ساتھ مذکورہ عورت کی نسوانی حسن کی طرف بھی اشارہ ہے کیونکہ اس عورت کی کمر پتلی اور سینہ اور سرین کا حصہ بھرا ہوا اور فربہ تھا۔ وہ لیٹی ہوئی تھی اور اس کے سینہ اور سرین کے درمیان جو خلا سا پیدا ہوتا تھا پتلی کمر کی

وجہ سے اسی کوتحت الخصر سے تعبیر کیا گیا ہے۔یہاں اس کے دو بچے دواناروں کے ساتھ کھیل رہے تھے یعنی اس کے پہلو کے نیچے سے انارادھرادھر پھینکتے جاتے تھے۔یہ دلربا منظر دیکھ کراس آدمی کوتعجب ہوا۔اور ایک توجیہ یہ بھی ہے کہ اس جملہ میں رمانتین عورت کے دو پستانوں کیلئے استعارہ کے طور پر مستعمل ہے۔جیسا کہ بعض روایات میں تحت صدر ہااور دوسری میں تحت درعہا سے اس توجیہ کی تائید ہوتی ہے۔پستانوں کواناروں کے ساتھ تشبیہ دی ہے یعنی یہ دو بچے اس عورت کے پستانوں کے ساتھ کھیل رہے تھے اور اس قسم کی تشبیہ متعارف بھی ہے۔ایک شاعر کا مصرع ہے ع وغصناٍ فیه رمّانٌ صغارُ. یعنی وہ محبوبہ ایک ٹہنی کی طرح ہے جس پر دوانار لگے ہوئے ہیں۔

فطلّقنی الخ یعنی اس عورت کے حسن سے متاثر ہوااور بیٹوں کی پھرتی سے نجابت کا علم ہوا تو ابوزرع نے مجھے طلاق دیکر اس عورت سے نکاح کرلیا۔فنکحتُ بعدهُ الخ اس زمانہ میں عورت کیلئے دوسرے مرد کے ساتھ شادی کوئی معیوب بات نہ تھی بلکہ آج بھی عرب معاشرے میں حالت تقریباً یہی ہے اور یہ عین اسلامی طریقہ بھی ہے اس میں نہ مرد کیلئے کوئی مسئلہ ہے نہ عورت کو مشکلات۔الغرض عورت نے اس کے بعد اس مرد سے نکاح کیا۔

رجلا سریا رکب شریا سریؓ سردار کے معنی میں بھی مستعمل ہے۔اور جاری نہر کو بھی کہتے ہیں۔ اسی وجہ سورۃ مریم کی آیت قَدْ جَعَلَ رَبّکِ تحتک سریّا کا ایک معنی تو یہ کیا جاتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے تیرے نزدیک ہی نشیب میں ایک چشمہ یا نہر جاری کردیا۔اور دوسرا معنی یہ بھی کیا جاتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے تجھ سے ایک بڑے سردار کوجنم دینے کا انتظام کردیا ہے یعنی وجیه فی الدنیا و الآخرة ۔پیغمبر حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو پیدا فرمایا ہےاور شریؓ اس گھوڑے کو کہتے ہیں جو کہ خاص انداز سے مستی اور دلکی چال چلے۔نیز مسلسل سفر کرتا جائے اور سفر کے دوران رکنے کا نام نہ لے۔اخذ خطیّا الخ نیزے کی صفت ہے۔یعنی رمحاً خطّیاً. خط جزیرۃ العرب کے جنوب مشرقی علاقے میں عمان کا ایک ساحلی شہر ہے جس میں بنائے جانے والے نیزے بہت اعلیٰ ہوتے تھے جسطرح کہ آج کل بعض ممالک کا اسلحہ بہت مشہور ہوتا ہے۔

مطلب یہ ہے کہ ابوزرع کے بعد میں نے ایک ایسے شخص سے نکاح کیا جو نہ صرف سردار تھا بلکہ سرکش گھوڑے پرسوار ہوتا تھا جنگجو اور نیزہ باز بھی تھا۔واراح علی نعما ثریا اراح یریح رواح سے

افعال کا صیغہ ہے۔شام کے وقت کوئی چیز لا کر دینے کو کہتے ہیں۔شام کو گھر واپس آنے والے جانوروں کو رائحہ جانور کہتے ہیں۔نعم کا اطلاق اونٹ،بیل اور بھیڑ بکریوں پر ہوتا ہے۔بعض نے اونٹوں کے ساتھ اسے خاص کہا ہے لیکن یہ درست نہیں ہے۔اور ثریاً ثروۃ سے کثرت کے معنی کا حامل ہے۔یعنی بہت زیادہ مویشی اور جانور مجھے مہیا کر دیئے۔شام کو گھر آتے تو گھر بھر جاتا تھا۔

واعطانی من کل رائحة زوجاً رائحہ سے ہر راحت کی چیز مراد ہے۔یا شام کے وقت گھر آنے والے جانور مراد ہیں مطلب یہ ہے کہ گائے بھیڑ بکری وغیرہ دیئے۔بعض روایات میں ذال کے ساتھ ذابحہ کا لفظ آیا ہے۔یعنی **مایجوز ذبحه** (ذبح ہونے والے جانور) مجھے کئی دیئے ایک پر اکتفاء نہیں کیا۔

ومیری اهلک میری ماریمیر سے امر حاضر واحد مونث کا صیغہ ہے میرۃ راشن پہنچانے کو کہتے ہیں مطلب یہ ہے کہ گھر والوں یعنی رشتہ داروں،والدین کو بھی دیتی رہو پرواہ نہ کرو یعنی والدین اور میکے والوں کے پاس کچھ بھیجنے سے مجھے رنج نہیں ہوگا۔ہر عورت اس بات سے خوش ہوتی ہے کہ اس کا خاوند اس کے میکے کو قدر کی نظر سے دیکھے۔ام زرع بھی اس بات سے اپنے خاوند کی کشادہ دلی بیان کر رہی ہے۔

فلوجمعت الخ تمام نعمتوں اور احسانات کے باوصف ام زرع ابوزرع اور اس کی محبت کو یاد کر رہی ہے۔اس جملے کا مطلب یہ ہے کہ اگر زوج ثانی کے تمام احسانات اور اس کی نعمتیں جمع کر دوں تو ابوزرع کے احسانات کے چھوٹے سے برتن میں سما جائیں۔بلکہ اس تک بھی نہ پہنچ سکیں۔وفاداری کی یہ عادت بعض لوگوں میں ہوتی ہے کہ علیحدگی کے باوجود بھی وہ پہلے خاوند کو یاد کرتی ہے اور خوشحالی کے باوجود اسی کا ذکر کر رہی ہے(۱)۔

---

(۱) یہی درحقیقت پہلی محبت کا جذبہ بھی ہے جس کی طرف ابوتمام نے یوں اشارہ کیا ہے۔

نقل فؤادک حیث شئت من الھویٰ   ماالحب الا للحبیب الاول

کم منزل فی الارض یا لفة الفتیٰ   وحنینه ابداً لاوّل منزل

اسی وجہ سے کہا جاتا ہے کہ "الشیب نصف المرأة" کیونکہ پوری نہ ہو تو کم از کم آدھی محبت وہ پہلے خاوند کو دے دیتی ہے اور حضرت عائشہ رضی اللہ عنہ کی محبوبیت اور ام زرع کا مقام دینے کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ وہ واحد کنواری تھیں جو آپ ﷺ کے پاس تھیں۔(اصلاح الدین)

حضرت عائشہؓ نگاہ رسول ﷺ میں: قالت فقال رسول اللہ ﷺ الخ قصہ ختم ہوجانے کے بعد نبی کریم ﷺ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہ کی دلجوئی بے مثال انداز سے فرماتے ہیں کہ میں تیرے لئے ابوزرع کے مرتبے میں ہوں یعنی اس طرح کی محبت میں تیرے ساتھ کرتا ہوں جس طرح کی محبت کو ام زرع آخردم تک یاد کرتی رہی۔اورایک روایت میں ہے غیر انی لم اطلقک (۱) یعنی میری محبت تو ویسی ہی ہے لیکن ابوزرع نے بے وفائی کرکے بیوی کو طلاق دے دی اور میں یہ کام نہیں کروں گا۔بعض روایات کے الفاظ یوں ہیں کنت لک کابی زرع لام ذرع فی الالفة والرفاء (۲) ایک دوسری روایت کے مطابق حضرت عائشہ رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ نہیں بلکہ آپ ﷺ میرے لئے ابوزرع سے ہزاروں درجہ بڑھ کر ہیں ابوزرع کیا تھا(۳)۔کیونکہ وہ تو صرف دنیوی لذات مہیا کرتا رہا اور پھر طلاق بھی دیدی لیکن نبی کریم ﷺ نے اس کے ساتھ اخروی منافع سے بھی مالا مال فرمایا۔

حدیث سے مسائل مستنبطہ: اس حدیث سے علماء نے متعدد مسائل مستنبط کئے ہیں لیکن امام ترمذی رحمۃ اللہ علیہ حدیث اس مقصد کیلئے لائے ہیں کہ ایک دائرے کے اندر اور حدود شریعت کا پابند رہتے ہوئے حسن معاشرت کی خاطر رات کے وقت سونے سے پہلے قصہ گوئی جائز ہے۔جس طرح کہ نبی کریم ﷺ کے عمل سے ظاہر ہوتا ہے اس کے علاوہ اس حدیث سے دیگر مسائل بھی مستنبط کئے گئے ہیں مثلاً

(۱) فضیلت عائشہ رضی اللہ عنہ اور نبی کریم ﷺ کے ہاں ان کا مرتبہ اسی وجہ سے امام مسلم رحمۃ اللہ علیہ نے یہ حدیث حضرت عائشہ رضی اللہ عنہ کے فضائل کے باب میں ذکر کیا ہے(۴)۔

(۲) بیویوں کے ساتھ محبت اور حسن معاشرت کا اہتمام کرنا۔اسی لئے بخاری شریف میں اس حدیث کو باب حسن المعاشرۃ مع الاہل کے تحت لایا گیا ہے(۵)۔

---

(۱) جمع الوسائل ج۲ص۲۷

(۲) نقله القاری فی الجمع عن بعض الکتب ج ۲ ص ۲۷

(۳) زادالزبیر إلاّ أنّه طلّقها وإنّی لااطلّقک فقالت عائشة رضی الله عنها بابی انت وامی لانت خیر لی من أبی زرع لامّ زرع. تو شیخ علی حاشیة البخاری ج ۱ ص ۷۸۰ (اصلاح الدین)

(۴) مسلم شریف ج۲ص۲۸۷

(۵) بخاری شریف ج۲ص۷۷۹

(۳)امم سابقہ کے واقعات کا بیان اور تاریخ گوئی کا جواز

(۴) یہ کہ مشبہ اور مشبہ بہ میں تمام وجوہ میں مماثلت شرط نہیں جیسا کہ نبی کریم ﷺ نے خود کو ابوزرع سے تشبیہ دی لیکن خود ہی بعض صفات کی نفی بھی کر دی۔

(۵) اگر محکی عنہ غیر معروف ہو اور اس کی حکایت سے اس کی بے عزتی نہ ہو تو اس کے عیوب کا بیان غیبت کے زمرے میں نہیں آتا۔

خلاصہ باب

اس باب میں نبی کریم ﷺ سے رات کو قصہ گوئی نقل کی گئی ہے۔جس سے بظاہر اس کا جواز معلوم ہو رہا ہے اور ابتدائے باب میں ہم لکھ چکے ہیں کہ جہاں کراہت کا ذکر آیا ہے اس کا اپنا محمل ہے۔

نبی کریم ﷺ سے ان دو احادیث کے علاوہ دیگر احادیث میں بھی سمر یعنی رات کی قصہ گوئی اور بات چیت منقول ہے۔ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے ساتھ بھی رات کو نماز کے بعد کبھی کبھی مشورہ اور باتیں کرتے تھے جس کا روایت میں ذکر موجود ہے۔

خلاصہ یہ کہ رات کو قصہ گوئی جائز اور نبی کریم ﷺ کے عمل سے ثابت ہے۔لیکن اس کے ساتھ ان دونوں احادیث میں مزید بے شمار احکام کو بھی اشارہ ہے۔جن کو ہم دوران تشریح بیان کر چکے ہیں۔

۳۹. باب ما جاء فی صفة نوم رسول اللّٰہ ﷺ

حضور اقدس ﷺ کے نیند کا بیان

گزشتہ باب میں نیند سے پہلے قصے سنانے کا ذکر تھا چونکہ ایسی قصہ گوئی کے بعد نیند ہوتی ہے اس لئے اس باب میں نیند کا ذکر کیا جاتا ہے۔نوم(۱) ذہول کی اس کیفیت کا نام ہے جس میں حواس اپنا کام چھوڑ دیتے ہیں اور علم و معرفت اور ادراک ماند پڑ جاتی ہے۔اس لئے اسے اخو الموت یعنی موت کا بھائی کہا جاتا ہے۔اس سے قبل کچھ دیگر کیفیات بھی ہوتی ہیں جن کے لیے عربی میں اپنے نام ہیں۔مثلا سِنَةٌ اس کیفیت کو کہا جاتا ہے جس میں صرف سر بھاری ہو جاتا ہے۔اس کے بعد جب آنکھیں بھاری ہو کر بند ہونے لگتی ہیں تو اسے نعاس کہتے ہیں۔اور جب یہ کیفیت دل تک پہنچ جاتی ہے تو نوم کہلاتی ہے۔

<u>نیند کی کیفیت اور دعائیں</u>: اس باب میں نبی کریم ﷺ کی نیند کی کیفیت کے ساتھ وہ دعائیں بھی منقول ہیں جو آپ ﷺ نے اس سے پہلے یا اس کے بعد پڑھی تھیں۔

(۱) حدثنا محمّد بن المثنٰی أنبأنا عبدالرحمٰن بن مهديّ أنا إسرائيل عن أبی إسحاق عن عبداللّٰه بن يزيد عن البراء بن عازب إنّ رسول اللّٰه ﷺ كان اذا اخذ مضجعه وضع كفّه اليمنٰی تحت خدّه الأيمن وقال ربّ قنی عذابک يوم تبعث عبادک(۲).

ترجمہ: حضرت براء بن عازبؓ سے روایت ہے کہ جب نبی کریم ﷺ اپنے بستر پر لیٹ جاتے تھے تو اپنا ہاتھ رخسار کے نیچے رکھ کر لیٹ جاتے تھے۔اور یہ دعا فرماتے

---

(۱) نوم کا لغوی معنی ہے سونا،اونگھنا اور مرنا اور اصطلاح میں غشية ثقيلة تهجم علی القلب فتقطعه عن المعرفة بالاشياء(المواهب اللدنية ص ۱۶۹) اور علامہ مناویؒ نے یوں تعریف کی ہے والنوم حالة طبعية تتعطل معها القویٰ تسير فی البخار إلیٰ الدماغ(المناوی علی هامش جمع الوسائل ۲/۴۷)(مختار)

(۲) السنن الكبریٰ ۶/۱۸۸ كتاب عمل اليوم والليلة باب مايقول اذاأویٰ إلی فراشه جامع ترمذی ۲/۶۵۰ ابواب الدعوات باب ماجاء فی الدعا اذا اویٰ الی فراشه،الادب المغرد للامام البخاری ۳۱۳ رقم الحديث ۱۲۱۶ مصنف ابن ابی شيبة ۹/۷۶(مختار)

تھے کہ" رِبّ قِنی عذابک یوم تبعث عبادک "یعنی اے میرے رب مجھے
اس دن کے عذاب سے بچا جس دن تو اپنے بندوں کو زندہ کر کے اٹھائے گا۔

إذا اخذ مضجعه مضجع ضَجَعَ سے ظرف کا صیغہ ہے۔مضجع لیٹنے کی جگہ کو کہتے ہیں۔ بستر مراد ہے۔وضع کفہ الیمنی کف سے ہتھیلی مراد ہے۔اس سے یہ پتہ چلتا ہے کہ نبی کریم ﷺ دائیں کروٹ سویا کرتے تھے۔اس طرح کے سونے میں ایک تو دائیں جانب کی تفضیل ہے۔آپ ﷺ کرامت کے کاموں میں دائیں کو بائیں پر ترجیح دیا کرتے تھے اور یہی وجہ سب سے بہتر وجہ ہے۔دوسری وجہ یہ بھی ہے کہ دائیں کروٹ سونے سے دل پر دیگر اعضاء کا بوجھ نہیں ہوتا کیونکہ دل سینے میں بائیں جانب کو ہے۔اس لئے ایسی نیند میں استغراق نہیں ہوتا۔اور بائیں جانب لیٹنے سے دل نیچے دب جاتا ہے۔جس کی وجہ سے نیند سے بیداری میں دقت ہوتی ہے۔لیکن یہ توجیہ اس وقت درست ہوگی جب کسی کو دائیں جانب لیٹنے کی عادت نہ ہو۔ورنہ بکثرت دائیں جانب لیٹنے سے جب اس کی عادت پڑ جاتی ہے تو اسی طرف کروٹ لیٹنے میں مزہ آتا ہے۔اور اسی جانب لیٹنا امت کی تعلیم کے لیے ہوگا(۱)۔ورنہ آپ ﷺ کا دل سوتے میں بھی بیدار رہوتا تھا۔لہٰذا آپ ﷺ کے لیے دائیں بائیں سے فرق نہیں پڑتا تھا۔

ربّ قِنی عذابک اس دعا میں نبی کریم ﷺ نے نہایت تواضع سے کام لیا ہے ورنہ عذاب سے بچنے کی دعا کی ضرورت آپ ﷺ کے لیے نہیں تھی۔یا پھر تعلیمِ امت کے لیے آپ ﷺ نے یہ دعا فرمائی۔یوم تبعث عبادک چونکہ نیند موت کی طرح اور بیداری بعث بعد الموت سے مشابہ ہے۔لہٰذا

---

(۱)اس روایت سے یہ بات ثابت ہے کہ دائیں کروٹ سونا مستحب ہے اور چت لیٹنا یا بائیں پہلو پر لیٹنا یا الٹا لیٹنا مکروہ ہے۔علامہ عبدالجواد الدومیؒ نے لکھا ہے وهذا دليل على استحباب النوم على الشق الايمن، وقد كره العلماء النوم على الظهر و البطن وعلى الجانب الايسر (الاتحافات ۳۰۶) طبی لحاظ سے بائیں جانب سونا اگرچہ نظام ہضم کے لئے فائدہ مند ہے مگر دوسری طرف دل پر اثرانداز ہوتا ہے تو نقصان دہ ہے۔شیخ الحدیث مولانا زکریا صاحبؒ نے لکھا ہے کہ بعض اطباء نے بائیں جانب سونے کو اچھا بتایا ہے کہ گہری نیند آنے سے ہضم بہتر ہوتا ہے اور یہ صحیح ہے لیکن اس میں ایک مضرت بھی ہے جس کی طرف ان کا ذہن نہیں گیا وہ یہ کہ جب دل نیچے کی جانب ہوگا تو تمام بدن کا زور اس پر پڑے گا اور بدن کا مواد اس پر اثر کرے گا دل اعضائے رئیسہ میں اہم عضو ہے اس پر مواد کا تھوڑا سا اثر ہونا بھی بہت سے امراض کا سبب اس لئے بائیں کروٹ سونے میں اگر طبی مصلحت ہے تو ایک طبی مضرت بھی ہے اور مضرت سے بچنا زیادہ اہم ہے اس لئے طبی حیثیت سے بھی دائیں کروٹ پر سونا بہتر ہے۔(خصائل ۲۰۸،۲۰۹)(مختار)

نیند کے ساتھ بعثت کی یادفطری بات تھی۔

(۲) حدّثنا محمّد بن المثنیٰ أنبانا عبدالرحمٰن انا إسرائیل عن أبی إسحاق عن أبی عبیدۃ عن عبداللّٰہ مثلہ و قال یوم تجمع عبادک.

ترجمہ: حضرت عبداللہ بن مسعودؓ سے بھی اسی طرح کی حدیث مروی ہے(صرف یہ فرق ہے) کہ آپ نے فرمایا"**یوم تجمع عبادک**"یعنی جب تم بندوں کو جمع کروگے۔

عن ابی عبیدۃ عن عبداللّٰہ ابوعبیدۃ حضرت ابن مسعود کے بیٹے ہیں۔اپنے والد سے حضرت براءؓ کی طرح کی حدیث نقل کرتے ہیں صرف **یوم تبعث** کی بجائے یوم تجمع کہا ہے۔جمع بعثت کے بعد قیامت کے روز ہی ہوگی(۱)۔

(۳) حدّثنا محمود بن غیلان ثنا عبدالرزاق أنا سفیان عن عبدالمالک بن عمیر عن ربعی بن حراش عن حذیفۃ قال کان النّبیّ ﷺ اذا آوی الی فراشہ قال اللھمّ باسمک أموت و أحییٰ وإذا ستیقظ قال الحمد للّٰہ الذی أحیانا بعد ماأماتنا وإلیہ النشور(۲).

ترجمہ: حضرت حذیفہؓ کہتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ جب بستر پر لیٹتے تو یہ کہتے"اے اللہ تیرے ہی نام سے مرتا(سوتا)ہوں اور تیرے ہی نام سے زندہ ہوتا(جاگتا)ہوں۔اور جب جاگ جاتے تو فرماتے"تمام تعریفیں اس اللہ کے لیے ہیں جس نے ہمیں موت کے بعد زندگی بخشی اور اسی کی جانب ہم نے رجوع کرنا ہے۔

---

(۱) پہلی روایت میں یوم تبعث ہے اور اس میں یوم تجمع ہے اس کی وجہ علامہ بیجوریؒ **قال یوتجمع عبادک أی بدل یوم تبعث عبادک ولابدمن تحق البعث والجمع معافاکتفیٰ فی کل حدیث بأحدھمالأنّہ یکون البعث ثمّ الجمع ثمّ النشور کما ورد(المواھب اللدنیۃ ص ۱۷۰)(مختار)**

(۲)صحیح بخاری ۲/۹۳۴ کتاب الدعوات باب مایقول اذانام، سنن ابی داؤد ۲/۳۴۰ کتاب الادب باب مایقول عندالنوم، جامع ترمذی ۲/۱۵۲ کتاب الدعوات باب منہ، السنن الکبریٰ للنسائی ۶/۱۸۷ کتاب عمل الیوم واللیلۃ باب ما یقول اذا ارادأن ینام (مختار)

إذا آوی الی فراشہ الخ حضرت حذیفہؓ فرماتے ہیں کہ جب آپ ﷺ اپنے بستر کو آتے تو مذکورہ دعا پڑھتے۔ ایواء حفاظت کی جگہ کو پہنچنے کو کہتے ہیں۔ ٹھکانے کو ماٗوی کہتے ہیں۔ قرآن مجید میں ہے آو آوِیْ اِلٰی رُکْنٍ شَدِیْدٍ. حضرت لوطؑ فرماتے ہیں کہ کاش میرا بھی مضبوط ٹھکانہ اور مرجع ہوتا جہاں میں سر چھپاتا اور جن سے دشمنانِ دین کے خلاف مدد حاصل کرتا۔

اللھم باسمک اموت (۱) **واحییٰ الخ** یعنی تیرے نام کو مستحضر کرتا ہوں میرا ایمان ہے توحید پر۔ اور اسی حالت میں سوتا ہوں۔ نیند ایک لحاظ سے موتِ اصغر ہے۔

نیند کی موت سے مشابہت: کیونکہ اس میں حواس معطل ہوجاتے ہیں۔ نیز موت کا اطلاق تعطل اور زوالِ حواس پر بھی ہوتا ہے۔ کہتے ہیں **النوم اخو الموت. واحییٰ** اور تیرے نام کے ساتھ زندہ ہوتا ہوں۔ یعنی جاگتا ہوں۔ اور حواس کا تعطل ختم ہونے کو حیاۃ کہا ہے۔

اس سارے جملے میں حضرت ابراہیمؑ کے قول کی طرف اشارہ ہے۔ انہوں نے فرمایا کہ **ان صلاتی ونسکی ومحیای و مماتی للّٰہ ربّ العالمین** ۔ نیز اس بات پر تنبیہ ہے کہ نیند سے پہلے یہ تصور کرنا چاہیے کہ شاید یہ آخری نیند ہو اور اسی میں روح قبض ہو۔ لہٰذا حسن خاتمہ کے لیے اللہ تعالیٰ کا ذکر چاہیے۔ اور بیدار ہونے کے بعد ادراک اور حس وحرکت دوبارہ ملنے پر خداوندِ تعالیٰ کا شکر ادا کرنا چاہیے۔

لیکن یہ سب کچھ ظاہری اعتبار سے ہے ورنہ حقیقت میں نبی کریم ﷺ کے نزدیک موت ہی بیداری ہے۔ نیند نہیں۔ اور ہم زندگی کی حالت میں نیند میں ہیں۔ مرجائیں گے تب ہی بیدار ہونگے۔ **انتبھوا** کہ زندہ لوگ خوابیدہ ہیں جب مرینگے تب بیدار ہونگے۔ **الناس نیام اذا ماتوا انتبھوا** کیونکہ اس وقت سارے حقائق محسوسات کی طرح منکشف ہوجائیں گے۔ اور یہی وجہ ہے کہ مومن زندگی کے تکالیف سے نہیں ڈرتا۔ وہ بڑی مصیبتوں کو صبر واستقامت سے جھیل سکتا ہے کیونکہ خواب کی تکلیف درحقیقت

---

(۱) ملاعلی قاریؒ نے موت کے مختلف معانی نقل کیے ہیں (۱) سکون (ٹھہرنا) **وقیل الموت فی کلام العرب یطلق علی السکون یقال ماتت الریح إذا سکنت** (۲) جہالت **وقدیستعمل فی زوال القوّة العاقلة وھی الجھالة کقولہ تعالیٰ اومن کان میتاً فأحییناہ(الایة)** (۳) احوال شاقہ **وقدیستعار الموت للاحوال الشاقة کالفضر والذل والسوال والھرام والمعصیة وغیرذلک(جمع الوسائل ۲/۷۵)(مختار)**

تکلیف ہے ہی نہیں۔ جاگنے کے بعد ساری کدورت دور ہو جاتی ہے۔ جبکہ کافر و فاسق دنیا میں مزے اڑائیں تو کیا؟ ابھی موت آئی آنکھیں کھلیں اور مار پڑنے لگی تو زندگی کے خواب میں مزوں سے کیا فائدہ۔ جب جاگنے کے بعد کدورت ہی کدورت ہے۔

<u>نیند سے بیداری کی بعثت سے مشابہت:</u> والیہ النشور (۱) نیند سے بیدار ہونے کے بعد آخرت کی بعثت اور اللہ تعالیٰ کے ہاں حاضری کا دھیان ہونا چاہیے۔ اور اعمال کے حساب کو یاد کرنا چاہیے۔ تاکہ استقامت میں فرق نہ آئے۔

(۴) حدّثنا قتیبة بن سعیدثنا المفضّل بن فضاله عن عقیل اراه عن الزّھری عن عروة عن عائشة قالت کان رسول اللّٰہﷺ إذاأوی إلیٰ فراشه کلّ لیلة جمع کفّیه فنفث فیهما وقرأفیهما قل ھواللّٰہ احد و قل أعوذ برب الفلق وقل أعوذ برب النّاس ثم مسح بهما ما استطاع من جسده یبدء بهما راسه ووجهه و ما أقبل من جسده یصنع ذلک ثلاث مرات(۲).

ترجمہ: حضرت عائشہؓ کہتی ہیں کہ نبی کریمﷺ ہر رات کو جب بستر پر لیٹتے تو دونوں ہاتھوں کو ملا کر ان پر دم فرمادیتے تھے۔ اور (تین سورتیں) **قل ھو اللّٰہ احد، قل اعوذ برب الفلق** اور **قل اعوذ برب الناس** پڑھ لیتے تھے۔ جہاں تک ان

---

(۱) علامہ ملاعلی قاریؒ الیہ النشور کی تشریح کرتے ہوئے لکھتے ہیں ای وإلیه المرجع فی نیل الثواب ممّا نکتسبه فی حیاتناهذه (جمع الوسائل ۲/۷۵) اور علامہ نوویؒ نے نشور سے بعث بعدالموت لیا ہے وقال النوویؒ المراد بـاماتتنا النوم وامّا النشور ھوالاحیاء للبعث یوم القیامة فنبهﷺ باعادة الیقظة بعدالنوم الذی ھو شبیه بالموت علی اثبات البعث بعد الموت اور بعض نے نشور سے مراد التفرق فی امر المعاش کا لافتراق حال المعاد لیا ہے (جمع الوسائل ۲/۷۵) (مختار)

(۲) صحیح بخاری ۲/۷۵۰ کتاب فضائل القرآن باب فض المعوذات، سنن ابی داؤد ۲/۳۴۰ کتاب الادب بـاب مایقول عندالنوم، جامع ترمذی ۲/۱۷۵ کتاب الدعوات باب ماجاء فیمن یقرأ القرآن عندالمنام، السنن الکبریٰ للنسائی ۶/۱۹۰ کتاب عمل الیوم واللیلة باب مایقول من یفزع فی منامه، سنن ابن ماجة ص۲۷۶ کتاب الدعاء باب مایدعوبه إذا اوی إلی فراشه.(مختار)

کے ہاتھ پہنچتے اپنے ہاتھوں کو بدن پر پھیر لیتے تھے۔سر اور چہرے سے شروع کر کے
بدن کے اگلے حصے پر پہلے ہاتھ پھیرتے تھے۔تین مرتبہ آپﷺ ایسا کرتے تھے۔

<u>دم ڈالنا اور پھونک مارنا:</u> فنفث فيهما نفخ پھونک مارنے کو کہتے ہیں جس کے ساتھ لعاب نہیں ہوتے۔نفث بھی بعض لوگوں کے ہاں اسی معنی میں ہے اور کچھ لوگوں کے ہاں نفث میں تھوڑا سا لعاب ہوتا ہے جبکہ تفل تھوکنے کو کہتے ہیں۔امام نوویؒ نے اہل اللغت سے نقل کیا ہے کہ النفث لطيف بلا ريق یعنی نفث نرم پھونک کو کہتے ہیں جس میں لعاب شامل نہ ہو۔عموماً دم کرتے وقت ایسا ہی کیا جاتا ہے۔اس سے مقصود برکت ہوتی ہے۔تو آپﷺ ہاتھوں کو جمع کر کے اس میں نفث فرماتے تھے۔

یعنی کچھ پڑھ کر دونوں ہاتھوں پر دم کرتے تھے گویا ذکر کی وجہ سے منہ میں اور پھر لعاب اور پھونک کے واسطے سے ہاتھوں میں برکت آ جاتی ہے۔وقرأ فيهما یہاں واو مطلق جمع کے لیے ہے کیونکہ نفث عموماً قراءۃ کے بعد ہوتا ہے(۱)۔بعض روایات میں فقرأ فاء کے ساتھ آیا ہے لیکن فاء کو بھی واو کے معنی میں لیا گیا ہے(۲)۔آپﷺ قرآن مجید کی آخری تین سورتیں پڑھتے اور بعض روایات میں مسبحات کا ذکر

---

(۱)اور یہی جمہور کی رائے ہے۔لأنّ النفث ينبغي ان يكون بعدالتلاوة ليوصل بركة القرآن إلىٰ بشرته(حاشيه شمائل ترمذی) اور ملا علی قاریؒ نے لکھا ہے لأنّ تقديم النفث على القرأة ممّالم يقل به احدٌ(جمع الوسائل ۲/۷۷) اگرچہ بعض حضرات نے اولاً نفث اور پھر قرأۃ کو ترجیح دی ہے جیسا روایت بالا سے بظاہر معلوم ہوتا ہے.قال العلامه البيجوری(قوله وقرأفيهما)وفی رواية فقرأبالفاء ومقتقى الرواية الاولىٰ أنّ تقديم النفث على القرأة وعكسه سيان حيث كانابعدجمع الكفين ومقتضىٰ الرواية الثانية أن النفث يكون قبل القرأة وبه جزم بعضهم وعلّل ذلک بمخالفة السحرة فانّهم ينفثون بعد القرأة (المواهب اللدنية ص ۱۷۱)لكنّ ظاهر كلام الشيخ ابن حجرؒ أنّ الاولىٰ تقديم القرأة على النفث فانّه حمل رواية الفاء على أنّ قوله فنفث فيهما فقرأة معناه فأرادالنفث فيهما فقرأ فنفث بالفعل (المواهب الدنية ص ۱۷۱) مگر علامہ بیجوریؒ نے اس توجیہ کی تردید کرتے ہوئے فرمایا ہے۔ولايخفى ما فى هذا الحمل من التكلف لأنّه خلاف ظاهر(المواهب اللدنية ص ۱۷۱) اور امام فرأؒ نے فرمایا ہے کہ الفاء لاتفيد الفاء الترتيب واحتجّ بقوله تعالىٰ اهلكناهافجاء ها بأسنابياتاًوهم نائمون(جمع الوسائل ۲/۷۷) مگر جو توجیہ مولانا صاحب مدظلہ نے ذکر فرمائی ہے وہ زیادہ وزنی ہے اس لئے کہ قاموس میں ہے انّ الفاء تأتی بمعنى الواو(جمع الوسائل ۲/۷۷)اور یہ توجیہ تکلف سے بھی خالی ہے۔(مختار)

(۲)فاء والی روایت کی ایک توجیہ علامہ ابن حجرؒ نے بھی کی ہے۔(مختار)

بھی ہے یعنی وہ سورتیں جن کی ابتداء میں تسبیح وارد ہوئی ہے جیسے سبحٰن الذی أسریٰ الخ۔یا سَبَّحَ لِلّٰہ الخ ۔ان روایات میں تعارض نہیں کیونکہ ممکن ہے کہ ایک وقت میں ایک سورۃ پڑھتے اور دوسرے وقت میں دوسری سورۃ پڑھتے ۔ما استطاع یعنی جہاں تک ہاتھ پہنچتا اور ممکن ہوتا یعنی سر سے شروع کرتے پھر جسم کے مقدم حصے پر ہاتھ پھیرتے پھر پیٹھ پر پھیرتے اور تین بار یہ عمل دہراتے۔تاکہ کمال برکت حاصل ہو اگرچہ نفس برکت ایک بار سے حاصل ہوجاتی ہے۔

(۵) حدّثنا محمّد بن بشّار ثنا عبدالرحمٰن بن مھدی ثنا سفیان عن سلمة بن کھیل عن کریب عن ابن عبّاس أنّ رسول اللّٰہ ﷺ نام حتّٰی نفخ و کان إذا نام نفخ فاتاہ بلال فاذنہ بالصّلٰوۃ فقام وصلّیٰ ولم یتوضّأ وفی الحدیث قصّة(۱).

ترجمہ: حضرت عبداللہ بن عباسؓ فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ سوئے تو خراٹے لینے لگے اور آپ ﷺ کی یہ عادت تھی جب سوتے تو خراٹے لیتے تھے۔پھر بلال آئے اور نماز کی تیاری کی اطلاع دی چنانچہ آپ ﷺ نے نماز پڑھی اور وضوء کی تجدید نہیں کی۔

<u>نیند میں خراٹے:</u> حتی نفخ الخ یہاں تک کہ آپ ﷺ خراٹے لینا شروع کردیتے تھے۔وہ صحت مند انسان جس کا سینہ مضبوط ہوتا ہے۔ عموماً سوتے وقت خراٹے لینا شروع کردیتا ہے۔آپ ﷺ بھی خراٹے لیتے تھے(۲)۔

---

(۱)صحیح بخاری کتاب الدعوات باب الدعاء إذاأنتبہ من الیل، صحیح مسلم کتاب الحیض باب غسل الوجہ والیدین اذااستیقظ من النوم، سنن ابی داؤد کتاب الادب باب فی النوم علی طھارۃ، سنن ابن ماجة کتاب الطھارۃ باب وضؤ النوم(مختار)

(۲)جدید طب کے اندازوں کے مطابق خراٹوں کا اصل سبب یہ ہے کہ بیماری یا کھانے کی زیادتی کی وجہ سے تھالوڈھیلا پڑجاتا ہے اس لئے نیند کی حالت میں سانس لیتے وقت اس کی تھرتھراہٹ سے خراٹوں کی آواز پیدا ہوتی ہے۔یہ آواز منہ کے ذریعے سانس لیتے وقت پیدا ہوتی ہے۔اگر ناک کے ذریعے سانس لی جائے تو خراٹوں کی آواز نہیں نکلتی۔اگر پہلو کے بل سویا جائے تو بھی یہ آواز پیدا نہیں ہوتی۔اسی وجہ سے پرانے لوگ اس کے علاج کے طور پر پشت پر کوئی پتھر بندھواتے تھے تاکہ مجبوراً پہلو کے بل سویا جائے۔بعض ماہرین نفسیات کے مطابق خراٹے ایک لاشعوری عمل ہے۔(بقیہ اگلے صفحہ پر)

ولم یتوضأ نبی کریم ﷺ کی نیند بالاتفاق ناقض وضوء نہیں تھی۔ یہ آپ ﷺ کی خصوصیت ہے آپ ﷺ فرماتے ہیں **تنام عینا ی و لاینام قلبی**(۱) وراس میں حکمت یہ تھی کہ آپ ﷺ کے لیے وحی کی خاطر ہردم بیدار ہونا ضروری تھا اور اصل بیداری دل ہی کی ہوتی ہے۔ قرآن مجید کا پاک ارشاد ہے کہ **نزّله علی قلبک** یعنی جبریل امین نے قرآن کو تیرے دل پر اتارا۔ تو اگر قلب میں بیداری نہ ہو۔ تو وحی کا اخذ اور حفاظت کیونکر ہو۔ اسی وجہ سے تو انبیاء کے خواب بھی وحی ہوتے ہیں۔ حضرت ابراہیمؑ کو سوتے میں حضرت اسماعیلؑ کو ذبح کرنے کا حکم ملا اور اس پر عمل بھی کیا۔

وفی الحدیث قصة الخ اس حدیث میں مزید قصہ وہ ہے جو حضرت میمونہؓ کے گھر حضرت عبداللہ بن عباسؓ کو پیش آیا یہ واقعہ بالتفصیل اگلے باب میں آرہا ہے۔ اس حدیث میں نبی کریم ﷺ کی نیند کی ایک نئی حیثیت ثابت ہوئی کہ آپ ﷺ نیند میں خراٹے بھی لیتے تھے۔

(۲) حدّثنا إسحاق بن منصور ثنا عفان ثنا حمّاد بن سلمة عن ثابت عن أنس بن مالک أنّ رسول اللّٰہ ﷺ کان إذا أوی الی فراشه قال الحمد للّٰہ الذی أطعمنا و سقانا و کفانا و آوانا فکم ممّن لا کافی له و لا مؤوی(۲).

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۷) پرانے زمانے میں انسان مضر جانوروں کو ڈرانے کے لیے اس قسم کی آوازیں جاگتے ہوئے نکالتا تھا۔ پھر یہی آوازیں وہ نیند کی حالت میں بھی لاشعوری طور پر نکالنے لگتا تھا۔ اور رفتہ رفتہ یہ آوازیں انسان کی فطرت کا جزو بن گئیں (از بی بی سی)

لیکن طب اور نفسیات کی ان تخمینی باتوں کا وزن اس وقت کم ہو جاتا ہے جب ہم یہ حدیث پڑھتے ہیں۔ کیونکہ نبی کریم ﷺ کی صحت آخر دم تک قابل رشک تھی۔ بلکہ مشاہدہ بھی یہی ہے کہ خوب صحتمند لوگ خراٹے لیتے ہیں۔ اگر چہ وہ بھوکے کیوں نہ سوئیں۔ اور اگر فطرت کی بات ہوتی تو کمزور لوگوں کی فطرت کا جزو کیوں نہ بنتیں (اصلاح الدین)

(۱) بخاری کتاب التراویح باب ۱ ، اور کتاب التهجد باب ۱۶ (مختار)

(۲) صحیح مسلم ۲/۳۵۶ کتاب الذکر والدعا والتوبة باب الدعا عندالنوم ، سنن ابی داؤد ۲/۳۴۰ کتاب الأدب باب مایقول عندالنوم، جامع ترمذی ۲/۶۵۰ کتاب الدعوات باب ماجاء فی الدعا إذا أویٰ إلیٰ فراشه، السنن الکبریٰ للنسائی ۶/۱۹۰ کتاب عمل الیوم واللیلة باب مایقول من یفرغ من منامه.(مختار)

ترجمہ: حضرت انسؓ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ جب اپنے بستر ے میں تشریف لائے تو یہ دعا فرمائی (ترجمہ) تمام تعریفیں اللہ تعالیٰ کے لیے ہیں جس نے ہمیں کھلایا، پلایا، ہماری ضروریات کی کفایت فرمائی۔اور سونے کے لیے ٹھکانہ دیا۔ کتنے لوگ ہیں جن کا کفایت کرنے والا کوئی نہیں اور نہ کوئی ٹھکانہ دینے والا ہے۔

کفران نعمت سے بچنے کا علاج: الحمد للّٰہ الخ دنیا کی نعمتوں میں اگر انسان کسی بدحال شخص پر نظر ڈالے تو اپنی خوشحالی پر دل کے اندر سے شکر نکلتا ہے۔اس کے برعکس اعلیٰ معیار زندگی گزارنے والوں پر نظر پڑتی ہے تو کفران نعمت میں مبتلا ہونے کا خوف ہوتا ہے۔یہاں پر نبی کریم ﷺ نے اللہ تعالیٰ کی نعمتوں پر شکر گزاری کی تعلیم دی ہے اور اسی کی طرف اشارہ فرمایا ہے کہ اپنی خوشحالی کا تصور کر کے شکر ادا کرنا چاہیے۔

روٹی کپڑا اور مکان صرف خدا دیتا ہے: اطعمنا وسقانا نیند کے وقت کھانے پینے کی نعمت کا تذکرہ اس لئے فرمایا کہ تینوں زندگی کے لیے ایک جیسے ضروری ہیں۔علاوہ ازیں نیند تب ہی آتی ہے جب آدمی بھوکا پیاسا نہ ہو۔اس لئے نیند کے ساتھ ہی دیگر دو نعمتیں بھی یاد آجاتی ہیں۔ بلکہ نیند کے لیے فراغِ خاطر بھی چاہیے۔اس لئے کھانے پینے کے بعد ضرورتوں کا پورا ہونا اور پناہ گاہ کا میسر ہونا بھی ذکر فرمایا۔ لیکن چونکہ رزق عام ہے اس سے کوئی محروم نہیں رہتا۔البتہ ضروریات کی کفایت اور پناہ گاہ سے بکثرت محرومی پیش آتی ہے اس لئے مؤخر الذکر دونوں کی نفی بعض مخلوقات سے کرنی پڑی۔

وکفانا یعنی ہماری ضروریات کی کفایت کی اور پیش آنے والے حوادث میں رحم فرما کر حفاظت فرمائی۔ ہمارے لاکھوں مسائل میں وہی ذات ہمارے لئے کافی ہوا۔اور دشمنوں،شرور وآفات وبلیات میں دستگیری فرمائی۔ ہمیں علم بھی نہیں ہوتا۔اور مسائل حل ہو چکے ہوتے ہیں اور حادثات ومصائب میں نجات مل چکی ہوتی۔ذالک بان اللّٰہ مولیٰ الذین آمنوا وان الکافرین لا مولیٰ لھم.

وآوانا اور ہمیں ٹھکانا اور پناہ دی۔فٹ پاتھ اور سڑک پر تو نہیں رہنے دیا۔جبکہ آج بھی ہزاروں لاکھوں انسان جنگلوں، خیموں اور سڑکوں پر پڑے ہوتے ہیں۔بسترہ تو کجا سر چھپانے کی جگہ میسر نہیں۔ مصائب کی زندگی بسر کر رہے ہیں۔انہی لوگوں کا ذکر نبی کریم ﷺ نے ان الفاظ میں فرمایا ''فکم ممن لا

کافی لہ ولا مؤوی لہ" وہ بھی اللہ تعالیٰ کی مخلوق ہے لیکن اللہ تعالیٰ نے ہم پر یہ احسان کیا کہ ہماری کفایت کردی اور پناہ وٹھکانہ دیا۔ نبی کریم ﷺ نے اس مقام پر روٹی کپڑا اور مکان کے بارے میں واضح کردیا کہ تینوں اللہ تعالیٰ ہی دیتے ہیں توفکم ممن لا کافی الخ دراصل حمد کے لیے تعلیل ہے۔یعنی ان بدحالوں کا احساس ہوتا ہے تو نعمتوں پر شکر دل سے نکل جاتا ہے۔

(۷) حدثنا الحسین بن محمّد الجریری ثنا سلیمان بن حرب ثنا حمّاد بن سلمة عن حمید عن بکربن عبداللّٰہ المزنّی عن عبداللّٰہ ابن رباح عن أبی قتادة أنّ النبی ﷺ کان إذا عرس بلیل اضطجع علی شقّہ الأیمن وإذا عرّس قبیل الصبّح نصب ذراعیہ ووضع راسہ علی کفّہ (۱).

ترجمہ: حضرت قتادہؓ کہتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ رات کے آخری حصہ میں (صبح سے بہت پہلے) آرام کے لیے پڑاؤ ڈالتے۔تو دائیں پہلو لیٹ جاتے تھے۔اور اگر صبح سے کچھ پہلے آرام کا ارادہ فرماتے تو کہنی رکھ کر ہاتھ کھڑا کردیتے تھے اور اس پر سر رکھ کر قدرے آرام فرمالیتے تھے۔

ابو قتادةؓ: حضرت ابوقتادہؓ انصاری مشہور خزرجی صحابی ہیں۔کنیت سے پہچانے جاتے ہیں۔نام میں اختلاف ہے بعض نے حارث بن ربعی بتایا ہے بعض کے خیال میں عمرو بن ربعی یا نعمان بن عمرو ہے۔ آپؓ کو فارس رسول اللہ ﷺ بھی کہا جاتا ہے۔بدر کے سوا تمام غزوات میں شریک رہے۔ایک قول کے مطابق حضرت علیؓ کی خلافت میں کوفہ میں وفات پائی تھی لیکن صحیح یہ ہے کہ آپؓ نے ۵۴ھ میں مدینہ میں وفات پائی کیونکہ مروان بن الحکم سے مدینہ میں آپؓ کی ملاقات ثابت ہے۔

تعریس باللیل کے بعد وقت کا لحاظ: اذا عرّس بلیل عموماً عرب لوگ زمانہ قدیم میں رات کو سفر کیا کرتے تھے۔آپ ﷺ کی بھی عادت شریفہ یہی تھی کہ دور کا سفر مقصود ہوتا تو عصر کے قریب سفر

(۱)صحیح مسلم ۱/۹۹ کتاب المساجد ومواضع الصلوٰۃ باب قضاء الصلوٰۃ الفائتة الخ المستدرک للحاکم ۱/۴۴۵،صحیح ابن حبان ۸/۱۱۸، مسنداحمد ۵/۲۹۸(مختار)

شروع کر دیتے تھے رات کے اکثر حصے میں سفر کرتے رہتے تھے۔رات کے آخری حصے میں کسی جگہ پڑاؤ ڈال دیتے تھے۔

اس قسم کے آرام کو جو رات کے آخر میں ہوتا ہے تعریس کہتے ہیں۔اس لئے کہ یہ عُرس سے ہے جو کہ شادی کو کہتے ہیں۔اور عروس دلہا اور دلھن کو کہتے ہیں کیونکہ یہ دونوں رات کے وقت ہی ملتے ہیں اور عموماً شب بیداری کے بعد صبح کو آرام کا موقعہ ملتا ہے۔بہرحال ایسی رات کو جب آپ ﷺ کو یقین ہوتا کہ ابھی کافی وقت ہے نماز قضا نہیں ہوگی تو اطمینان کے ساتھ دائیں کروٹ سو جاتے تھے اور اگر وقت کم ہوتا تو صرف آرام کرتے نیند کی صورت میں نماز کے جانے کا اندیشہ ہوتا۔لہٰذا ہاتھ سے تکیہ لگا کر لیٹ جاتے تھے۔جو کہ بروقت بیداری میں زیادہ ممد ہے۔اس سے یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ نیند کے نظام الاوقات میں ایسی ترتیب ہونی چاہیے کہ سفر،نماز،اور دیگر مشاغل بھی بروقت ادا ہوں۔

۴۰. باب ما جاء فی عبادة رسول اللهﷺ

رسول اللہﷺ کے عبادت کے بیان میں

عبادت کا معنی اقصیٰ غایة الخضوع و التذلل یعنی زیادہ سے زیادہ عاجزی اور خشوع وخضوع ہے(۱)۔ لیکن شریعت میں ان اعمال پر بھی اسکا اطلاق ہوتا ہے۔ جو اس تذلل کا مظہر ہیں جیسے نماز روزہ غیرہ۔

تمام انسانوں اور خصوصاً نبی کریمﷺ کی اصل صفات معنوی صفات ہیں۔ ایک خلقی خوبیاں ہوتی ہیں ان کا تعلق ظاہر سے ہے اور جو دکھائی دیتی ہیں۔ اس قسم کی خوبیاں بھی اللہ تعالیٰ نے نبی کریمﷺ کو بدرجۂ اتم عطا فرمائی تھیں۔ ان محاسن کے کچھ نمونے ہم پڑھ چکے ہیں لیکن عظیم صفات وہ معنوی صفات ہیں جو اخلاق کہلاتی ہیں۔

<u>صفتِ عبدیت:</u> ان تمام باطنی صفات میں سب سے اعلیٰ صفت عبدیت کی صفت ہے۔ آپﷺ اعبدُالناس یعنی سب سے زیادہ بندگی کرنے والے بشر تھے۔ اللہ تعالیٰ کی بندگی آپﷺ کی رگ وریشہ

(۱) خواہ وہ عجز وانکساری بطور عادت ہو یا عبادت، اگر چہ اصلی معنی عبادت کا امتثال امر ہے۔ اس لئے علماء کرام نے فرمایا ہے کہ بعض عادات بھی عبادات بن جاتی ہے۔ البتہ بعض اشیاء ایسی ہیں جن کی مشروعیت صرف عبادت کے لئے ہے۔ اور بعض افعال واعمال ایسے ہیں جن کی مشروعیت حوائج انسانیہ کیلئے ہوئی مگر وہ نیت کی وجہ سے عبادت بن جاتے ہیں۔ لفظ عبادت اگر چہ عام ہے۔ یعنی فرض، واجب اور نوافل سب کو شامل ہے۔ مگر روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ یہاں عبادات نافلہ مراد ہیں جن پر عام لوگوں کو اطلاع نہیں۔ فرائض پر تو ہر ایک کو اطلاع ہوتی ہے (تقریر ترمذی مع شمائل ترمذی حضرت مدنیؒ ص ۱۷۸) آنحضرتﷺ کے نوافل کے بارے میں انعقاد باب کی وجہ اور غرض یہ ہے کہ آنحضرتﷺ باوجود معصوم ہونے اور قد غفر الله ماتقدّم وماتأخّر کا خطاب ملنے کے نوافل کا اور خصوصاً رات کے وقت نوافل کا کس قدر اہتمام فرمایا کرتے تھے۔ علامہ عبدالجواد الدومیؒ نے لکھا ہے ستعرف فی هذاالباب کیف کانت عبادة النبیﷺ و کیف داوم علیها حتیّ ورمت قدماه(الاتحافات ۳۱۱) اور پھر باب نوم کے بعد اس باب کو لانے کی وجہ علامہ مناوی نے یہ لکھا ہے کہ لانّ نومه عبادة او لانّه کان یعقب نومه بعبادته (المناوی علی هامش جمع الوسائل ۷۹/۲) جبکہ بعض نسخوں میں یہ باب باب النوم سے قبل ہے۔ اس کی وجہ علامہ بیجوریؒ نے یہ لکھی ہے وفی بعض النسخ فی عبادة النبیﷺ وعضب باب النوم بباب العبادة لأنّ نومهﷺ من أجل العبادات وأکمل الطاعات(المواهب اللدنیة ص ۱۷۲)(مختار)

میں سما گئی تھی اور اسی وجہ سے قرآن میں جہاں دوسرے انبیاء کے نام آتے ہیں وہاں آپﷺ کا ذکر ''عبدہٗ'' سے ہوتا ہے۔اس سے پتہ چلا کہ بندوں میں کامل عبدیت کی صفت کے حامل اور عبد کا فرد کامل نبی کریمﷺ ہیں۔کیونکہ ضابطہ یہ ہے کہ جو چیز مطلق ذکر ہو اس سے فرد کامل مراد لیا جاتا ہے۔

مثلاًسبحن الذی أسریٰ بعبده لیلا من المسجد (الایة) اور و انّه لما قام عبدالله(الایة) اور اس قسم کی متعدد(۱) آیتیں ہیں جن میں آپﷺ کا نام لینے کی بجائے آپﷺ کو عبد کے نام سے یاد کیا گیا ہے۔اسی صفت پر آپﷺ فخر بھی کیا کرتے تھے۔کیونکہ انسانیت کی فضیلت و مزیت اور کمال بھی عبدیت ہی میں مضمر ہے۔عبدیت سے تجاوز کرنے کی کوشش کرنا انسانیت سے نکلنا ہے۔اور دیگر مذاہب میں افراط و تفریط کا سبب بھی یہی ہے کہ کسی نے تو عبد(کسی پیغمبر) کو عبدیت سے نکال کر الوہیت کی طرف پہنچا دیا اور کسی نے اس کو عبدیت سے بھی نیچے گرا دیا۔بہر حال عبدیت کی یہ صفت آپﷺ میں بدرجہ اتم موجود ہے۔اب بطور نمونہ مختلف اوقات میں نبی کریمﷺ کی عبادات کا بیان ہے۔

<u>بعثت سے قبل عبادت کی نوعیت:</u> نبوت سے پہلے بھی آپﷺ عبادت کیا کرتے تھے۔البتہ اس میں اختلاف ہے کہ آپﷺ نبوت سے قبل کسی شریعت کی تقلید کیا کرتے تھے یا نہیں۔کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ آپﷺ شریعت ابراہیمی پر تھے۔بعض نے شریعت موسوی اور بعض نے شریعت عیسوی کا نام لیا ہے۔

لیکن صحیح قول یہ ہے کہ آپﷺ کسی بھی سابقہ شریعت کے مقلد نہیں تھے کیونکہ سابقہ تمام شریعتیں حضرت عیسیٰؑ کی شریعت سے منسوخ ہو چکی تھیں اور حضرت عیسیٰؑ کی شریعت تحریف کا شکار ہو چکی تھی۔الله تعالیٰ فرماتے ہیں ماکنت تدری ماالکتاب و لاالایمان(الآیة) یعنی ایمان کے شرائع و احکام کا تجھے وحی سے قبل پتہ نہیں تھا۔البتہ اس پر ملا علی قاریؒ نے یہ شبہ کیا ہے کہ عیسیٰؑ بنی اسرائیل میں مبعوث ہوئے تھے۔اس لئے بنی اسماعیل کیلئے ابراہیمؑ کی شریعت باقی ہو سکتی ہے۔

ملا علی قاریؒ لکھتے ہیں کہ اس پر اجماع ہے کہ نبی کریمﷺ نبوت سے قبل بھی مؤمن تھے۔کبھی بھی بت پرستی نہیں کی۔البتہ ان کی عبادت کا انداز ہمیں معلوم نہیں۔

---

(۱)قرآن مجید میں دس مقامات پر آپﷺ کو عبد کہا گیا ہے جبکہ نام سے صرف چار بار یاد کیا گیا ہے۔

پھر کچھ مزید تفصیل لکھنے کے بعد لکھتے ہیں کہ ظاہر یہی ہے کہ نبوت سے قبل آپ ولی تھے پھر نبی اور پھر رسالت سے مشرف ہوئے(۱)۔ملاعلی قاریؒ نے جمع الوسائل میں بھی اس موضوع پر طویل بحث کی ہے کہ جمہور کہتے ہیں کہ آپﷺ کسی بھی شریعت کے مقلد نہیں تھے ورنہ کہیں تو یہ بات نقل ہوتی نیز جو تابع ہوتا ہے وہ متبوع کیسے بنتا۔جبکہ امام الحرمینؒ نے اس سلسلے میں توقف کو اختیار کیا ہے۔جبکہ بعض لوگ آپﷺ کو سابقہ شریعت کے تابع کہتے ہیں۔پھر ان لوگوں میں سے بعض نے آدمؑ بعض نے نوحؑ بعض نے ابراہیمؑ بعض نے موسیٰؑ اور بعض نے عیسیٰؑ اور بعض نے تمام شراعین کے اتباع کا قول کیا ہے۔پھر کچھ مزید تفصیل اور اقوال ذکر کرنے کے بعد لکھتے ہیں کہ ظاہر یہی معلوم ہوتا ہے کہ آپﷺ کی عبادت باطنی اعمال مثلاً ذکر قلبی اور صفات الٰہی میں تفکر نیز آفاقی، نفسی آیات اور مصنوعات میں سوچ کے قبیلے سے تھے۔ نیز رحم، شفقت، تحمل، صبر وشکر، رضاء بالقضاء، تسلیم وتفویض، توکل اور فناء و بقاء کے احوال کی رعایت جیسے اخلاق عالیہ سے آپ متصف تھے۔جیسا کہ اولیاء واصفیاء کی حالت کاملہ ہوتی ہے(۲)۔واللہ اعلم۔

(۱) حدّثنا قتیبة بن سعیدو بشر بن معاذ قالاأنا أبو عوانة عن زیاد ابن علاقة عن المغیرة بن شعبة قال صلّی رسول اللهﷺ حتّیٰ انتفخت قد ماه فقیل له اتتکلّف هذا وقد غفر الله لک ماتقدّم من ذنبک و ماتاخّر قال أفلاأکون عبداً شکوراً(۳).

ترجمہ: حضرت مغیرہ بن شعبہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریمﷺ نے نوافل پڑھیں۔حتیٰ کہ آپﷺ کے پاؤں میں ورم آگیا۔کسی نے آپﷺ سے عرض کیا کہ آپ اس قدر مشقت اٹھا کر عبادت کرتے ہیں حالانکہ اللہ تعالیٰ نے

---

(۱)مرقات علی المشکوٰۃ ج۳ص۳۰۸(مختار)

(۲)جمع الوسائل ج۲ ص۷۹، ۸۰ مختصراً(مختار)

(۳)صحیح بخاری ۱/۱۵۲ کتاب التهجد باب قیام النبیﷺ اللیل، صحیح مسلم ۲/۳۸۵ کتاب صفات المنافقین واحکامهم باب اکثار الاعمال والاجتهاد فی العبادة، سنن نسائی ۱/۲۴۳، سنن ابن ماجة ص۱۰۲ کتاب اقامة الصلوٰة والسنة فیها باب ماجاء فی قیام شهر رمضان (مختار)

آپ ﷺ کے گزشتہ اور آئندہ تمام گناہ معاف کر دیئے ہیں۔تو آپ ﷺ نے فرمایا

کہ پھر (اتنے انعام کے بعد) کیا میں اللہ تعالیٰ کا شکر گزار بندہ نہ بنوں۔

عبادت میں مبالغہ اور مشقت شکراً تھا: فقیل لہ اکابر صحابہ میں سے بعض نے عرض کیا کچھ شراح نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا نام لیا ہے کہ یہ عرض انہوں نے کی تھی۔

أتتکلف بھذا یہاں تکلف سے تصنع مراد نہیں بلکہ بمشقت کام کرنا مراد ہے(۱) مطلب یہ ہے کہ کمال عفو اور مغفرت کے وعدے کے باوجود آپ ﷺ عبادت میں اتنی مشقت اٹھاتے ہیں جبکہ خود اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ **طٰہٰ ما انزلنا علیک القرآن لتشقٰی** یعنی ہم نے قرآن کو اس لئے نازل نہیں کیا کہ تم خود کو تھکا دو۔ بلکہ رات کے بعض حصوں میں آرام کر کے تخفیف سے کام لو۔لتشقٰی کا معنی جلالین نے "**لتتعب بما فعلت بعد نزولہ من طول قیامک بصلوٰۃ اللیل** " سے کیا ہے یعنی ساری رات تہجد پڑھ کر کھڑے رہنے کیلئے ہم نے تم پر قرآن کو نازل نہیں کیا ہے۔صاحب کمالین نے اس مقام پر یہ محاورہ بھی نقل کیا ہے کہ **سید القوم اشقاھم** یعنی قوم کا سردار زیادہ تھکا ہوا ہوتا ہے۔آرام کا موقع اسے نہیں ملتا۔ **وقد غفر اللہ لک الخ** سائل کے سوال کا منشاء یہ ہے کہ عبادت میں مبالغہ تو خدا کو راضی کرنے اور اپنے گناہوں کی معافی کیلئے کیا جاتا ہے جبکہ آپ ﷺ کے اول تو گناہ ہیں نہیں۔اور اگر بالفرض ہوں تو وہ بھی پہلے سے معاف ہو چکی ہیں۔لہٰذا عبادت میں اتنی مشقت بلاضرورت ہے۔یہاں یہ اعتراض کیا جاتا ہے کہ نبی کریم ﷺ تو معصوم ہیں ان کے گناہ نہیں ہیں تو مغفرت کا کیا معنی؟ اس کے مفسرین نے متعدد جواب دیئے ہیں مثلاً یہ کہ اس سے مراد ذنوبِ امت ہیں نہ کہ خود نبی کریم ﷺ کے گناہ۔

بعض نے یہ کہا ہے یہ فرض پر مبنی ہے یعنی اگر بالفرض تیرے گناہ ہونگے بھی تو وہ بخش دیئے گئے ہیں۔بعض نے یہ کہا ہے کہ یہاں پر وہ خلاف اولیٰ باتیں مراد ہیں جو نبی کریم ﷺ سے گاہے گاہے

---

(۱) اس لئے کہ تکلف کی دو قسمیں ہیں۔علامہ بیجوریؒ نے لکھا ہے **التکلف نوعان ان یفعل الانسان فعلا بمشقۃ وھو ممدوح وھو المراد ھنا اویفعل فعلاً تصنعاً وھو مذموم وھذا لیس مراداًھنا(المواھب الدنیۃ ص ۱۷۳)** اس لئے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے **انا وامتی براء من التکلف** (جمع الوسائل ۲/۸۰) اور قرآن کریم نے فرمایا ہے **وماانامن المتکلفین** (سورۃ ص ۸۶)(مختار)

بتقاضائے بشریت صادر ہوسکتی تھیں۔ بعض کہتے ہیں کہ سلوک الی اللہ میں تقصیرات کو اشارہ ہے جو کہ آپ ﷺ سے بوجہ دیگر مصروفیات صادر ہوسکتی تھیں وغیرہ وغیرہ۔

أفلا اکون عبداً شکوراً یعنی یہ تو ہم غلط ہے کہ عبادت میں مبالغہ کا صرف ایک سبب یعنی گناہ معاف کروانا ہے۔ بلکہ دراصل اللہ تعالیٰ کا نبی کریم ﷺ پر انعام بہت بڑا تھا۔ جس کا ذکر خود سائل نے بھی کیا ہے اور انعام کا تقاضا یہ ہے کہ اس کا شکر ادا کردیا جائے اور شکر اس بات کا متقاضی ہے کہ عبادت میں خوب انہماک ہو۔ تو میری عبادت شکراً ہے گناہ معاف کرانے کیلئے نہیں ہے۔ اور اسی کو اشارہ کرتے ہوئے حضرت علی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ **ان قوما عبدوا رغبةً فتلک عبادة التجار وان قوماً عبدوا شکراً فتلک عبادة الاحرار**. یعنی کچھ لوگوں نے تو اللہ تعالیٰ کی عبادت جنت اور نعمتوں کی رغبت کیلئے کی۔ یہ تاجروں کی عبادت ہے کچھ لوگوں نے اللہ تعالیٰ سے خوف کی بناء پر عبادت کی یہ غلاموں کی عبادت ہے (جو ڈنڈے کے زور پر کام کرتے ہیں) اور کچھ لوگوں نے خدا کی عبادت بطور شکر کی۔ یہی آزاد لوگوں کی عبادت ہے۔

<u>تورّم وانتفاخ قدمین:</u>

(۲) حدّثنا أبوعمّار الحسین بن حریث أنا الفضل بن موسیٰ عن محمّد بن عمرو عن أبی سلمة عن أبی ہریرةؓ قال کان رسول اللّٰہ ﷺ یصلّی حتّیٰ ترم (۱) قدماہ قال فقیل لہ تفعل ھذا وقد جاءک انّ اللّٰہ تعالیٰ قدغفرلک ماتقدم من ذنبک وما تاخّر قال أفلا أکون عبداًالشکوراً(۱).

ترجمہ: حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے اتنی نفل نمازیں پڑھیں کہ آپ ﷺ کے قدم مبارک پھول گئے۔ آپ ﷺ سے کہا گیا کہ کیا آپ ﷺ اتنی عبادت کرتے ہیں؟ حالانکہ آپ ﷺ کے پاس تو یہ وحی آچکی ہے کہ

(۱) فتفرد الامام الترمذی بھذاالحدیث ﷺ فی نسخة حتیٰ تورّم (مختار)

اللہ تعالیٰ نے آپ کے اگلے پچھلے تمام گناہ معاف فرمائے ہیں۔ آپ ﷺ نے فرمایا تو کیا میں عبادت چھوڑ دوں اور اللہ تعالیٰ کا شکر گزار بندہ نہ بنوں؟

حتی ترِمَ ورم یرم حسب یحسب کے باب سے مضارع معلوم کا صیغہ ہے اور ان کی تقدیر کی وجہ سے منصوب ہے پھول جانے کو کہتے ہیں۔ ثلاثی مجرد کا صیغہ کم ہی استعمال ہوتا ہے۔ عموماً تورّم باب تفعل سے مستعمل ہوتا ہے بلکہ ایک نسخہ میں تورّم بھی آیا ہے۔ جو ماضی کا صیغہ ہے یا مضارع کا صیغہ ہے اور ابتداء میں ایک تاء تخفیفاً حذف کیا گیا ہے(۱)۔

افلا اکون الخ ھمزۂ استفہام کا مدخول محذوف ہے اور فاء عطف کیلئے ہے۔ یعنی أأترک المبالغة فی التعبدا فلا اکون عبداً شکورا. کیا عبادت میں انہماک ترک کرلوں اور شکر گزار نہ بنوں۔

(۳) حدّثنا عیسیٰ بن عثمان بن عیسیٰ بن عبدالرحمان الرملیّ ثنی عمّی یحییٰ بن عیسیٰ الرملیّ عن الأعمش عن أبی صالح عن أبی هریرةؓ قال کان رسول الله ﷺ یقوم یصلیّ حتّیٰ یتنفخ قد ماه فیقال له یارسول اللّٰه أتفعل هذا وقدغفر اللّٰه لک ماتقدّم من ذنبک وماتاخّر قال أفلاأکون عبداًشکورا(۲).

ترجمہ: حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نماز اتنی طویل پڑھتے تھے کہ آپ ﷺ کے پاؤں پھول جاتے تھے۔ آپ سے کہا جاتا تھا کہ یارسول اللہ آپ اتنی عبادت کرتے ہیں حالانکہ آپ کے سب اگلے پچھلے گناہ معاف کردیئے گئے ہیں۔ آپ ﷺ فرماتے کہ کیا میں عبادت میں مبالغہ ترک کردوں اور ایک شکر گزار بندہ نہ بنوں۔

---

(۱) علامہ مناویؒ نے لکھا ہے کہ عبادات میں حتی الوسع مشقت برداشت کرنا مستحب ہے۔ والغرض من سیاق هذا الحدیث بیان انّه اعظم الخلق طاعة لربّه وفیه ندب تشمیر ساق الجدفی العبادة وان اوی لمشقة مالم یفض إلیٰ ملال (المناوی علی هامش جمع الوسائل ۲/ ۸۱)(مختار)

(۲) سنن ابن ماجة ص ۱۰۲ کتاب اقامة الصلوٰة والسنة فیها باب ماجاء فی قیام شهر رمضان ص ۱۰۲ (مختار)

حتّیٰ تنتفخ قدماه: انتفاخ سے مضارع منصوب ہے یہ بھی تورّم کے معنی میں ہے۔اوپر کی دونوں حدیثوں کا مفہوم اس باب کی پہلی حدیث سے ملتا جلتا ہے۔

(۴) حدّثنامحمّد بن بشّار أخبرنامحمّد بن جعفر ثنا شعبة عن أبی إسحاق عن الأسود بن یزید قال سالت عائشة عن صلوٰة رسول اللهﷺبالليل فقالت كان ينام أوّل الليل ثم يقوم فاذا كان من السحرا وترثمّ أتیٰ فراشه فإذا كانت له حاجة المّ بأهله فاذا سمع الاذان وثب فان كان جنبا أفاض عليه من الماء وإلاّ توضّأ وخرج إلى الصلوٰة(۱).

صلوٰۃ اللیل اور عبادۃ میں حقوق اللہ اور حقوق العباد کی رعایت:

ترجمہ: حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے حضرت اسود بن یزیدؓ نے نبی کریمﷺ کی رات کی نماز (تہجد) کے بارے میں پوچھا۔تو حضرت عائشہ رضی اللہ نے فرمایا کہ نبی کریمﷺ رات کے ابتدائی حصہ میں آرام فرماتے تھے۔نماز پڑھنے کیلئے قیام فرماتے تھے پھر جب صبح قریب ہوجاتی تھی۔تو وتر کی نماز پڑھ لیتے تھے پھر اپنے بستر پر تشریف لاتے تھے۔اور اگر ضرورت اور رغبت ہوتی تو اہلیہ کے پاس جاکر صحبت فرماتے۔پھر جب اذان کی آواز سنتے تو پھرتی کے ساتھ اٹھ جاتے تھے۔اگر آپﷺ جنب ہوتے تو غسل فرماتے ورنہ وضوء فرماکر نماز کیلئے (مسجد) تشریف لے جاتے تھے۔

عن صلاة الخ رات کی نماز کے بارے میں پوچھا بات کی نماز تہجد اور وتر دونوں کو شامل ہے۔یعنی یہ پوچھا کہ تہجد کتنی اور کن کن اوقات میں پڑھتے تھے۔نیز وتر کس وقت ادا کرتے تھے۔اول اللیل

(۱)صحیح بخاری ۱/۱۰۴ کتاب التهجد باب من نام اوّل الليل الخ، صحيح ابن حبان ۴/۱۲۷، شرح معانی الاثار، السنن الكبریٰ للبهيقی. (مختار)

رات کے پہلے نصف تک عموماً نفل پڑھتے تھے۔فاذا کان من السحر اوتر یعنی رات کے آخری حصے میں وتر ادا کردیتے تھے۔جس سے دن رات کی ساری نمازیں وتر یعنی طاق بن جاتیں۔اور ابھی مسئلہ ایسا ہی ہے جو شخص یہ یقین رکھے کہ رات کے آخری حصے میں وہ جاگے گا۔تو وتر عشاء کی نماز کے ساتھ نہ پڑھے بلکہ لمن یثق بالانتباہ کیلئے وتر موخّر کردینا چاہیے(۱)۔

ثمّ اتی فراشه یعنی صبح کی نماز کیلئے تازہ دم ہونے اور احیاء اللیل کا اثر زائل کرنے کیلئے قدرے آرام فرماتے(۲)۔الّم باھله یعنی ازواج کے حقوق پورا فرماتے۔آپ ﷺ حقوق اللہ، حقوق العباد، حقوق نفس اور حقوق الازواج سب پورا فرماتے اور اس کیلئے بہترین نظام الاوقات بنادیا تھا۔جس میں حقوق اللہ کو دیگر حقوق پر مقدم رکھا کرتے تھے۔دوسری طرف رہبانیت اور تبتل سے آپ ﷺ نے ہمیشہ اجتناب کیا بلکہ خلوت میں جلوت اور جلوت میں خلوت ہوتی تھی۔اس حدیث سے یہ بھی ثابت ہوا کہ رات کے اوقات میں بھی عبادت اکثر اور غالب رہتی تھی۔والاتوضّأ یعنی فجر کی نماز کیلئے یا خوب تازہ ہونے کیلئے یا وضوء علی الوضوء کی فضیلت کے حصول کیلئے وضوء کرکے سنت پڑھ لیتے تھے اور مسجد تشریف لے جاتے۔

(۵) حدّثنا قتیبة بن سعید عن مالک بن أنس ثنا إسحاق ابن موسیٰ الأنصاری ثنا معن عن مالک عن مخرمة بن سلیمان عن کریب عن ابن عبّاسؓ أنّه أخبره أنّه بات عند میمونة وھی خالته قال فاضطجعت فی عرض الوسادة واضطجع رسول اللّٰہ ﷺ فی طولھا

---

(۱)اس روایت میں وتر کی کوئی کیفیت بیان نہیں کی گئی۔احناف کثّر اللہ سوادھم کے ہاں وتر تین رکعات ہیں۔علامہ بیجوریؒ نے لکھا ہے وکان رسول اللّٰہ ﷺ یوتر بثلاث یقرأ فیھنّ بتسع سور من المفصل یقرأ فی کل رکعة ثلاث سور آخرھنّ قل ھو اللّٰہ احد وفی روایة أنّه کان یقرأ فی الاول سبح اسم ربک الاعلیٰ وفی الثانیة قل یاأیھا الکافرون وفی الثالثة قل ھو اللّٰہ احد والمعوذتین رواه ابوداؤد ۱/۲۰۸ والمصنف(ترمذی)(المواھب الدنیة ص ۱۷۴)(مختار)

(۲)لیقوّی بھا علی صلوٰة الصبح ومابعدھا من وظائف الطاعات ولانّه یدفع صفرة السھر عن الوجه(جمع الوسائل ۲/۸۲)(مختار)

فنام رسول اللهﷺ حتیٰ اذا انتصف اللیل اوقبله بقلیل فاستیقظ رسول اللهﷺ فجعل یمسح النوم عن وجهه ثمّ قرأ العشر الآیات الخواتیم من سورة اٰل عمران ثمّ قام إلیٰ شن معلّق فتوضّأ منه فاحسن الوضوء ثمّ قام یصلّی قال عبداللّٰه بن عباس فقمت إلیٰ جنبه فوضع رسول اللهﷺ یده الیمنیٰ علی راسی ثمّ اخذ باذنی الیمنی ففتلها فصلّی رکعتین ثمّ رکعتین ثمّ رکعتین ثمّ رکعتین ثمّ رکعتین ثمّ رکعتین قال معن ست مرات ثمّ اوتر ثمّ اضطجع ثمّ جاء ہ المؤذن فقام فصلّی رکعتین خفیفتین ثمّ خرج فصلّی الصبح(۱).

ترجمہ: حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ انہوں نے ایک رات حضرت میمونہ رضی اللہ عنہ کے ہاں گزاری۔ وہ ان کی خالہ لگتی تھیں۔ کہتے ہیں کہ پس میں سرہانے کی چوڑائی والے حصہ پر سر رکھ کر سویا۔ اور نبی کریمﷺ اس کے طول والے حصے پر سر رکھ کر لیٹ گئے۔ نبی کریمﷺ سوئے رہے۔ حتیٰ کہ رات آدھی بیت گئی یا اس سے تھوڑا پہلے یا تھوڑا بعد کہ نبی کریمﷺ بیدار ہوگئے۔ پھر نبی کریمﷺ اپنے رخ انور سے نیند بھگانے کیلئے اس پر ہاتھ پھیرنے لگے۔ اور سورۃ آل عمران کی آخری دس آیات (ان فی خلق السمٰوات الخ) پڑھیں۔ پھر ایک لٹکے ہوئے مشک کی طرف بڑھے۔ پس اس سے وضوء فرمایا اور کامل وضوء فرمایا۔ پھر نماز پڑھنے کھڑے ہوگئے۔ حضرت عبداللہ بن عباسؓ کہتے ہیں کہ میں بھی (وضوء کرکے) ان کے (بائیں) جانب (آپﷺ کے ساتھ نماز پڑھنے) کھڑا ہوگیا۔ حضورﷺ نے

---

(۱) صحیح بخاری ۱/۳۰ کتاب الوضؤ باب قرأة القرآن بعدالحدث، صحیح مسلم ۱/۲۶۰ کتاب صلوٰة المسافر وقصرهاباب الدعاء فی کتاب صلوٰة اللیل وقیامه، سنن ابی داؤد ۱/۱۹۹ کتاب الصلوٰة باب فی الصلوٰة اللیل، سنن النسائی ۱/۲۴۱ کتاب قیام اللیل وتطوع النهار باب ذکرمایستفتح به القیام، (مختار)

اپنا دایاں ہاتھ میرے سر پر رکھا، پھر مجھے میرے دائیں کان سے پکڑا اسے مروڑا (تا کہ میری نیند دفع ہوجائے یا تا کہ مجھے داھنے جانب کھڑا کردیں) پھر آپﷺ نے دو رکعت نماز پڑھی، پھر دو رکعت پڑھیں، پھر دو رکعت پڑھیں پھر دو پڑھیں، پھر دو پڑھیں، پھر دو پڑھیں۔ راوی معنؒ نے چھ مرتبہ دوگانہ کا ذکر کیا۔ پھر آپﷺ نے وتر پڑھی۔ پھر (تھوڑی دیر) لیٹ گئے۔ اس کے بعد موذّن (صبح کی نماز کیلئے) بلانے آئے تو آپﷺ اٹھے دو رکعت مختصر قرات سے پڑھیں۔ پھر مسجد کی طرف نکلے اور صبح کی نماز پڑھی۔

ابن عباسؓ میں حضور اقدسﷺ کے اعمال کے تعلیم و تعلم کا جذبہ: أنـه بـات عـنـد مـيـمـونةؓ

حضرت ابن عباس اس وقت نوجوان تھے مگر دین کے تعلم کا جذبہ اور تڑپ تھی جو نبی کریمﷺ کی عبادت کو جاننے کیلئے حضرت میمونہ رضی اللہ عنہا کے حجرے میں لے آیا۔ رات کے وقت نبی کریمﷺ کس وقت اٹھتے ہیں اور کیا کیا معمولات کی عادت ہے۔ اس تجسس نے رات کو نیند کی حاجت بھی بھلادی۔ اسی جذبے کا نتیجہ تھا کہ حبر الامۃ کا مقام عالی حاصل کیا۔

وهـي خالته حضرت میمونہ رضی اللہ عنہا کے حالات تفصیل کے ساتھ ۳۱ نمبر حدیث نمبر ۲ کی ضمن میں گزر چکے ہیں۔ یہاں اس بات کی طرف اشارہ مقصود ہے کہ ابن عباس رضی اللہ عنہ نبی کریمﷺ کے چچازاد بھائی ہیں تو حضرت میمونہ رضی اللہ عنہ کے بھی بھانجے ہیں اور ان کے بھی ذی رحم محرم ہیں۔

فاضطجعت الخ بعض لوگوں نے وسادہ سے بستر ہ لیا ہے۔ لیکن بظاہر تکیہ یا سرہانہ ہی مراد ہے یعنی ایک ہی سرہانہ یا تکیہ ہے۔ نبی کریمﷺ نے طول کی جانب اس پر سر رکھدیا اور ابن عباس رضی اللہ عنہ نے عرض کی جانب سے۔ سادہ سی زندگی تھی۔ زمین پر سویا کرتے تھے۔ اور سر تکیے میں بھی عموماً کھجور کی چھال بھری ہوتی تھی۔ مسلم شریف کی روایت میں تصریح ہے کہ نبی کریمﷺ اور حضرت میمونہؓ دونوں ایک ساتھ لیٹے۔ اور حضرت ابن عباس بھی عرض تکیہ پر سر رکھ کر سوگئے۔ اس سے اس بات کی جواز کی طرف بھی اشارہ ہے کہ بیوی کے محارم میں سے کسی کی موجودگی میں اس کے ساتھ ہی بستر ے پر سویا جائے اگر چہ اس کا محرم

ممیز ہو۔ کیونکہ بیوی کے ساتھ سونا اس کا حق ہوتا ہے اور آپ ﷺ اس سلسلے میں بہت حساس تھے۔ بیوی سے الگ بستر ے میں سونا عجم کی عادت ہے جس کی بنا تعلیٰ اور تکبر پر ہے۔لہٰذا اس کی تقلید نہیں کرنا چاہیئے۔ البتہ محرم ممیز کیلئے یہ بات جائز نہیں کہ میاں بیوی کی خلوت میں مخل ہو۔لیکن اس کا جواب یہ ہے کہ حضرت میمونہ اس رات حیض کی حالت میں تھیں۔جیسا کہ بعض روایات میں مصرّ ح ہے۔ بخاری کی ایک روایت میں یہ بھی آتا ہے کہ اکٹھے لیٹ کر آپ ﷺ نے تھوڑی دیر کیلئے حضرت میمونہ رضی اللہ عنہ سے باتیں بھی کیں پھر سو گئے۔جس سے سمر فی اللیل بھی ثابت ہوتا ہے۔

<u>قیام اللیل میں مجاہدۂ نفس:</u> **یمسح النوم من وجهہ** یعنی نیند کا غلبہ ہٹانے کیلئے چہرے پر ہاتھ پھیرا کرتے تھے۔اس سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ ﷺ کو نیند کا تقاضا بھی ہوتا تھا۔اشتیاق بھی تھا۔لطف اور مزہ بھی نیند میں ملتا تھا۔یہ نہ تھا کہ نیند نہ آئی تو اٹھ کر تہجد پڑھی۔ بلکہ نفس کے ساتھ مقابلہ اور مجاہدہ کرنا پڑتا تھا۔

اسی طرف اللہ تعالیٰ نے یوں اشارہ فرمایا کہ **ان ناشئة الليل هی أشدّ وطأواقوم قيلا** (مزمل ٦) یعنی رات کو اٹھنا سخت روندنے والی چیز یعنی بھاری ریاضت ہے۔اور اس میں بات سیدھی نکلتی ہے۔یعنی ذکر کرتے ہوئے دل وزبان موافق ہوتے ہیں اور عبادت کا یہی مفہوم ہے کہ نفس کے تقاضوں کو چھوڑ کر اسے خالق کا تابع بنانے کیلئے اس کے ساتھ جہاد کرو۔**العشر الايات الخ** یعنی **ان فی خلق السمٰوت والارض (الاية)** دس آیتیں پڑھتے ان آیات میں آفاقی اور انفسی دلائلِ توحید کی طرف اللہ تعالیٰ نے اشارہ فرمایا ہے۔اور انسانی تدبر وتفکر کو دعوت دی گئی ہے۔نیند سے جاگ کر گویا انسان کو نئی زندگی ملتی ہے۔لہٰذا اٹھتے ہی اسے آیات اللہ میں تدبر وتفکر کرنا چاہیے۔کہ دنیا وکائنات میں اللہ تعالیٰ کے وجود ووحدانیت کے کتنے لاتعداد دلائل ہیں۔سائنس کے جدید انکشافات سے تو اور بھی ان کی دلالت واضح ہو چکی ہے۔

ثمّ قام إلیٰ شنّ معلّق شن پرانے مشک کو کہتے ہیں۔جس کا پانی زیادہ ٹھنڈا ہوتا ہے کیونکہ اس کے مسامات زیادہ کشادہ ہوتے ہیں۔بالخصوص جب اسے لٹکایا جائے۔**فتوضامنها** ایک نسخہ میں منہ آتا ہے جو ظاہر ہے لیکن اگر شن کی تاویل قربۃ سے کی جائے تو مؤنث کی ضمیر راجع کرنا بھی جائز ہے۔**فاحسن**

الوضوء یہاں پر اسباغ اور اکمال کو احسان الوضوء سے تعبیر کیا ہے۔ صحیحین میں ہے کہ فتوضا وضوءاً احسناًبین الوضوء من لم یکثر وقد ابلغ ۔یعنی پانی بھی زیادہ استعمال نہیں کیا لیکن اعضاء مکمل دھولئے۔فقمت الی جنبہ مسلم اور بخاری میں تصریح ہے کہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ نے وضوء کر کے نیت باندھی۔

ابن عباسؓ کے کان مروڑنے کی حکمتیں: ایک روایت میں آتا ہے فقمت عن یسارہ ففتل الخ نبی کریم ﷺ نے اس کا کان مروڑ کر اسے دائیں جانب کھڑا کر دیا۔اس حدیث میں اس قصہ کی تفصیل موجود ہے۔جس کا ذکر گزشتہ باب کے حدیث نمبر ۴ میں اجمالاً ذکر کیا گیا تھا۔سر پر ہاتھ رکھنے اور کان مروڑنے کی وجہ کیا تھی؟

ملاعلی قاری رحمۃ اللہ علیہ نے اس کی متعدد وجوہ ذکر کی ہیں۔مثلاً یہ کہ ہاتھ رکھنے کی برکت سے ابن عباس رضی اللہ عنہ کو نبی کریم ﷺ کے اقوال وافعال خوب یاد ہوجائیں۔یہ کہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ کی نیند اڑ جائے اور بیدار ہو کر حالات کا خوب ادراک کرسکیں۔بائیں جانب کھڑے ہو کر مخالفت سنت پر اس کو تنبیہ ہوجائے اور تاکہ بائیں سے دائیں جانب آنے میں ابن عباس رضی اللہ عنہ آپ ﷺ کی اطاعت کریں۔

علامہ بیجوری رحمۃ اللہ علیہ نے لکھا ہے کہ معلم شاگرد کو کان سے پکڑ کر تھوڑا مروڑے تو اس سے شاگرد میں ذکاوت پیدا ہوتی ہے۔حضرت ربیع رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں کہ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ ایک دن گھوڑے پر سوار ہو گئے میں ساتھ کھڑا ہو گیا تو انہوں نے میرا کان پکڑ کر مروڑا مجھے اس سے تعجب ہوا۔لیکن بعد میں جب ابن عباس رضی اللہ عنہ کا یہ واقعہ مجھے معلوم ہوا تو پتہ چلا کہ امام رحمہ اللہ کوئی ایسا کام نہیں کرتے جس کی کوئی اصل نہ ہو۔

قال معن ست مرات چھ مرتبہ دو دو رکعت کا ذکر کیا یوں آپ ﷺ نے بارہ رکعت تہجد کے پڑھے۔امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے اسی کو ترجیح دی ہے کہ تہجد میں افضل یہ ہے کہ بارہ رکعت پڑھی جائیں۔ویسے اس میں توسع ہے جتنی بھی سہولت اور نشاط میں پڑھی جائیں کافی ہیں۔

ثم اضطجع نبی کریم ﷺ رات کے آخری چھٹے حصے میں آرام فرماتے تھے۔تاکہ صبح کی نماز

کیلئے تازہ دم ہوسکیں اور رات کی تھکاوٹ دور ہو(۱)۔

(۱) فجر کی سنتوں کے بعد استراحت: فجر کی سنتوں کے بعد استراحت کے بارے میں اہل علم کے مختلف اقوال ہیں۔علامہ بنوریؒ نے لکھا ہے الضجعة بعد ركعتي الفجر قداختلف فيهاالصحابة والتابعون ومن بعدهم على ثمانية اقوال(۱)الاول إنّها سنة وإليه ذهب الشافعي وأصحابه قال النوويؒ في شرح المهذب هوالمختار(۲)والثاني: إنّها مستحبة ورويٰ ذلک عن جماعة من الصحابة منهم أبوموسىٰ، رافع بن خديج وأبي هريرة وأنس وروى عن فقهاء المدينة السبعة وابن سيرين(۳)والثالث: انّها واجبة لاتصحّ الصلوٰة الفجربدونهاوهوقول ابن حزم فقد جعلها شرطاً في صحة صلوٰة الصبح وقدبالغ ابن العراقي في شرح التقريب في الردّعليه وقال هذا غلوّ فاحش..الخ (۴)الرابع: إنّهابدعة وروى عن ابن مسعود وابن عمروالأسودابن يزيدوابراهيم النخعي..واليه ذهب مالک من الائمة وحكاه القاضي عياض عنه وعن جمهورالعلماء(۵)والخامس: إنّهاخلاف الأولىٰ روى عن الحسن البصري(۶)السادس: انّها ليس مقصودة لذاتها وانّما الغرض الفصل امّا بضجعة أوحديث أوغيرهاوحكى ذلک عن الشافعي (۷)السابع: انّهامستحبه في البيت دون المسجدويروى عن ابن عمرويقول الحافظ في الفتح وقواه بعض شيوخنا (۸)الثامن: إنّهامستحبة لمن يقوم الليل لأجل الاستراحة لامطلقاً واختاره ابن العربي ويشهدله حديث عائشة عندعبدالرزاق والطبراني لم يضطجع سنة ولكنّه كان يدأب ليلة فيستريح(معارف السنن ۴/۶۸تا۶۹) مذهب الحنفية كما يقول ابن عابدين في ردالمحتار.

ان آٹھ اقوال میں احناف کا مذہب آٹھویں قول کے موافق ہے اس لئے کہ احناف فرماتے ہیں کہ یہ آنحضرتﷺ کی سنت عادیہ ہے سنت تشریعیہ نہیں۔علامہ شامیؒ نے لکھا ہے وحاصله أنّ اضطجاعه عليه الصلوٰة والسلام إنّماكان في بيته للاستراحة لاللتشريع(ردالمحتار ۲/۲۱) البتہ جہاں تک حدیث امر عن ابی هريره اذاصلىٰ احدكم ركعتي الفجر فليضطع على جنبه الايمن کا تعلق ہے تو اس بارے میں علامہ شامیؒ نے لکھا ہے وإنّ صحّ حديث الأمر بهاالدال علىٰ انّ ذلک للتشريع يحمل على طلب ذلک في البيت فقط توفيقاً بين الأدلة(ردالمختار ۲/۲۱) اور مزید لکھا ہے فالمطلق محمول على المقيدعلى أنّه لوكان هذا في المسجد شائعاً في زمانه ﷺ لماكان يخفى على هولاء الاكابرالأعيان أرادبالمقيدمامرّمن قوله بعدركعتي الفجرفي بيته(ردالمختار ۲/۲۱) مذہب احناف کی تائید اس بات سے بھی ہوتی ہے کہ آنحضرتﷺ سے اضطجاع کا یہ عمل کب ثابت ہے۔تو اس بارے میں امام زہریؒ (بقیہ حاشیہ اگلے صفحہ پر)

اس حدیث میں اس بات کی تصریح ہے کہ ابن عباس رضی اللہ عنہ آپ ﷺ کے ساتھ نفل میں شریک ہوگئے تھے۔ ہمارے احناف نے یہ کہا ہے کہ نفل کی جماعت علی سبیل التداعی ہوتو مکروہ ہے۔ بعض فتاویٰ میں یہ جائز ہے۔ تین ہوں تو اختلاف ہے اور اگر مقتدی چار ہوجائیں تو باتفاق احناف مکروہ ہے(۱)۔ واللّٰہ اعلم بالصواب.

(٦) حدّثنا أبو کریب محمّد بن العلاء ثنا وکیع عن شعبة عن أبی جمرة عن ابن عباس قال کان النبیّ ﷺ یصلّی من اللیل ثلث عشرة رکعة(۲) .

ترجمہ: حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ رات کو تیرہ رکعت نماز پڑھتے تھے۔

(بقیہ حاشیہ ص۱۴۹) کے شاگردوں کا اختلاف ہے۔ امام اوزاعی ،ابن ابی الذئب عُقیل، یونس، شعیب اور ان کے اکثر شاگردوں نے یہ نقل کیا ہے یہ لیٹنا رکعتی الفجر کے بعد ہوتا ہے جبکہ امام مالکؒ نے مؤطا میں نقل کیا ہے۔۔۔۔ ثمّ اوتر ثمّ اضطجع حتّیٰ جاءہ المؤذن فصلّیٰ رکعتین خفیفتین ثمّ خرج فصلّی الصبح(مؤطاامام مالک ص ۱۰۴) یعنی یہ لیٹنا رکعتی الفجر سے پہلے ہوا کرتا تھا۔ حافظ ابن عبدالبرؒ نے اس روایت کو ترجیح دی ہے۔ اگر چہ دوسرے اہل علم نے امام زہریؒ کے دوسرے تلامذہ کی روایت کو ترجیح دی ہے۔ کیونکہ وہ اکثریت میں ہیں مگر امام مالکؒ کی روایت کو ترجیح ہوجانے کے بعد حنفیہ کے اس قول کی اور زیادہ تائید ہوجاتی ہے کہ آنحضرت ﷺ کی اضطجاع صلوٰۃ اللیل سے تعب کی بناء پر تھا۔ اور آپ ﷺ کے اس عمل کی حیثیت سنت عادیہ کی سی تھی نہ کہ سنت تشریعی کی سی۔(مختار)

(۱) ملاعلی قاریؒ نے لکھا ہے اقول وقد صرّح فی الفروع اتفاق الفقهاء لکراهیة الجماعة فی النوافل اذاکان سوی الامام اربعة قال فی الکافی إنّ التطوع بالجماعة انّما یکره إذاکان علی سبیل التداعی وامالو اقتدیٰ واحدبواحداو اثنان بواحدلایکره وان اقتدی ثلاثة بواحداختلف فیه وان اقتدیٰ اربعة بواحدکره اتفاقاً واماماذکره فی شرح النقایة من جواز الجماعة فی النوافل مطلقاً نقلاً عن المحیط وکذاماذکرفی الفتاویٰ الصوفیة ونحوهما فمحمول علی أنّ المراد بالجواز الصحة وهی لاتنافی الکراهة (جمع الوسائل ۸۶/۲)(مختار)

(۲)صحیح بخاری ۱۵۳/۱ کتاب التهجد باب کیف صلوٰة النبیّ ﷺ ،صحیح مسلم ۲۶۱/۱ کتاب صلوٰة المسافرین وقصرهاباب الدعا فی صلوٰة اللیل وقیامه، سنن النسائی باب الوتر ثبلاث عشرة رکعة ۲۵۱/۱ کتاب الصلوٰة ، جامع ترمذی ۱۰۰/۱ کتاب الصلوٰة باب منه.(مختار)

صلوٰۃ اللیل میں تعداد رکعات: ثلاث عشرۃ رکعۃً اس سے قبل بارہ رکعت تہجد کا ذکر ہے اور وتر کے ساتھ پندرہ بنتے ہیں۔ اور یہاں مجموعہ تیرہ بتایا گیا ہے۔ لہٰذا تہجد دس اور وتر کی تین رکعتیں ہوئیں تو گویا آپ ﷺ نے مختلف اوقات میں حسب گنجائش مختلف تعداد میں تہجد کی نماز پڑھی ہے۔

احناف کے نزدیک صرف آٹھ رکعت پڑھنے پر بھی اکتفاء جائز ہے کیونکہ اگر مجموعہ تیرہ ہو تو اس میں سے تین وتر اور دو فجر کی سنتیں بھی ہو سکتی ہیں۔ لہٰذا تہجد کی کل آٹھ رکعتیں باقی بچیں۔ لیکن ملا علی قاری رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ بارہ رکعتوں والا قول مختار ہے۔ جیسا کہ بعد کی روایت میں آتا ہے۔

(۷) حدّثنا قتيبة بن سعيدثنا ابو عوانة عن قتادة عن زرارة بن اوفى عن سعد بن هشام عن عائشة أنّ النبىّ ﷺ كان اذا لم يصل بالليل منعه من ذلك النوم اوغلبته عيناه صلّى من النّهار ثنتى عشرة ركعة(۱).

ترجمہ: حضرت عائشہ رضی اللہ عنہ کہتی ہیں کہ نبی کریم ﷺ جب رات کو تہجد نہ پڑھ سکتے۔ نیند اس کے لئے رکاوٹ بنتی یا یہ کہا کہ آنکھ لگ جاتی تو (تہجد کے بدلے) دن کو بارہ رکعت نفل پڑھ لیتے تھے۔

منعه من ذالك النوم یعنی نیند کی وجہ سے رہ گئیں۔ **اوغلبته عيناه** راوی کا شک ہے کہ الفاظ کونسے تھے لیکن مطلب دونوں کا ایک ہے(۲)۔ **صلّىٰ من النّهار الخ** اس میں ایک تو اس بات پر تنبیہ ہے کہ آپ ﷺ عبادۃ کا کتنا اہتمام کرتے تھے۔ کہ قضاء نہیں ہونے دیتے تھے۔ اگر رات کو تہجد قضاء

---

(۱)صحيح مسلم ۱/۲۵٦ كتاب صلوٰة المسافرين وقصرهاباب ماجاء فى صلوٰة الليل ومن نام عنه جامع ترمذى كتاب الصلوٰة باب اذانام عن صلوته بالليل صلّىٰ بالنهار، سنن النسائى ۱/۲۵۵ كتاب قيام الليل وتطوع النهار باب كم يصلّى من نام عن الصلوٰة اومنعه.(مختار)

(۲)علامہ بیجوریؒ نے لکھا ہے کہ فالمقصودبه بيان سبب عدم صلوته فى الليل أو للشك من الراوى أو للتقسيم والفرق بينهما أن الاوّل محمول على ماإذااراد النوم مع امكان تركه اختياراً والثانى محمول على ماأذاغلبه النوم بحيث لايستطيع دفعه(المواهب اللدنية ۱۷٦)(مختار)

ہوجاتی تو دن کو اس کا اعادہ فرماتے(۱) اور ساتھ ساتھ اس حدیث سے امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے قول کو تقویۃ بھی ملتی ہے کہ نماز تہجد کی رکعات کی تعداد بارہ ہے۔ جیسا کہ ملاعلی قاری رحمۃ اللہ علیہ نے ذکر کیا ہے باقی وتر کی قضاء اس حدیث سے بطریق اولیٰ معلوم ہورہی ہے۔ نیز یہ بھی ممکن ہے کہ آپ ﷺ وتر کو کبھی قضاء نہ ہونے دیتے تھے یا قضاء کی صورت میں صبح کی نماز سے پہلے ہی قضاء کرلیتے تھے۔ دن تک نہیں رہنے دیتے تھے۔

(۸) حدّثنا محمّد بن العلاء انا ابو اسامة عن هشام يعني ابن حسان عن محمّد ابن سيرين عن أبي هريرة عن النبيّ ﷺ قال اذا قام احدكم من الليل فليفتتح صلوٰته بركعتين خفيفتين(۲).

ترجمہ: حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ رسول اللہ ﷺ سے نقل کرتے ہیں کہ انہوں نے فرمایا کہ تم میں سے جب کوئی رات کو تہجد کیلئے اٹھے تو اپنی نماز کی ابتداء دو مختصر رکعتوں کے ساتھ کرے۔

<u>عبادت میں تدریج وتخفیف:</u> فليفتتح الخ کوئی بھی کام شروع کرنا ہوتو فطری طور پر اس میں ابتداءً تخفیف ہونی چاہیے۔ گاڑی بھی آہستہ رفتار سے چل کر بتدریج تیز ہوتی جاتی ہے تو نبی کریم ﷺ بھی عبادت میں ایک نفسیاتی طریقے کی طرف رہنمائی فرماتے ہیں۔ کہ پہلے دو رکعتیں خفیف پڑھ لو۔ پھر آہستہ آہستہ طبیعت میں نشاط اور آمادگی پیدا ہوجائیگی۔ نیز شیطان کا جو اثر ہوتا ہے۔ وہ بھی زائل ہوجاتا ہے۔ اور سستی زائل ہوجاتی ہے۔ اس کے بعد نفس پر بوجھ بڑھایا بھی جاسکتا ہے۔

بعض علماء کا خیال ہے کہ نبی کریم ﷺ تہجد سے قبل دو رکعت تحیۃ الوضوء کا حکم دے رہے ہیں۔ جو

---

(۱) ملاعلی قاریؒ نے اس روایت سے دو مسائل کا استنباط کیا ہے لکھتے ہیں وفيه دليل على جواز قضاء النافلة بل على استحبابه لئلا يعتاد النفس بالترك وعلى أنّ صلوٰة الليل ثنتاعشرة ركعة كماهو المختار عند ابى حنيفة(جمع الوسائل ۲/۸۸)(مختار)

(۲) صحيح مسلم ۱/۲۶۲ كتاب صلوٰة المسافرين وقصرها باب الدعا فى صلوٰة الليل وقيامه، شرح السنة للبغوى كتاب الصلوٰة رقم الحديث ۹۰۷، سنن ابى داؤد ۱/۱۹۴ كتاب الصلوٰة باب افتتاح صلوٰة الليل بركعتين، السنن الكبرىٰ للبيهقى ۳/۶ كتاب الصلوٰة (مختار)

مختصر قرات کے ساتھ پڑھی جاتی ہیں۔ جبکہ بعض شراح نے وتر سے پہلے دو رکعتوں پر اس حدیث کو حمل کیا ہے لیکن صلوٰۃ اللیل کو وتر کے ساتھ منحصر کرنا بعید معلوم ہو رہا ہے جبکہ یہاں پر مطلق صلوٰۃ کا ذکر ہے۔ لہٰذا تہجد کی نماز سے پہلے کی دو نفل لینا اولیٰ ہے۔

(۹)حدّثنا قتیبة بن سعید عن مالک بن أنس ثنا إسحاق بن موسیٰ ثنا معن ثنا مالک عن عبداللّٰه بن أبی بکر عن أبیه أنّ عبداللّٰه بن قیس بن مخرمة أخبره عن زید بن خالدالجهنّی أنّه قال لا رمقنّ صلوٰة رسول اللّٰهﷺ فتوسدت عتبته اوفسطاطة فصلّیٰ رسول اللّٰهﷺ رکعتیں خفیفتین ثمّ صلّیٰ رکعتین طویلتین طویلتین طویلتین ثمّ صلّیٰ رکعتین وهما دون اللتین قبلهما ثم صلّیٰ رکعتین وهما دون اللتین قبلهماثمّ صلّیٰ رکعتین وهما دون اللتین قبلهما ثم صلّیٰ رکعتین وهمادون اللتین قبلهماثمّ اوترفذلک ثلث عشرة رکعة(۱).

ترجمہ: حضرت زید بن خالد جہنی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں نے ایک رات کو یہ ارادہ کیا کہ رسول اللہﷺ کی نماز کو آج غور سے ضرور دیکھوں گا۔ میں آپﷺ کی چوکھٹ پر یا یہ کہا کہ آپﷺ کے خیمہ کی چوکھٹ پر سر رکھ کر لیٹ گیا۔ نبی کریمﷺ نے (پہلے) دو مختصر رکعتیں پڑھیں۔ پھر دو رکعتیں خوب طویل پڑھ لیں۔ پھر دو رکعتیں پڑھ لیں جو کہ پہلے طویل رکعتوں سے کم تھیں۔ پھر دو رکعتیں پڑھ لیں جو کہ ان سے پہلے پڑھی جانیوالی دو رکعتوں سے کم تھیں۔ پھر دو رکعتیں پڑھیں جو کہ ان پہلے پڑھی جانے والی دو رکعتوں سے بھی کم تھیں۔ پھر دو رکعتیں پڑھی جو ان پہلے پڑھی جانے والی دو رکعتوں سے بھی کم تھیں۔ پھر وتر پڑھیں تو یہ تیرہ رکعتیں ہو گئیں۔

---

(۱)صحیح مسلم ۱/۲۶۲ کتاب صلوٰة المسافرین وقصرهاباب الدعافی صلوٰة اللیل وقیامه، سنن ابی داؤد ۱/۲۰۰ کتاب الصلوٰة باب صلوٰة اللیل، سنن ابن ماجة ص۹۷ کتاب اقامة الصلوٰة والسنة فیها باب ماجاء فی کم یصلّی باللیل. (مختار)

زیدبن خالد: زیدبن خالد الجھنّی رضی اللہ عنہ مشہور صحابی ہیں۔ابوزرعہ،ابوعبدالرحمان یا ابوطلحہ کنیت تھی۔صلح حدیبیہ میں شریک رہے۔فتح مکہ کے دن اپنے قبیلہ جھینہ کے علمبر دار تھے۔۹۷ھ میں پچاسی سال کی عمر میں وفات پائی جبکہ بعض نے تاریخ وفات ۶۸ھ تحریر کی ہے۔مدینہ میں وفات پائی(۱)۔

لارمقنّ (۲) صلوٰۃ الخ دینی علوم کے بارے میں صحابہ کے حرص اور تجسس کا بہترین نمونہ اس حدیث میں موجود ہے۔جب بھی موقع ملا تو اپنے منہوم فی العلم ہونے کا ثبوت دیا۔

گھروں میں تاک جھانک: **فتوسدت عتبتہ** توسد کے معنی وسادہ بنانا یعنی بطور سرہانہ استعمال کرنا ہے۔عتبۃ دروازے کی چوکھٹ کی نچھلی پٹی کو کہتے ہیں لیکن اس سے گھر کا دروازہ مراد نہیں کیونکہ اس قسم کا تجسس تو ممنوع ہے کہ کسی کے گھر کے اندر جھانکا جائے اگر چہ مقصد نیک ہو لیکن ناجائز ہے۔بلکہ باہر سے تین بار اجازت لینا ضروری ہے۔اگر جواب نہ ملے یا نفی میں ملے تو واپس لوٹنا لازم ہے۔اس لئے عتبہ سے مراد بھی خیمے کے دروازے کی چوکھٹ ہے اور یہ کسی سفر ہی کا واقعہ ہے۔اسی احتمال کو ملا علی قاری،علامہ مناوی اور علامہ بیجوری رحمہم اللہ نے ظاہر کیا ہے۔

بہرحال صحابہ آپ ﷺ کے گھر میں تاک جھانک نہیں کرتے تھے۔بلکہ چونکہ نبی کریم ﷺ کی زندگی کا ایک معتدبہ حصہ اسفار میں اور گھر سے باہر بھی گزرا ہے۔جن میں جہاد، حج اور عمرے کے اسفار قابل ذکر ہیں۔تو ایسے دنوں میں صحابہ کرام آپ کی عبادت اور اعمال معلوم کرنے کے متلاشی ہوتے تھے۔ **عتبتہ او فسطاطہ** عتبہ چوکھٹ کو کہتے ہیں اور فسطاط بڑے خیمے کو کہتے ہیں۔دوسری صورت میں بھی عتبہ کا لفظ مقدر رہیگا۔یعنی اوعتبۃ فسطاطہ۔یعنی خیمے کی چوکھٹ پر۔راوی کو یہاں شک ہے۔

حضور اقدس ﷺ کی عبادت شب کے کچھ نمونے: بہرحال آپ ﷺ جہاں مقیم تھے۔اس مکان کے دروازہ یا اس خیمے کے دروازے پر آپ ﷺ کی نماز کا انتظار کرنے لگا۔**فذالک ثلث عشرہ رکعۃ الخ** اس سے قبل بارہ رکعت کا ذکر کیا۔اور اب وتر کے ساتھ تیرہ رکعت بتائے گئے۔یہاں یہ بات

---

(۱) کذافی الاصابۃ وقال عبدالروف المناویؒ مات ۸۸ھ ولہ ۸۵ سنۃ واللہ اعلم۔

(۲) الرمق ھوبہ النظر إلی الشئ علی وجہ المراقبۃ والحافظۃ (المواھب اللدنیۃ ۱۷۷)

کہ وتر ایک رکعت ہے یا تین رکعت، محل بحث نہیں، کیونکہ یہ مسئلہ کتاب الصلوٰۃ میں خوب تحقیق کے ساتھ گزر چکا ہے۔ یہاں آپ ﷺ کی عبادت کا محض ایک نمونہ پیش کیا جاتا ہے۔ لہٰذا وتر کے ساتھ تیرہ رکعت مقصود ہو۔ تو تہجد دس رکعت بنتے ہیں۔ اور پہلے کے دو رکعت تحیۃ الوضوء ان میں شمار نہیں ہیں۔ بصورت دیگر بارہ رکعت تہجد کے ساتھ تین رکعت ملا کر کل پندرہ رکعت بنتے ہیں۔

(۱۰) حدّثنا إسحٰق بن موسیٰ ثنا معن ثنا مالک عن سعید بن أبی سعید المقبری عن أبی سلمة بن عبدالرحمان أنّه أخبره أنّه سأل عائشة کیف کان صلوٰة رسول اللهﷺ فی رمضان فقالت ما کان رسول اللهﷺ لیزید فی رمضان ولا فی غیره علی احدی عشرة رکعة یصلّی اربعا لاتسال عن حسنهنّ وطولهنّ ثمّ یصلّی اربعا لاتسال عن حسنهنّ وطولهنّ ثمّ یصلّی ثلاثا قالت عائشة قلت یارسول الله أتنام قبل ان توتر قال یا عائشة إنّ عینی تنا مان ولاینام قلبی(۱).

ترجمہ: ابوسلمہ بن عبدالرحمان رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں کہ انہوں نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے پوچھا کہ نبی کریم ﷺ کی نماز تہجد رمضان میں کیسی تھی۔ تو آپ ﷺ نے فرمایا کہ نبی کریم ﷺ گیارہ رکعت تہجد سے زیادہ نہ تو رمضان میں پڑھتے تھے اور نہ غیر رمضان میں۔ آپ اولاً چار رکعت نماز (ایک سلام سے) پڑھتے تھے۔ ان چار رکعتوں کے حسن کا اور طول کا مت پوچھنا۔ پھر مزید چار رکعت نفل پڑھتے تھے۔ ان چار رکعتوں کے حسن اور طول کا مت پوچھنا۔ پھر تین رکعت (ایک سلام سے) پڑھتے

---

(۱)صحیح بخاری ۱/۱۵۴ کتاب التهجد باب قیام النبیﷺ باللیل فی رمضان وغیره، صحیح مسلم ۱/۲۵۴ کتاب الصلوٰة المسافرین وقصرها باب صلوٰة اللیل وعدد رکعات النبیﷺ فی اللیل، سنن ابی داؤد ۱/۱۹۶ کتاب الصلوٰة باب فی الصلوٰة اللیل، سنن النسائی ۱/۲۴۸ کتاب قیام اللیل وتطوع انهار باب کیف الوتر بثلاث(مختار)

تھے۔حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کہتی ہیں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ سے عرض کیا۔کہ کیا آپ ﷺ نماز وتر سے پہلے بھی سوتے ہیں (کیا وہ اس طرح قضاء نہیں ہونگی) تو آپ نے فرمایا کہ میری آنکھیں سوتی ہیں اور دل جاگتا ہے (یوں قضاء ہونے کا خطرہ نہیں ہوتا)

نماز تہجد کے رکعات اور اضطراب روایات: **کیف کانت صلوٰۃ الخ** یہاں پر نماز تہجد کے بارہ میں سوال کیا گیا ہے جو کہ نیند کے بعد ادا کی جاتی ہے۔اس لئے آپؐ نے جواب دیتے وقت ''**ولا فی غیرہ**'' کا اضافہ کر دیا ہے۔اب نیند سے قبل پڑھی جانے والی نماز جو کہ تراویح کی صورت میں آپ نے پڑھی تھیں گیارہ سے زیادہ ہو سکتی ہیں۔چنانچہ اس حدیث سے تراویح کے آٹھ ہونے پر استدلال لغو ہے۔ وہ الگ نماز ہے اور جمہور صحابہ کا اس پر اجماع منعقد ہو چکا ہے۔کہ وہ بیس رکعت پڑھی جائیں گی۔اور یہی ائمہ اربعہ کا مذہب ہے(۱)۔یہاں پر سوال کا منشا اصل میں یہ تھا کہ چونکہ رمضان شریف میں نبی کریم ﷺ عموماً عبادت میں عام دنوں کی نسبت اضافہ فرماتے تھے۔لہٰذا ابو سلمہؓ نے رمضان شریف میں تہجد کے بارے میں دریافت کیا اور حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے فرمایا کہ رمضان شریف میں بھی آپ ﷺ کی نماز تہجد معمول کے مطابق ہوتی تھی۔

---

(۱)اور یہی بیس رکعات تراویح سنت مؤکدہ ہیں۔بعض لوگ اس سے انکار کرتے ہیں مگر ان کا انکار کم فہمی اور لاعلمی پر مبنی ہے۔افادہ کے لئے ناچیز کا ایک تفصیلی فتویٰ جو ماہنامہ الحق میں شائع ہوا ہے۔یہاں پر بھی پیش کیا جاتا ہے۔

<u>رسول اللہ ﷺ سے بیس (۲۰) رکعات تراویح پڑھنے کی تحقیق</u>

محترم جناب ایڈیٹر ماہنامہ ''الحق'' اکوڑہ خٹک۔

السلام علیکم ورحمۃ اللہ امید ہے مزاج گرامی بخیر ہوں گے۔

جناب! ماہنامہ الحق ستمبر ۲۰۰۴ء جلد نمبر ۳۹ ص ۳۴ میں درج ہے کہ نبی کریم ﷺ نے بنفس نفیس ۲۰ رکعات تراویح کی نماز ادا فرمائی ہے......حالانکہ علمائے احناف اس کے خلاف فرماتے ہیں۔

۱۔ امام ابوحنیفہؒ: آپ ﷺ نماز عشاء سے لے کر نماز فجر تک آٹھ رکعت اور تین وتر پڑھتے تھے (کتاب الآثار ص ۲۶)

۲۔امام محمد تلمیذ ابوحنیفہ رسول اللہ ﷺ رمضان میں یا اس کے علاوہ گیارہ رکعات پر اضافہ نہیں (بقیہ اگلے صفحہ پر)

احدیٰ عشر رکعة بعض دیگر روایات میں تیرہ رکعات اور بعض میں اس سے بھی زیادہ کا ذکر موجود ہے بلکہ خود حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی حدیث گزر گئی ہے۔ جس میں بارہ رکعات تہجد کی طرف

اشارہ ہے۔ کیونکہ آپ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ رات کو کبھی فوت ہونے کے بعد آپ دن کو بارہ رکعات پڑھ لیتے تھے۔ اور بارہ رکعات کے ساتھ وتر کی تین رکعات ملائی جائیں تو پندرہ بنتی ہیں۔

(بقیہ حاشیہ ص۱۵۶) کرتے تھے (موطاء امام محمد مترجم ص۱۲۲) ۳۔ امام ابن ہمام حنفیؒ: ہدایہ کی شرح فتح القدیر میں لکھتے ہیں۔ تراویح کی مسنون تعداد گیارہ رکعات ہے (ص۶۰۷ ج۱) ۴۔ علامہ بدرالدین عینیؒ: (عمدہ القاری ص۱۷۷ ج۱) ۵۔ ملاعلی قاری حنفیؒ: (مرقاۃ المفاتیح ص۱۹۶، ج۱۲) ۶۔ مولانا عبدالحئی لکھنویؒ: (التعلیق الممجد ص۱۶۱) ۷۔ انورشاہ کاشمیریؒ (العرف الشذی ص۱۶۶ ج۱)

۸۔ جلال الدین السیوطی: (المصابیح فی رکعات التراویح ص۱۶۔ ۹۔ عبدالحق دہلوی: (ماثبت بالسنۃ ص۲۱۷ ۱۰۔ قاضی شمس الدین (القول الفصیح ص۵) ۱۱۔ طحطاوی شرح درمختار جلد نمبر ۱ ص۲۹۵ ان النبی ﷺ لم یصلها عشرین بل ثمانیاً ۱۲۔ ابوالسعود شرح کنز الدقائق ص۱۶۵۔ ج۱ مصری لأن النبی ﷺ لم یصل عشرین بل ثمانیاً. ۱۳۔ الشیخ عبدالحق دہلوی اپنی کتاب "فتح سر المنان فی تائید مذہب النعمان" کے صفحہ نمبر ۳۲۷ میں لکھتے ہیں۔ ولم یثبت روایة عشرین منه ﷺ کما هو المتعارف :(مروجہ ۲۰ رکعت نبی ﷺ سے ثابت نہیں......) تو جناب آپ کے پاس کوئی نص ہے تو بندہ کی رہنمائی فرمائیں کہ رسول اکرم ﷺ نے ۲۰ رکعت تراویح ادا کی ہے۔ امید ہے ضرور جواب دیں گے۔ دعاگو عبیدالرحمان یزدانی (لائبریرین)

الجواب وبالله التوفیق

آنجناب کا والا نامہ بتاریخ ۱۹/۱۰/اکتوبر ۲۰۰۴ء بمطابق ۴/رمضان المبارک ۱۴۲۵ھ کو موصول ہوا۔ پڑھ کر بڑی خوشی ہوئی کہ آنجناب نے احقر کے مضمون کا بغور مطالعہ کیا ہے۔ اور پھر ایک مقام (آنحضرت ﷺ نے خود بنفس نفیس بیس رکعت تراویح پڑھی ہے) کے اصل ماخذ کے بارے میں مزید وضاحت طلب کی۔ اور اس روایت کو رد کرنے کے لئے چند اقوال اور بعض کتابوں کے حوالجات بھی تحریر فرمائی ہے۔ آنجناب نے جس حدیث کے بارے میں وضاحت طلب کی ہے وہ حدیث مصنف ابن ابی شیبہ ۲/۳۹۴ اور سنن بیہقی ۲/۴۹۶/ باب ماروی فی عدد رکعات الصیام فی شهر رمضان میں مذکورہ ہے۔ مصنف ابن ابی شیبہ کے الفاظ یہ ہیں: حدّثنا یزید بن هارون أخبرنا إبراهیم ابن عثمان عن الحکم عن مقسم عن ابن عباسؓ أنّ رسول اللّٰہ ﷺ کان یصلّی فی رمضان عشرین رکعة والوتر (مصنف ابن ابی شیبۃ ۲/۳۹۴) (بقیہ اگلے صفحے پر)

(بقیہ حاشیہ ص ۱۵۷)اور سنن بیہقی میں یصلی فی رمضان بغیر جماعة عشرین رکعة والوتر کے الفاظ مذکور ہے۔اسی طرح اس روایت کو عبدبن حمید نے مسند عبدبن حمید میں،علامہ بغویؒ نے اپنی شرح السنۃ میں اور امام طبرانیؒ نے معجم کبیر میں روایت کیا ہے(التعلیق الحسن علی آثار السنن ۲۵۴ واعلاء السنن ۸۲/۷)مگر عموماً اس حدیث پر یہ اعتراض کیا جاتا ہے کہ یہ روایت ضعیف ہے اس لئے اس سے استدلال کرنا درست نہیں،اور گمان غالب ہے کہ آنجناب نے بھی اسی اعتراض کی وجہ سے مضمون میں درج شدہ مفہوم حدیث کے اصل مأخذ کی وضاحت طلب کرنے کے لئے مکتوب ارسال فرمایا،اور یہ بات قرین قیاس ہے۔اس لئے کہ جب کسی کو اس مسئلہ کے بارے میں اتنی کتابوں کا علم ہو تو اس کو اس روایت کا اصل مأخذ کیسے معلوم نہ ہوگا،لازماً اسی اعتراض کی وجہ سے مضمون میں یہ روایت انوکھی لگی،مگر اس اعتراض کی حقیقت اور جواب سے قبل چند مقدمات کو ذہن نشین کرنا نہایت ہی ضروری ہے،جب ہی اشکال واعتراض کی حقیقت معلوم ہوگی تو جواب سمجھ میں آئیگا۔ (1)مقدمہ اولیٰ: کسی حدیث کے قابل عمل ہونے کے لئے صرف اس حدیث کی سند کا صحیح ہونا ضروری نہیں ہے اس لئے کہ اگر اس شرط کو ضروری قرار دیا جائے تو پھر بہت ساری احادیث کا ترک کرنا لازم آئے گا،حالانکہ ان احادیث مبارکہ کو باوجود سند کے اعتبار سے غیر صحیح ہونے کے فقہاء کرام اور محدثین عظام نے معمول بہ بنائے ہیں۔اور اسی پر عمل کرکے چلے آرہے ہیں۔مثلاً (۱) آنحضرت ﷺ فرماتے ہیں کہ لاوصیة لـــلـــوارث (الـحـديـث) کہ وارث کے لئے وصیت نہیں۔اس بارے میں امام شافعیؒ فرماتے ہیں کہ اس کو اہل حدیث ثابت نہیں کہتے۔لیکن عامہ علماء نے اس کو قبول کرلیا ہے۔اور اس پر عمل کرتے ہیں۔یہاں تک انہوں نے اس حدیث کو آیت وصیت کا ناسخ قرار دیا ہے۔

(۲) اسی طرح العینان وکاء السه(الحدیث) آنکھیں سرین کے تسمے ہیں۔یہ روایت بھی سنداً ضعیف ہے مگر اس کے باوجود بعض محدثین اور فقہاء کرام نے اس کو معمول بہ قرار دیا ہے۔

(۳) اس کے علاوہ الـمـاء طهـور لايـنـجـسـه شئي إلاّماغلب علی ريحه اوطعمه (الحديث) کے بارے میں امام نوویؒ نے کہا ہے کہ اس روایت کے ضعیف ہونے پر علماء امت کا اتفاق ہے،مگر اس کے باوجود اہل مدینہ اور دوسرے فقہاء کرام نے اس کو معمول بہ قرار دیا ہے۔

(۴)اسی طرح کہ مـن جـمـع بـيـن الـصـلاتـيـن مـن غـيـر عـذر فـقـداتی باباً من ابواب الكبائر(ترمذی ۳۰۳/۱) اس روایت کے بارے میں امام ترمذیؒ فرماتے ہیں:قـال ابـو عيـسـى حـنـش هذا (بقیہ اگلے صفحے پر)

حضرت زید بن خالد جہنی کی روایت میں تیرہ رکعات کا ذکر ابھی ابھی گزر چکا ہے۔ بلکہ خودحضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی بعض روایات میں تیرہ رکعات کا ذکر بھی آیا ہے۔تو گویا حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی روایات اس باب میں مضطرب ہیں۔

اس لئے ہم کہتے ہیں کہ بارہ رکعتوں والی روایات کو ترجیح دی جاتی ہے۔ کیونکہ وہ غیر مضطرب ہیں یا پھر دونوں میں تطبیق کی جائیگی۔ یوں کہ تہجد میں اکثر اوقات میں آپﷺ کی عادت بارہ رکعات پڑھنے کی تھی۔لیکن کبھی کبھی آٹھ پر اکتفاء بھی کر لیتے تھے۔اور ہوسکتا ہے کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے حجرے میں عام معمول یہی ہو۔

(بقیہ حاشیہ ص۱۵۸)**هو بو علي الرحبي وهو حنش بن قيس وهو ضعيف عنداهل الحديث ضعّفه احمد وغيره** لیکن اس کے باوجود **والعمل على هذا عنداهل العلم ان لايجمع بين الصلاتين إلاّ في السفر اوبعرفة (الجامع الترمذی ۱/۳۰۳)**

امام ترمذی فرماتے ہیں: حنش یہ بوعلی الرجی ہے اور اس کا نام حسین بن قیس ہے اور یہ راوی محدثین کے ہاں ضعیف ہے۔ امام احمد اور دوسرے ائمہ جرح وتعدیل نے اس کی تضعیف کی ہے۔لیکن اس کے باوجود اہل علم کا اس پر عمل ہے اور ان کے ہاں سفر اور عرفہ کے علاوہ جمع بین الصلاتین جائز نہیں۔

(٦) اسی طرح کہ **طلاق الامة ثنتان وعدتها حيضتان (الحديث)** اس روایت کے بارے میں امام ترمذیؒ فرماتے ہیں کہ **حديث غريب والعمل عليه عندأهل العلم من اصحاب رسول اللهﷺ وغيرهم** ترمذی اور امام دار قطنیؒ فرماتے ہیں کہ **قال قاسم و سالم عمل به المسلمون وقال مالک شهرة الحديث بالمدينة تغني عن صحة سنده (۴۴۱/۲)**

یہ حدیث غریب ہے اور اس پر آنحضرتﷺ کے اہل علم صحابہ کرام اور دوسرے اہل علم کا عمل ہے' امام قاسم اور امام سالم کہتے ہیں کہ اس پر مسلمانوں کا عمل ہے اور امام مالکؒ نے فرمایا ہے کہ مدینہ منورہ میں کسی حدیث کی شہرت سند کی صحت سے مستغنی کردیتی ہے۔اسی طرح امام ترمذیؒ نے کئی مقامات پر فرمایا ہے کہ یہ حدیث سند کے لحاظ سے ضعیف ہے مگر اسپر اہل علم کا عمل ہے۔اور آج تک ان پر عمل چلا آرہا ہے۔

(2) مقدمہ ثانیہ: دوسرا مقدمہ یہ ہے کہ جس طرح حدیث مبارک سند کی وجہ سے درجہ صحت اور درجہ حسن تک پہنچتا ہے تو اسی طرح امت مسلمہ کے تلقی بالقبول سے بھی وہ روایت باوجود سنداً ضعیف ہونے کے درجہ (بقیہ اگلے صفحہ پر)

حسن وطول صلوٰۃ: لاتسأل الخ یہ حسن میں مبالغہ کا بیان ہے اور نماز میں حسن اور عدم حسن انہی کو معلوم ہوتا ہے۔ جو کہ نماز کے عشاق ہیں۔ ان کو لذتوں اور نماز کے دقائق معلوم ہوتے ہیں۔ نبی کریم ﷺ اور صحابہ کیلئے نماز کی دنیا دوسری دنیا تھی۔ تیروں، تلواروں اور نیزوں کی بارش میں وہ نماز پڑھتے تو حرکت نہیں کرتے تھے۔ یصلی اربعاً یہ چونکہ نفل ہیں۔ اس لئے ان کو دو دو پڑھنا اور چار چار پڑھنا برابر ہیں۔

(بقیہ حاشیہ ص۱۵۹) صحت و حسن کا مقام پالیتا ہے' اسی لئے محدثین عظام نے فرمایا ہے: قال بعضهم يحكم للحديث بالصحة اذا تلقاه الناس بالقبول وان لم يكن له اسناد صحيح (تدریب الراوی ۱/۶۷) بعض نے کہا ہے کہ حدیث پر صحیح کا حکم اس وقت بھی لگایا جائے گا۔ جب امت اس کو قبول کرے اگر چہ اس کی سند ضعیف ہو۔

اور اسی وجہ سے محقق ابن ہمامؒ نے فتح القدیر ۱/۴۶۱) میں فرمایا ہے کہ اذا تأيد الضعيف بما يدل على صحته من القرائن كان صحيحاً کہ جب کسی ضعیف روایت کی صحت پر قرائن شرع دال ہوں تو وہ حدیث صحیح ہے۔

اور اسی بناء پر محدثین اور فقہاء نے کافی سارے ذخیرہ احادیث کو صحیح کہا ہے اور ان کو معمول بہا قرار دیا ہے۔

۱۔ مثلاً الاستذکار میں علامہ ابن عبدالبرؒ فرماتے ہیں کہ لما حكى عن الترمذى انّ البخارى صحّح حديث البحر هو الطهور ماؤه واهل الحديث لا يصححون مثل اسناده لكن الحديث عندى صحيح لان العلماء تلقوه بالقبول (بحوالہ مقدمہ اعلاء السنن/۶۱۔ وتدریب الراوی ۱/۶۵) 'امام ترمذیؒ فرماتے ہیں کہ امام بخاریؒ البحر هو الطهور ماءه کو صحیح فرماتے ہیں اور دوسرے محدثین اس روایت کو سند کی وجہ سے صحیح نہیں کہتے مگر میرے نزدیک یہ روایت صحیح ہے اس لئے کہ علماء نے اس روایت کو قبول کیا ہے

۲۔ اسی طرح علامہ محقق ابن ہمامؒ ۔ قول الترمذى (والعمل عليه عنداهل علم) يقتضى قوة أصله وإن ضعف خصوص من هذه الطريق (فتح القدیر ۱/۲۱۷) کہ امام ترمذی کا قول کہ اہل علم کے ہاں اس روایت پر عمل ہے اس روایت کے اصل کی قوت (صحت) کا تقاضہ کرتا ہے' اگر چہ انہوں نے سند کی وجہ سے اس کو ضعیف کہا ہو۔

اور کتاب الطلاق کے فصل اول میں لکھا ہے ومما يصحّح الحديث ايضاً عمل العلماء على وفقه وقال الترمذى عقيب رواية حديث طلاق الامة ثنتان...... حديث غريب والعمل عليه عنداهل العلم من أصحاب رسول الله ﷺ وغيرهم (فتح القدير ۳/۱۴۳) علماء کا عمل بھی ان امور میں سے ہے جس کی وجہ سے حدیث کو صحیح کہا جاتا ہے۔ امام ترمذی نے طلاق الامة ثنتان وعدتها حيضتان کے بعد فرمایا ہے یہ حدیث غریب ہے مگر صحابہ کرام اور دوسرے اہل علم کے ہاں اس پر عمل ہے۔

اسی طرح علامہ سیوطیؒ نے تعقبات میں ایک اور مثال ذکر کرتے ہوئے فرمایا ہے: وقال الترمذى (بقیہ اگلے صفحہ پر)

(بقیہ حاشیہ ص ۱۶۰)قدرأی ابن المبارک وغیرہ .

۳۔ صلوٰۃ التسبیح وذکروا الفضل فیہ قال البیھقی فان عبداللہ بن المبارک یصلیھا وتداولہ الصالحون بعضھم عن بعض وذلک تقویۃ للحدیث المرفوع (مقدمہ اعلاء السنن /۶۲)'' کہ عبداللہ بن مبارک اور دوسرے اہل علم نے صلوٰۃ تسبیح کی ترغیب دی ہے۔امام بیہقی ؒ فرماتے ہیں کہ عبداللہ بن مبارک ؒ صلوٰۃ تسبیح پڑھا کرتے تھے اور صالحین کے ہاں یہ نماز چلی آ رہی ہے۔اور اسی وجہ سے اس حدیث مرفوع کو تقویت ملی۔''

یہ چند روایات بطور نمونہ ذکر کئے گئے ورنہ اور بھی کافی ساری روایات ذخیرہ کتب حدیث میں موجود ہیں۔جو سنداً ضعیف ہیں مگر تلقی بالقبول کی وجہ سے علماء نے ان کو صحیح کہا ہے۔تلقی الامۃ بالقبول ایسی دلیل صحت ہے کہ کبھی کبھی خبر تلقی الامۃ بالقبول کی وجہ سے ضعیف روایت تواتر کے حکم میں ہوجاتا ہے۔چنانچہ علامہ ابوبکر الجصاص الرازیؒ نے احکام القران میں لکھا ہے۔ وقد استعملت الامۃ ھذین الحدیثین وان کان ورودہ من طریق الاحاد فصار فی خیر التواتر لأن ما تلقاہ الناس من اخبار الاحاد بالقبول فھو عندنا فی معنی التواتر

(احکام القرآن ۱/ ۳۸۶ بحوالہ مقدمہ اعلاء السنن / ۶۲)

ان دونوں احادیث کو امت نے معمول بھا بنایا ہے اگر چہ ان کا ورود بطریق الاحاد ہو چکا ہے مگر اس تعامل سے یہ روایات تواتر کے حکم میں داخل ہوئے اس لئے کہ لوگوں کا اخبار احاد کو قبول کرنا اور اس پر عمل کرنا ہمارے ہاں تواتر کے معنی میں ہے۔تلقی الامۃ بالقبول سے حدیث ضعیف کا قابل احتجاج ہونے کا اصول علامہ صدیق بن حسن خان القنوجیؒ نے الروضۃ الندیۃ ۱/ ۶ میں بھی لکھا ہے۔

(3) مقدمہ ثالثۃ: تیسرا مقدمہ یہ ہے کہ جس طرح حدیث صحت سند اور تلقی الامۃ بالقبول کی وجہ سے صحت اور حسن کا مرتبہ پاتا ہے تو اسی طرح دوسرے قرائن شرع' مثلاً اجماع امت' شواہد اور توابع وغیرہ کی وجہ سے بھی ضعف روایت صحت کا مقام حاصل کر لیتا ہے۔

اس لئے علامہ ابوالحسن بن الحصار المالکیؒ نے تقریب المدارک علی مؤطا مالک میں لکھا ہے: قد یعلم الفقیہ صحۃ الحدیث اذا لم یکن فی سندہ کذّاب بموافقۃ آیۃ من کتاب اللہ او بعض اصول الشریعۃ فیحملہ ذلک علی قبولہ والعمل بہ (تدریب الراوی ۱/ ۶۸) کبھی فقیہ کسی حدیث کی صحت کو صرف اس وجہ سے جان لیتا ہے کہ وہ روایت قرآنی آیت یا اصول شرعیہ کے موافق ہے اور وہ اس روایت کو قبول کر کے اس پر عمل کر لیتا ہے بشرطیکہ اس روایت کی سند میں کوئی کذّاب راوی نہ ہو۔اور حافظ ابن حجرؒ نے اپنے استاد حافظ عراقیؒ (بقیہ اگلے صفحہ پر)

(بقیہ حاشیہ ص۱۶۱) کے حوالہ سے لکھا ہے کہ ان یتفق العلماء علی العمل بمد لول حدیث فانّه یقبل حتّیٰ یجب العمل به (بحوالہ التعلیقات الحافلة علی الاجوبۃ الفاضلة ص۲۳۱)

علماء امت مدلول حدیث پر عمل کرنے پر متفق ہیں اور اس کو قبول کرتے ہیں حتیٰ کہ اس پر عمل کرنے کو واجب اور ضروری سمجھتے ہیں، اس کا مطلب یہ ہے کہ جب وہ روایت اصول شرع کے موافق ہو اگرچہ اس کی سند میں کوئی کمزوری ہو تب بھی وہ روایت ان کے ہاں معمول بہا ہوتی ہے۔ اور اسی وجہ سے محقق بن ہمامؒ نے لکھا ہے کہ فان ضعف الاسناد غیر قاطع ببطلان المتن بل ظاهر فيه فاذا تايد بما يدل على صحته من القرائن كان صحيحاً (فتح القدیر ۲/۸۷) سند کا ضعیف ہونا متن کے بطلان کی دلیل نہیں، بلکہ اس میں ظاہر ہے کہ جب اس صحت پر قرائن شرع میں سے کوئی قرینہ دلالت کرے تو وہ روایت صحیح کہلاتی ہے۔

(4)۔ مقدمہ رابعہ: چوتھا مقدمہ یہ ہے کہ کسی بھی حدیث کو قطعی طور پر اس وقت تک ضعیف اور غیر معمول بھا نہیں کہا جا سکتا جب تک اس کے بارے میں پوری تحقیق نہ ہو۔ علامہ سیوطیؒ فرماتے ہیں: واذا قيل هذا حديث صحيح فهذا معناه اى ماتصل سنده مع الاوصاف المذكورة فقبلنا عملاً بظاهر الاسناد لانّه مقطوع به فى نفس الامر لجواز الخطاء والنسيان عن الثقة واذا قيل هذا حديث غير صحيح (ضعيف) فمعناه لم يصح إسناده على الشرط المذكور لانّه كذب فى نفس الامر لجواز صدق الكاذب واصابة من هو كثير الخطاء (تدریب الراوی بحوالہ مقدمہ اعلاء السنن/۵۶)

جب یہ کہا جائے کہ یہ روایت صحیح ہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ یہ وہ روایت ہے جس کی سند صفات مذکورہ کے ساتھ ہم تک پہنچا ہے، تو ہم اس کو ظاہر سند کی وجہ سے قبول کرتے ہیں۔ لیکن اس کے بارے میں قطعی طور پر یہ نہیں کہا جا سکتا کہ نفس الامر میں بھی یہ روایت صحیح ہے اس لئے کہ ثقہ راوی سے بھی خطاء اور نسیان کا احتمال ہے، اور جب کہا جائے کہ یہ حدیث صحیح نہیں تو اس کا مطلب یہ ہے کہ اس روایت کی سند مذکورہ شرائط کے ساتھ ہم تک نہیں پہنچا لیکن اس کا یہ مقصد ہرگز نہیں کہ نفس الامر میں بھی یہ جھوٹ ہے اس لئے کہ جھوٹے سے بھی سچ اور اصابت رائے کی توقع کی جا سکتی ہے۔

یہی وجہ ہے کہ کبھی کبھی ضعیف حدیث بھی محتج بہ بن جاتا ہے جب اس کی صحت پر کوئی قرینہ دلالت کرے اور جب قرائن اس کے خلاف ہو تو صحیح حدیث پر بھی عمل ترک کیا جاتا ہے (اعلاء السنن/۵۶) (بقیہ اگلے صفحہ پر)

(بقیہ حاشیہ ص۱۶۲)

لہٰذااب ان مقدمات کوذہن نشین کرنے کے بعداس روایت پرضعف کاجواعتراض کیاجاتا ہے۔وہ یہ ہیں کہ یہ روایت سنداًضعیف ہے'اس لئے کہ اس روایت کی سند میں ابوشیبہ ابراہیم بن عثمان العبسی ہےاوراس کومحدثین نےضعیف کہا ہے۔چنانچہ امام بیہقیؒ فرماتے ہیں۔**تفردبہ أبوشیبة ابراهیم بن عثمان العبسی وهو ضعیف** کہ ابوشیبہ ابراہیم بن عثمان عبسی اس روایت میں متفرد ہے۔اوروہ ضعیف ہے(السنن الکبریٰ ۲/۴۹۶)

شیخ الاسلام علامہ ذھبیؒ فرماتے ہیں' **ابراهیم بن عثمان ابو شیبة العبسی الکوفی قاض بواسط وجد ابی بکر بن ابی شیبة مروی عن زوج امه الحکم بن عتیبة وغیره کذّبه شعبة لکونه روی عن الحکم عن ابن ابی لیلی انه قال شهد صفین من اهل بدر سبعون فقال شعبة کذب والله لقد ذکرت الحکم فما وجدنا شهدصفین. احداً من اهل بدرغیرحزیمة:**

قلت سبحان اللّٰه ' اما شهدها علیؓ! اما شهد ها عمارؓ روی عثمانؓ لادارمی عن ابن معین ! لیس بثقة وقال احمد ضعیف وقال البخاری سکتو عنه وقال النسائی متروک الحدیث .... الخ (میزان الاعتدال ۱/۴۸)

ابوشیبہ ابراہیم بن عثمان العبسی الکوفی واسط کا قاضی ہےاورابوبکر بن ابی شیبہ کے دادا' آپ نے اپنی ماں کے شوہرحکم بن عتیبہ وغیرہ سے روایت کی۔امام شعبہ نے آپ کی تکذیب اس وجہ سے کی ہے کہ آپ نے حکم بن عتبہ عن ابن ابی لیلیٰ کی سند سے ذکرکیا ہے کہ جنگ صفین میں ۷۰ بدری صحابہ شریک ہوئے تھے'امام شعبہ فرماتے ہیں کہ یہ جھوٹ ہے' میں نے خودحکم بن عتیبہ سے اس کا ذکرکیا تو انہوں نے حضرت خزیمہؓ کے علاوہ کسی بدری صحابی کاصفین میں شرکت کا ذکر نہیں کیا۔علامہ ذہبیؒ فرماتے ہیں کہ میں کہتا ہوں کہ سبحان اللہ کیا حضرت علیؓ بھی شریک نہیں ہوئے تھےاورحضرت عمارؓ نے بھی شرکت نہیں کی تھی' عثمان دارمی نے امام ابن معین سے نقل کیا ہے کہ ابوشیبہ ثقہ نہیں ہے'امام احمدؒ فرماتے ہیں کہ ابوشیبہ ضعیف راوی ہے'امام بخاریؒ فرماتے ہیں کہ محدثین ابوشیبہ سے خاموش ہےاورنسائی نے کہا ہے کہ ابوشیبہ متروک الحدیث راوی ہے۔یہ وہ اعتراض ہے جس کی وجہ سے بعض حضرات اس کی اصلیت سے انکارکر بیٹھے۔مگراس اعتراض کے جواب کے بارے میں علامہ محمد حسن فیض پوریؒ رسالہ تحفۃ الاخوان فی صلوٰۃ رمضان میں لکھتے ہیں ۔(بقیہ اگلے صفحہ پر)

(بقیہ حاشیہ ص۱۶۳)

<u>ابراہیم بن عثمان کی توثیق:</u>(الجواب) اس اعتراض کا جواب یہ ہے کہ اگر چہ اہل حدیث نے اس کو مجروح اور ضعیف کہا ہے اوراس کے ضعف پر اصرار کیا ہے مگر اس عاجز ہیچ مداں کے نزدیک یہ تمام جروحات خام اور غیر موثر ہیں اور افسوس صد افسوس ان اہل علم پر جن سے یہ حرکت سرزد ہوئی اور کسی نے مخالف اور موافق سے غور اور تامل نہ کیا تفصیل اس اجمال کی یہ ہے کہ چند اسباب جرح کے متعدد اور متکثر ہیں مگر مآل اور انجام کار ان سب کا دو امر پر ہے۔اول جرح باعتبار عدالت اور تقویٰ کے اور دوسری جرح باعتبار حفظ اور ضبط کے اور میرے ناقص فہم میں ان محدثین کے جروحات سب کے سب عدالت کی طرف راجح ہیں۔حفظ اور ضبط کی طرف نہیں کیونکہ حافظ ابن حجرؒ نے فتح الباری کے ۷اصفحہ ۶۸ میں اس کو حافظ کے لفظ سے تعبیر کیا ہے اوراس کی عبارت یہ ہے : ابراهيم بن عثمان ابو شيبة الحافظ انتهى لہٰذا جب اس کے بارے میں لفظ حافظ مسلم ہوا تو اب باقی جروحات ان اہل حدیث کے سب عدالت کی طرف راجح ہے جبکہ یہی امر معہود متعین ہو چکا تو میں کہتا ہوں کہ جرح باعتبار عدالت کے بھی اس کے حق میں خام اور غیر موثر ہے اوروجہ اس کی یہ ہے کہ جن اہل علم نے عدالت کے رو سے اس کو متروک اور ضعیف کہا ہے تو وہ سب جروحات مبہم اور غیر مفسر ہیں اور مدار ان سب کا مفسر طور پر فقط ایک ہی جرح پر ہے وہ یہ کہ ان میں سے شعبہ بن حجاج نے سب سے مقدم اور مبین السبب جرح فرمائی ہے یعنی جو کہ شیخ الاسلام علامہ ذہبیؒ نے لکھی ہے وهو قوله كذبه شعبة لكونه روى عن الحكم عن ابن ابى ليلىٰ انه قال شهد صفين من اهل بدر سبعون فقال شعبة كذب والله لقد ذاكرت الحكم فما وجدنا شهد صفين من اهل بدر غير حزيمة اور باقی محدثین شعبہ کے تبع اور مقلد ہیں اور سب کے سب اسکے بعد ہیں۔کوئی جارح ابوشیبہ کا معاصر نہیں بجز شعبہ کے تو جروحاتِ عدالت کا مدار شعبہ کی کلام پر رہا جب یہی امر مہد متعین ہو چکا تو میں کہتا ہوں کہ یہ جرح اگر چہ مفسر اور مبین السبب ہے مگر اس قدر کی جرح سے ابوشیبہ متروک قرار دینا اور من کل الوجوہ ضعیف کہنا غلط اور بے انصافی ہے کیونکہ اس قسم کی جرح از قبیل سہو اور نسیان ہے اور وہ چنداں خارج نہیں ورنہ ابن حجاج بلکہ خود حکم بن عتیبہ کذاب اور متروک قرار دیا جاوے گا کیونکہ ان سے بھی اس قسم کی غلطی سرزد ہوئی ہے۔اسلئے شعبہ اور حکم اس بات کے قائل ہیں کہ صفین میں بجز خزیمہؓ کے اہل بدر میں سے کوئی معاصر نہ تھا حالانکہ حضرت علیؓ اور حضرت عمارؓ دونوں صحابہ کرامؓ بھی موجود تھے اس واسطے شیخ الاسلام علامہ ذہبیؒ نے شعبہ کے جواب میں کہا کہ سبحان الله أما شهدها عليؓ اما شهدها عمارؓ انتهى اب اگر اس قدر سہو اور ذہول کے سبب ابوشیبہ متروک قرار دیا جائے (بقیہ اگلے صفحہ پر)

(بقیہ حاشیہ ص۱۶۴) تو چاہیے کہ شعبہ بن حجاج اور حکم بن عتیبہ بھی متروک قرار دے جاوے للعلة الواحدة الجامعة فیھم وھی عدم حفظ اصحاب بدر ' اب شعبہ بن حجاج کو امیر المومنین قرار دینا اور حکم بن عتیبہ کو اجماعی امام ثقہ کہنا اور ابو شیبہ کو ضعیف قرار دینا مع اتحاد سبب الجرح فیھم انصاف سے بعید ہے۔ اور میں کہتا ہوں کہ ابو شیبہ کی بہ نسبت شعبہ اور اسکے شیخ حکم بن عتیبہ کی غلطی سخت ہے اور اسکی ایک وجہ تو یہ ہے کہ ان ایام میں بہت سارے بدری صحابہ کرامؓ زندہ تھے۔

منهم رفاعة بن رافع مات فی اولّ خلافة معاوية ' ابو لبابة الانصاری عاش الی خلافة علی ' أبو طلحة الانصاری مات سنة اربع و ثلاثين و قال ابوزرعة عاش بعد النبی ﷺ اربعين سنة ' سعيد بن زيد بن عمرو بن نفيل مات سنة خمسين او بعدها ' سهل بن حنيف مات فی خلافة علی ' عبدالله بن مسعود مات سنة اثنين وثلاثين ' أبو مسعود البدری مات قبل الاربعين ' عبادة بن الصامت مات سنة ثلاثين ' عتبان بن مالک مات فی خلافة معاوية ' مالک بن ربيعة ابو السيد مات سنة ثلاثين او بعدها اب یہ تمام صحابہ اور ان کے سواء دوسرے بدری صحابہ زندہ تھے کل ذلک من التقريب '

اور دوسری وجہ یہ ہے کہ بنسبت اور بدریوں کے حضرت علیؓ اور حضرت عمارؓ کا صفین میں ہونا اظھر من الشمس تھا اور ہر فرد بشر ادنیٰ اور اعلیٰ ذی علم میں سے اس بات کا خوب واقف ہے اور شعبہ اور حکم ان سے بھی غافل ہیں۔ اب باوجود ایسی سخت غلطی کے جب شعبہ اور حکم مجروح نہیں تو ابو شیبہ بھی مجروح نہ ہو۔ وھو المطلوب اسی واسطے خاتم المحدثین اور ہمارے پیران پیر اور شیخ الشیخ اعنی شاہ عبدالعزیز محدث دھلویؒ نے رسالہ تراویح میں لکھتے ہیں کہ حالانکہ ابو شیبہ ان قدر ضعف ندارد کہ روایت او مطروح ساختہ شود اور میں کہتا ہوں کہ یہ بات خاتم المحدثین کی راست اور درست ہے۔ (رسائل ستہ ضروریہ ص۲۰۰ تا ۲۰۲)

اور میں کہتا ہوں کہ علامہ فیض پوریؒ کا یہ کلام قرین قیاس ہے۔ اس لئے کہ ابراہیم بن عثمان ابو شیبہ کو مجروح ثابت کرنے میں کچھ مبالغہ سے کام لیا گیا ہے۔ اس لئے کہ امام ابن عدیؒ آپؒ کے متعلق فرماتے ہیں لـه احاديث صالحة وهو خير من ابراهيم بن ابی حيه (تہذیب التہذیب ۱/۱۴۵) اسی طرح امام بخاریؒ کے استاد الاستاذ یزید بن ھارون جو نہایت ثقہ اور اعلیٰ درجہ کے حافظ حدیث ہیں۔ ابو شیبہ ابراہیم بن عثمان کے بڑے مداح تھے' آپ فرمایا کرتے تھے ماقضیٰ علی الناس یعنی فی زمانه اعدل فی قضاء منه (تہذیب التہذیب ۱/۱۴۵)

یعنی ہمارے زمانے میں ان سے زیادہ عادل کوئی قاضی نہیں تھا۔ یہاں یہ بات گوش گزار کرنا ضروری سمجھتا ہوں کہ یزید بن ہارون سے بڑھ کر ابراہیم بن عثمان کا پرکھنے والا اور ان کے حالات سے باخبر ان (بقیہ اگلے صفحہ پر)

(بقیہ حاشیہ ص ۱۶۵) جارحین میں کوئی بھی نہیں ہے۔اس لئے کہ یزید بن ہارون ان کے محکمہ میں کاتب یعنی ان کے منشی تھے۔وہ ابوشیبہؒ کی عدالت، تقویٰ للّٰہیت سے خوب واقف تھے۔اس لئے یزید کی شہادت ابراہیم بن عثمان ابوشیبہ کے علم اور دیانت داری دونوں میں زبردست شہادت ہے۔اورویسے بھی کسی راوی کی روایت کوقبول کرنے کے لئے دو باتیں لازمی طور پر دیکھی جاتی ہیں۔ایک تدین (دینداری)، دوم اس کا قوت حافظہ، یزید بن ہارون کی شہادت کے بعداب تو ابراہیم بن عثمان کے تدین میں تو کوئی شک باقی نہیں رہا۔اور حافظ ابن حجرؒ اور ابن عدیؒ کی شہادت سے اس کا حافظہ بھی معلوم ہوا۔ان دونوں امور کے ثابت ہونے کے بعداس کواس حد تک ضعیف قرار دینا جس کی وجہ سے اس کی روایت کردہ حدیث کونا قابل استدلال قرار دیا جائے۔اس کے علاوہ امام شعبہ کے بارے میں مشہور ہے کہ وہ ہمیشہ ثقہ راویوں سے روایت لیتے تھے، اور تہذیب التہذیب میں یہ بھی لکھا ہے کہ ابوشیبہ سے امام شعبہ نے روایت لیا ہے اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ شعبہ نے اپنی جرح سے رجوع کرلیا ہوگا، اب اگر شعبہ کے رجوع کو مان لیا جائے تو راوی ابوشیبہ ثقہ ہوا اور اگر رجوع ثابت نہ مانا جائے تو راوی مختلف فیہ ہوا جس کی وجہ سے وہ درجہ حسن میں آئے گا اور درجہ حسن کی روایت بھی قابل احتجاج ہے۔اس لئے یہ روایت صرف شعبہ کے جرح سے نا قابل استدلال قرار نہیں دیا جاسکتا۔

اس کے علاوہ اگر بالفرض ان حضرات کی جرح کو مان لیا جائے اوران کی وجہ سے ابراہیم بن عثمان کوضعیف قرار دیا تو صرف اس سے روایت کوضعیف نہیں کہا جاسکتا۔اس لئے کہ اس کی تائید میں عہد فاروقی کے مسلمانوں کا علانیہ عمل اور ائمہ مجتہدین کے اتفاق رائے جیسے قوی اور ٹھوس دلائل موجود ہیں۔جس کی وجہ سے یہ روایت قابل احتجاج ہے، مولانا ثناء اللہ صاحب امرتسریؒ نے خود ایک موقعہ پر اعتراف کیا ہے کہ بعض ضعیف ایسے ہیں جو امت کی تلقی بالقبول سے رفع ہوگئے ہیں (اخبار اہل حدیث مورخہ ۱۹/اپریل ۱۹۰۷ء بحوالہ بیس تراویح کا ثبوت ص ۴)

<u>غیر مقلدین کی ناانصافی:</u> تلقی بالقبول پر مزید تفصیلی بحث کرنے سے قبل حضرات غیر مقلدین کی ناانصافی بتانا ضروری ہے، کہ تراویح کے مسئلہ میں تو احناف کے مستدل حدیث بالا پر ورق کے ورق سیاہ کرتے ہیں کہ ابراہیم بن عثمان ابوشیبہ سخت ضعیف ہے، اس سند کو پیش کرنا بدنامی اور حماقت ہے۔مگر نماز جنازہ میں سورۃ فاتحہ پڑھنے کے ثبوت میں مشہور غیر مقلد حکیم محمد صادق سیالکوٹی نے اپنی کتاب صلوۃ الرسول کے صفحہ ۴۳۴ پر اسی راوی کی روایت بحوالہ ابن ماجہ پیش کی ہے۔وعن ابن عباس أنّ النبیّ ﷺ قرأ علی الجنازۃ بفاتحۃ الکتاب (ابن ماجۃ) کہ رسول اللہ ﷺ نے نماز جنازہ میں سورۃ فاتحہ پڑھی ہے۔ (بقیہ اگلے صفحہ پر)

(بقیہ حاشیہ ص۱۶۶)اور ابن ماجہ میں اس روایت کی سند یوں ہے حدثنا أحمد بن منیع ثنا زید بن الحباب ثنا إبراهیم بن عثمان عن الحکم عن مقسم عن ابن عباس أنّ النّبیّﷺقرأ علی الجنازة بفاتحة الکتاب (ابن ماجہ ص۱۰۷)

گزشتہ تفصیل سے معلوم ہوگا کہ ابراہیم بن عثمان ابوشیبہ ضعیف راوی نہیں لیکن اگر ان محدثین کی بات مان لی جائے تو بعض کے توثیق اور بعض کی تضعیف سے اس کو مختلف فیہ راوی مان لیا جائے گا۔ جیسا کہ ہم نے مقدمہ ثانیہ میں ذکر کیا کہ ایک ضعیف روایت تلقی بالقبول کی وجہ سے بھی قابل استدلال اور صحیح قرار دیا جاتا ہے۔ یہاں پر بھی اس روایت کو امت مسلمہ نے معمول بھا قرار دیا ہے اور دور صحابہ سے لے کر آج تک اسی روایت پر عمل ہوتا رہا ہے۔ اور بیس رکعات تراویح کا عمل خیر القرون سے آج تک منقول ومشاہد ہے' خلفاء راشدین' صحابہ کرام' تابعین' تبع تابعین اور ائمہ مجتہدین کے اقوال' افعال اور فتاویٰ اس روایت کے مؤید ہیں ہم نے مقدمہ ثالثہ میں یہی ذکر کیا ہے کہ ایک حدیث ضعف سند کے باوجود قرائن شرع کی تائید سے صحیح اور قابل احتجاج بن جاتا ہے اور یہاں پر قرائن شرع یعنی اجماع صحابہ' تعامل امت اور ان کا اتفاقی عمل اس روایت کے مؤید ہیں' ذیل میں بعض آثار اور تائیہ قرائن ذکر کئے جاتے ہیں تا کہ مزید وضاحت ہو سکے۔

<u>دور فاروقی میں بیس رکعات تراویح</u>: امیر المؤمنین حضرت عمر فاروقؓ کے زمانہ خلافت میں باقاعدہ طور پر نماز تراویح باجماعت کا اہتمام کیا گیا اور اس وقت سے لوگوں نے باقاعدہ طور پر بیس رکعات تراویح کا اہتمام کرنا شروع کیا۔

(۱) چنانچہ حضرت سائب بن یزید فرماتے ہیں: کنا نقوم فی زمان عمر بن الخطاب بعشرین رکعة والوتر ۔ حضرت عمرؓ کے خلافت کے زمانہ میں بیس رکعات تراویح اور تین وتر پڑھتے تھے۔(معرفة السنن للبیهقی ص ۳۶۷)اس روایت کی سند پر امام نوویؒ کلام کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ اس حدیث کی سند صحیح ہے(شرح المهذب) علامہ سبکیؒ علامہ جلال الدین سیوطیؒ ملاعلی قاریؒ نے بھی اس کی سند کی تصحیح کی ہے۔

(۲) اسی طرح یحییٰ بن سعید فرماتے ہیں کہ أنّ عمر بن الخطاب امر رجلاً یصلّی بهم عشرین رکعة بیشک حضرت عمرؓ نے ایک آدمی کو مقرر کیا کہ وہ لوگوں کو بیس رکعات تراویح پڑھائے۔

(۳) اسی طرح یزید بن رومان سے مروی ہے کان الناس یقومون فی زمان عمر بن الخطاب فی رمضان بثلاث وعشرین رکعة (موطا امام مالک ص۴۰) کہ لوگ حضرت عمرؓ کے زمانہ خلافت میں رمضان میں بیس (۲۰) رکعات تراویح اور تین وتر پڑھتے تھے۔ (بقیہ اگلے صفحہ پر)

(بقیہ حاشیہ ص ۱۶۷)(۴)عن الحسن أنّ عمر بن الخطاب جمع الناس علی ابی بن کعب فکان یصلّی بھم عشرین رکعۃ حضرت عمرؓ نے لوگوں کو حضرت ابی بن کعبؓ کی اقتداء میں جمع کیا اور وہ لوگوں کو بیس رکعات تراویح پڑھاتے تھے۔

(۵) عن ابی بن کعب ان عمربن الخطاب امرہ ان یصلّی باللیل فی رمضان فصلّی بھم عشرین رکعۃ (کنزالعمال ۲۶۴/۸) حضرت ابی بن کعبؓ سے روایت ہے کہ بیشک حضرت عمرؓ نے اسے حکم دیا کہ وہ لوگوں کو رمضان میں رات کو (تراویح) پڑھائے اس لئے اس نے لوگوں کو بیس رکعات پڑھائے۔

حضرت ابی بن کعبؓ کے بیس رکعات پڑھانے کی تحقیق کے ثبوت کے بارے میں شیخ الاسلام علامہ ابن تیمیہ فرماتے ہیں قدثبت أنّ ابی بن کعب کان یقوم بالناس عشرین رکعۃ ویوتر بثلاث فرای اکثر من العلماء أنّ ذالک ھوالسنۃ لامۃ قام بین المھاجرین والانصار ولم ینکرہ منکر (فتاوی ابن تیمیہ ۱۱۲/۲۳)

یہ بات ثابت ہوگئی ہے کہ حضرت ابی بن کعب لوگوں کو بیس رکعات تراویح اور تین وتر پڑھائے تھے۔اس لئے علماء کی اکثریت کی رائے میں بیس ہی سنت ہے کیونکہ حضرت ابی بن کعبؓ کے پیچھے مہاجرین اور انصار (بیس رکعات پڑھتے تھے)اور کسی منکر نے بھی انکارنہیں کیا۔

<u>دورعثمانی میں بیس رکعات تراویح:</u> حضرت سائب بن یزید فرماتے ہیں کہ عہد فاروقی میں لوگ بیس رکعات تراویح پڑھتے تھے اور حضرت عثمانؓ کے زمانہ میں بھی اور لوگ لمبے قیام کی وجہ سے لاٹھیوں پر سہارا لیتے تھے (السنن الکبریٰ ۲۹۲/۴) اسی طرح علامہ عینیؒ نے لکھا ہے وفی روایۃ لہ (سائب بن یزید) وعلی عھد عثمان وعلیؓ مثلہ (البنایۃ ۱۰۱/۳) کہ حضرت سائب بن یزید سے روایت کہ لوگ حضرت عثمانؓ اور حضرت علیؓ کے زمانہ میں بھی بیس رکعات پڑھتے تھے دورفاروقی کی طرح عہدعثمانی میں بھی کسی نے بیس رکعات تراویح پرتنقیدنہیں کی اورنہ اس کو بدعت کہا ہے گویا اس دور میں سب مسلمانوں کا بیس رکعات تراویح پر اتفاق رہا۔

<u>دورمرتضوی میں بیس رکعات تراویح:</u> اسی طرح دورمرتضوی (حضرت علیؓ کے زمانہ خلافت) میں بھی اسی پر مواظبت رہا حضرت علیؓ نے خودقرأ کو بیس رکعات تراویح پڑھانے پر مامورفرمایا تھا۔(۱) عن أبی عبدالرحمن السلمیؒ عن علیّ قال دعا القراء فی رمضان فامر منھم رجلاًیصلّی بالناس عشرین رکعۃ وکان علی یو تربھم (سنن کبریٰ للبیہقی ۴۹۶/۲) کہ حضرت علیؓ نے قاریوں کو بلایا اوران میں سے ایک آدمی کو حکم دیا کہ وہ لوگوں کو بیس رکعات پڑھایا کرے اورخود حضرت علیؓ لوگوں کو وتر پڑھاتے تھے۔ (بقیہ اگلے صفحہ پر)

(بقیہ حاشیہ ص۱۶۸)(۲) عن ابی الحسن ' انّ علیّا امر رجلاً یصلّی بھم فی رمضان عشرین رکعة. (مصنف ابن ابی شیبہ ۲/۳۹۳)ابوحسن سے روایت ہے کہ بیشک حضرت علیؓ نے ایک آدمی کو مامور کیا کہ وہ رمضان میں لوگوں کو بیس رکعات تراویح پڑھائے۔

<u>دیگر صحابہ کرام وتابعین کا عمل:</u> دور خلفاء ثلاثہ کے علاوہ بعد کے ادوار میں بھی قریباً جمیع صحابہ کرام کا بیس رکعات پڑھنے کا عمل تھا۔چنانچہ امام حسن بصریؒ عبدالعزیز بن رافع سے روایت کرتے ہیں:

۱. کان أبی بن کعب یصلّی بالناس فی رمضان بالمدینة بعشرین رکعة ویوتر بثلاث(مصنف ابن ابی شیبة ۲/۲۸۵) ''کہ ابی بن کعبؓ مدینہ منورہ میں رمضان مبارک میں لوگوں کو بیس رکعات تراویح اور تین رکعات وتر پڑھایا کرتے تھے۔''

۲.عن عطاء قال ادرکت الناس وھم یصلون ثلاثا وعشرین رکعة بالوتر (مصنف ابن ابی شیبہ۲/۲۹۳) ''حضرت عطاء بن ابی رباحؒ فرماتے ہیں کہ میں نے لوگوں کو بیس رکعات تراویح اور تین وتر پڑھتے پایا ہے۔''اس روایت میں الناس سے مراد صحابہ کرام اور تابعین ہیں۔

۳۔ابوحنیفة عن حماد عن ابراھیم أنّ الناس کانوا یصلّون خمس ترویحات فی رمضان (کتاب الاثار لابی یوسف۴۱)''ابراہیم نخعی فرماتے ہیں کہ سب لوگ(تابعین وتبع تابعین)رمضان میں بیس رکعات پڑھا کرتے تھے۔''

ان آثار اور تعامل کے علاوہ مزید روایات وآثار کے لئے مصنف ابن ابی شیبہ،قیام اللیل،سنن کبریٰ للبیھقی اور آثار السنن مطالعہ کیا جاسکتا ہے۔اس لئے کہ ان کے علاوہ اور بھی بہت سارے صحابہ کرامؓ کے آثار کتب حدیث میں موجود ہیں۔اسی وجہ سے شیخ الحدیث مولانا زکریاؒ فرماتے ہیں: قلت والاثار فی الباب اکثر من ان تحصی (اوجز المسالک۲/۵۳۵) میں کہتا ہوں کہ اس باب میں اتنے آثار ہیں جو گنے نہیں جاسکتے(یعنی بہت زیادہ ہیں)

<u>اجماعی ثبوت:</u> اوراسی پر صحابہ کرامؓ ،تابعین اور ائمہ مجتہدین کا اجماع ہے۔چنانچہ علامہ بدرالدین العینیؒ نے لکھا ہے: والیہ ذھب من التابعین ابن ابی ملیکة' وعطاء وابو البختری والحارث الھمدانی وسعید ابن ابی الحسن ' اخوالحسن البصری وعبد الرحمن بن ابی بکر وغیرھم قالاابن عبدالبر وھوقول جمھور العلماء وبة قال الکوفیون والشافعی واکثر الفقھاء وھو الصحیح عن ابی بن کعب من غیر خلاف من الصحابة (بحوالہ معارف السنن ۵/۵۴۲) (بقیہ اگلے صفحہ پر)

(بقیہ حاشیہ ص۱۶۹) بیس تراویح کی طرف تابعین میں سے ابن ابی ملیکہ عطاء بن ابی رباح ابوالبختری حارث سعید بن ابی الحسن اخوالحسن البصری عبدالرحمٰن بن ابی بکراور دوسرے حضرات گئے ہیں علامہ ابن عبدالبرؒ فرماتے ہیں کہ یہ جمہور علماء کا قول ہے اور یہی رائے کوفیوں امام شافعی اور اکثر فقہا کرام کی ہے حضرت ابی بن کعبؓ سے یہی صحیح طریقے سے نقل ہے اوراس میں کسی بھی صحابی سے اختلاف مروی نہیں اور علامہ کاسانیؒ فرماتے ہیں أنّ **عمر جمع اصحاب رسول اللّٰہ ﷺ فی شهر رمضان علی ابی بن کعب فصلّی بهم کل لیلة عشرین رکعة ولم ینکر علیه احد فیکون اجماعاً منهم علی ذلک** . ابن قدامۃ نے المغنی کے ۱/۸۰۲ پرلکھا ہے کہ **وهذا کالا جماع** (بحوالہ معارف السنن ۵/۵۴۳) بیشک حضرت عمرؓ نے آنحضرت ﷺ کے صحابہ کرام کو رمضان المبارک کے مہینے میں حضرت ابی بن کعبؓ کی اقتداء میں جمع کیا اور آپؓ نے ان کو ہررات بیس رکعات تراویح پڑھایا کرتے تھے اور کسی نے اس پرنکیر نہیں کی گویا اسی پران کا اجماع ہوا علامہ ابن قدامہؒ نے المغنی میں لکھا ہے کہ (صحابہ کرام کا نکیر نہ کرنا) اجماع کی طرح ہے۔

اسی طرح شیخ الحدیث مولانا محمد زکریاؒ الدسوقی علی الشرح الکبیر کے حوالہ سے لکھتے ہیں: **وهی ثلاث وعشرون رکعة بالشفع و الوتر کما کان علیه عمل الصحابة و التابعین وجریٰ علیه العمل سلفاً و خلفاً** (اوجز المسالک ۲/۵۳۴)

بیس رکعات تراویح دو رکعات کے ساتھ اور تین رکعات وتر پر صحابہ کرام تابعین کا عمل رہا اور اسی پر سلفاً وخلفاً عمل ہوتا رہا ہے۔

اسی طرح ملا علی قاریؒ فرماتے ہیں: **أجمع الصحابة علی أنّ التراویح عشرون رکعة** (مرقات ۳/۱۹۴) صحابہ کرامؓ کا بیس رکعات پر اجماع تھا۔

صاحب اتحاف سادۃ المتقین فرماتے ہیں: **وبالاجماع الذی وقع فی زمن عمرؓ اخذ ابوحنیفة والثوری والشافعی واحمد والجمهور واختار ابن عبدالبر** (اتحاف سادۃ المتقین ۳/۴۲۴) بیس رکعات تراویح جو حضرت عمرؓ کے زمانہ خلافت میں اجماعاً ثابت ہے۔اسی کو امام ابوحنیفہؒ امام سفیان ثوریؒ امام شافعیؒ امام احمد بن حنبلؒ اور جمہور نے لیا ہے اور اسی کو حافظ ابن عبدالبرؒ نے بھی اختیار کیا ہے۔

<u>بیس رکعات تراویح پر مذاہب اربعہ کا اتفاق:</u> جس طرح صحابہ کرام تابعین اور تبع تابعین کا بیس رکعات تراویح پر اتفاق تھا۔اسی طرح مذاہب اربعہ میں بھی یہ مسئلہ اتفاقی ہے کسی بھی مذہب کے امام نے آٹھ تراویح کا قول نہیں کیا۔

(بقیہ اگلے صفحہ پر)

(بقیہ حاشیہ ص ۱۷۰)۱۔ امام ترمذیؒ نے جامع ترمذی میں لکھا ہے: واختلف اهل العلم فی قیام رمضان فرای بعضهم ان یصلّی احدی واربعین رکعة مع الوتر وهو قول اهل المدینة والعمل علی هذا عندهم بالمدینةواکثراهل العلم علی ماروی عن علی وعمر و غیرهما من اصحاب النبیﷺعشرین رکعة وهو قول سفیان الثوری وابن المبارک والشافعی وقال الشافعی وهکذا ادرکت ببلد نا بمکة یصلون عشرین رکعة وقال احمد روی فی هنا الوان لم ینص فیه بشئی وقال اسحاق بل نختار احدیٰ واربعین رکعة علی ماروی عن ابی بن کعب. (جامع ترمذی ۱/۱۱۲)

رمضان المبارک کے مہینے میں قیام کا مسئلہ اہل علم کے ہاں مختلف فیہ ہے، بعض اہل علم وتر کے ساتھ اکتالیس رکعات کے قائل ہیں اور یہی اہل مدینہ کا قول ہے اور اسی پر ان کا عمل ہے، اور اکثر اہل علم بیس رکعات کے قائل ہیں اور یہ رائے آنحضرتﷺ کے صحابہ کرام مثلاً حضرت علیؓ حضرت عمرؓ اور دوسرے صحابہ کرامؓ کے مرویات کے موافق ہے، اور یہی سفیان ثوری، عبداللہ بن مبارک اور امام شافعی کا قول ہے۔ اور امام شافعیؒ فرماتے ہیں کہ میں نے اپنے شہر مکہ میں بیس رکعات پڑھتے دیکھا ہے۔ اور امام احمد حنبلؒ کا کہنا ہے کہ تراویح میں مختلف روایات میں (بیس سے لے کر اکتالیس تک) اسی پر کوئی حکم نہیں لگایا۔ اور امام اسحاق فرماتے ہیں۔ کہ ہم اکتالیس رکعات کو اختیار کرتے ہیں، اور یہی حضرت ابی بن کعبؓ کی روایت کے موافق ہے، امام ترمذیؒ کی عبارت پر اگر غور کیا جائے تو معلوم ہو جائے گا کہ صحابہ، تابعین، تبع تابعین کے زمانہ میں کہیں بھی کوئی جماعت یا فرد مشہور آٹھ رکعات تراویح کا قائل نہیں تھا۔ ورنہ امام ترمذیؒ اس کا تذکرہ ضرور کرتے، ان کا ذکر نہ کرنا اس بات کی دلیل ہے کہ ان ادوار میں آٹھ رکعات تراویح کا کوئی رواج ہی نہیں تھا۔ اور نہ لوگ آٹھ رکعات تراویح پڑھتے تھے۔

اس لئے علامہ انور شاہ کشمیریؒ فرماتے ہیں: ولم یقل احد من الائمة الاربعة باقل من عشرین رکعة فی التراویح والیه جمهور الصحابة رضوان الله عنهم. (العرف الشذی ۱/۱۶۶) ائمہ اربعہ میں سے کسی نے بھی بیس رکعات تراویح سے کم کے متعلق نہیں کہا ہے، اور یہی عمل جمہور صحابہ کرامؓ سے ثابت ہے۔

جب ان دلائل شرع کی تائید اس روایت کو حاصل ہے تو یہ اس بات کی بالکل واضح دلیل ہے کہ جس روایت کو اعتراض کا نشانہ بنایا گیا ہے وہ اعتراض غلط اور صحیح نہیں ہے بلکہ وہ درست اور قابل استدلال حدیث ہے۔ اس لئے شیخ الحدیث مولانا محمد زکریاؒ فرماتے ہیں: لاشک فی أنّ تحدید التراویح فی عشرین رکعة لم یثبت مرفوعاً عن النبیﷺ بطریق صحیح علی اصول المحدثین وما وردفیه من روایة (بقیہ اگلے صفحہ پر)

(بقیہ حاشیہ ص ۱۷۱)ابن عباس متکلم فیها علی اصولهم لکن مع هذا لایمکن الانکار عن ثبوته بفعل عمر و سکوت الصحابة علی ذلک و اجماعهم علی قبوله بمنزلة النص علی ان له اصلاً عندهم (اوجز المسالک ۲/۵۳۴)

اس میں کوئی شک نہیں کہ بیس رکعات تراویح آنحضرتﷺ سے محدثین کے اصول کے مطابق مرفوعاً صحیح طریقے سے ثابت نہیں اور جو روایت (بیس رکعات) کی عبداللہ ابن عباسؓ سے مروی ہے، محدثین کے اصول کے مطابق متکلم فیہا ہے۔لیکن اس کے ثبوت سے انکار کرنا حضرت عمرؓ کے فعل اور صحابہ کرامؓ کے سکوت سے ممکن نہیں۔ان کا حضرت عمرؓ کے فعل کو قبول کرنے پر اتفاق کرنا نص کی طرح ہے اور یہ اس بات کی دلیل ہے کہ ان کے ہاں اس فعل (بیس رکعات کی تراویح) کے لئے اصل موجود ہے۔اور یہی بات علامہ انور شاہ کشمیریؒ صاحب فتاویٰ تاتارخانیہ کے حوالہ سے نقل کرکے فرماتے ہیں: ففی التاتارخانیة: سأل ابویوسف ابا حنیفة ان اعلان عمر بعشرین رکعة هل کان له عهد منه ﷺ قال ابو حنیفة ماکان عمر مبتدعاً ای لعله یکون له عهد فدل علی ان عشرین رکعة لابدمن ان یکون لها اصل منه ﷺ وان لم یبلغنا بالاسناد القوی . (العرف الشذی ۱/۱۶۶)

تاتارخانیہ میں ہے کہ امام ابو یوسفؒ نے امام ابوحنیفہؒ سے سوال کیا کہ حضرت عمرؓ کے بیس رکعات کے اعلان کے لئے آنحضرتﷺ کے زمانہ میں کوئی اصل ہے۔امام ابوحنیفہؒ نے فرمایا کہ حضرت عمرؓ بدعتی نہیں تھے،اس کا مطلب یہ ہے کہ اس بیس رکعات تراویح کے لئے آنحضرتﷺ کے زمانہ میں اصل موجود ہے اگرچہ وہ ہم تک قوی سند کے ساتھ نہیں پہنچا ہے۔جب یہ بیس رکعات تراویح کا ثبوت آنحضرتﷺ سے بنفس نفیس ثابت ہوا۔جمیع صحابہ کرام، تابعین، تبع تابعین اور ائمہ مجتہدین سلفاً وخلفاً اسی پر عمل کرتے چلے آرہے ہیں تو اس کے بعد آٹھ رکعات کا قائل ہونا، بیس رکعات کو بدعت اور ناجائز کہنا خرق للاجماع ہے۔ چنانچہ علامہ بنوریؒ لکھتے ہیں وبالجملة :العشرون من التراویح و ثلاث الوتر هوالذی استقرعلیه الامر أخیرا کما یقوله الشعرانی فی کشف الغمة والسیوطی فی المصابیح فمن احدث خلافاً بعد هذا الاتفاق یکون خارقاً للاجماع (معارف السنن ۵/۵۴۶)

بیس رکعات تراویح اور تین وتر پر اخیر میں استقرار (دوام) ہوا۔جیسا کہ علامہ شعرانیؒ نے کشف الغمۃ اور علامہ سیوطیؒ نے المصابیح میں لکھا ہے، پس جس کسی نے بھی اس اتفاق کے خلاف کہا تو اس نے اجماع کو پامال کیا۔جب کسی روایت کو صحابہ کرامؓ کے اجماع خلفاء راشدین کا تعامل، تابعین، تبع تابعین اور ائمہ مجتہدین اور اجماع امت کا تعاون حاصل ہو تو پھر بھی صرف ایک فرد کی وجہ سے اور وہ بھی اس وجہ سے جو حقیقتاً سبب جرح بھی نہیں پورے کو (بقیہ اگلے صفحہ پر)

(بقیہ حاشیہ ص۱۷۲) ضعیف اور نا قابل احتجاج قرار دینا انصاف نہیں۔

احناف کی بعض کتابوں کے حوالہ جات کا جواب: اور جو حوالہ جات آنجناب نے اپنے مکتوب میں تحریر فرمائے ہیں ان کے بارے میں لکھنے سے قبل یہ بات ذہن نشین کر لینا ضروری ہے کہ فقہ حنفی کی کتابوں میں درج شدہ جزئیات میں سے صرف ان جزئیات کا اعتبار کیا جاتا ہے جو فقہاء امت کے ہاں راجح ہوں یا ان کا تعلق ظاہر الروایۃ سے ہو' اس لئے جو جزئیات ان دونوں میں سے الگ ہوں تو وہ فقہ حنفی شمار نہیں ہوگا۔اس لئے اگر کسی حنفی عالم نے اس قسم کی کوئی بات لکھی دی ہو وہ اس کا تفرد اور ذاتی رائے شمار ہوتی ہے فقہ حنفی شمار نہیں ہوگی۔محقق العصر علامہ ابن عابدین شامیؒ نے اپنے منظوم کلام میں لکھا ہے۔

لہٰذا اس اصول کو ذہن نشین کرنے کے بعد جو حوالہ جات آنجناب نے اپنے مکتوب میں پیش کئے ہیں۔وہ ان حضرات کی یا تو ذاتی رائے ہے اور یا انہوں نے کسی سے روایت نقل کی ہے اور آنجناب نے اس مقام کو سمجھنے کی سعی نہیں فرمائی۔کہ آیا واقعی یہ اس مصنف کا قول ہے بھی جس کا خط میں حوالہ دیا جا رہا ہے' اور یہ قول اس مذہب حنفی میں رہتے ہوئے کہی ہے۔یا اس نے کسی کا حوالہ یا روایت نقل کی ہے۔

آنجناب نے کتاب الاثار کے حوالہ سے جو عبارت نقل کی ہے اس میں کہیں یہ ذکر نہیں کہ آپ ﷺ نے آٹھ رکعات تراویح پڑھی تھی' اور نہ اس میں رمضان کا ذکر ہے' اس لئے اس کو تراویح کی تعداد پیش کرنا نامناسب ہے۔اس روایت کو امام محمدؒ نے باب الصلوة تطوعاً میں ذکر کیا ہے۔اس سے مراد قیام اللیل یعنی تہجد ہے جو رمضان وغیر رمضان دونوں میں جائز اور مستحب ہے۔

ضروری تنبیہ:ا۔ اگر آنجناب نے اس روایت سے استدلال اس لئے کیا ہے کہ اس میں لفظ کان ذکر ہے اور کان دوام اور استقرار کے معنی میں آتا ہے تو مقصد یہ ہوا کہ یہ اس سے مراد صلوۃ تراویح ہے اور آنحضرت ﷺ رمضان میں بھی آٹھ رکعات پڑھا کرتے تھے۔اس کا جواب یہ ہے کہ لفظ کان عموماً اور کلیۃ استقرار کے معنی میں استعمال نہیں ہوتا بلکہ موقع اور محل کے اعتبار سے اس میں دوام پایا جاتا ہے۔ ہر وقت دوام کے لئے نہیں ورنہ پھر اس روایت کے متصل روایت کہ کان عبداللہ بن عمرؓ یصلی التطوع علی راحلتہ کا معنی ہوگا کہ عبداللہ بن عمرؓ ہمیشہ نفل سواری کے اوپر پڑھا کرتے تھے۔حالانکہ آپؓ عموماً ایسا نہیں کرتے تھے بلکہ یہ کیفیت آپؓ کی صرف حالت سفر میں ہوتی تھی کہ آپ سواری کے اوپر نفل پڑھتے تھے' اس سے معلوم ہوا کہ کان عموماً دوام کے لئے استعمال نہیں ہوتا۔اور اس کے اور بھی نظائر موجود ہیں جہاں لفظ کان مضارع پر داخل ہوا مگر وہاں کسی نے دوام کا معنی نہیں لیا۔ (بقیہ اگلے صفحہ پر)

(بقیہ حاشیہ ص۱۷۳) ۲۔اسی طرح دوسرا جواب یہ ہے کہ آنجناب نے جو عبارت امام محمدؒ کی کتاب المؤطا کے حوالہ سے نقل کیا ہے وہ دراصل حضرت عائشہؓ کی روایت کا حصہ ہے امام محمدؒ کا اپنا قول نہیں اور حضرت عائشہؓ کی روایت تہجد کی نماز پر محمول ہے۔

۳۔ اسی طرح امام ابن ہمامؒ کے حوالہ سے جو بات مکتوب میں نقل کی گئی ہے تو وہ ابن ہمامؒ کا اپنا اجتہاد اور تفرد ہے اس کو علماء احناف نے قبول نہیں کیا ہے اور میں نے پہلے ذکر کیا ہے کہ فقہ حنفی میں مذہب کے حوالہ سے انفرادی رائے قبول نہیں ہوتی۔اور ابن ہمامؒ کے تفردات کے بارے میں ان کے شاگرد علامہ قاسم بن قطلو بغا فرماتے ہیں۔تفردات شیخنا لا تقبل کہ میرے شیخ کے تفردات مقبول نہیں اس لئے اس کو فقہ حنفی پر لاگو نہیں کیا جاسکتا۔

۴۔ اسی طرح آنجناب نے جو حوالہ عمدۃ القاری کا دیا ہے اس میں کہیں یہ مذکور نہیں کہ یہ احناف کثر اللہ سوادھم یا خود علامہ عینیؒ کی رائے اور فتویٰ ہے بلکہ علامہ صاحب تو تفصیلی بحث میں آنجناب کے حوالہ کے خلاف فرماتے ہیں وقیل عشرون وحكاه الترمذی عن اكثر اهل العلم فانه روی عن عمرو علی وغيرهما من الصحابة وهو اصحابنا الحنيفة (عمدہ القاری ۱۱/۱۲۶)

تراویح کی تعداد کے بارے میں ایک رائے بیس رکعات کی ہے۔اور اسی کو امام ترمذیؒ نے اکثر اہل العلم سے نقل کیا ہے اسی طرح حضرت علیؓ اور دوسرے صحابہ کرامؓ سے مروی ہے اور یہی ہمارے احناف کی رائے ہے۔

آنجناب نے کیسے آٹھ رکعات کی نسبت علماء احناف کی طرف کردی۔اور اس کو علامہ عینیؒ کا قول اور رائے قرار دیا گیا۔

۵۔ اسی طرح یہی حال ملاعلی قاریؒ کے مرقات کے حوالہ کی ہے اگر چہ اختلاف فی المسئلہ کے بیان میں انہوں نے آٹھ کا ذکر کیا ہے لیکن وہاں یہ بھی فرماتے ہیں۔ لكن اجمع الصحابة على أن التراويح عشرون ركعة (مرقات ۳/۳۸۲) کہ بیس رکعات تراویح پر تمام صحابہ کرامؓ متفق ہو چکے ہیں۔اس سے معلوم ہوا کہ مکتوب میں درج شدہ حوالہ کی عبارت ملاعلی قاریؒ کا فتویٰ یا رائے نہیں۔

۶۔ اسی طرح آنجناب نے علامہ عبدالحئیؒ کے التعلیق المجد کا حوالہ دیا ہے اس حوالے کا جواب یہ ہے کہ انہوں نے بناء بر حکایت حدیث ۱۱ رکعات نقل کی ہے لیکن اس سے ہرگز یہ مطلب نہیں کہ یہ علامہ کی رائے ہے بلکہ علامہ صاحب دونوں طرح کی روایات کو نقل کرنے کے بعد لکھتے ہیں۔اذلاشک فی صحة حديث عائشة وضعف حديث ابن عباس لكن الاخذ بالراجح وترک المرجوح إنّما يتعين اذا تعارضاتعارضاًلايمكن الجمع وههنا الجمع ممكن بأن يحمل حديث عائشة على انه اخبار عن حالة الغالب كما صرّح به الباجی فی شرح الموطا وغيره ويحمل حديث ابن عباس على انه كان ذلک (بقیہ اگلے صفحہ پر)

(بقیہ حاشیہ ص ۱۷۴)احیاناً (التعلیق الممجد علی الموطا للامام محمد ۱/۲۲۱)

حضرت عائشہؓ کی روایت کی صحت اور ابن عباسؓ کی روایت کی ضعف میں کوئی شک نہیں لیکن راجح کو لینے اور مرجوع کو ترک کرنے کا سوال تب پیدا ہوگا جب دونوں میں ایسا تعارض ہو کہ دونوں کا جمع کرنا ممکن ہی نہ ہو اور یہاں جمع کرنا ممکن ہے وہ اس طرح کہ حضرت عائشہؓ کی روایت غالب احوال کے متعلق ہے جیسا کہ علامہ باجیؒ نے موطا کی شرح وغیرہ میں لکھا ہے اور حضرت عبداللہ بن عباس کی روایت أحیاناً کے متعلق ہے۔

بلکہ علامہ صاحب اپنی دوسری تصنیف میں فرماتے ہیں: **قلت اکتفاء النبیﷺ علی ثمان رکعات فی التهجد ، لو ثبت انه لم یزد علیه شیئاً فی وقت ما، لیس من قبیل التحدید الالتزامی، بحیث لایجوز الزیادة علیه فکیف وقد قال النبیﷺ الصلاة خیر موضوع فمن شاء فلیقلل ومن شاء فلیستکثر فلما جازت الزیادة و واظب علی الزیادة الخلفاء کانت سنة بالنسبة الینا لا مرلزوم سنتهم**

(تحفة الاخبار باحیاء سنة سید الابرار . ص ۱۲۷)

میں کہتا ہوں کہ آنحضرتﷺ کا آٹھ رکعات پر اکتفاء کرنا تہجد میں تھا، البتہ اگر ثابت ہو جائے کہ آنحضرتﷺ نے (رمضان میں) آٹھ رکعات پر کسی بھی وقت زیادتی نہیں کی تو یہ تحدید التزامی نہیں جس پر زیادتی جائز نہ ہو اور یہ عدم جواز کیسے ہو سکتا ہے کہ آنحضرتﷺ نے تو فرمایا ہے کہ نماز بہترین عمل ہے، جو چاہے اس میں کمی کرے اور جو چاہے زیادہ پڑھے۔ جب نماز کی تعداد رکعات میں زیادتی جائز ہے اور خلفاء راشدین نے (رمضان میں اس پر زیادتی کرتے بیس رکعات) پر مواظبت کی تو ہمارے لئے خلفاء راشدین کی تعداد سنت ہے۔ اس لئے کہ ان کی سنت پر عمل کرنے کے لزوم کا حکم ہو چکا ہے۔

اور حدیث ابن عباس پر بحث کرتے ہوئے خود علامہ صاحبؒ فرماتے ہیں۔

لایقال هذا حدیث غیر مقبول کما صرّح به ائمة الفن علی ماسبق ذکره لانا نقول لم یصرّح احد منهم بانّه موضوع بد غایة ماقیل أنّه حدیث منکر والمنکر لیس من اقسام الموضوع بل هو من اقسام الضعیف ولیس کل ضعیف ولا کل منکر کالموضوع الذی لایحل نقله والتایید به

(تحفة الاخبار باحیاء سنة سید الابرار ص ۱۲۷)

اور نہ یہ کہا جائے کہ یہ حدیث مقبول نہیں جیسا کہ ائمہ الفن نے تصریح کی ہے جس کی تفصیل پہلے ذکر ہو چکی ہے۔ اس لئے کہ ہم کہتے ہیں کہ ان ائمہ میں سے کسی نے بھی اس روایت کو موضوع نہیں کہا ہے بلکہ زیادہ سے زیادہ انہوں نے اس روایت کو منکر قرار دیا ہے۔ اور منکر موضوع کے اقسام میں سے نہیں بلکہ منکر ضعیف کے اقسام میں سے ہے اور نہ ہر ضعیف موضوع کے مانند ہے اور نہ ہر منکر جن کا نقل اور ان سے تائید حاصل کرنا جائز نہیں ہو۔ (بقیہ اگلے صفحہ پر)

(بقیہ حاشیہ ص ۱۷۵)علامہ صاحب کے مذکورہ بالا عبارات اور تصریحات سے معلوم ہو گیا ہو گا کہ علامہ صاحب نہ خود آٹھ رکعات تراویح کے قائل ہے اور نہ وہ آٹھ رکعات احناف کا مذہب قرار دیتے ہیں۔ بلکہ ہدایۃ کے حاشیہ میں لکھتے ہیں کہ آٹھ رکعات پڑھنے والا سنت موکدہ کا تارک ہے (حاشیہ ھدایہ ۱/۱۰۱)

۷۔ اسی طرح یہی حال آنجناب کے العرف الشذی کے حوالہ کا ہے کہ حضرت شاہ صاحبؒ نے اگر چہ آٹھ رکعات کا ذکر العرف الشذی میں کیا ہے مگر اس میں یہ کہیں نہیں کہ یہ حضرت شاہ صاحبؒ کی ذاتی رائے یا انہوں نے اس کو احناف کی طرف منسوب کیا ہے۔ بلکہ انہوں نے تو آٹھ رکعات پر اکتفا کرنے والوں کو سخت الفاظ سے یاد فرمایا ہے' چنانچہ فرماتے ہیں: **واما من اکتفی بالرکعات الثمانیة وشذ عن السواد الاعظم وجعل ترمیهم بالبدعة فلیر عاقبته**

(فیض الباری ۳/۱۸۱)

کہ جو آٹھ رکعات پر اکتفا کرتا ہے تو گویا اس نے سواد اعظم سے علیحدگی اختیار کی اور جوان کو (بیس رکعات تراویح کے قائلین) کو بدعتی کہتے ہیں وہ اپنی عاقبت (انجام) کو دیکھ لے۔

علی ھذا القیاس یہی حال ان حوالجات کا بھی ہے جو آنجناب نے مکتوب میں احناف کا مذہب ظاہر کرتے ہوئے تحریر فرمائی ہے۔ان میں سے کوئی بھی نہ ذاتی طور پر اور مذہباً آٹھ رکعات تراویح کا قائل ہے اور اگر بالفرض کوئی ہو بھی تو وہ اس کی ذاتی انفرادی رائے ہوگی۔مذہب کے ساتھ اس کا کوئی تعلق نہیں' ان کی ذاتی رائے کو ہم جمہور کی رائے اور ترجیح کے مقابل بلاضرورت نہیں قبول کر سکتے' ان وضاحتوں کے باوجود یہ بات ذہن نشین کرنا ضروری ہے کہ کتاب میں کسی عبارت کو نقل کرنے اور اپنے مذہب کے خلاف قول کی حکایت کرنے سے یہ ہرگز لازم نہیں کہ یہ رائے ناقل کی ذاتی یا اس کے مسلک کا مفتی بہ قول ہے۔ورنہ اگر کسی قول کا نقل کرنا ناقل کی ذاتی رائے یا مذہب تصور کیا جانا صحیح ہو پھر تو غیر مقلدین حضرات کی کتابوں میں اس قسم کے اقوال و آراء بہت سارے ہیں جو ان کی رائے کے خلاف ہیں وعلیٰ القیاس۔

اس لئے یہ واضح ہو کہ آٹھ رکعات تراویح نہ صحابہ کرامؓ کا مذہب رہا ہے اور نہ اسلاف و اخلاف کا اور نہ مذاہب اربعہ میں سے کوئی آٹھ رکعات کا قائل ہے۔ بلکہ یہ آٹھ رکعات تہجد کی نماز ہے جو آنحضرتﷺ رمضان اور غیر رمضان دونوں میں پڑھا کرتے تھے اگر اس کو تراویح قرار دیا ہے تو تراویح تو صرف رمضان میں ہوا کرتی ہے' غیر رمضان میں نہیں ہوتی جبکہ حضرت عائشہؓ کی روایت میں رمضان اور غیر رمضان دونوں میں آٹھ رکعات کا ذکر ہے۔

حضرت عائشہؓ کی یہی تصریح واضح کرتی ہے کہ اس روایت کا تعلق قیام اللیل (تہجد) کے ساتھ ہے۔اور تراویح الگ نماز ہے جس کی تعداد آنحضرتﷺ کے عمل مبارک سے جو بروایت عبداللہ بن عباس ذکر ہوا اور خلفاء راشدین اور صحابہ کرام' تابعین کے تعامل سے بیس رکعات ثابت ہے۔ (بقیہ اگلے صفحہ پر)

البتہ ترجیح کے لحاظ سے امام صاحب اور صاحبین کا اختلاف ہے۔امام اعظم رحمۃ اللہ عنہ فرماتے ہیں۔دن کی طرح رات کو بھی چار چار نفل پڑھنا اولیٰ ہے۔جبکہ صاحبین رحمہا اللہ فرماتے ہیں کہ رات کو دو دو نفل پڑھنا اولیٰ ہے۔

ثم یصلی ثلاثا نسائی شریف کی روایت میں بھی آتا ہے **ویوتر بثلاث** (۱)۔ملاعلی قاری رحمۃ اللہ علیہ نے تین رکعات وتر پڑھنے کے جواز پر اجماع نقل کیا ہے(۲) البتہ ایک رکعت کے جواز میں اختلاف ہے۔امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ اسے جائز نہیں سمجھتے اور دیگر ائمہ اسے جائز سمجھتے ہیں۔حضرت حسن بصریؒ کو حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ کے بارے میں بتایا گیا کہ وہ تو ایک رکعت الگ پڑھتے ہیں تو فرمایا کہ ان کے والد حضرت عمر رضی اللہ عنہ ان سے بڑے عالم تھے اور وہ وتر کی تین رکعتیں ایک سلام سے پڑھتے تھے۔بلکہ اس سلسلے میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے ایک روایت امام ابوداؤدؒ نے روایت کی ہے جس میں تصریح ہے کہ آپ تہجد کو کم یا زیادہ پڑھتے تھے۔لیکن وتر کو ہمیشہ تین پڑھتے تھے (۳)۔

انبیاء کی نیند: **اتنام الخ** حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے استفسار کا مطلب یہ ہے کہ ایک طرف تو آپﷺ دیگر لوگوں کو وتر کا امر دیتے ہیں۔جو کہ وجوب کی دلیل ہے لیکن دوسری طرف خود وتر پڑھے بغیر سو جاتے ہیں۔اس کی کیا وجہ ہے۔**ان عینی تنا مان و لا ینام قلبی** آپﷺ نے جو جواب دیا۔اس کا

(بقیہ حاشیہ ص۱۷۶) آخر میں اللہ جل شانہ سے دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ ہم سب کو حق بات سمجھنے، حق بولنے اور حق پر چلنے کی توفیق عطا فرمائے اور ہم سب کو تعصب، عناد اور زیغ وضلال سے محفوظ و مامون رکھے۔(آمین) اس کے علاوہ الفاظ، تعبیر اور تحریر کی غلطی کا معذرت خواہ ہوں۔ وھوالموفق

(مفتی) ابوطلحہ مختار اللہ حقانی

خادم دارالافتاء والتدریس بجامعہ دارالعلوم حقانیہ اکوڑہ خٹک

۲/رمضان المبارک ۱۴۲۵ھ

(۱) نسائی ج۱ص۲۴۹

(۲) جمع الوسائل ج۲ص۹۲

(۳) قالت (عائشہ رضی اللہ عنہا) کان یوتر باربع وثلاث. وست وثلاث وثمان وثلاث و عشر وثلاث.ابوداود ج ا ص ۱۹۳ .(مختار)

حاصل یہ ہے کہ میری نیند غفلت کی نیند نہیں ہوتی بلکہ میرا دل جاگ رہا ہوتا ہے۔اس بنا پر میری نسبت سے وتر کے قضاء ہونے کا احتمال نہیں ہے۔ بلکہ وتر کے وقت کا ادراک ہوجاتا ہے اور یہ بات تمام انبیاء کا خاصہ ہے کہ ان کے دل نیند کی حالت میں بھی بیدار ہوتے ہیں تاکہ وحی اور عبادات سے غفلت نہ رہے۔

باقی **لیلة التعریس** کی رات جو غفلت نبی کریمﷺ پر طاری ہوئی اور صبح کی نماز جاتی رہی اس کے حق میں بعض شراح تو یہ کہتے ہیں کہ طلوع فجر کا تعلق ادراک **بالبصر** سے ہے اور آنکھوں کے بارے میں تو آپﷺ خود فرماتے ہیں کہ وہ سوتی رہتی ہیں جبکہ بعض شراح کے خیال میں وہ خود اللہ تعالیٰ کی حکمت تھی۔تاکہ امت کو تعلیم دی جائے کہ نماز کی قضاء کیسے ہو۔اگر وہ غلبہ نوم نہ ہوتا تو قضاء کے متعدد احکام ہمیں کیسے پہنچتے۔ بہرحال ان حکمتوں کی وجہ سے آپﷺ پر گاہے گاہے نیند کا غلبہ ہوا کرتا تھا۔تو گویا نیند کی حالت میں کبھی کبھی آنکھ کی طرح آپ کا قلب بھی سو جاتا تھا۔

(۱۱) حدثنا إسحاق بن موسیٰ ثنا معن ثنا مالک عن ابن شهاب عن عروة عن عائشة أنّ رسول اللهﷺ کان یصلّی من اللیل احدی عشرة رکعة یوتر منها بواحدة فاذا فرغ منها اضطجع علی شقه الأیمن.

(۱۲) حدثنا ابن أبی عمران معن عن مالک عن ابن شهاب نحوه وثنا قتیبة عن مالک عن ابن شهاب نحوه(۱).

ترجمہ: حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ نبی کریمﷺ رات کو گیارہ رکعات نماز پڑھتے تھے ایک رکعت سے وہ نماز کو وتر بنا لیتے تھے پھر جب وہ ان سے فارغ ہوجاتے تھے تو دائیں کروٹ پر لیٹ جاتے تھے۔

---

(۱)صحیح مسلم ۱/۲۵۳ کتاب صلوٰة المسافرین وقصرها باب صلوٰة اللیل وعدد رکعات النبیﷺ فی اللیل، سنن ابی داؤد ۱/۱۹۵ کتاب صلوٰة المسافرین باب صلوٰة اللیل، سنن النسائی ۱/۱۹۴ کتاب قیام اللیل تطوع النهار باب کیف الوتر باحدی عشرة رکعة ۱۲ .(مختار)

ایک رکعت نماز نہیں: یوترمنها بواحدة جولوگ ایک رکعت وتر کے قائل ہیں۔وہ اس حدیث سے بھی استدلال کرتے ہیں کہ ایک رکعت وتر پڑھ کر رکعتوں کو طاق بنادیتے تھے لیکن ہم جواب میں کہتے ہیں کہ اس قول کا یہ معنی نہیں بلکہ مقصد یہ ہے کہ تم نے اگر آٹھ رکعتیں پڑھی ہیں۔اور آخر میں تین رکعتیں پڑھ لیں۔تو وتر تو ایک رکعت سے ہوئی باقی تو سب رکعتوں کے شفعات یعنی جوڑے ہیں۔تو مطلب یہ ہوا کہ آخر میں طاق نماز تین رکعات کی پڑھتے اور اس میں ایک رکعت ہی طاق بننے کا سبب بنتی۔اور اگر اس حدیث کی یہ تاویل نہ بھی کریں تو بھی ہم کہہ سکتے ہیں کہ یہ حدیث معمول بہ نہیں بن سکتی کیونکہ نبی کریم ﷺ نے صراحت کے ساتھ ایک رکعت سے منع فرمایا ہے۔حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کی روایت ہے فرماتے ہیں۔

أنّ النبی ﷺ نهیٰ عن البتیراء(۱) نبی کریم ﷺ نے ایک رکعت کی نماز سے منع فرمایا۔

اس طرح حضرت حسن بصریؒ نے صحابہ کرام کا اس بات پر اجماع نقل کیا ہے کہ ایک رکعت نماز نہیں اور ناجائز ہے۔بہرحال اس بات پر مستقل دلائل موجود ہیں کہ ایک رکعت نماز نہیں اور یہ کہ وتر تین رکعات ہیں۔

(۱۳) حدّثنا هنّادثنا ابوالأحوص عن الأعمش عن إبراهيم عن الأسود عن عائشة قالت كان رسول الله ﷺ يصلّی من الليل تسع ركعات.

(۱۴) حدّثنا محمودبن غيلان ثنا يحيی بن ادم ثنا سفيٰن الثوری عن الاعمش نحوه(۲).

---

(۱)قال علی القاریؒ وقيل كون الوتر واحدة منسوخ للنهی عن البتيراء ۱۲ جمع الوسائل ج۲ ص۹۲

(۲)جامع ترمذی ۱/۱۰۳ كتاب الصلوٰة ،سنن النسائی ۱/۱۹۳ كتاب قيام الليل وتطوع النهار باب كيف الوتربتسعٍ ، سنن ابن ماجة ص۹۸ كتاب اقامة الصلوٰة والسنة فيها باب ماجاء فی كم يصلّی بالليل، سنن ابی داؤد باب صلوٰة الليل ۱/۱۹۸ ، السنن الكبریٰ ۲/۴۷۱،۴۷۲

ترجمہ: حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ رات کو نو رکعات نماز پڑھتے تھے۔

یصلّی من اللیل تسع رکعات الخ اس کا یہ معنی بھی ہوسکتا ہے کہ آپ ﷺ عشاء کی نماز پڑھتے جس کی تعداد نو رکعات بنتی ہے۔لیکن راجح معنی یہ ہے کہ چھ رکعات تہجد کی پڑھتے اور تین وتر کی۔ بہرحال تہجد بھی مختلف اوقات میں مختلف تعداد میں آپ نے پڑھی ہے(۱)۔

نحوہ اسی سابقہ حدیث کو دوسری سند کے ساتھ لائے ہیں۔

(۱۵) حدّثنا محمّد بن المثنیٰ ثنا محمّد بن جعفر ثنا شعبة عن عمروبن مرّة عن أبی حمزة رجل من الأنصار عن رجل من بنی عبس عن حذیفة بن الیمان أنّه صلّی مع رسول اللّٰه ﷺ من اللیل قال فلمّا دخل فی الصلٰوة قال اللّٰه اکبر ذوالملکوت والجبروت والکبریاء والعظمة قال ثمّ قرأ البقرة ثمّ رکع فکان رکوعه نحوا من قیامه وکان یقول سبحان ربی العظیم سبحان ربی العظیم ثمّ رفع راسه وکان قیامه نحوا من رکوعه وکان یقول لربی الحمدلربی الحمدثمّ سجد فکان سجوده نحوامن قیامه وکان یقول سبحان ربی الأعلیٰ سبحان ربی الأعلیٰ ثمّ رفع راسه فکان مابین السجدتین نحوامن السجود وکان یقول ربّ اغفرلی ربّ اغفرلی حتیّ قرأ البقرة وال عمران والنساء والمائدة او الأنعام شعبة الذی شکّ فی المائدة والأنعام قال

(۱) جیسا کہ حضرت ابوداوُدؒ نے خود حضرت عائشہؓ سے نقل کیا ہے۔وقدمر ماآنفا(اصلاح الدین) اورعلامہ بیجوریؒ نے لکھا ہے والحاصل انّ فی روایة ثلاث عشرة وفی روایة احدیٰ عشرہ وفی روایة سبعاً ولعل اختلاف الروایات بحسب اختلاف الاوقات والحالات من صحة ومرض وقوّة وضعف ولذلک قال الشیخ ابن حجرؒ الصواب حمله علی اوقات متعددة واحوال مختلفة فکان تارة یصلّی کذاوتارة یصلّی کذالذلک اولتنبیه علی سعة الامرفی ذلک(المواهب الدنیة۱۷۹)(مختار)

أبوعیسیٰ و أبوحمزة اسمه طلحة بن زید و أبو جمرة الضبعیّ أسمه نصر بن عمران(۱).

ترجمہ: حضرت حذیفہ بن الیمان کہتے ہیں کہ انہوں نے ایک رات نبی کریم ﷺ کے ساتھ نماز پڑھی۔ حضرت حذیفہؓ کہتے ہیں کہ جب آپ ﷺ نے نماز شروع کی تو فرمایا ''**اللّٰہ اکبر ذو الملکوت والجبروت والکبریاء والعظمة** (اللہ تعالیٰ سب سے بڑا ہے۔ بڑی بادشاہی والی ذات ہے۔ بڑے غلبہ والی ذات ہے اور بڑی بزرگی اور عظمت والی ذات ہے)'' پھر (سورۃ فاتحہ کے بعد) سورۃ بقرہ کی قرآت فرمائی پھر رکوع فرمایا تو آپ ﷺ کا رکوع آپ ﷺ کے قیام کے برابر تھا۔ آپ اس میں ''**سبحان ربی العظیم**'' پڑھتے رہے پھر سر اٹھایا تو آپ کا قومہ بھی رکوع جیسا تھا۔ اس میں آپ ''**لربی الحمد**'' کہتے رہے۔ پھر سجدہ کیا تو وہ بھی آپ کے قومہ جتنا تھا۔ آپ اس میں ''**سبحان ربی الاعلیٰ**'' دہراتے رہے پھر سجدے سے سر اٹھا کر بیٹھے تو آپ کا جلسہ سجدے جتنا تھا۔ آپ اسمیں ''**رب اغفرلی**'' بار بار پڑھتے رہے۔ حتیٰ کہ آپ نے اپنی اس نماز میں سورۃ البقرہ، سورۃ آل عمران، سورۃ النساء اور سورۃ مائدہ یا انعام میں سے ایک سورۃ پڑھی۔ اخیر کی دو سورتوں میں شک کرنے والے شعبہؒ ہیں۔

تسبیح وتحمید: **فلما دخل فی الصلوٰة قال اللّٰہ اکبر** علامہ مناویؒ کہتے ہیں کہ دخل یہاں پر ارادالدخول کے معنی پر ہے۔ اور تکبیر سے تکبیر تحریمہ ہی مراد ہے جبکہ ملا علی قاریؒ نے کہا ہے کہ بظاہر تکبیر تحریمہ کے بعد بطور ذکر پھر سے تکبیر ذکر کرنا مراد ہے۔ **ذو الملکوت والجبروت** دونوں مبالغہ کے صیغے ہیں۔ پہلا ملک میں اور دوسرا جبر میں مبالغہ ہے یعنی بڑے ملک بادشاہی والا اور بڑے غلبہ اور قہر و جبر والا ہے

(۱) سنن ابی داؤد ۱/۱۳۳ کتاب الصلوٰۃ باب مایقول الرجل فی رکوعه وسجوده، مصنف ابی شیبة ۱/۲۲۶ کتاب الصلوٰۃ سنن دارمی ص۳۰۳، المستدرک للحاکم ۱/۲۷۱ کتاب الصلوٰۃ (مختار)

جبکہ کبریاء تکبر وترفع کے معنی میں آتا ہے۔ یہاں پر چونکہ آپ نوافل پڑھ رہے تھے۔اس لئے فرائض میں جومعہود تسبیح ہے۔اس کے بغیر تسبیح کے دیگر الفاظ سے تسبیح ادافرمائی۔حتی قرأ البقرہ یعنی سورۃ فاتحہ پڑھ کر سورۃ بقرہ بھی تمام پڑھ لی۔ابوداؤد کی روایت میں سورۃ فاتحہ کی قرأۃ کی تصریح موجود ہے۔ویسے ظہور کی وجہ سے راوی نے اس کا ذکر نہیں کیا۔سورۃ بقرہ کی طرح دیگر رکعتوں میں اگلی طویل سورتیں پڑھ لیں۔

فکان رکوعه نحوا من قیامه الخ رکوع کا قیام جتنا ہونا یا تو اپنے ظاہری معنی پر محمول ہے یعنی اتنا لمبا رکوع کیا جتنا سورۃ بقرہ پڑھنا۔اور یا مطلب یہ ہے کہ جس طرح قرأت معمول سے زیادہ طویل تھی یونہی رکوع بھی معمول کی رکوع سے طویل تھی۔عام رکوع سے لمبا تھا۔

او الانعام الخ یعنی چوتھی سورۃ میں شک ہے کہ سورۃ مائدہ پڑھی ہے یا انعام۔لیکن مسلم کی روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ ایک رکعت میں پہلی تین سورتیں اور دوسری میں وہی تین پڑھ لی ہیں۔بہرحال ممکن ہے کہ یہ اختلاف تعدّد مواقع پر مبنی ہو۔ایک موقع پر ان سورتوں کو دو رکعتوں میں اور دوسرے موقع پر چار رکعتوں میں پڑھ چکے ہوں۔لیکن عبادت کا یہ انداز سید الکونینﷺ کی شایان شان ہی ہوسکتی ہے۔

قال ابو عیسیٰ ابو حمزة الخ امام ترمذی رحمۃ اللہ یہاں ایک راوی کے نام کے بارے میں تبصرہ کررہے ہیں۔مذکورہ حدیث میں جس راوی کو حمزہ (حاء کے ساتھ) ذکر کیا گیا ہے اس کا نام طلحہ بن زید بتایا ہے لیکن نسائیؒ نے طلحہ بن یزید کہا ہے اور یہی راجح معلوم ہوتا ہے علامہ ابن حجرؒ نے بھی طلحہ بن یزید لکھا ہے(۱)۔جبکہ دوسرا راوی جس کا ذکر امام ترمذی کررہے ہیں۔وہ ابوجمرہ (جیم کے ساتھ) ہیں۔ان کا نام نصر بن عمران ہے(۲)۔یہ ضبعی ہیں۔چونکہ جیم اور حاء کے نقطوں پر کبھی کبھی دھیان نہیں رہتا۔لہٰذا عموما التباس کا اندیشہ رہتا ہے اور کبھی کبھی ناسخین کی غفلت سے نقطے ادھر ادھر ہوجاتے ہیں۔اس لئے امام ترمذیؒ نے احتیاطاً دونوں کے نام ذکر کرکے بتادیا ہے کہ یہاں راوی ابوحمزہ حاء کے ساتھ پڑھا جائے جیم

---

(۱)طلحة بن یزید الایلی ابوحمزة مولیٰ الانصار نزل الکوفة وثقه النسائی من الثالثة ۱۲ تقریب التھذیب ج۱ ص ۳۸۰.(مختار)

(۲)نصر بن عمران بن عصام الضبعی ابوجمرة بالجیم البصری نزیل خراسان مشھوربکنیته. ثقة ثبت من الثالثة مات سنته ثمان وعشرین. ۱۲ تقریب التھذیب ج۲ ص ۳۰۰.(مختار)

کے ساتھ نہ پڑھا جائے۔ بعض نسخوں میں غلطی سے ابوجمرۃ کو ابوحمزہ لکھا گیا ہے۔ فلیتنبہ

<u>پوری رات نماز میں آیت کی تلاوت:</u>

(۱۶) حدثنا ابوبکر محمّد بن نافع البصریّ ثنا عبدالصمد ابن عبدالوارث عن إسماعیل بن مسلم العبدی عن أبی المتوکل عن عائشۃؓ قالت قام رسول اللهﷺ بایة من القرآن لیلة(۱).

ترجمہ: حضرت عائشہ رضی اللہ عنہ فرماتی ہیں کہ نبی کریمﷺ ایک رات کو تہجد میں صرف ایک آیت نماز میں بار بار دہرا کر کھڑے رہے۔

قام بآیة من القرآن لیلة لیلۃ سے تمام رات مراد ہے یعنی ساری رات ایک ہی آیت پڑھ کر قیام کیا۔ ابن حجرؒ نے یہ ترجمہ کیا ہے کہ ساری رات ایک ہی رکعت میں قیام کر کے پڑھتے رہے۔ دوسری رکعت نہیں کی لیکن ملاعلی قاریؒ نے اس پر رد کیا ہے کہ ایک رکعت نماز ہی نہیں ہے۔ بلکہ اس کا ترجمہ یوں کیا ہے کہ ساری رات ایک ہی آیت کو اہتمام کے ساتھ نماز کے ارکان میں پڑھتے رہے(۲) جیسا کہ ابوذر رضی اللہ عنہ کی روایت میں اس کی تصریح ہے کہ نبی کریمﷺ ایک رات نماز پڑھنے کھڑے ہوگئے۔ ساری رات صبح تک ایک ہی آیت کو پڑھتے رہے۔ قیام میں بھی، رکوع میں بھی اور سجدے میں بھی یہی آیت پڑھتے رہے۔ لوگوں نے ابوذر رضی اللہ عنہ سے پوچھا کہ وہ کونسی آیت تھی تو انہوں نے کہا کہ وہ آیت یہ تھی جو آپ تمام ارکان میں پڑھتے رہے(۳)۔

---

(۱)جامع ترمذی ۱/۱۰۰، ۱۰۱ کتاب الصلوٰۃ باب ماجاء فی قرأۃ اللیل ، سنن ابن ماجۃ ص۹۶، ۹۷ کتاب الصلوٰۃ، مصنف ابن أبی شیبة ۲/۴۷۷ کتاب الصلوٰۃ.(مختار)

(۲)ولعل ذالک کان قبل النهی عن القراءۃ فی الرکوع والسجود فلا ینافیه خبر مسلمؒ نهیت ان اقرء القرآن راکعا وساجدا علی أنّ النهی للتنزیه فیکون فعله لبیان الجواز . کذاقال البیجوریؒ ومثله عندعلی القاریؒ(اصلاح الدین).

(۳)علامہ بیجوریؒ نے اس روایت سے ایک مسئلہ کا استنباط کیا ہے ویؤخذ منه جواز تکرار الآیة فی الصلوٰۃ(المواهب اللدنیة ۱۸۱)(مختار)

قدرت کاملہ اور صفت رحمۃ کا استحضار: **ان تعذّبهم فإنّهم عبادک و ان تغفرلهم فانّک أنت العزیز الحکیم(مائدة ۱۱۸)** اگرتو ان کو سزادے تو یہ تمہارے بندے ہیں اور اگرتو ان کو معاف کردے تو تو ہی زبردست حکمت والا ہے۔

گویا آپ اللہ تعالیٰ کی قدرت کاملہ کا استحضار کرتے کہ اگر تمام بندوں کو جہنم میں ڈال دیا تب بھی کوئی پوچھنے والا نہیں اور اگر سب کو بخش دیا تب بھی وہ ہی بخشنے والا ہے۔ آپ ﷺ کو اللہ تعالیٰ کی صفت مغفرت سے زیادہ دلچسپی تھی۔ ہرطرح سے اپنی امت کو بخشوانے کی کوشش کرتے۔ زیادہ حرص کی بناء پر اس کیلئے آپ اکثر روتے رہتے۔ ایک دوسرے موقع پر حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے تلاوت کروائی تو سورۃ النساء کی اس آیت کو سن کر رو پڑے اور فرط رحمت سے تاب نہ لا کر ابن مسعودؓ کو چپ کرایا(۱) **فکیف اذا جئنا من کل امةٍ بشهیدٍ وجئنا بک علی هولاء شهیداً(نساء ۴۱)** جب ہر ہر امت میں سے ایک ایک گواہ کو حاضر کریں گے اور آپ کو ان لوگوں پر گواہی دینے کیلئے حاضر لائیں گے۔

(۱۷) حدّثنا محمود بن غیلان ثنا سلیمان بن حرب ثنا شعبة عن الأعمش عن أبی وائل عن عبداللّٰه قال صلیت لیلة مع رسول اللّٰهﷺ فلم یزل قائما حتی هممت بامر سوء قیل له وماهممت به قال هممت ان اقعد وادع النبیّﷺ.

(۱۸) حدثنا سفیان بن وکیع ثنا جریر عن الاعمش نحوه (۲).

ترجمہ: حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ ایک رات میں نے نبی کریم ﷺ کے ساتھ نماز پڑھی۔ آپ لمبے وقت تک کھڑے رہے حتیٰ کہ میں نے ایک برے کام کا ارادہ کیا۔ کسی نے پوچھا وہ کونسا برا کام تھا جس کا تم نے ارادہ کیا۔ تو بولے کہ میں نے ارادہ کیا کہ میں بیٹھ جاؤں اور نبی کریم ﷺ کو تنہا چھوڑ دوں۔

---

(۱) شمائل باب ماجاء فی بکاء النبی ﷺ.

(۲) صحیح بخاری باب طول الصلوٰة فی قیام اللیل ۱/۱۵۲ کتاب التهجد، صحیح مسلم ۱/۲۶۴ کتاب صلوٰة المسافرین وقصرها باب استحباب تطویل القرأة فی صلوٰة اللیل، مسنداحمد ۱/۳۸۵(مختار)

قالت هممت ان اقعدوادع الخ اسکے تین مطلب ہو سکتے ہیں۔اول یہ کہ نبی کریم ﷺ کو چھوڑ کر نماز ہی توڑ دوں اور چلا جاؤں۔اس کی برائی تو واضح ہے۔لیکن یہ احتمال شراح کے نزدیک ضعیف ہے کیونکہ حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ جلیل القدر صحابی ہے اسے علم ہے کہ یہ کام انتہائی برا ہے۔اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں **لاتبطلوا اعمالکم.**

دوم یہ کہ نبی کریم ﷺ کی اقتداء تو بحال رہے لیکن اسے کھڑا چھوڑ کر خود بیٹھ کران کی اقتداء کروں یہ کام برااس لئے ہے کہ اس میں سوءادب ہے۔اگر چہ فی نفسہ نفل میں ایسا کرنا جائز ہے۔سوم یہ کہ یہ ارادہ کیا کہ جس شفع میں اقتداء کیا ہے۔اسے پورا کرنے کے بعد دوسرے شفع میں نیت ہی نہ باندھوں۔اور نبی کریم ﷺ کو چھوڑ دوں وہ خود ہی نماز پڑھیں۔یا میں الگ نماز کی نیت باندھوں اور مختصر نوافل پڑھوں۔اور آپ ﷺ کو چھوڑوں۔اپنی نماز پڑھتے رہیں یہ بھی اگر چہ جائز ہے لیکن نبی کریم ﷺ کی مفارقت کی وجہ سے بری بات ہے۔بالخصوص ابن مسعود رضی اللہ عنہ کے نزدیک اس کی برائی واضح ہے۔

<u>بوجہ ضعف بیٹھ کر نماز:</u>

(۱۹) حدّثنا إسحاق بن موسىٰ الأنصاری ثنا معن ثنا مالک عن أبی النضر عن أبی سلمة عن عائشة أنّ النبیّ ﷺ کان یصلّی جالسا فیقرأ و هو جالس فاذابقی من قراء ته قدرمایکون ثلثین اوأربعین آیة قام فقرأ وهوقائم ثمّ رکع وسجدثمّ صنع فی الرکعة الثانیة مثل ذلک(۱).

ترجمہ: حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ بیٹھ کر نماز پڑھتے تھے اور بیٹھ کر ہی قرأت فرماتے تھے۔اور جب مقررہ سورۃ کی تیس چالیس

---

(۱)صحیح بخاری ۱/ ۱۵۰ کتاب تقصیر الصلوٰة باب إذاصلّی قاعداً الخ، صحیح مسلم ۱/ ۲۵۲ کتاب صلوٰة المسافرین وقصرها باب جواز النافلة قائماً الخ، سنن ابی داؤد کتاب الصلوٰة باب فی صلوٰة القاعد والامام جامع ترمذی ۱/ ۸۵ کتاب الصلوٰة باب فی من یتطوع جالساً، سنن النسائی ۱/ ۱۸۷ کتاب قیام اللیل تطوع النهار باب کیف یعمل اذاافتتح الصلوٰة قائماً.(مختار)

آیات رہ جاتی تھیں تو کھڑے ہوکر تلاوت فرمانے لگتے۔ پھر(وہیں سے)رکوع میں اور پھر سجدے میں چلے جاتے تھے۔ پھر دوسری رکعت میں بھی ایسا ہی کرتے تھے۔

کان یصلّی جالساً الخ بخاریؒ اور مسلمؒ کی روایت میں حضرت عائشہؓ سے یہ تصریح منقول ہے۔ کہ یہ وہ زمانہ تھا جب نبی کریم ﷺ کی عمر مبارک کا بیشتر حصہ گزر چکا تھا۔ اور بڑھاپے، کمزوری، ضعف و بیماری وغیرہ کے عوارض لاحق تھے۔ **قدر مایکون ثلاثین الخ** اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس وقت بھی آپ ﷺ سورہ بقرہ وغیرہ کی لمبی سورتیں پڑھتے جس کا بڑا حصہ بیٹھ کر پڑھ لیتے تھے۔

ایک ہی نماز قائماً و قاعداً پڑھنے کا مسئلہ: **رکع وسجد الخ** اس کا مقصد یہ ہے کہ رکوع اور سجدے کی نوبت آتی تو قیام کی حالت سے رکوع اور سجدے کی طرف انتقال فرماتے کیونکہ رکوع اور سجدہ تو قائماً ہو سکتے تھے۔ اس حدیث سے نفل نماز کے بارے میں ائمہ اربعہ کا یہ مسلک ثابت ہوتا ہے کہ بعض رکعات کھڑے اور بعض بیٹھ کر ادا کی جائیں تو یہ جائز ہے۔ یا ایک رکعت کا بعض حصہ کھڑے ہوکر اور بعض حصہ بیٹھ کر ادا کیا جائے یا پہلے بیٹھ کر ادا کیا جائے پھر کھڑا ہو جائے۔ یہ تمام صورتیں جائز ہیں۔ بعض مالکیہ نے اس صورت کو ناجائز کہا ہے کہ کھڑے ہوکر نفل کی نیت کی جائے پھر بیٹھا جائے۔

اس طرح بعض حنفیہ اور بعض مالکیہ نے کہا ہے کہ نفل نماز کی ابتداء قیام کی حالت میں کی تو قیام ہی سے رکوع و سجدہ کیا جائے گا۔ اور قعود کی حالت میں کی تو قعود ہی سے رکوع اور سجدہ ادا کیا جائے گا۔ دوسری صورت جائز نہیں جس طرح کہ اگلے حدیث میں آتا ہے۔ لیکن زیر نظر حدیث سے اس مذہب پر رد ہوتا ہے کیونکہ اس میں ابتداء بیٹھ کر کرنے کے بعد بھی رکوع و سجدہ قیام کی حالت سے مروی ہے۔ بہر حال نوافل میں اس قسم کی باتوں کا توسّع ہے لیکن فرائض میں بغیر مجبوری کے بیٹھ کر پڑھنا جائز نہیں ہے۔

(۲۰) حدّثنا أحمد بن منيع ثنا هشيم أناخالدالحذاء عن عبدالله بن شقيق قال سالت عائشة عن صلوة رسول الله ﷺ عن تطوّعه فقالت كان يصلّى ليلًا طويلًا قائماً وليلاً طويلاً قاعداً فاذاقرأ وهوقائم ركع

وسجدوهوقائم واذا قرأ وهو جالس رکع وسجد وهوجالس(۱).

ترجمہ: عبداللہ بن شقیقؒ کہتے ہیں کہ میں نے حضرت عائشہؓ سے نبی کریمﷺ کے نوافل کے بارے میں دریافت کیا تو انہوں نے فرمایا کہ نبی کریمﷺ رات کے ایک طویل حصے تک کھڑے ہوکر اور رات کے ایک طویل حصے تک بیٹھ کر نوافل ادا کرتے تھے اور جب کھڑے ہوکر قرأت فرماتے تو قیام کی حالت سے رکوع اور سجدے میں جاتے تھے اور جب بیٹھ کر قرأت فرماتے تو قعود کی حالت ہی سے رکوع اور سجدے میں جاتے تھے۔

آپﷺ پر تہجد فرض تھی یا نفل: عن تطوعہ بعض لوگ اس لفظ سے اس بات پر استدلال کرتے ہیں کہ تہجد کی نماز نبی کریمﷺ پر فرض نہیں تھی بلکہ امت کی طرح آپﷺ کیلئے نوافل کے درجہ میں تھی۔ کیونکہ یہاں اسے تطوع کہا گیا ہے۔ اور یہ ظاہر بھی ہے کہ خواہ مخواہ آپ پر زائد بوجھ ڈالنا مناسب نہیں۔ اور آیت تہجد میں جو لفظ ''نافلة لک'' وارد ہوا ہے۔ تو اس کا معنی زائد فرض نماز نہیں بلکہ اس کا معنی یہ ہے کہ یہ نماز تیرے لیے ایک زائد اعزاز واکرام اور فضیلت ہے۔ پھر عبدیت کے اعلیٰ مقام پر فائز ہونے کے سبب نبی کریمﷺ باوجود عدم فرضیت کے اس نماز کا بڑا اہتمام کرتے تھے حتیٰ کہ چھوٹ جانے پر دن کے وقت اس کی قضاء بھی لاتے تھے۔

نوافل کا اہتمام اور توسع: کان یصلّی اس سے معلوم ہوتا ہے کہ نوافل میں بہت توسع ہے۔ بیٹھ کر پڑھنا بھی جائز ہے۔ اگرچہ عذر نہ ہو۔ اس لئے آپ نے اسے مختلف انداز سے ادا کئے ہیں۔ ایک رات کھڑے ہوکر تو دوسری رات بیٹھ کر۔ یا مراد یہ ہے کہ ایک ہی رات کے کچھ حصے میں دیر تک کھڑے کھڑے نماز پڑھتے تھے اور بعض حصے میں بیٹھ کر پڑھتے تھے۔ تاکہ امت کو سہولت ہو۔

لیلا طویلا یا تو زمنا محذوف کی صفت ہے اس صورت میں یہ لیلا سے بدل بعض واقع ہوا

---

(۱)صحیح مسلم ۱/۲۵۲ کتاب صلوٰة المسافرین وقصرها باب جواز النافلة قائماًوقاعداً، جامع ترمذی ۱/۸۶ کتاب الصلوٰة باب ماجاء فی من یتطوع جالساً، سنن ابی داؤد ۱/۱۸۵ کتاب الصلوٰة ابواب التطوع الخ(مختار)

ہےاور محذوف موصوف کا قائم مقام ہے یا پھر یہ صلاۃ محذوف کی صفت ہے حذف محذوف کے بعد طویلۃ کی تاء کی حذف ہوئی۔اس صورت میں یہ مفعول مطلق کا قائم مقام ہے۔تقدیر یوں ہوگی ''کان یصلی لیلا صلوٰۃ طویلۃ''

رکع وسجد وھو قائم یعنی قیام کی حالت سے رکوع اور سجدے کو منتقل ہوتے تھے۔یہی تاویل رکع وسجد وھو جالس میں ہوگی۔وجہ یہ کہ قیام یا جلوس کی حالت میں تو رکوع اور سجدہ ممکن نہیں البتہ قیام یا جلوس کی حالت سے منتقل ہوکر رکوع اور سجدہ ممکن ہے۔بہر حال اس حدیث سے یہ بات معلوم ہورہی ہے کہ نوافل میں توسع ہے اور جس حالت میں بھی سہولت ہو اور جب بھی طبعی نشاط ہو ادا کرنا چاہیے۔حتی الوسع نوافل کا اہتمام کرنا چاہیے۔جبکہ نبی اکرمﷺ کے حق میں دونوں صورتوں میں فرق نہیں پڑتا۔وجہ یہ ہے کہ آپﷺ بیٹھ کر بھی پڑھیں تو تعلیم امت کا فریضہ ادا ہوتا جاتا ہے۔

(۲۱) حدّثنا اسحاق بن موسیٰ الأنصاری ثنا معن ثنامالک عن ابن شهاب عن السائب بن یزید عن المطلب بن أبی وداعة السهمیّ عن حفصة زوج النبیّ ﷺ قالت کان رسول اللهﷺ یصلّی فی سبحته قاعداً و یقرأ بالسورة ویرتّلها حتّی تکون أطول من أطول منها(۱).

ترجمہ: حضرت حفصہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا فرماتی ہیں کہ نبی کریمﷺ اپنی نفل نماز میں بیٹھ کر نماز ادا فرماتے تھے اور ایک سورۃ کو تلاوت فرماتے اور ایسے آرام سے تلاوت فرماتے تھے کہ وہ اس سورۃ سے طویل سورۃ کی نسبت بھی لمبی ہوجاتی تھی۔

ام المؤمنین حفصہؓ: عن حفصة ام المومنین سیدہ حفصۃ بنت عمر رضی اللہ عنہما نبی کریمﷺ سے قبل خنیس بن حذافہ السہمی رضی اللہ عنہ (۲) کے نکاح میں تھیں جو بدری صحابی ہیں اور احد میں شہادت پائی۔

---

(۱)صحیح مسلم ۱/۲۵۲ کتاب صلوٰة المسافرین وقصرهاباب جواز النافلة قائماً واعداً، جامع ترمذی ۱/۸۵،۸۶ کتاب الصلوٰة باب ماجاء فی الرجل یتطوع جالساً، مؤطاامام مالک ۱/۱۳۷ (مختار)

(۲)علامہ ابن حجرؒ نے الاصابہ میں خنیس کی جگہ حصن بن حذافہ لکھا ہے لیکن خود ہی تقریب وغیرہ میں خنیس لکھا ہے دیگر کتب میں بھی ان کا نام خنیس لکھا ہے۔(اصلاح الدین)

بیوہ ہونے پر حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے پہلے حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ سے ان کا نکاح کرنا چاہا۔ وہ خاموش ہو گئے پھر حضرت عثمان رضی اللہ عنہ سے نکاح کرنے کو کہا چونکہ حضرت رقیہ رضی اللہ عنہا کی وفات کا زمانہ قریب تھا۔ لہٰذا انہوں نے کہا کہ ابھی میں نکاح نہیں کروں گا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے یہ بات نبی کریم ﷺ کو بتائی تو آپ ﷺ نے فرمایا ''**بتزوج حفصة من هو خير من عثمان ويتزوج عثمان من هو خير من حفصة**'' یعنی حفصہ سے نکاح کرنے والا عثمان رضی اللہ عنہ سے بہتر ہوگا اور عثمان سے نکاح کرنے والی (ام کلثومؓ) حفصہ سے بہتر ہوگی۔

چنانچہ نبی کریم ﷺ نے ۳ھ کو حضرت حفصہ رضی اللہ عنہا سے نکاح کیا۔ ایک دفعہ کسی بات پر نبی کریم ﷺ نے ان کو طلاق بھی دیا تھا جس سے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو بہت صدمہ ہوا۔ پھر حضرت جبرئیل علیہ سلام نبی کریم ﷺ کے پاس تشریف لائے اور سفارش کی کہ ''**ارجع حفصة فانها صوامة قوامة وانها زوجتک فی الجنة**'' یعنی حفصہ سے رجوع کرو کیونکہ وہ بہت زیادہ روزے رکھنے والی اور بہت نوافل پڑھنے والی ہیں۔ اور وہ جنت میں بھی آپ ﷺ کی بیوی ہونگیں۔ چنانچہ آپ ﷺ نے ان سے رجوع فرمایا۔ جمادی الثانیہ ۴۱ھ میں اور ایک قول کے مطابق ۴۵ھ میں وفات پائی علامہ ابن حجرؒ نے تقریب میں قولِ ثانی کو ترجیح دی ہے۔

فی سبحته سبحته سے اس مقام پر نفلی نمازیں مراد ہیں اور نفلی نماز کو تسبیح سے تشبیہ کی بنیاد پر سبحہ کہا جاتا ہے کیونکہ تسبیح بھی نفل ہے لیکن کبھی کبھی فرض نماز پر بھی تسبیح کا اطلاق ہوتا ہے جیسے ''**فسبّح بحمد ربّک**'' کا ترجمہ فصلّ سے کیا جاتا ہے۔

قاعداً بیٹھ کر نماز پڑھنا عمر کے آخری حصے میں ہوتا تھا کیونکہ مسلم کی روایت میں آتا ہے(۱)۔ کہ **مارأیت رسول اللہ ﷺ فی سبحته قاعداً حتی اذا کان قبل موته بسنة فکان یصلّی فی سبحته قاعداً**. میں نے نبی کریم ﷺ کو نفل نماز بیٹھے ہوئے پڑھتے نہیں دیکھا تھا یہاں تک کہ جب آپ ﷺ کی وفات سے ایک سال قبل کا زمانہ تھا کہ آپ ﷺ نماز بیٹھ کر پڑھنے لگے۔

ویرتّلها یعنی آپ ﷺ آرام اور سکون واطمینان کے ساتھ قرات فرماتے تھے۔ تجوید کی رعایت

---

(۱)مسلم ج ۱ ص ۲۰۳(مختار)

فرماتے تھے۔اطول من اطول منہا یعنی جوسورۃ آپ ﷺ ترتیل کے ساتھ پڑھتے تھے وہ اتنا وقت لے لیتی تھی کہ اگر بغیر ترتیل کے پڑھی جائے تو اس سورۃ سے لمبی سورت اتنا وقت نہیں لیتی تھی یوں وہ اپنے سے لمبی سورت سے بھی باعتبار وقت کے لمبی ہو جاتی تھی۔

(۲۲) حدّثنا الحسن بن محمّدالزعفرانیّ ثناالحجاج بن محمّد عن ابن جریج قال أخبرنی عثمان بن أبی سلیمان أنّ أباسلمة ابن عبدالرحمان أخبره أنّ عائشةؓ أخبرته أنّ النبیّ ﷺ لم یمت حتّیٰ کان أکثر صلوته وھو جالس(۱).

ترجمہ: حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ ابھی وفات نہیں پائے تھے (بلکہ قریب الوصال تھے) کہ ان کی اکثر نماز بیٹھ کر ہوتی تھی۔

لم یمت الخ یعنی مرض وفات میں اکثر نمازیں حالت قعود میں پڑھیں اور اس میں حرج نہیں لیکن عزیمت پر عمل کی حالت یہ تھی کہ اس حالت میں بھی نماز نہیں چھوڑی(۲)۔

سنن مؤکدہ کی تعداد اور زوائد:

(۲۳) حدّثنا أحمد بن منیع ثنا إسماعیل بن إبراهیم عن أیوب عن نافع عن ابن عمرقال صلیت مع رسول اللّٰہ ﷺ رکعتین قبل الظهر ورکعتین بعدهاورکعتین بعد المغرب فی بیته ورکعتین بعد العشاء فی بیته(۳).

---

(۱)صحیح مسلم ۱/۲۵۲ کتاب صلوٰة المسافرین وقصرهاباب جواز النافلة قائماً وقاعداً، السنن النسائی ۱/۱۹۷ کتاب قیام اللیل وتطوع النهار باب صلوٰة القاعدفی النافله.(مختار)

(۲)بعض لوگوں نے اس حدیث کوفرض ونفل دونوں پرمحمول کیا ہے لیکن اکثر شراح نے لکھا ہے کہ یہ نفل ہے جو کہ آپ ﷺ نے عمر کے آخری حصے میں بکثرت بیٹھ کر پڑھی تھیں کیونکہ ام المومنین ام سلمہؓ کی روایت ہے"والذی نفسی بیده مامات رسول اللّٰہ ﷺ حتی کان اکثر صلوته قاعدا الاالمکتوبة"(رواه انسائی و ابن ماجة)(اصلاح الدین)

(۳)جامع ترمذی ۱/۹۶ کتاب الصلوٰة باب ماجاء فی الرکعتین بعدالظهر، صحیح مسلم ۱/۲۵۲ کتاب الصلوٰة باب فضل السنن الراتبة قبل الفرائض. (مختار)

ترجمہ: حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ میں نے نبی کریم ﷺ کے ساتھ دو رکعات ظہر سے قبل، دو رکعات ظہر کے بعد اور دو رکعات مغرب کے بعد ان کے گھر میں پڑھیں۔ اور دو عشاء کے بعد بھی ان کے گھر میں پڑھیں۔

رکعتیں قبل الظھر الخ نبی کریم ﷺ محض فرضوں پر اکتفاء نہیں کرتے تھے بلکہ وقتی نمازوں کے ساتھ بطور مکملات و متممات دوسری نمازیں بھی پڑھتے جن میں سے بعض پر تو اہتمام کے ساتھ مداومت کی ہے۔ اس نے تو سنت موکدہ کا مقام لیا۔ اور بعض کو کبھی ادا کیا ہے کبھی ترک کیا ہے وہ زوائد ہیں۔

یہاں ظہر سے قبل دو رکعتوں کا ذکر ہے۔ اس لئے کہ وہ چار رکعتیں جو سنت موکدہ ہیں یہاں مذکور نہیں بلکہ یہ غیر موکدہ نفل کا بیان ہے یا یہ تو تحیۃ المسجد ہیں یا صلوٰۃ حاجت، جنہیں آپ مسجد میں ادا فرماتے تھے۔ علاوہ ازیں معہ کا بھی یہ معنی نہیں کہ جماعت کے ساتھ پڑھے ہیں یہاں صرف متابعت کی معیت مراد ہے یعنی آپ پڑھتے تو ہم بھی پڑھتے تھے۔

ورکعتیں بعدھا الخ یہ سنت موکدہ ہیں۔

ورکعتین بعد المغرب یہ بھی اور اس طرح عشاء کے بعد بھی دو رکعات سنت مؤکدہ ہیں جو آپ ﷺ پڑھتے تھے تو ہم بھی پڑھتے تھے۔

فی بیتہ اس کا تعلق یا تو صرف آخری مذکور شام کی دو رکعتوں سے ہے اور یہ احتمال ظاہر معلوم ہوتا ہے جیسے کہ بعد میں عشاء کی سنتوں کے ساتھ الگ "فی بیتہ" کا اضافہ کیا ہے اور یہ بھی احتمال ہے کہ پہلے کے تینوں سنتوں سے اس کا تعلق ہو۔

اس سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ نبی کریم ﷺ سنت نماز عموماً گھر میں پڑھتے تھے یہی دیگر نوافل کا بھی حکم ہے حتیٰ کہ جوف کعبہ یعنی کعبہ کے اندر کی نسبت بھی گھر میں نوافل پڑھنے کا زیادہ ثواب ہے۔ اس میں اخلاص زیادہ ہوتا ہے اور یہ عمل ریاء سے بعید تر ہوتا ہے۔

اس حدیث میں بعض سنن مؤکدہ کا ذکر ہے۔ دوسری احادیث میں تصریح ہے کہ سنن مؤکدہ کی تعداد مجموعی طور پر بارہ رکعات بنتی ہیں جن میں سے ظہر سے قبل چار رکعات اور صبح کی نماز سے قبل دو رکعات بھی ہیں۔

(۲۴) حدّثنا أحمد بن منیع ثناإسماعیل بن إبراهیم ثناأیوب عن نافع عن ابن عمرؓ قال ابن عمر وحدّثتنی حفصة انّ رسول اللّٰہﷺ کان یصلّی رکعتین حین یطلّع الفجر وینادی المنادی قال أیوب اراه قال خفیفتین(۱).

ترجمہ: حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے وہ کہتے ہیں کہ حضرت حفصہ رضی اللہ عنہا نے مجھے کہا کہ نبی کریمﷺ دو رکعات نماز (سنت) اس وقت پڑھتے تھے جب فجر طلوع ہو جاتا تھا جس وقت مؤذن اذان دیتا۔ حضرت ایوبؒ کہتے ہیں میرا خیال ہے کہ حضرت نافعؒ نے یہ بھی کہا کہ دو مختصر رکعتیں پڑھتے تھے۔

وحدثتنی حفصة رضی اللّٰہ عنها واو کے بارے میں بعض لوگ کہتے ہیں کہ زائدہ ہے جبکہ بعض نے عاطفہ قرار دیا ہے۔ اس صورت میں معطوف علیہ مقدر ہوگا تقدیر یوں ہوگی کہ "**حدثنی غیر حفصة وحدثتنی حفصة**" (۲) یعنی مجھ کو کچھ حفصہ رضی اللہ عنہا کے علاوہ دیگر لوگوں نے بیان کیا اور کچھ حفصہ رضی اللہ عنہا نے یہ کہا کہ آپﷺ طلوع فجر کے بعد دو رکعات سنت پڑھا کرتے تھے۔

(۲۵) حدّثناقتیبة بن سعیدثنا مروان بن معاویة الفزاریّ عن جعفر بن برقان عن میمون بن مهران عن ابن عمرقال حفظت من رسول اللّٰہﷺ ثمانی رکعات رکعتین قبل الظهر ورکعتین بعدها ورکعتین بعدالمغرب ورکعتین بعدالعشاء قال ابن عمروحدثتنی حفصة برکعتی الغداة ولم اکن أراهما من النبیّﷺ(۳).

---

(۱)صحیح بخاری ۱/۸۷ کتاب الاذان باب اذان بعدالفجر، صحیح مسلم ۱/۲۵۰ کتاب صلوٰة المسافرین وقصرهاباب استحباب رکعتی سنة الفجر، سنن النسائی ۱/۶۷ کتاب المواقیت باب الصلوٰة بعد طلوع الفجر سنن ابن ماجة ص۸۰ کتاب اقامة الصلوٰة والسنة فیها باب ماجاء فی رکعتین قبل الفجر(مختار) (۲)اقول ویحتمل ان یکون حدیث نافع هو حدیث میمون الآتی. ورح فالتقدیر حفظت من رسول اللّٰہﷺ ثمان رکعات وحدّثتنی حفصة . اقول ولااعلم لم لم یذهب الشراح الی هذا الاحتمال.(مختار) (۳)جامع ترمذی ۵۹۰ ط رحمانیه

ترجمہ: حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ میں نے نبی کریم ﷺ سے (فرض نماز کے علاوہ) آٹھ رکعات یاد کی ہیں۔ دو رکعات نماز ظہر سے قبل دو رکعات اس کے بعد، دو رکعات مغرب کے بعد اور دو رکعات نماز عشاء کے بعد۔ ابن عمرؓ کہتے ہیں اور میری بہن حضرت حفصۃ رضی اللہ عنہا نے صبح کی دو رکعتوں کے بارے میں مجھے بتایا جن کو میں خود نبی کریم ﷺ سے نہیں دیکھ سکا تھا۔

<u>صلوٰۃ فجر کی سنتیں:</u> ولم اکن اراھما یعنی حضرت حفصہ رضی اللہ عنہما نے فرمایا کہ صبح کی بھی دو سنتیں ہیں یہ میں نبی کریم ﷺ سے سیکھ چکی ہوں لیکن ساتھ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ نے یہ بھی فرمایا کہ مجھے یہ معلوم نہیں کہ حضرت نبی اکرم ﷺ بھی یہ ادا کرتے تھے۔ گویا میں اس کا مشاہدہ نہ کر سکا چونکہ نبی کریم ﷺ مختلف حجروں میں قیام فرماتے تھے۔ اس لئے ممکن ہے آپ کو اس حدیث کے بیان کرنے تک اس بات کا علم نہ ہو۔ بعد میں پتہ چلا ہو کہ نبی کریم ﷺ بھی ان دو رکعتوں کو ہمیشہ پڑھتے بلکہ دیگر صحابہ رضی اللہ عنہم کی طرح حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ نے خود نبی کریم ﷺ کے اس معمول کا مشاہدہ کیا تھا۔ ابتداء میں اس لاعلمی کا سبب یہ ہو سکتا ہے کہ نبی کریم ﷺ عموماً گھر میں ہی صبح کی سنتیں پڑھا کرتے تھے۔ جن کا حضرت حفصہ رضی اللہ عنہا کو پتہ تھا کہ آپ ﷺ مواظبت کے ساتھ ان کو پڑھتے ہیں۔ جب انہوں نے اپنے بھائی کو بتایا تو ان کو بھی علم ہوا کہ یہ مؤکدہ ہیں اور پھر خود اس کا مشاہدہ بھی کیا۔ لہٰذا یہ حدیث اس حدیث کے منافی نہیں جس میں آیا ہے کہ میں نے ایک ماہ تک نبی کریم ﷺ کو دیکھا کہ وہ صبح کی سنتیں سورۃ الکافرون اور سورۃ الاخلاص کے ساتھ پڑھا کرتے تھے۔

سنت مؤکدہ میں تمام سنتوں کی نسبت زیادہ مؤکدہ سنت صبح کی سنتیں ہیں حتی کہ بعض علماء نے اسے واجب بھی کہا ہے۔ اس لئے ان کو نہیں چھوڑنا چاہیے۔ اور اسی وجہ سے علماء نے یہ بھی لکھا ہے کہ اگرچہ دیگر سنتوں کی قضا نہیں ہے۔ صبح کی سنتوں کی قضاء پڑھنی چاہیے۔

(۲۶) حدّثنا أبو سلمة يحيىٰ بن خلف ثنا بشر بن المفضل عن خالد الحذاء عن عبد اللّٰه بن شقيق قال سألت عائشةؓ عن صلوٰة

النبیّﷺقالت کان یصلّی قبل الظھر رکعتین وبعدھا رکعتین وبعد المغرب رکعتین وبعد العشاء رکعتین وقبل الفجر ثنتین(۱).

ترجمہ: عبداللہ بن شقیقؒ کہتے ہیں میں نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے نبی کریمﷺ کی سنت نماز کے بارے میں پوچھا۔ توانہوں نے کہا کہ نبی کریمﷺ ظہر کی نماز سے پہلے دو رکعتیں، اس کے بعد دو رکعتیں مغرب کے بعد دو رکعتیں عشاء کے بعد اور فجر سے قبل دو دو رکعتیں (سنت) پڑھتے تھے۔

یصلی قبل الظھر رکعتین یہاں ظہر سے قبل دو رکعتوں کا ذکر ہے۔ بعد میں حضرت علیؓ کی روایت میں چار رکعات کا ذکر آرہا ہے۔ اسی طرح حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی بہت سی دیگر روایات میں بھی چار کا ذکر ہے(۲)۔ اسی وجہ سے علامہ طبری رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں کہ اکثر حالات میں ظہر سے قبل آپﷺ نے چار اور بعض حالات میں دو رکعات پڑھی ہیں۔ اگلے باب کی آخری احادیث میں چار رکعات کی تصریح ہے۔

(۲۷) حدّثنا محمّد بن المثنیٰ ثنا محمّد بن جعفر ثنا شعبة عن أبی إسحاق قال سمعت عاصم بن ضمرة یقول سألنا علیّاؓ عن صلوٰة رسول اللهﷺ من النھار قال إنّکم لاتطیقون ذلک قال قلنا من اطاق منّا ذلک صلّی فقال کان إذا کانت الشمس من ھٰھنا کھیئتھا من ھٰھنا عند العصر صلّی رکعتین وإذا کانت الشمس من ھٰھنا کھیئتھا من ھٰھنا عند الظھر صلّی أربعا ویصلّی قبل الظھر أربعا وبعدھا رکعتین وقبل العصر أربعا یفصل بین کل رکعتین بالتسلیم علی الملئکة

---

(۱)صحیح مسلم ۲۵۲/۱ کتاب صلوٰة المسافرین وقصرھا باب جواز النافلة قائماً وقاعداً، سنن ابی داؤد ۱۸۵/۱ کتاب الصلوٰة ابواب التطوع ورکعات السنة، مسند احمد ۳۰/۶(مختار)

(۲)رویٰ مسلم عن عائشةؓ کان یصلی فی بیته قبل الظھر اربعا. بل رویٰ الشیخان کان لایدع اربعا قبل الظھر. ۱۲ جمع الوسائل ج۳ ص ۱۰۳ (مختار)

المقّربین و النبییّن و من تبعهم من المؤمنین و المسلمین(۱).

ترجمہ: عاصم بن حمزہ کہتے ہیں کہ ہم نے حضرت علیؓ سے نبی کریمﷺ کے دن کے نوافل کے بارے میں پوچھا۔عاصم کہتے ہیں کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ تم لوگ ان نوافل کی طاقت نہیں رکھتے۔عاصم کہتے ہیں ہم نے عرض کیا ہم میں سے جس کوتوفیق ہووہ تو پڑھ لے گا (اس لئے آپ بتادیں) تو حضرت علیؓ نے فرمایا کہ صبح کے وقت جب سورج اس طرف (مشرق کو) اتنا اوپر چڑھ جاتا جتنا کہ اسطرف (مغرب کو) عصر کی نماز کا وقت ہوتا ہے تو نبی کریمﷺ دو رکعات (اشراق کی) نماز پڑھتے تھے۔ اور جب سورج اس طرف (مشرق کو) اتنا اوپر چڑھتا جتنا کہ اس طرف (مغرب کو) ظہر کی نماز کے وقت ہوتا ہے تو چار رکعات (چاشت کی) نماز پڑھتے تھے۔جن کے دونوں شفعوں کے درمیان (تشہد میں) مقرب فرشتوں، انبیاء کرام اوران کے متبع مؤمنوں اور مسلمانوں پر سلام بھیج کر فصل کرتے تھے۔(یا یہ کہ دونوں شفعوں کے درمیان سلام پھیرتے تھے۔)

سالنا علیا الخ رات کے تہجد کے بارے میں پہلے سے علم ہوگا۔اس لئے صرف دن کے نوافل کا پوچھا اور چونکہ حضرت علیؓ سمجھ گئے کہ یہ سائلین تقلید کا عزم کرکے ہی نوافل کا پوچھ رہے ہیں۔اس لئے آپؓ نے فرمایا کہ تمہارے بس کی بات نہیں۔

انّکم لا تطیقون ذالک الخ یعنی دن کے وقت آپﷺ کے نوافل اور عبادت زیادہ اہتمام

---

(۱)ابوداؤد کی روایت عن ابی ایوب عن النبیﷺ قال اربع قبل الظهر لیس فیهنّ تسلیم تفتح لهنّ ابواب السماء سنن ابی داؤد ۱/۱۸۷ باب الاربع قبل الظهر وبعدها وعن علیّ کان النبیﷺ یصلّی قبل الظهر اربعاً وبعد رکعتین (جامع ترمذی ۱/۹۶ کتاب الصلوٰة باب ماجاء فی الاربع قبل الظهر کیف الصلوٰة باب کیف کان تطوع النبیّﷺ بالنهار، سنن النسائی ۱/۱۰۱ کتاب الامامة باب الصلوٰة قبل العصر، ابن ماجة ص ۸۱ کتاب اقامة الصلوٰة والسنة فیها باب ماجاء فیها یستحب من التطوع بالنهار،مصنف ابن ابی شیبة ۲/۲۰۱ (مختار)

اور ایسے طریقے سے تھی کہ آپ لوگ اس پر عمل نہیں کر سکتے وہ خشوع وخضوع اور دوام والتزام جو نبی کریمﷺ کے ہاں تھا تمہارے ہاں نہیں ہے اور حصولِ علم تو عمل کیلئے ہوتا ہے محض علم سے کیا فائدہ۔علم برائے علم تو فضول بات ہے بلکہ علم عمل کا تقاضا کرتا ہے۔عمل نہ ہو تو وہ بے فائدہ ہوتا ہے بلکہ باقی بھی نہیں رہتا۔

من اطاق ذالک منا الخ یعنی کسی کی طاقت اور توفیق تو بن جائے گی۔اس لئے آپ بیان کریں تا کہ اگر کوئی عمل کا ارادہ کرے تو مشکل پیش نہ آئے۔کچھ تو معلوم ہو۔علاوہ ازیں جس کی بس سے باہر ہو ان کے لئے علم بھی غنیمت ہے کسی اور کو تو پہنچا دیگا جو عمل کر سکے گا۔

قال إذا کانت الشمس الخ آپ نے پہلے مشرق کی طرف اشارہ کیا۔پھر مغرب کی طرف اور کہا کہ جب ادھر یعنی مشرق کی جانب سورج اتنا چڑھتا جتنا ادھر مغرب کی طرف عصر کے وقت یہ ہوتا ہے۔یعنی جب سورج ایک دو نیزے چڑھ آتا تو دو رکعتیں پڑھ لیتے یہ صلوٰۃ ضحیٰ تھی جو اشراق کی نماز کہلاتی ہے۔آئندہ باب میں اس کا تفصیلی ذکر آئے گا۔

واذا کانت الشمس الخ پھر اس طرح کے دو اشارے کرتے ہوئے یہ ظاہر فرمایا کہ ظہر کے وقت مغرب کی جانب سورج جتنا بلند ہوتا ہے جب مشرق کی جانب دوپہر کو اتنا چڑھتا تو چار رکعات پڑھ لیتے یہ چار رکعتیں چاشت کی نماز تھی۔اسے حدیث میں صلوٰۃ الاوّابین بھی کہا گیا ہے۔یہ زوال سے قبل ضحوہ کبریٰ کے وقت پڑھی جاتی ہے۔عین زوال کے وقت تو نماز مکروہ ہوتی ہے۔**قبل الظهر اربعا الخ** یہ سنت مؤکدہ ہیں اور زوال کے بعد پڑھی جاتی ہیں جو کہ ہمارے ہاں بھی مؤکدہ ہیں۔**وبعدها رکعتین** یہ بھی سنت مؤکدہ ہیں۔**قبل العصر الخ** یہ سنن زوائد میں سے ہیں۔**یفصل بین کل الخ** یعنی ہر دو رکعتوں کے بعد تشہد پڑھتے تھے جس میں ملائکہ انبیاء اور عباداللہ پر سلام موجود ہے۔

اسی ترجمہ کو ملا علی قاریؒ نے ترجیح دی ہے اور **یفصل بین کل الخ** کو اس توجیہ کیلئے قرینہ قرار دیا گیا ہے کیونکہ سلام التحلیل میں تو مذکورہ **مسلم علیھم** کا حاضر ہونا مناسب ہے۔جبکہ حدیث کا لفظ عام ہے۔وہ حاضر ہو یا نہ ہوں جبکہ سلام تشہد میں حاضری ضروری نہیں ہے۔

علامہ ابن حجرؒ نے اس تسلیم کو سلام تحلل پر محمول کیا ہے۔ان کے نزدیک معنی یہ ہے کہ دو دو رکعتوں پر سلام پھیرتے اور سلام کے وقت مقتدیوں،فرشتوں اور اللہ تعالیٰ کے نیک بندوں کی نیت کی جاتی ہے۔بہر حال جو لوگ کہتے ہیں کہ صلاۃ النہار اربعا اربعا وہ پہلی تاویل کرتے ہیں اور جو مثنیٰ مثنیٰ کے قائل ہیں وہ دوسری تاویل کرتے ہیں۔ وصلی اللّٰہ علیہ و آلہٖ وسلم۔

خلاصہ باب

اس باب کو نبی کریمﷺ کی عبادت کا عنوان دیا گیا ہے اور احادیث کو مدنظر رکھ کر ہم یہ کہہ سکتے ہیں۔ کہ عبادت سے نفلی عبادت مراد ہے فرض مراد نہیں ہے اگرچہ نوافل کے اہتمام سے فرائض کا اہتمام بطریق اولیٰ معلوم ہوتا ہے لیکن مقصود نوافل میں مبالغہ اور اہتمام ہے بالخصوص نماز میں آپ کا شغف اور اپنی مشکوریت کا ثبوت وہ امر ہے جس کی تقلید ممکن نہیں ہے۔ اس لئے تو حضرت علیؓ فیصلہ سناتے ہیں ''لاتسطیقون ذالک'' عجز و تواضع اور راز و نیاز کے جس تعلق کو عبادت کہا جاتا ہے وہ آپﷺ کس کیفیت، استحضار، خشوع و خضوع اور ہمہ تن یکسوئی کے ساتھ کرتے تھے۔ بقول حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا وہ ناقابل بیان ہے حتیٰ کہ قرأت میں ترتیل اول سے آخر تک برقرار رہتی اور جذب کی ایسی حالت کہ کبھی تو ایک آیت پڑھتے پڑھتے رات بیت گئی۔ مشقت اور جفاکشی کا حال بھی بے مثال ہے۔ پاؤں کھڑے کھڑے پھول جاتے ہیں۔ رات کا اکثر و اغلب حصہ اور کبھی ساری رات اس تملق اور حسن تعلق کی نذر ہو جاتا ہے۔ سب سے طویل ترین سورتیں صرف ایک رکعت میں بلکہ کبھی تو کئی طویل ترین سورتیں صرف ایک رکعت میں پڑھ لیتے ہیں۔ حتیٰ کے صحابہ میں سے بہت جفاکش صحابہ بھی حوصلہ ہار کر آپﷺ کو چھوڑنے کا قصد کر لیتے ہیں۔ پھر یہ ایک دو دن کی بات بھی نہیں عمر بھر اس پر دوام رہا۔ بلکہ التزام کا یہ حال کہ کبھی عذر کی بنا پر چھوٹ جائے تو دن کو اس کے بدلے نوافل پڑھ لیں۔ عمر کے آخر حصے میں قیام کی طاقت نہ رہی تو بیٹھ کر بھی ہدیہ عبدیت پیش فرمایا۔

بہر حال کمال بندگی کا جو نمونہ آپﷺ نے امت کے سامنے پیش کیا۔ وہ امت کیلئے ناقابل تقلید ضرور ہے۔ لیکن ایک مغفور بندے کی اس قسم کی عبدیت کو دیکھ کر عبادت میں رغبت اور جذبہ اتباع میں تحریک ضرور پیدا ہوتی ہے۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو عبدیت اور عظمت کے اس مینار کے لائے ہوئے راہ راست پر چلنے کی توفیق اور دنیا و آخرت میں اس کا قرب نصیب فرمائے۔ آمین۔

وصلّی اللّٰہ علی خیر خلقه و نور عرشه

۴۱. باب صلوٰۃ الضحیٰ

حضوراقدس ﷺ کے اشراق کی نماز کا بیان

<u>ضحیٰ اورضحوہ:</u> سورج نکلنے کے بعد جب اس کی روشنی پھیل جائے تو اس وقت کوضحوہ اورضحیٰ کہا جاتا ہے۔اس کے دو حصے ہیں۔ابتدائی جو کہ عین ارتفاع شمس کے ابتدائی وقت میں یعنی مکروہ وقت گزر جانے کے بعد ہوتا ہے۔اس وقت کی نماز کواشراق کی نماز کہتے ہیں۔ یہ دن کے ربع اول میں اداء ہوتی ہے۔دوسرا وہ حصہ جوزوال سے کچھ پہلے ہوتا ہے۔اسکوضحوۂ کبریٰ کہتے ہیں۔اوراس وقت ادا کی جانے والی نماز کو چاشت کی نماز کہتے ہیں(۱)۔صوفیہ کے نزدیک فرق معتبر ہے لیکن فقہاء اور محدثین ان دونوں نمازوں کوصلوٰۃ ضحیٰ کہتے ہیں جنکا ابتدائی وقت سورج کا منور ہونا اور آخری وقت زوال سے قبل کا وقت ہے۔

صلوٰۃ ضحیٰ بھی عبادات کے زمرے میں آتی ہے لیکن چونکہ بعض وجوہ سے اس نماز کوخصوصی اہمیت حاصل ہے اسلئے اسکومستقل باب کی صورت میں ذکر کیا ہے۔جس میں آٹھ حدیثیں ذکر کی ہیں۔

(۱) حدّثنامحمودبن غیلان ثنابو داؤدالطیالسیّ اناشعبة عن یزید الرشک قال سمعت معاذة قالت قلت لعائشة أكان النبیّ ﷺ یصلّیٰ الضحیٰ قالت نعم اربع رکعات ویزید ماشاء اللّٰہ عزّوجلّ(۲) .

ترجمہ: معاذہؒ کہتی ہیں کہ انہوں نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے پوچھا کہ کیا نبی کریم ﷺ نماز ضحیٰ پڑھتے تھے۔تو انہوں نے کہا کہ ہاں چار رکعات پڑھتے تھے۔اور

---

(۱)اس نماز کوصلوٰۃ الاوّابین بھی کہا جاتا ہے اگرچہ مغرب کے بعد چھ رکعات نفل نماز کو بھی صلوٰۃ اوابین کہا گیا ہے۔اوابین کا معنی اللہ کی طرف رجوع کرنے والے کے ہیں۔گویا صلوٰۃ اوابین کا معنی ہے اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع کرنے والوں کی نماز۔مغرب کے بعد چھ رکعات نفل نماز کے بارے میں سنن ابن ماجۃ میں روایت ہے کہ جولوگ ایمان اوراخلاص کے ساتھ مغرب کے بعد چھ نوافل ادا کرتے ہیں۔اللہ تعالیٰ ان کو بارہ سال کی نماز کا ثواب عطافرماتے ہیں۔شرعاً یہ سب نمازیں چاہئے اشراق ہو یا چاشت کی یا اوابین مستحب ہیں۔(مختار)

(۲)صحیح مسلم ۱/۲۴۹ کتاب صلوٰۃ المسافرین وقصرهاباب استحباب صلوٰۃ الضحیٰ الخ، سنن ابن ماجة ص ۹۹ کتاب اقامة الصلوٰۃ والسنة فیها باب ماجاء فی الصلوٰۃ الضحیٰ، السنن الکبریٰ للبیهقی ۴۷/۳ کتاب الصلوٰۃ(مختار)

اس سے زیادہ جتنا اللہ تعالیٰ کو منظور ہوتا تھا، پڑھ لیتے تھے۔

رشک کسے کہتے ہیں: یزید الرشک رشک کے کئی معانی منقول ہیں (۱) آگے باب صوم النبی ﷺ کی ساتویں حدیث میں مصنفؒ نے کہا ہے کہ اہل بصرہ کی اصطلاح میں رشک قسام (تقسیم کرنے والے) کے معنی میں مستعمل ہے۔ اور یہ یزید بن ابی یزید ضبعی کا لقب ہے۔ اس لئے کہ وہ اس کام میں ماہر تھے اور حکومت کی طرف سے تقسیم اراضی وغیرہ کا کام ان کے سپرد تھا۔ (۲) بعض لوگوں کا خیال ہے کہ رشک بڑی داڑھی والے کو کہتے ہیں اور یزیدؒ کی داڑھی اتنی بڑی تھی کہ ایک مرتبہ ایک بچھو اس میں گھس گیا۔ اور تین دن کے بعد نکالا جاسکا۔ (۳) بعض شراح کہتے ہیں کہ رشک بچھو کو کہتے ہیں اور مذکورہ واقعہ کی وجہ سے ان کو یزید الرشک کہا گیا۔ (۴) بعض لوگوں کا خیال ہے کہ رشک فارسی میں غیور کو کہتے ہیں اور چونکہ یزید بھی مجسمہ غیرت تھے۔ اس لئے ان کو رشک کہا جاتا ہے۔

اربع رکعات یہاں چار رکعات کا ذکر ہے لیکن دو پر اکتفاء بھی جائز ہے۔ یہ نوافل ہیں۔ عملاً زیادہ سے زیادہ بارہ رکعات تک ثابت ہیں۔ جبکہ آٹھ رکعتوں کی بھی زیادہ ترغیب آئی ہے۔ بہر حال آپ ﷺ نے عموماً چار رکعت ادا فرمائے ہیں۔ لیکن تعداد میں اختلاف اختلافِ اوقات واحوال پر محمول ہوگا۔ حضرت عائشہؓ نے بھی ''ویزید ماشاء اللّٰہ عزوجل'' میں اس بات کی طرف اشارہ کیا ہے۔

ثبوت صلوٰۃ الضحیٰ اور ابن عمر کے بدعت کہنے کی توجیہات: بہر حال صلوٰۃ ضحیٰ روایات سے ثابت ہے۔ حضرت عائشہؓ کی اس روایت کے علاوہ دیگر اُنیس (۱۹) صحابہؓ سے اس نماز کے بارے میں روایات منقول ہیں۔ بلکہ بعض نے تو پچیس (۲۵) صحابہ سے اسے نقل کیا ہے(۱)، ان روایات کی تفصیل اوجز المسالک میں درج ہے۔ مسلم شریف کی ایک روایت میں یہ بھی آتا ہے کہ انسانی بدن میں جتنے جوڑ ہیں ہر ہر جوڑ کیلئے صلوٰۃ ضحیٰ صدقہ بن جاتا ہے(۲)، اور اس کثرت روایات کے سبب اس میں مذاہب بھی مختلف

(۱) حتّی قال محمّدبن جریر الطبری إنّھابلغت حدالتواتر ۱۲ جمع الوسائل ج۲ ص۱۰۷

(۲) عن ابی ذرؓ عن النبیّ ﷺ انّہ قال یصبح علی کل سلامیٰ من احدکم صدقۃ فکل تسبیحۃ صدقۃ وکل تحمیدۃ صدقۃ وکل تھلیلۃ صدقۃ وکل تکبیرۃ صدقۃ وامر بالمعروف صدقۃ ونھی عن المنکر صدقۃ ویجزی من ذالک رکعتان یرکعھما من الضحی. ۱۲ مسلم ج۱ ص۲۵۰ (اصلاح الدین)

ہیں۔بعض لوگ وجوب کے قائل ہیں۔اور بعض سنت مؤکدہ بتاتے ہیں۔لیکن احناف کے نزدیک یہ مستحب ہے۔

البتہ یہاں پرایک اشکال یہ ہوتا ہے کہ حضرت عبداللہ بن عمرؓ نے صلوٰۃ ضحیٰ کو بدعت کہا ہے۔نیز یہ کہ حضرت عثمانؓ کی شہادت تک کوئی بھی ان کو پڑھنے والا نہیں تھا۔تو اس کا جواب یہ ہے کہ حضرت ابن عمرؓ کو شاید صلوٰۃ ضحیٰ کے بارے میں حدیث نہ پہنچی ہوں اور چونکہ یہ نوافل ہیں جو عموماً گھر کے اندر ادا کی جاتی ہیں۔اس لئے وہ کسی کو پڑھتے ہوئے بھی نہ دیکھ سکے۔یا ان کے اس قول کا مطلب یہ ہے کہ نبی کریم ﷺ نے اس پر دوام نہیں فرمایا۔اگرچہ پڑھنا ان کے نزدیک بھی ثابت ہوگا یا اس کے کلام کا معنی یہ ہوگا کہ مسجد میں جمع ہوکر بصورت اجتماع صلوٰۃ ضحیٰ کا پڑھنا بدعت ہے۔اور ظاہر ہے کہ اسلاف نے چاشت کی نماز پڑھی ہے لیکن بصورت تداعی اور اجتماع کے نہیں پڑھی۔

اور یہ بھی محتمل ہے کہ حضرت ابن عمرؓ کی مراد یہ ہو کہ آپ ﷺ نے اسے واجب سمجھ کر نہیں پڑھی۔ جیسا کہ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ آپ ﷺ پر چاشت کی نماز واجب تھی۔تو ان پر رد کرنے کیلئے فرمایا کہ پڑھی ہونگیں مگر وجوب کے انداز سے نہیں پڑھیں۔

(۲) حدّثنا محمّد بن المثنیٰ ثنی حکیم بن معاویة الزیادیّ ثنا زیاد بن عبیداللہ بن الربیع الزیادیّ عن حمید الطویل عن أنس ابن مالک أنّ النبیّ ﷺ کان یصلّی الضحیٰ ست رکعات(۱).

ترجمہ: حضرت انسؓ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ چاشت کی نماز چھ رکعات پڑھا کرتے تھے۔

ست رکعات عام معمول تو نبی کریم ﷺ کا چار رکعات پڑھنے کا تھا لیکن کبھی اس پر اضافہ فرماتے جیسے کہ گزشتہ حدیث میں بتایا گیا ہے۔یہاں پر اضافے کی ایک صورت بیان ہے۔

(۳) حدّثنا محمّد بن المثنیٰ ثنا محمّد بن جعفر انا شعبة عن عمرو بن مرّة عن عبدالرحمان ابن أبی لیلیٰ قال ما أخبرنی احد أنه رای

(۱) تفرد الامام الترمذی بهذا الحدیث(مختار)

النبیّ ﷺ یصلّی الضحیٰ إلاّ امّ ھانی فانّھا حدثت أنّ رسول اللّٰہ ﷺ دخل بیتھا یوم فتح مکۃ فاغتسل فسبّح ثمانی رکعات ما رأیتہ ﷺ صلوۃ قط أخفّ منھا غیر أنّہ کان یتمّ الرکوع والسجود(۱).

ترجمہ: حضرت عبدالرحمان بن ابی لیلیٰؒ کہتے ہیں کہ مجھے (صحابہ میں سے) ام ہانی کے سوا کسی نے یہ خبر نہیں پہنچائی کہ نبی کریم ﷺ نے صلوۃ ضحیٰ پڑھی تھی۔ البتہ ام ہانیؓ نے یہ حدیث بیان کی کہ نبی کریم ﷺ فتح مکہ کے دن ان کے گھر تشریف لائے۔ وہاں غسل کیا اور آٹھ رکعات نماز پڑھی۔ میں نے ان آٹھ رکعات سے زیادہ مختصر نماز پڑھتے ہوئے نبی کریم ﷺ کو نہیں دیکھا تھا۔ مگر پھر بھی آپ ﷺ رکوع اور سجدہ مکمل طور پر ادا فرماتے تھے۔

عبدالرحمان بن أبی لیلیٰ الأنصاری تابعی ہیں۔ پہلے مدینہ میں اور بعد میں کوفہ میں رہائش اختیار کی۔ حضرت عمرؓ سے آپ کی سماع میں اختلاف ہے۔ لیکن دیگر بہت سے صحابہ سے ان کی سماع ثابت ہے۔ ۸۶ھ کو وقعۃ الجماجم میں وفات پائی جبکہ بعض کے نزدیک آپ نے پانی میں ڈوب کر وفات پائی۔

إلاّ امّ ھانی حضرت ام ہانی حضرت علیؓ کی ہمشیرہ ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے ان کو لمبی عمر عطا فرمائی تھی۔ حضرت علیؓ کی وفات کے بعد وفات پائیں۔

ابن ابی لیلیٰ کے قول کا مطلب: حضرت ابن ابی لیلیٰؒ کے اس قول کا معنی یہ نہیں کہ اسے کسی دوسرے شخص نے اس کے بارے میں نہیں بتایا کیونکہ صلوٰۃ ضحیٰ کثرت روایات سے ثابت ہے بلکہ معنی یہ ہے کہ صحابہ میں سے اور بالخصوص نبی کریم ﷺ کے صلوۃ ضحیٰ کا مشاہدہ کرنے والے صحابہ میں سے صرف ایک صحابیہ نے اس کے بارے میں حضرت ابن ابی لیلیٰؒ کو بتایا ہے۔ نفس اثبات اور تابعین کی زبانی اثبات تو ابن ابی لیلیٰؒ کو بہت سے طرق سے پہنچا ہے۔ مسلمؒ کی روایت میں تصریح ہے **سألت وحرصت علی أنّ**

(۱) صحیح مسلم ۱/۲۴۹ کتاب صلوٰۃ المسافرین وقصرھا باب استحباب صلوٰۃ الضحیٰ الخ، سنن ابی داؤد ۱/۱۹۰ کتاب الصلوٰۃ باب الضحیٰ، مؤطا امام مالک ۱۵۲ کتاب الصلوٰۃ، ابن مصنف ابن ابی شیبۃ ۱/۳۱۲ کتاب الصلوٰۃ(مختار)

احداً من الناس یخبرنی أنّ النبیّ ﷺ تسبّح سبحة الضحیٰ فلم یخبرنی احد غیر امّ ھانی جس سے معلوم ہوتا ہے کہ عبداللہ بن ابی لیلیٰؒ کو ان نوافل کے اثبات کا تو یقین تھا لیکن نبی کریم ﷺ کے عمل کی تحقیق باقی تھی۔اس بارے میں تسلی کرنا چاہتے تھے۔

فسبّح ثمانی رکعات الخ یعنی آٹھ رکعات نفل نماز پڑھ لی۔یہ ساری نماز یا تو صلوٰۃ ضحیٰ تھی یا پھر ان میں چار چاشت کی اور چار فتح مکہ کے شکرانہ میں پڑھی تھیں اور اگر چہ عین ارتفاع شمس کے موقعہ پر نفل پڑھنے کا موقع نہیں ملا۔لیکن فارغ ہوتے ہی زوال سے پہلے پہلے پھر بھی ادا فرمائے۔اس سے معلوم ہوا کہ صلوٰۃ ضحیٰ کا وقت زوال تک ہے۔**أخفّ منھا** چونکہ فتح مکہ کے موقع پر ضروریات ومصروفیات زیادہ تھیں وقت کم تھا۔اس لئے آپ ﷺ نے نماز میں تخفیف کی۔لیکن تعدیل ارکان کو پھر بھی نقصان نہیں پہنچایا۔رکوع اور سجدوں میں طمانیت بہت اہم ہے۔اس لئے اسے ملحوظ رکھا۔

(۴) حدّثنا ابن ابی عمر ثنا وکیع ثنا کھمس بن الحسن عن عبداللّٰہ بن شقیق قال قلت لعائشة أکان النبیّ ﷺ یصلّی الضحیٰ قالت لا إلاّ ان یجیٴ من غیبة(۱)۔

ترجمہ: عبداللہ بن شقیق کہتے ہیں میں نے حضرت عائشہؓ سے پوچھا کہ نبی کریم ﷺ صلوٰۃ ضحیٰ پڑھتے تھے۔آپؓ نے فرمایا کہ نہیں الا یہ کہ آپ سفر سے واپس لوٹتے (تو پڑھتے تھے)

<u>حضرت عائشہؓ کی صلوٰۃ ضحیٰ کی نفی کی توجیہ:</u> **لا الاّ ان یجیٴ من غیبة.** اس میں یہ اشکال ہے کہ حضرت عائشہؓ صلوٰۃ ضحیٰ کی نفی کیسے کرتی ہیں حالانکہ یہ انیس (۱۹) صحابہ کی روایات سے بلکہ خود حضرت عائشہؓ کی روایات سے ثابت ہے۔تو اس کا ایک جواب تو یہ ہے کہ یہ نفی دوام ہے یعنی یہ کہ فرض اور واجب کی طرح التزام سے نہیں پڑھتے تھے۔کہ کبھی بھی ترک نہ ہو۔یہاں سائل کے سوال کا تو ہمیں اندازہ نہیں کہ کس مقصد سے سوال

---

(۱)صحیح مسلم ۱/۲۴۸ کتاب صلوٰۃ المسافرین وقصرھاباب استحباب علیھا، مصنف ابن ابی شیبة ۲/۴۰۷ کتاب الصلوٰۃ، السنن الکبریٰ للبیھقی ۳/۵۰ کتاب الصلوٰۃ(مختار)

کیا ہے لیکن شاید حضرت عائشہؓ سمجھی ہیں کہ سائل پوچھ رہے ہیں۔ کہ آپ ﷺ نے ہمیشہ یہ نماز پڑھی ہے یا نہیں۔ چنانچہ امام بیہقیؒ نے مذکورہ بالا جواب دیا ہے اور یہ دراصل سوال کی اس توجیہ پر مبنی ہے۔ دوسرا جواب بعض شراح نے یہ دیا کہ سائل کا مطلب اس مخصوص نماز کے بارے میں استفسار تھا جو کہ اس زمانہ میں اجتماعی طور پر رائج تھا اور لوگ اسے التزاماً مسجد میں پڑھا کرتے تھے۔ جس طرح آج کل بھی بعض لوگ صبح کی نماز سے اشراق تک مسجد میں بیٹھے ہوئے ہوتے ہیں اور سورج نکلنے کے بعد اشراق پڑھتے ہیں۔ یہ درست ہے لیکن اسے اجتماعی حیثیت سے اور اہتمام والتزام اور اجتماع کے ساتھ ادا کرنا درست نہیں۔ حضرت ابن مسعودؓ نے ایک دفعہ ایسے لوگوں کو مسجد سے بھگا دیا تھا جو کہ اجتماعی طور پر مسجد میں نماز کے بعد اشراق تک بیٹھتے اور پھر اشراق کیلئے اکٹھے اٹھ جاتے۔ دین میں جہاں احداث اور غلو آتا ہے وہ قبیح ہے۔

تو گویا سائل یہ پوچھ رہا ہے کہ کیا یہ ضروری ہے کہ اشراق کو اہتمام کے ساتھ مسجد میں ادا کیا جائے۔ جواب کا خلاصہ یہ ہے کہ نہیں۔ آپ ﷺ اشراق کی نماز پڑھتے تھے مگر گھر کے اندر باہر مسجد میں صرف ایسی صورت میں پڑھتے جب اتفاقاً آپ اشراق کے وقت سفر سے واپس آجاتے اور حسب عادت سیدھے مسجد میں جاتے تھے۔ تو وہیں نماز بھی ادا فرماتے تھے۔

بعض حضرات نے یہ جواب بھی دیا ہے کہ حضرت عائشہؓ کی یہ حدیث مرجوح ہے کیونکہ صحیحین میں دیگر صحابہ کرام سے چاشت کی نماز کا اثبات مروی ہے۔ لیکن یہ توجیہ درست معلوم نہیں ہوتی کیونکہ یہ تب ہوتا کہ حضرت عائشہؓ نماز چاشت سے منکر ہوتیں۔ حالانکہ دوسری طرف خود ان سے یہی نماز مروی ہے۔ جیسا کہ اس باب کی پہلی حدیث میں انہی کی روایت سے اثبات ہو رہا ہے۔

(۵) حدّثنا زیاد بن أیوب البغدادیّ ثنا محمّد بن ربیعة عن فضیل بن مرزوق عن عطّیة عن أبی سعید الخدریّ قال کان النبیّ ﷺ یصلّی الضحیٰ حتیّ نقول لایدعها ویدعها حتّی نقول لا یصلّیها(۱).

---

(۱) جامع ترمذی ۱/۱۰۸ کتاب الصلوٰۃ باب ماجاء فی صلوٰۃ الضحیٰ، شرح السنة للبغوی ۴/۱۳۶ باب صلوٰۃ الضحیٰ رقم الحدیث ۱۰۰۲، (مختار)

ترجمہ: حضرت ابوسعید خدریؓ کہتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ (کبھی تو) نماز چاشت (ایسے اہتمام ودوام کے ساتھ) پڑھتے تھے کہ ہمارا خیال ہوتا کہ آپ ﷺ اسے چھوڑیں گے نہیں اور (کبھی ایسے) چھوڑ دیتے تھے حتیٰ کہ ہم کہتے کہ پھر نہیں پڑھیں گے۔

مواظبت اور ترک ضحیٰ کی حکمتیں: حتیّٰ نقول یعنی آپ ﷺ کی مواظبت اور طویل زمانہ تک صلوۃ ضحیٰ پر مداومت کو دیکھ کر ہم صحابہ اپنے دلوں میں کہتے تھے یا یہ کہ ہم آپس میں ایک دوسرے سے کہتے تھے کہ **لایدعها** یعنی اب آپ ﷺ اس نماز کو چھوڑنے والے نہیں ہیں۔ **حتی نقول لا یصلّیها** یعنی پھر طویل زمانہ تک ترک کو دیکھ کر ہم کہتے کہ دوبارہ شروع کرنے والے نہیں ہیں۔ لیکن ہمارے دونوں خیال غلط نکلتے اور آپ ﷺ پڑھتے پڑھتے چھوڑ دیتے تھے اور پھر چھوڑنے کے بعد شروع کر دیتے تھے۔

جہاں تک آپ ﷺ کے چھوڑنے کا تعلق تھا۔ تو اس کا سبب یہ ہوتا تھا کہ کہیں دیکھنے والے یہ تو ہم نہ کر بیٹھیں کہ یہ نماز فرض یا واجب ہے۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ اللہ تعالیٰ حضور ﷺ کے شوق کو دیکھ کر اسے حقیقتاً واجب نہ کر دیں۔ تیسری وجہ بعض لوگوں نے یہ لکھی ہے کہ اگر آپ ﷺ مداومت فرماتے تو پھر یہ واجب یا کم از کم سنت موکدہ بن جاتی۔ یوں اس امت کیلئے ایک نماز زائد ہو جاتی۔ لہٰذا آپ ﷺ نے شفقت فرماتے ہوئے اس سے امت کو معاف فرمایا۔

بہر حال آپ ﷺ کے عمل سے کم از کم اس نماز کا مستحب ہونا معلوم ہو رہا ہے اور یہی احناف رحمہم اللہ اور جمہور کا مسلک ہے۔ نبی کریم ﷺ نے اس نماز کے بہت سے فضائل بھی ذکر کی ہیں جو کہ حدیث کی کتابوں میں مذکور ہیں (۱)۔

---

(۱) صلوٰۃ ضحیٰ اور بے بنیاد عوامی باتیں: بعض شروح کے مطابق عوام میں یہ بات مشہور ہے کہ جو شخص صلوۃ ضحیٰ پڑھنا شروع کردے پھر اسے چھوڑ دے تو وہ اندھا ہو جاتا ہے۔ یونہی عورتوں کے درمیان یہ بات مشہور ہے کہ جو عورت اس نماز کو پڑھتی رہے اور پھر چھوڑ دے تو وہ نوجوان بھی ہو لیکن اس کو حیض اور نفاس آنا بند ہو جاتا ہے۔ اس لئے یہ نماز آئسہ عورتیں پڑھیں تو پڑھیں لیکن جوان عورتوں کو یہ نماز نہیں پڑھنی چاہیے۔ لیکن یہ دونوں باتیں بے بنیاد ہیں۔ شیطانی دھوکہ ہیں۔ اور ایک بڑے ثواب سے مردوں اور عورتوں کو محروم رکھنے کیلئے گھڑی گئی ہیں۔ کیونکہ خود نبی کریم ﷺ سے ثابت ہو چکا ہے کہ وہ اس نماز کو پڑھتے بھی تھے اور پھر ترک بھی کر لیتے تھے۔ لہٰذا پڑھنے کے بعد چھوڑنے میں بھی کسی قسم کے وبال کا کوئی خطرہ نہیں۔ کذا فی الجمع (اصلاح الدین)

(٦) حدّثنا احمد بن منيع عن هشيم اناعبيدة عن ابراهيم عن سهم بن منجاب عن قرثع الضبّى او عن قزعة عن قرثع عن أيوب الأنصارىّ أنّ النبىّ ﷺ كان يدمن أربع ركعات عندزوال الشمس فقلت يارسول اللّٰه ﷺ إنّك تدمن هذه الأربع الركعات عندزوال الشمس فقال أنّ أبواب السماء تفتح عند زوال الشمس فلاترتجّ حتىّ تصلّى الظهر فاحبّ ان يصعد لى فى تلك الساعة خيرقلت أفى كلّهنّ قراءة قال نعم قلت هل فيهنّ تسليم فاصل قال لا.

حدّثنا احمد بن منيع ثنا ابومعاوية ثنا عبيدة عن إبراهيم عن سهم بن منجاب عن قزعة عن القرثع عن أبى أيّوب عن النبىّ ﷺ نحوه(١).

ترجمہ: حضرت ابوایوب الانصاریؓ فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ زوال کے وقت ہمیشہ چار رکعات پڑھتے تھے۔ میں نے عرض کیا کہ یارسول اللہ ﷺ آپ ﷺ زوال کے وقت چار رکعتوں پر دوام فرماتے ہیں(اس کی کیاوجہ ہے)تو آپ ﷺ نے فرمایا کہ آسمان کے دروازے زوال کے وقت کھول دیئے جاتے ہیں۔ پھر ظہر کی نماز تک بندنہیں کئے جاتے۔اس لئے میں چاہتا ہوں کہ میرا کوئی نیک عمل اس وقت آسمان پر چڑھ جائے۔ میں نے عرض کیا کہ کیااس نماز کی تمام رکعتوں میں قراءت ہے۔تو آپ ﷺ نے فرمایاہاں۔ میں نے پھر عرض کیا کہ کیاان چاروں کے درمیان سلام ہے۔آپ ﷺ نے فرمایانہیں۔

كان يدمن ادمن يدمن ادمان کسی کام کومداومت سےاور ہمیشہ کرنا۔یعنی آپ ﷺ صلوۃ ضحیٰ کوہمیشہ پڑھاکرتے تھے۔

---

(١)وبمعنى الحديث فى سنن ابى داؤد ١٨٧/١ كتاب الصلوٰة باب الأربع قبل الظهروبعدها، وبمعنى الحديث فى سنن ابن ماجة ص ٨٢ كتاب اقامة الصلوٰة والسنة فيها باب فى الاربع ركعات قبل الظهر، السنن الكبرىٰ للبيهقى ٤٨٨/٢ كتاب الصلوٰة(مختار)

عندزوال الشمس کا مطلب اور باب سے تطبیق: عند زوال الشمس الخ عند کا لفظ ''مع'' ''قبل'' اور ''بعد'' کے معنی میں مستعمل ہے۔اب یہاں کونسا وقت مراد ہے اور نماز سے کونسی نماز مراد ہے۔بعض شراح نے لکھا ہے کہ عند کا لفظ یہاں قبل کے معنی میں اور زوال سے پہلے پڑھی جانے والے چاشت کی نماز اس کا مصداق ہے۔یوں یہ حدیث ترجمۃ الباب سے موافق ہوجائے گا۔لیکن اکثر شراح کے نزدیک عند اس مقام پر بعد کے معنی میں ہے۔اور اس نماز سے مراد بظاہر ظہر کی سنتیں ہیں۔

کیونکہ اس وقت ظہر کی سنتوں کے سوا اور کوئی نماز نبی کریم ﷺ سے علی سبیل الدوام ثابت نہیں ہے۔نیز اسی باب کی آئندہ تمام احادیث بھی اس بات کی تائید کررہی ہیں کہ آپ اس وقت ظہر کی سنتیں پڑھتے تھے۔اور زوال کے بعد کا وقت اس مقام پر مراد ہے۔

البتہ اس پر یہ اعتراض ضرور وارد ہوتا ہے کہ اس صورت میں باب کے ساتھ ان احادیث کی مطابقت نہیں رہتی۔اس کے جواب میں ملا علی قاریؒ نے لکھا ہے کہ چونکہ زوال کے بعد پڑھی جانے والی نماز اس سے قبل پڑھی جانے والی نماز سے بالکل قریب ہے۔اس لئے بعد الزوال سنتوں کو بھی صلوٰۃ الضحیٰ کہا گیا ہے۔اور یہاں جر جوار کی نوعیت کی متابعت سے گویا بعد کی نماز قبل الزوال کی نماز کی تابع ٹھہری۔

جبکہ علامہ بیجوریؒ نے دو اور جواب ذکر کئے ہیں۔اول یہ کہ دراصل یہ چاروں احادیث اس باب کے نہیں بلکہ باب عبادۃ النبی ﷺ کی احادیث ہیں۔کسی ناسخ نے اپنے نسخہ میں غلطی سے اسے اپنی جگہ سے مؤخر کرکے یہاں ذکر کیا ہے۔اور باب العبادۃ کے ساتھ ان احادیث کا تعلق واضح ہے۔دوم یہ کہ دراصل یہاں پر باب العبادۃ کے عنوان سے صرف ایک ہی باب اصل کتاب میں موجود تھی۔اور باب صلوٰۃ الضحی، باب التطوع اور باب ماجاء فی صوم النبی ﷺ والے تین ابواب کے الگ الگ عنوان اصل نسخوں میں موجود ہی نہیں بلکہ یہ ساری احادیث عبادات کے ضمن میں مذکور تھیں۔اگر یہ بات تسلیم کرلی جائے پھر تو سرے سے اعتراض کی گنجائش ہی نہیں ہے۔

فاحِبُّ ان یصعدلی الخ صعود سے مراد صرف قبول ہے۔رفع الی مقام القبول نہیں ہے کیونکہ اعمال ظہر کے وقت پیش نہیں ہوتے بلکہ فرشتے اعمال کو صبح اور عصر کی نماز کے بعد آسمان پر اٹھا کر لیجاتے ہیں۔

عن سھم بن منجاب عن قزعۃ عن القرثع دوسری سند میں امام ترمذیؒ دراصل یہ بتانا

چاہتے ہیں کہ سہم بن منجاب اور قرثع کے درمیان قزعہ کا واسطہ ثابت ہے۔اس میں شک نہیں ہونا چاہیے جبکہ سابقہ سند میں اس بات کو شک کی صورت میں بیان کیا گیا تھا کہ منجاب قرثع سے بلاواسطہ یا پھر قزعہ کے واسطے سے روایت کرتے ہیں۔

(۸) حدّثنامحمّد بن المثنٰی اناابو داؤ دثنامحمّد بن مسلم بن أبی الوّضاح عن عبدالکریم الجزریّ عن مجاهد عن عبداللّٰه بن السائب أنّ رسول اللّٰهﷺ کان یصلّی اربعاً بعدان تزول الشمس قبل الظهروقال إنّهاساعة تفتح فیها ابواب السماء فاحبّ ان یصعدلی فیها عمل صالحٌ(۱).

ترجمہ: حضرت عبداللہ بن سائبؓ کہتے ہیں کہ نبی کریمﷺ زوال کے بعد ظہر سے قبل چار رکعات نماز پڑھتے تھے۔اور یہ بھی فرمایا کہ یہ وہ وقت ہے جس میں آسمان کے دروازے کھلتے ہیں۔ چنانچہ میرا دل چاہتا ہے کہ اس وقت میرا کوئی نیک عمل قبولیت کا مقام پائے۔

بعدان تزول الشمس یہ تصریح ہے کہ جو چار رکعات نبی کریمﷺ وقت کی رعایت کی خاطر پڑھتے تھے۔وہ زوال کے بعد ہوتے تھے۔البتہ باب سے عدم مطابقت کے اعتراض کا گزشتہ صفحات میں ہم جواب لکھ چکے ہیں۔

(۹) حدّثناأبوسلمة یحییٰ بن خلف ثناعمربن علّی المقدّمی عن مسعر بن کدام عن أبی إسحاق عن عاصم بن ضمرة عن علیّ أنّه کان یصلّی قبل الظهر أربعا وذکرأنّ النبیّﷺ کان یصلّیها عندالزوال ویمدُّ فیها(۲).

---

(۱)جامع ترمذی ۱/۱۰۸ کتاب الصلوٰة باب ماجاء فی الصلوٰة عندالزوال، مسنداحمد۳/۴۱۱، شرح السنة للبغوی ۳/رقم الحدیث ۸۹۰(مختار)

(۲)وبمعنی الحدیث فی جامع ترمذی ۱/۹۶ کتاب الصلوٰة باب ماجاء فی الأربع قبل الظهر، سنن ابن ماجة کتاب اقامة الصلوٰةوالسنة باب فی الاربع رکعات قبل الظهر ۸۲(مختار)

ترجمہ: حضرت علیؓ ظہر سے قبل چار رکعات نماز پڑھتے تھے۔اورانہوں نے بتایا کہ نبی کریم ﷺ بھی اسے زوال کے وقت پڑھتے تھے۔اوراس میں طویل قرأت پڑھتے تھے۔

أنّ النّبیّ ﷺ کان یصلّیھا الخ ظہر کی ان چار سنتوں کی فضیلت میں دیگر احادیث بھی مروی ہیں۔ایک حدیث میں آتا ہے''**اربع قبل الظھر وبعد الزوال تحسب بمثلھنّ فی السحر** (۱)(**الحدیث**)''یعنی زوال کے بعد ظہر سے پہلے چار رکعات ثواب کے لحاظ سے صبح سے پہلے(تہجد) کی نماز کے برابر شمار کی جاتی ہیں۔

اس مبارک وقت کے بارے میں نبی کریم ﷺ نے فرمایا کہ رحمت کے دروازے کھل جاتے ہیں۔اورتہجد کے وقت کے بارے میں نبی کریم ﷺ فرماتے ہیں کہ ہررات نصف شب کے بعدرب تعالیٰ زمین پرنزول فرماتے ہیں۔

زیرنظرحدیث اوراس سے پہلے دیگر احادیث سے یہ بات بھی بخوبی معلوم ہورہی ہے کہ ظہر سے پہلے چار رکعات پڑھنا سنت ہے۔دوپراکتفاءنہیں کرنا چاہیے۔جیسا کہ گزشتہ باب کی آخری احادیث میں ہم بیان کرچکے ہیں۔

ویمدّ فیھا آپ ﷺ ان چار رکعتوں میں طویل قرأت پڑھتے تھے۔یعنی فجر کی سنتوں کی طرح ان میں تخفیف نہیں فرماتے تھے۔امام غزالیؒ تو فرماتے ہیں کہ ان رکعتوں میں سورۃ بقرہ یاایسی ہی لمبی سورت پڑھنی چاہیے۔

---

(۱)ترمذی شریف ج۲ص۱۴۱

خلاصہ باب

نبی کریم ﷺ جس طرح راتوں کو اللہ تعالیٰ کے ساتھ راز ونیاز میں مشغول رہتے تھے۔اس طرح دن کے وقت بھی تقرّب کا کوئی موقعہ ہاتھ سے جانے نہیں دیتے تھے۔اوراس باب میں اسی مبارک عادت کا بیان ہے کہ آپ ﷺ اشراق اور چاشت کے وقت نوافل پڑھتے تھے اور پڑھنے کی ترغیب بھی دیا کرتے تھے۔

اس نماز میں رکعتوں کی تعداد میں اختلاف ہے۔دو رکعتوں سے لیکر بارہ رکعتوں تک کی روایات موجود ہیں۔اکثر واغلب چار رکعتیں آپ ﷺ نے پڑھیں ہیں۔آٹھ رکعتوں کی روایات بھی کثیر ہیں۔لیکن کوئی حتمی عدد متعین نہیں فرمائی۔البتہ آپ ﷺ نے تقریباً اسے مواظبت کے ساتھ پڑھا ہے اگر چہ کبھی کبھی استحباب کے بیان کیلئے یا خوف وجوب کی بنا پر آپ ﷺ اس نماز کو ترک بھی کیا کرتے تھے۔شمائل کے علاوہ کتب حدیث میں اس نماز کے فضائل میں متعدد احادیث مروی ہیں۔

۴۲. باب صلوٰۃ التطوع فی البیت

نفل نماز گھر میں پڑھنے کا بیان

اس سے پہلے نبی کریم ﷺ کی عبادت اوراس کی کچھ مخصوص انواع کا ذکر تھا۔ یہاں پر نفلی عبادت کا مناسب انداز میں بیان کیا جاتا ہے کہ اگر نماز فرض ہو وہ تو مسجد میں پڑھنا اولیٰ ہے۔لیکن نوافل کا مسجد کی نسبت گھر میں پڑھنا اولیٰ ہے۔اس باب میں ایک حدیث لائی گئی ہے۔

(۱) حدثنا عباس العنبری ثناعبدالرحمان بن مهدیؒ عن معاوية ابن صالح عن العلاء بن الحارث عن حرام بن معاوية عن عمّه عبدالله ابن سعد قال سالت رسول اللهﷺ عن الصلوٰة فی بيتی والصلوٰة فی المسجدقال قد تری ماأقرب بيتی من المسجد فَلَأنْ أصلّی فی بيتی أحبّ إلیّ من ان أصلی فی المسجد إلاأن تكون صلوٰة مكتوبة(۱).

ترجمہ: عبداللہ بن سعدؓ سے روایت ہے کہ میں نے نبی کریم ﷺ سے دریافت کیا کہ میری نفل نماز میرے لیے گھر میں بہتر ہے۔تو آپ ﷺ نے فرمایا کہ تم دیکھتے ہو کہ میرا گھر مسجد کے کتنے قریب ہے پھر (بھی) گھر میں نماز پڑھنا مجھے مسجد میں نماز پڑھنے کی نسبت زیادہ پسند ہے۔البتہ اگر فرض نماز ہو(تو وہ مسجد میں پڑھتا ہوں)

عبداللّٰہ بن سعدؓ انصاری صحابی ہیں بنوحرام سے تعلق ہے۔حرام بن معاویہ بن سعد جوان سے روایت کرتے ہیں کے چچا ہیں۔بعض لوگوں نے اسے قرشی اموی کہا ہے۔جنگ قادسیہ میں ان کی شرکت بھی منقول ہے۔دمشق میں رہتے تھے۔بعض لوگوں نے اسے ازدی کہا ہےاور بعض نے بنی تیم اللہ کی طرف اسے منسوب کیا ہے۔امام ابوداؤدؒ نے غسل میں بھی ان کی ایک حدیث روایت کی ہے۔جس میں غسل کے موجبات کے بارے میں آپؓ نے نبی کریم ﷺ سے پوچھا ہے(۲)۔

---

(۱)سنن ابن ماجة۹۸ کتاب اقامة الصلوٰة والسنة فيها باب ماجاء فی التطوع فی البيت، مسنداحمد۳۴۲/۴ شرح معانی الاثار ۲۳۶/۱ کتاب الصلوٰة باب التطوع فی المساجد(مختار)

(۲)الاصابة ۳۱۸/۲ (مختار)

فلان اصلّی فی بیتی الخ یعنی میرا گھر مسجد سے بالکل متصل ہے۔ازواج مطہرات کے حجروں کے دروازے مسجد نبوی ﷺ کے ایک حصے میں کھلتے ہیں۔اس قرب کے باوجود گھر میں نفل پڑھنا مجھے محبوب ہے۔اس سے کہ مسجد میں نفل نماز پڑھوں۔

عبادات میں فرض عبادات کے بارے میں یہ حکم ہے کہ ان کو علانیۃ ادا کیا جائے کیونکہ یہ شعائر اسلام ہیں۔اور اسلامی شعائر کا اخفاء ناجائز اور اعلان مطلوب ہے۔مثلاً فرض نماز، حج زکوٰۃ وغیرہ جہراً اور علانیۃً ادا کرنا چاہیے۔اس طرح وہ نوافل جن کی مشروعیۃ مسجد میں یا علانیۃ ہوئی ہے وہ بھی چھپ کر ادا نہیں کرنا چاہیے۔مثلاً تحیۃ المسجد، طواف کی دو رکعتیں، نماز تراویح، عیدین، اور خوف وکسوف کی نمازیں۔

اس کے برعکس جو نمازیں خالص نفل ہیں ان کو گھر میں تنہا ادا کرنا افضل ہے۔اور گھر میں ادائیگی کا رجحان کئی وجوہ سے ہے۔

(۱) اس طرح ریا سے آدمی بچ سکتا ہے۔

(۲) خود پسندی اور تکبر سے آدمی محفوظ رہتا ہے۔

(۳) منافقین کی مخالفت اور مؤمنین صادقین کے ساتھ مشابہت ہو جاتی ہے۔

(۴) گھر میں فرشتوں کا ورود اور شیاطین سے حفاظت ہو جاتی ہے۔

(۵) گھر اور گھر والوں میں برکت ہوتی ہے۔اسی وجہ سے نبی کریم ﷺ کا ارشاد ہے

''اجعلوا فی بیوتکم من صلوتکم ولاتتخذوھا قبوراً'' (متفق علیہ)

<u>خلاصہ باب</u>

اس باب میں نفل نماز کو گھر میں پڑھنے کی تعلیم دی گئی ہے۔جس کے فوائد ہم بیان کر چکے ہیں۔ بخاری شریف کی ایک حدیث میں آیا ہے۔

''افضل صلوٰۃ المرأ فی بیتہ إلاّ المکتوبۃ'' مزید کلام واضح ہے(۱)۔

(۱) سنتیں بھی گھر میں پڑھنا افضل ہے۔لیکن اگر گھر میں مشغولیت کا خدشہ ہو تو مسجد ہی میں پڑھ لی جائیں۔چونکہ آج کل سستی کا غلبہ ہے۔اس لئے مسجد میں پڑھنے پر فتویٰ دیا گیا ہے۔(مختار)

۴۳. باب ماجاء فی صوم رسول اللہ ﷺ

حضور اقدس ﷺ کے روزوں کا بیان

یہاں پر بعض نسخوں میں صیام اور بعض میں صوم مذکور ہے۔لغۃً دونوں صام یصوم کے مصدر ہیں۔صوم کا لغوی معنی امساک یعنی رکنا ہے۔بات کرنے سے رکنے اور ترک کلام کو بھی صوم کہا جاتا ہے۔ جیسا کہ ''اِنِیّ نَذَرتُ للرّحمٰنِ صَوْماً'' میں مذکور ہے۔

شریعت میں اس کا معنیٰ ''**الامساک عن المفطرات من طلوع الفجر الیٰ غروب الشمس بنیّۃٍ**'' سے کیا گیا ہے۔

اس باب میں کل سولہ احادیث ذکر کی جائیں گی جن میں اصالۃ تو آپ ﷺ کے نفل روزوں کا بیان مقصود ہے۔لیکن تبعاً فرض روزوں کا بھی ذکر ہے۔روزوں کے بہت سے فضائل ہیں اس سلسلے میں شیخ الحدیث حضرت مولانا زکریاؒ نے فضائل رمضان میں متعدد احادیث کو جمع فرمایا ہے۔رمضان شریف کے روزے ۲ھ میں فرض ہوئے ہیں۔اس سے قبل آپ ﷺ عاشورے کا روزہ التزام سے رکھتے تھے(۱)۔

(۱) حدّثنا قتیبۃ بن سعید ثنا حمّاد بن زید عن أیوب عن عبداللّٰہ بن شقیق قال سألت عائشۃ عن صیام رسول اللّٰہ ﷺ قالت کان یصوم حتیّ نقول قد صام ویفطر حتّی نقول قد افطر قالت وماصام رسول

---

(۱)روزوں کی مشروعیت تخلیق آدم سے ہے۔حضرت آدمؑ ایام بیض یعنی چاند کی ۱۳، ۱۴، ۱۵ تاریخ کو روزہ رکھتے تھے۔ حضرت نوحؑ نے اس دن روزہ رکھا جب کشتی مقام جودی پر ٹھہری۔حضرت داؤدؑ ایک دن روزہ اور ایک دن افطار کیا کرتے تھے۔حضرت موسیٰؑ نے کوہ طور پر قیام کے دوران چالیس دن روزے رکھے۔اسی طرح حضرت عیسیٰؑ کا معمول تھا کہ ایک دن روزہ اور دو دن افطار کیا کرتے تھے اور اسی تسلسل کی وجہ سے امت محمدیہ کو بھی روزوں کا حکم دیا گیا کما قال تعالیٰ **کتب علیکم الصیام کما کتب علی الذین من قبلکم(الآیۃ)**

یہ نہیں ہندوؤں میں بھی روزہ رکھنے کا رواج ہے اور پارسی مذہب میں بھی روزے کا حکم موجود ہے گویا روزہ ہر مذہب چاہے آسمانی ہو یا غیر آسمانی سب میں روزہ روحانیت کا نسخۂ مجرب ہے۔(مختار)

اللّٰہ ﷺ شھرا کاملا منذ قدم المدینة إلاّ رمضان(۱)۔

ترجمہ: عبداللہ بن شقیقؒ کہتے ہیں کہ میں نے حضرت عائشہؓ سے نبی کریم ﷺ کے روزہ رکھنے کے بارے میں پوچھا تو انہوں نے فرمایا کہ نبی کریم ﷺ کبھی مسلسل روزہ رکھتے تھے حتیٰ کہ ہم یہ خیال کرتے کہ (اس ماہ کے سارے) روزے رکھیں گے پھر کبھی مسلسل روزہ چھوڑ دیتے تھے۔ حتیٰ کہ ہم یہ خیال کرتے کہ (اس ماہ کے سارے ایام) افطار کریں گے۔

حضرت عائشہؓ نے فرمایا کہ جب سے نبی کریم ﷺ مدینہ تشریف لائے ہیں آپ ﷺ نے رمضان کے سوا کسی بھی مہینہ کے تمام روزے نہیں رکھے۔

کان یصوم، اس کا مطلب یہ ہے کہ آپ ﷺ مسلسل روزے رکھتے تھے اور **قد صام** کا معنی یہ ہے کہ ہمارا خیال ہوتا کہ آپ ﷺ سارے مہینے کے روزے رکھنے والے ہیں۔ کوئی روزہ نہیں چھوٹے گا۔

منذ قدم المدینة، چونکہ عام احکام کا نزول ہجرت کے بعد مدینہ میں ہوا تھا، اس لئے یہ قید لگا دی ورنہ مدینہ آنے سے پہلے بھی آپ ﷺ نے مکمل مہینہ کے روزے نہیں رکھے۔

اس حدیث میں اس بات پر تنبیہ ہے کہ نبی کریم ﷺ رمضان کے سوا کسی دوسرے مہینے کے تمام روزے تو نہیں رکھتے تھے، لیکن کوئی مہینہ بھی روزے رکھے بغیر نہیں گزرتا تھا۔ اس طرح آپ ﷺ مہینہ کے اول، وسط یا آخر کو متعین بھی نہیں فرماتے تھے بلکہ نفل روزے آپ حسب اتفاق رکھا کرتے تھے۔ آئندہ آنے والے احادیث میں آپ ﷺ کے نفل روزوں کے بارے میں مزید تفصیل منقول ہے۔

<u>رمضان کا وجہ تسمیہ:</u> **الّا رمضان**، رمضان کا لفظ **رمض** سے نکلا ہے جو سخت گرمی کے معنی میں مستعمل ہے۔ اس مہینہ کا یہ نام کیسے پڑا۔ اس کے بارے میں مختلف اقوال ہیں۔

(۱) سب سے پہلے جب مہینوں کے نام وضع کئے گئے تو یہ ماہ سخت گرمی کے موسم میں پڑتا تھا اس لئے اسے رمضان کہا جانے لگا۔

---

(۱) صحیح مسلم ۱/۳۶۴ کتاب الصیام باب اکل الناسی و شربه الخ، جامع ترمذی ۱/۱۵۹ کتاب الصوم باب ماجاء فی سرد الصوم (مختار)

(۲) اگر واضع لغت خود اللہ تعالیٰ ہو، تو مہینوں کے نام کے الہام کے وقت رمضان گرمی میں آ رہا تھا۔

(۳) یہ رمض الصائم سے ہے جس کا معنی ہے کہ روزہ دار کے سینہ کی گرمی شدید ہوگئی۔

(۴) یہ مہینہ روزہ دار کے گناہ کو جلا دیتا ہے(۱)۔

(۵) رمضان اللہ تعالیٰ کے ناموں میں سے ہے اور خصوصی عبادات کی وجہ سے اسے شہر رمضان یعنی خدا کا مہینہ کہا گیا ہے۔

(۲) حدّثنا علیّ بن حجر ثنا إسمٰعیل بن جعفر عن حمید عن أنس ابن مالک أنّه سئل عن صوم النبیّ ﷺ فقال کان یصوم من الشهر حتّی نری ان لا یرید ان یفطر ویفطر منه حتّی نری ان لا یرید ان یصوم منه شیئاً وکنت لاتشاء ان تراه من اللیل مصلّیاً إلاّ ان رأیته مصلّیاً ولانائماً إلاّ رأیته نائماً(۲).

ترجمہ: حضرت انسؓ سے رسول اللہ ﷺ کے روزوں کے بارے میں پوچھا گیا تو آپؓ نے کہا کہ نبی کریم ﷺ بعض مہینوں کے روزے (اتنے تواتر سے) رکھتے

---

(۱) اسی وجہ سے مالکیہ کا کہنا ہے کہ رمضان کا اطلاق غیر اللہ پر بغیر قید کے جائز نہیں۔ اور اکثر شافعیہ فرماتے ہیں کہ اگر غیر اللہ پر اطلاق کے لئے قرینہ موجود ہو تو بغیر قید کے بھی رمضان کا استعمال جائز ہے ورنہ بغیر قید کے رمضان کا اطلاق غیر اللہ پر مکروہ ہے۔ مگر مذکورہ حدیث پاک اور دوسرے روایات ان دونوں آراء کے خلاف ہیں۔ ملا علی قاریؒ نے لکھا ہے **وقال الشارح من علمائنا فیه دلیل للمذهب الصحیح المختار الذی ذهب إلیه البخاری والمحققون أنّه یجوز ان یقال رمضان من غیر ذکر الشهر بلاکراهة وقالت طائفة لایقال رمضان بانفراده بحال انّما یقال شهر رمضان....** اور آگے شافعیہ کے قول کا جواب دیتے ہوئے لکھتے ہیں **قلت فیه قرینة صارفة ایضاً وهی تنزیه اللّٰه تعالیٰ عن المجیٔ الدخول وقد جاء فی حدیث صحیح اذجاء رمضان فتحت ابواب الجنة فینبغی ان یمثل احبّ رمضان ونحوهٗ(جمع الوسائل ۲/۱۱۷)(مختار)**

(۲) جامع ترمذی ۱/۱۵۹ کتاب الصوم باب ماجاء فی سرد الصوم، صحیح بخاری ۱/۳۶۵، السنن الکبریٰ کتاب الصیام، باب من کره ان یتخذ الرجل صوم شهر یکمله من بین الشهور اوصوم یوم من بین الایام(۴/۲۹۹) للبیهقی ۳/۱۷ کتاب الصوم(مختار)

تھے۔ کہ خیال ہوتا کہ نبی کریم ﷺ کا ارادہ روزے کے ترک کا نہیں ہے۔ پھر بعض مہینوں میں (اتنا طویل) افطار فرماتے کہ یہ گمان ہوجاتا کہ اس ماہ میں روزے کا ارادہ ہی نہیں ہے۔ نیز اگر تم رات کے کسی حصے میں نبی کریم ﷺ کو نماز پڑھتے ہوئے دیکھنا چاہتے۔ تو ان کو نماز پڑھتے ہوئے دیکھ لیتے اور اگر اس میں سوتا ہوا دیکھنا چاہتے تو سوتا ہوا دیکھ لیتے۔

فقال کان یصوم من الشهر حتی نری، نون کے ساتھ یہ لفظ نَرَی بھی مروی ہے۔ پھر معنی یہ ہوگا کہ ہم خیال کرتے اور تــــری تاء کے ساتھ بھی صحیح ہے۔ پھر مطلب یہ ہوگا کہ تجھے لگتا کہ نبی کریم ﷺ اس ماہ میں افطار کرنے والے نہیں۔

نفل صوم وصلوٰۃ میں معمول کے اختلاف کی حکمتیں: بہر حال اس حدیث میں بھی اس بات کا بیان ہے کہ نفل روزوں میں نبی کریم ﷺ کا معمول تمام مہینوں میں یکساں نہیں رہتا تھا۔ اور اس اختلاف معمول کا سبب یا تو یہ ہے کہ نبی کریم ﷺ مہینے کی مختلف تاریخوں میں روزہ رکھ کر تمام تاریخوں میں برکت کے حصول کی کوشش فرمایا کرتے تھے، دوسری طرف حقوق نفس کی ادائیگی بھی ملحوظ ہوتی تھی۔ اس لئے افطار بھی فرمایا کرتے تھے اور یا یہ کہ اس طرح نفس کسی خاص معمول کا عادی نہیں بنتا تھا۔ اور یوں عبادت میں نفس کی مشقت بحال رہتی، جس سے روح کو سکون ملتا ہے۔

علاوہ ازیں روزہ نفس کیلئے ایک دوا اور علاج بھی ہے جو کہ بوقت ضرورت کم یا زیادہ استعمال کیا جاتا ہے اور کبھی کبھی اس کی ضرورت محسوس نہیں کی جاتی یا دیگر عوارض کی وجہ سے ترک کیا جاتا ہے۔ روزے کے ساتھ یہی معاملہ برتنا عین قرین قیاس ہے تا کہ اعتدال برقرار رہے۔

وکنت لاتـراه مـن الـلّیـل مُصلیًاالخ ، یہاں روزے کے بارہ میں سوال ہوا تھا لیکن نفل نماز کا بھی حکم زیادۃ فی الافادۃ کے طور پر بیان کیا جاتا ہے۔ نیز اس بات پر تنبیہ کیلئے بھی کہ سائل کو نماز کا بھی اہتمام کرنا چاہئے۔ خلاصہ یہ کہ آپ تہجد کے ساتھ بھی تقدیم وتاخیر اور کمی وبیشی کا معاملہ روزے کی طرح کیا کرتے تھے اور اس جگہ بھی معمول میں اختلاف کی تقریباً وہی حکمتیں ہیں جو وہاں ہیں۔

مداومت اعمال اور ترک اعمال کے روایات میں تطبیق: یہاں ایک اعتراض ہوتا ہے کہ متعدد احادیث میں اس بات کا ذکر ہے کہ آپ ﷺ اعمال میں دوام کو پسند فرماتے تھے چنانچہ حضرت عائشہؓ سے روایت ہے کہ **کان اذاصلّی داوم علیها**، ایک اور روایت میں ہے کہ **کان عمله دیمةً**، ایک اور روایت میں ہے کہ **احبّ الأعمال إلی اللّٰه مادیم علیه**، اور ظاہر ہے کہ زیر نظر احادیث میں اس کے برعکس مذکور ہے۔ اس کا جواب علامہ ابن حجرؒ نے تو یوں دیا ہے کہ جس دوام کا ذکر کیا گیا ہے وہ واجب اعمال کے بارے میں ہے اور نوافل میں آپ دوام نہیں کرتے تھے لیکن علامہ میرک نے اس پر اعتراض کیا ہے کہ یہ جواب تسلی بخش نہیں ہے۔

ملاعلی قاریؒ نے کہا ہے کہ تہجد کو آگے پیچھے کرنے اور کبھی اول شب میں اور کبھی آخر شب میں پڑھنے کا دوام سے منافات ہی نہیں ہے۔ لہٰذا سرے سے یہ اعتراض بے جا ہے۔

(۳) حدثنا محمود بن غیلان ثنا أبو داؤد ثنا شعبة عن أبی بشر قال قال سمعت سعید بن جبیر عن ابن عبّاس قال کان النبیّ ﷺ یصوم حتیّ نقول مایرید ان یفطر منه ویفطر حتیّ نقول مایرید ان یصوم وماصام شهراً کاملاً منذ قدم المدینة إلاّ رمضان(۱).

ترجمہ: حضرت عبداللہ بن عباسؓ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ کبھی کسی مہینے کے روزے مسلسل رکھتے تھے۔ حتیٰ کہ ہم یہ سمجھتے کہ (اس ماہ میں) افطار کا ارادہ نہیں ہے۔ اور کبھی کسی ماہ میں مسلسل افطار فرماتے حتیٰ کہ ہم یہ سمجھتے کہ (اس ماہ میں) روزے رکھنے کا ارادہ نہیں ہے۔ اور جب سے آپ ﷺ مدینہ تشریف لائے آپ ﷺ نے رمضان کے سوا کسی بھی مہینہ کے تمام روزے نہیں رکھے۔

---

(۱) صحیح بخاری ۱/۲۶۴ کتاب الصیام باب یذکر من صوم النبیّ ﷺ وافطاره، صحیح مسلم ۱/۳۶۵ کتاب الصیام باب صیام النبیّ ﷺ وغیره رمضان سنن النسائی ۱/۲۵۰ کتاب الصیام باب صوم النبی ﷺ (مختار)

<u>نفل اعمال میں میانہ روی:</u> وماصام شهراً كاملاًالخ ،اس حدیث میں بھی اس بات پر تنبیہ ہے کہ نبی کریم ﷺ کے نفل روزے افراط وتفریط سے خالی اور اعتدال پر مبنی ہوتے تھے۔اسی وجہ سے جب بعض صحابہ نے صوم الدھر یعنی ہمیشہ کیلئے روزے رکھنے کا عزم ظاہر کیا۔تو آپ ﷺ نے اس پر انکار فرمایا اور اپنی میانہ روی کو قابل تقلید بتایا(۱)۔

(۴) حدّثنا محمّدبن بشارثنا عبدالرحمان بن مهدیّ عن سفيان عن منصورعن سالم بن أبی الجعد عن أبی سلمة عن امّ سلمة قالت مارأيت النبیّ ﷺ يصوم شهرين متتابعين إلاّشعبان ورمضان(۲).

قال ابوعيسٰی هذااسنادصحيح وهكذاقال عن أبی سلمة عن امّ سلمة وروىٰ هذاالحديث غيرواحدٍ عن أبی سلمة عن عائشة عن النبیّ ﷺ

(۱) مسلسل روزوں کے بارے میں علامہ بنوریؒ نے مختلف مذاہب لکھے ہیں فرماتے ہیں ذهب الجمهور إلىٰ جوازه وهومستحب عندالشافعی إذاأطاقه ولم يؤدإلىٰ فوات حق وإلىٰ كراهته ذهب اسحٰق والظاهرية وأحمد فی رواية وشذّابن حزم فقال يحرم كمافی الفتح قال ابن قدامة الذی يقوی عندی أن صوم الدهر مكروه وعزاالنووی الكراهة إلى أبی يوسف وغيره من أصحاب الامام ولم يذكرالبدر العينی فی العمدة خلاف أبی حنيفة ولا صاحبه وقد صرّح فی البدائع بمايدل على كراهته عندأبی يوسف،راجعه (۲.۹۷)قال ابن الهمام فی "فتح القدير" ويكره صوم الدهر لأنه يضعفه، أو يصير طبعاً له، ومبنى العبادة على مخالفة العادة اه. وصرح فی "الدر" بكراهته تنزيهاً، والكراهة هی المذكورة فی "البدائع" ويستفاد من "الفتاوی الهندية" أن صوم الدهر وصوم الوصال واحد، حيث قال: ويكره صوم الوصال وهو أن يصوم السنة كلها ولايفطرفی الأيام المنهی عنها، وإذا أفطرفی الأيام المنهية المختار أنه لا بأس به، كذا فی "الخلاصة" (معارف السنن۵/۴۵۴)(مختار)

(۲)جامع ترمذی ۱/۱۵۵ كتاب الصوم باب ماجاء فی وصال صيام شعبان برمضان، سنن ابن ماجة ۱۱۹ كتاب الصيام باب ماجاء وصال صيام شعبان برمضان، مصنف ابن ابی شيبة۲/۳،كتاب الصيام، من رخص ان يصل رمضان بشعبان(۲/۴۳۸)،السنن الكبرىٰ للبيهقی۴/۲۱۰ كتاب الصيام باب الرخصة فی ذلک(ای فی رخصة الصيام اذاانتصف شعبان) بماهواصح من حديث العلاء(۴/۲۱۰)(مختار)

ویحتمل ان یکون ابوسلمة بن عبدالرحمان قدروی هذاالحدیث عن عائشة وامّ سلمة جمیعا عن النبیّ ﷺ.

ترجمہ: ام المؤمنین حضرت ام سلمہؓ سے روایت ہے کہ میں نے نبی کریم ﷺ کو شعبان اوررمضان کے سوادومہینے مسلسل روزے رکھتے ہوئے نہیں دیکھا۔

امام ترمذیؒ کہتے ہیں کہ یہ سند درست ہےاوراسی طرح حضرت سالم بن ابی الجعدؒ نے یوں کہا کہ **عن ابی سلمة عن عائشةؓ عن النبیﷺ**، یہ بھی ممکن ہے کہ ابوسلمۃ بن عبدالرحمان نے اس حدیث کوحضرت عائشہؓ اورام سلمہؓ دونوں کے واسطہ سے نبی کریم ﷺ سے روایت کیاہو۔

وجہ تسمیہ شعبان: **الّاشعبان ورمضان**، شعبان کوشعبان دووجوہ سے کہا گیاہےاول یہ کہ عرب لوگ اس ماہ میں پانی کی تلاش میں متشعب یعنی متفرق ہوگئے تھے دوم یہ کہ ماہ رجب کامہینہ انکے ہاں محترم تھا، رجب گزرنے کے بعد وہ غارات اورلوٹ مارکیلئے ادھرادھر نکل جاتے تھے چنانچہ یہ مہینہ انکے تشعب اورتفرق کاتھا۔

تعارض روایات کی توجیہ: اس حدیث پر یہ اعتراض ہوتا ہے کہ اس باب کی احادیث میں یہ بات مصرح ہے کہ آپ ﷺ رمضان کے علاوہ کسی بھی مہینے کے روزے کامل نہیں رکھتے تھے تو اس حدیث میں شعبان کے سارے روزے رکھنے کی بات کیوں کر درست ہوسکتی ہے۔اس کا جواب متعدد وجوہ سے دیا گیا ہے۔

اول: اس حدیث میں اکثر کوکل کے قائم مقام بنایا گیا ہے چونکہ شعبان میں افطار کے نسبت روزے زیادہ ہوتے تھے۔اس لئے گویا سارے ماہ کے روزے رکھنے کی خبر ہے۔جیسا کہ اگلے حدیث میں اس کی طرف اشارہ ہے۔

دوم: یہاں شعبان کے سارے روزے رکھنے کا مطلب یہ ہے کہ کبھی اول عشرے میں، کبھی دوسرے عشرے میں، کبھی تیسرے عشرے میں آپ ﷺ اس کے روزے رکھتے تھے۔اس طرح کئی سالوں میں اس کے سارے روزے رکھ لیتے تھے۔

سوم: حضرت ام سلمہؓ کی حدیث مثبت ہے اور دیگر احادیث نافی ہیں تو شاید ام سلمہؓ کو اس کا علم ہو چکا ہو۔ اور دیگر صحابہؓ کو علم نہ ہو۔

چہارم: یہ کہ ہوسکتا ہے کہ شعبان کے سارے روزے رکھنے کا قصہ مکی زندگی کا واقعہ ہو۔ اور دیگر احادیث مدنی زندگی کے متعلق ہوں جیسا کہ حضرت عائشہؓ کی پچھلی حدیث میں "مـنـذقدم المدينه" کے قید سے بھی یہی ظاہر ہوتا ہے کہ مدینہ آنے کے بعد آپ ﷺ نے رمضان کی تخصیص کا اہتمام کیا تھا، مکہ میں کسی اور مہینے کے سارے روزے رکھے ہوں تو بعید نہیں ہے۔

رمضان کے روزے تو فرض ہیں لیکن شعبان میں بھی آپ بکثرت روزے رکھتے تھے بلکہ اس حدیث کی طرح اگلی حدیث اور دیگر احادیث سے یہ بات صراحۃً ثابت ہے کہ شعبان میں تقریباً سارا مہینہ آپ روزے رکھتے تھے۔ اس اہتمام کی متعدد وجوہ ذکر کی گئی ہیں۔ جن کا خلاصہ یہ ہے:

۱) ایک مرفوع حدیث میں ہے کہ شعبان میں بندہ کے سال بھر کے اعمال اللہ کے حضور پیش کئے جاتے ہیں۔ میں چاہتا ہوں کہ میرے اعمال ایسی حالت میں اللہ کے دربار میں پیش ہوں کہ میں روزے سے ہوں۔

۲) نبی کریم ﷺ ہر مہینے تین دن کے روزے رکھتے تھے جبکہ بعض ایام مثلاً پیر اور جمعرات کو بھی اکثر روزے کا اہتمام فرماتے لیکن کبھی کبھی سفر، جہاد یا دوسری وجوہ کی بناء پر روزے رہ جاتے تھے چنانچہ شعبان بھر کے روزے رکھ کر آپ ﷺ وہ کمی پورا فرماتے تھے۔

۳) ایک روایت میں ہے کہ شعبان کے روزے رمضان کی تعظیم کی وجہ سے افضل ہیں۔

۴) ایک روایت میں آپ ﷺ نے شعبان میں بکثرت روزے کی وجہ یہ بیان فرمائی کہ اس مہینے میں سال بھر میں مرنے والوں کے نام درج کئے جاتے ہیں اور میں چاہتا ہوں کہ میری موت ایسی حالت میں لکھی جائے جب کہ میں روزہ دار ہوں۔

۵) بعض علماء نے لکھا ہے کہ چونکہ رمضان میں نفل روزے رکھنا ممکن نہیں ہے۔ لہٰذا آپ ﷺ رمضان شریف کے مہینے کے نفل روزے پیشگی شعبان میں رکھ لیتے تھے اور دوسرے مہینوں کی نسبت زیادہ رکھ لیتے تھے۔

ویحتمل ان یکون ابو سلمة الخ،امام ترمذیؒ نے جو احتمال ذکر کیا ہے دوسری کتب حدیث سے اس احتمال کو تقویت ملتی ہے۔

(۵) حدّثنا هنّاد ثنا عبدة عن محمّد بن عمرو ثنا أبو سلمة عن عائشة قالت لم أر رسول اللّٰه ﷺ يصوم في شهر أكثر من صيامه في شعبان كان يصوم شعبان إلّا قليلا بل كان يصوم كلّه(۱).

ترجمہ: حضرت عائشہؓ کہتی ہیں کہ میں نے نبی کریم ﷺ کو شعبان کی نسبت کسی مہینہ میں زیادہ روزے رکھتے ہوئے نہیں دیکھا۔سوائے چند ایام کے آپ ﷺ تمام شعبان کے روزے رکھتے تھے بلکہ گویا تمام شعبان کے روزے رکھتے تھے۔

یصوم فی شهر الخ،ترکیب میں یہ "لم أرَ" کے مفعول سے حال واقع ہوا ہے یعنی اس حالت میں کہ نبی کریم ﷺ کسی ماہ کے روزے رکھتے تھے۔یہ تشریح اس وقت ہے جب "لم آرَ" سے رویت بصری مراد ہو اور اگر رویتہ علمی ہو تو "**یصوم فی شهر**" مفعول ثانی بن جاتا ہے۔**اکثر من صیامه یعنی لَمْ آرَهُ یصوم صیاماً اکثر من صیامه الخ**،اس طرح اکثر صیاماً کی صفت ہے جو مفعول مطلق مقدر ہے۔

بل کان یصوم الخ ،بل ترقی کیلئے ہے یعنی پہلے تو چند دن کی استثناء کردی لیکن یہ دن اتنے کم ہوتے تھے گویا کالعدم ہوں اور تمام مہینے روزے سے ہوں باقی شعبان کے روزوں کی اہمیت کے اسباب پہلے ذکر کئے جاچکے ہیں۔

(۶) حدّثنا القاسم بن دينار الكوفيّ ثنا عبيد اللّٰه بن موسىٰ وطلق ابن غنام عن شيبان عن عاصم عن زرّ عن عبد اللّٰه قال كان رسول اللّٰه ﷺ يصوم من غرّة كلّ شهر ثلاثة ايّام وقلّ ماكان يفطر

---

(۱)صحیح بخاری ۱/۲۶۴ کتاب الصوم باب صوم شعبان،صحیح مسلم ۱/۳۶۵ باب صیام النبی ﷺ فی غیر رمضان واستحباب ان لایخلی شهر من صوم، جامع ترمذی ۱/۱۵۵ کتاب الصوم باب ماجاء فی وصال شعبان برمضان، سنن ابن ماجة باب ماجاء فی وصال شعبان برمضان(۱/۱۹۹) ابواب ماجاء فی الصیام ،السنن الکبریٰ للبیهقی ۴/۲۹۲ کتاب الصوم باب فضل صوم شعبان(مختار)

یوم الجمعة(۱).

ترجمہ: حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کہتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ ہر ماہ کے ابتداء کی تین ایام کے روزے رکھا کرتے تھے اور بہت کم جمعہ کے دن کا روزہ چھوڑتے تھے۔

<u>ہر ماہ کے ابتداء کے تین اور جمعہ کا روزہ:</u> **یصوم من غرة کل شهر ثلثه ایام**، اس روایت میں ابتدائی تین دنوں کا ذکر ہے جبکہ بعض روایات میں ایام بیض کے تین دنوں کے روزوں کا اہتمام کا ذکر ہے اور بعض میں آخر مہینہ کا بھی ذکر ہے۔ گویا آپ ﷺ غیر متعین تین روزے ہر مہینے میں رکھتے تھے اور یہی بات آئندہ صراحۃً مذکور ہے۔ بہر حال اگر روزے کا دس گنا بدلہ مل جائے تو تین روزہ رکھنے سے سارے مہینے کے روزوں کا ثواب مل جائے گا۔ اور گویا ہر ماہ تین دن روزہ رکھنے والا ثواب کے لحاظ سے صائم الدھر بن جاتا ہے۔

وقلّما کان یُفطِرُیوم الجمعة، صرف جمعہ کا روزہ رکھنا مندوب ہے، یا مکروہ اس بارے میں مذاہب مختلف ہیں۔ شوافع اور حنابلہ کے نزدیک کراہت کا قول راجح ہے۔ اگر چہ ندب کا قول بھی موجود ہے۔ مالکیہ کے نزدیک جمعہ کا روزہ مندوب ہے جبکہ احناف کے ہاں ایک قول کراہۃ تنزیہی اور دوسرا ندب کا ہے۔

البتہ اگر جمعرات یا سنیچر کا روزہ ملا کر جمعہ کا روزہ رکھا جائے تو بالاتفاق مندوب ہوگا۔ ہوسکتا ہے یہاں بھی جمعہ کے ساتھ ساتھ آپ ﷺ ایک اور روزہ بھی ملا کر رکھتے ہوں گے۔

(۷)حدثنا محمود بن غیلان ثنا أبو داؤد انا شعبة عن یزید الرشک قال سمعت معاذة قالت قلت لعائشة أكان النبیّ ﷺ یصوم ثلاثة ایّام من کل شهر قالت نعم قلت من ایّه کان یصوم قالت کان لایبالی من أیّه صام(۲).

---

(۱)سنن ابی داؤد ۱/ ۳۳۹ کتاب الصوم باب فی صوم الثلاث من کل شهر دون مافی آخره، جامع ترمذی ۱/ ۱۵۷ کتاب الصوم باب ماجاء فی صوم یوم الجمعه، السنن النسائی ۱/ ۲۵۱ کتاب الصوم، سنن ابن ماجة ۱/ ۱۲۳ کتاب الصیام باب فی صیام یوم الجمعة(مختار)

(۲) بعض نسخوں میں حضرت عائشہؓ کی یہ حدیث موخر کر کے بارہویں نمبر پر لائی گئی ہے اور اکثر شراح نے بھی اسی نسخے پر اعتماد کیا ہے۔(مختار)

قال ابوعیسیٰ ویزیدالرشک هویزیدالضبعی البصریّ وهوثقة وروی عنه شعبة وعبدالوارث بن سعید وحمّاد بن زیدوإسماعیل ابن إبراهیم وغیرواحدمن الائمة وهویزیدالقاسم ویقال القاسم والرشک بلغة أهل البصرة هوالقسّام(۱).

ترجمہ: حضرت معاذہؓ فرماتی ہیں کہ میں نے حضرت عائشہؓ سے پوچھا کہ کیا نبی کریم ﷺ ہر ماہ کے تین روزے رکھتے تھے۔انہوں نے فرمایا کہ ہاں، میں نے پوچھا کہ مہینے کے کن ایام کا روزہ رکھتے تھے۔فرمایا کہ اس کی پرواہ نہیں فرماتے تھے کہ مہینے کے کونسے روزے رکھے۔

امام ترمذیؒ کہتے ہیں کہ (سند میں) یزیدالرشک یزید ضبعی بصری ہیں۔جوثقہ راوی ہیں، امام شعبہؒ، امام عبدالوارثؒ بن سعید، امام حمادؒ بن زید امام اسماعیل بن ابراہیمؒ اور متعدد ائمہ حدیث نے ان سے روایت کی ہے۔اسی یزید کو القاسم اور القسام بھی کہتے ہیں اور الرشک کے معنی بھی اہل بصرہ کی زبان میں قسام (تقسیم کرنے والے) کے ہیں۔

روایات تعین وعدم تعین ایام میں تطبیق: كان لايبالي الخ، حضور ﷺ کے نوافل اور بالخصوص نفل روزوں کا علم حضرت عائشہؓ کو سب سے زیادہ ہوسکتا ہے۔اس لئے یہ کہا جاسکتا ہے کہ گزشتہ حدیث میں مہینہ کے صرف ابتدائی ایام کا جو ذکر تھا وہ اکثر واغلب پر محمول ہوگا۔یا یہ کسی زمانہ میں تخصیص اور کسی میں عدم تعین کا طریقہ آپ نے اپنایا ہو، اور دونوں صورتوں میں الگ الگ مصالح بھی ہیں علاوہ ازیں ہو سکتا ہے کہ عبداللہ بن مسعودؓ کے علم میں تخصیص وتعین ہو لیکن حضرت عائشہؓ دیگر ایام میں آپ ﷺ کے روزوں کو جانتی ہوں اسلئے ان سے تعمیم مروی ہے۔

---

(۱)صحیح مسلم ۱/۳۶۷ کتاب الصیام باب استحباب صیام ثلاثة ایّام من کل شهر سنن ابی داؤد ۱/۳۳۹ کتاب الصوم باب من قال لایبالی من أیّ الشهر، جامع ترمذی ۱/۱۵۹ کتاب الصوم باب ماجاء فی ثلاثة ایّام من کل شهر، سنن ابن ماجة ۱/۱۲۲ کتاب الصیام باب ماجاء فی صیام ثلاثة من کل شهر.(مختار)

قال أبو عیسیٰ الخ ،امام ترمذیؒ ایک راوی امام شعبہؒ کے استاد یزید الرشک کا تعارف کرار ہے ہیں لیکن یہاں ایک اشکال یہ ہوتا ہے کہ اس راوی کا پہلے بھی ذکر ہو چکا ہے اوران کی روایت باب صلوٰۃ الضحی کی ابتداء میں بھی مذکور ہے۔تو وہاں ان کا تعارف کیوں نہیں کیا۔اس کا جواب یہ ہے کہ دراصل امام ترمذیؒ کو یہاں تعارف کی ضرورت کا احساس اس لئے ہوا کہ اس روایت کا گزشتہ روایت سے تدافع معلوم ہوتا ہے۔کیونکہ سابقہ روایت میں مہینے کے ابتدائی تین ایام کا تعین اوراس میں عدم تعین کا ذکر ہے۔لہٰذا یہ تو ہوسکتا ہے کہ یہ روایت کمزور ہو اوراس میں یزید الرشک ضعیف ہوں تو امام ترمذی نے تعارف کے ضمن میں یہ تصریح کردی کہ یہ راوی ثقہ ہیں۔رہا تدافع کا قضیہ تو وہ ہم پہلے نمٹا چکے ہیں۔نیز یزید الرشک کے احوال بھی پہلے باب نمبر ۴۰ میں گزر چکے ہیں۔

(۸) حدّثنا أبو حفص عمرو بن علیّ ثنا عبداللّٰہ بن داود عن ثور ابن یزید عن خالد بن معدان عن ربیعة الجرشی عن عائشة قالت کان النبیّ ﷺ یتحرّی صوم الاثنین والخمیس(۱).

ترجمہ: حضرت عائشہؓ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ سوموار اور جمعرات کے دنوں کا روزہ رکھنے کی کوشش فرمایا کرتے تھے۔

<u>پیر اور جمعرات کے روزے اور عرض اعمال:</u> **یتحرّی الصوم** ،تحرّی کا معنی ہے ’’طلب الاحریٰ‘‘ یعنی مناسب ترین امر کو ترجیح دینا،تو مطلب یہ ہوگا کہ آپ ﷺ مذکورہ دودنوں کو قصداً عمداً روزہ رکھنے کی کوشش فرماتے تھے۔ان دودنوں کی تخصیص کی وجوہ کی طرف بھی احادیث میں اشارات موجود ہیں۔مثلاً (۱) یہ کہ ان ایام میں اعمال کی پیشی ہوتی ہے اور روزہ کی حالت میں روزہ دار کا روزہ بھی پیش ہوگا۔(۲) پیر کے روز نبی کریم ﷺ کی ولادت باسعادت بھی ہوئی تھی اور پیر کے روز قرآن شریف کی پہلی

---

(۱)جامع ترمذی ۱/۱۵۷ کتاب الصوم باب ماجاء فی صوم الاثنین والخمیس، سنن ابن ماجة ص۱۲۵ کتاب الصیام باب صیام یوم الاثنین والخمیس، صحیح ابن حبان ۵/۲۶۱ کتاب الصوم ذکر تحری المصطفی ﷺ صوم الاثنین والخمیس رقم الحدیث[۳۶۳۵](مختار)

وحی نازل ہوئی تھی۔(۳) پیراور جمعرات کے روز مسلمانوں کی عمومی مغفرت ہوتی ہے صرف وہ دوشخص اس مغفرت سے محروم رہتے ہیں جن کے درمیان عداوت اور بغض کی وجہ سے ترک کلام ہو۔

(۹) حدثنا ابومصعب المدینیّ عن مالک بن أنس عن أبی النظر عن أبی سلمة بن عبدالرحمان عن عائشة قالت ماکان رسول اللّٰہ ﷺ یصوم فی شھر اکثرمن صیامہ فی شعبان(۱).

ترجمہ: حضرت عائشہؓ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ شعبان کی نسبت کسی بھی دوسرے مہینہ میں زیادہ روزے نہیں رکھتے تھے۔

ماکان الخ، حضرت عائشہؓ کی اس طرح کی حدیث ابھی گزر چکی ہے جس کی تشریح وہاں ملاحظہ فرمائیں۔اس حدیث کو بھی بعض نسخوں میں کچھ تاخیر کے ساتھ ذکر کیا گیا ہے۔

(۱۰) حدثنا محمّدبن یحیٰی ثنا ابوعاصم عن محمّدبن رفاعة عن سھیل ابن أبی صالح عن أبیه عن أبی ھریرة أنّ النبی ﷺ قال تعرض الأعمال یوم الاثنین والخمیس فاحبّ ان یعرض عملی وانا صائم(۲).

ترجمہ: حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ (اللہ تعالیٰ کے ہاں) بندوں کے اعمال پیر اور جمعرات کو پیش ہوتے ہیں۔لہٰذا میرا دل چاہتا ہے کہ میرے اعمال ایسی حالت میں پیش ہوں کہ میں روزہ سے ہوں۔

عرض اعمال کے ایام واوقات کا تعدد: **تعرض الاعمال یوم الاثنین الخ،** پیراور جمعرات کے دن اعمال کو پیشی کی وجوہ تو ہم پہلے ذکر کر چکے ہیں لیکن مسلم شریف کی ایک روایت میں یہ آتا ہے "یرفع الیہ

(۱)صحیح بخاری ۱/۲۶۴ کتاب الصوم شعبان، صحیح مسلم ۱/۳۶۵کتاب الصیام باب صیام النبیّ ﷺ وغیررمضان الخ، سنن ابی داؤد ۱/۳۳۸کتاب الصوم باب کیف کان یصوم النبیّ ﷺ، سنن النسائی ۱/۲۵۱کتاب الصیام باب صوم النبی ﷺ الخ، مؤطاامام مالک ۱/۳۰۹ کتاب الصوم،(مختار)

(۲)جامع ترمذی ۱/۱۵۷ کتاب الصوم باب ماجاء فی صوم الاثنین والخمیس، سنن ابن ماجة کتاب الصیام باب صیام یوم الاثنین والخمیس، سنن الدارمی ۲/۲۰ کتاب الصوم(مختار)

عمل اللیل قبل عمل النہار وعمل النہار قبل عمل اللیل(۱) ''یعنی روزانہ دن آنے سے پہلے اور پھر رات چھا جانے سے پہلے دو مرتبہ اللہ تعالیٰ کے ہاں اعمال پیش کئے جاتے ہیں۔تو جب روزانہ دوبار رفع عمل ہوتا ہے تو پھر ہفتے میں دوبار اعمال کی پیشی کا کیا فائدہ ہے۔اس کا ایک جواب تو یہ ہے کہ روزانہ دوبار رفع عمل ہوتا ہے عرض عمل کا ذکر نہیں ہے اور پھر ان اعمال کا عرض ہفتے میں دوبار ہوتا ہے دوسرا جواب یہ ہے کہ بار بار عرض عمل میں بھی بہت سی حکمتیں ہوسکتی ہیں۔مثلاً یہ مصلحت کیا کم ہے کہ اس طرح اللہ تعالیٰ فرشتوں پر نیک عمل کرنے والوں کی شرافت ظاہر کرنا چاہتے ہیں۔تا کہ انسان کی خلقت وخلافت کی حکمت ان پر عیاں ہوجائے کہ وہ صرف فساد کرنے والے نہیں بلکہ نفس لمّارہ کے باوجود بڑے بڑے نیک اعمال بھی روزانہ وہاں سے آتے رہتے ہیں۔ورنہ اللہ تعالیٰ کے ہاں تو عرض اعمال کی سرے سے ضرورت ہی نہیں۔وہ تو علیم وخبیر ہے روزانہ اور ہفتہ وارعرض کے علاوہ سالانہ عرض بھی ہوتا ہے۔چنانچہ روایت میں لیلۃ البراءت اور لیلۃ القدر میں بھی عرض اعمال کا ذکر ہے۔نیز یہ بھی ہوسکتا ہے کہ بعض اوقات عرض اعمال تفصیلی اور بعض اوقات اجمالی ہو۔

(۱۱) حدثنا محمود بن غیلان ثنا أبو أحمد ومعاویة بن هشام قالا ثنا سفیان عن منصور عن خیثمة عن عائشة قالت کان رسول اللّٰہ ﷺ یصوم من الشهر السبت والاحد والاثنین ومن الشهر الأخر الثّلاثاء والأربعاء والخمیس(۲).

ترجمہ: حضرت عائشہؓ کہتی ہیں کہ نبی کریم ﷺ کبھی ایک مہینے میں ہفتے اتوار اور پیر کے روزے رکھ لیتے تھے تو دوسرے مہینے میں منگل بدھ اور جمعرات کے روزے رکھتے تھے۔

---

(۱)مشکوٰۃ شریف ج ۱ ص ۲۱ کتاب القدر

(۱)جامع ترمذی ۱/۱۵۷ کتاب الصوم باب ماجاء فی صوم یوم الاثنین والخمیس ومنه(مختار)

<u>امۃ کی سہولت کے لئے تعدد وتعین ایام میں توسّع:</u> **کان یصوم فی الشھر الخ،** اس حدیث میں ہفتے کے چھ دنوں کا ذکر ہے جبکہ حضرت ابن مسعودؓ کی حدیث میں جمعہ شریف کے دن کا ذکر بھی گزر گیا ہے اور یوں آپ ﷺ نے ہفتے کے ساتوں دن روزے کی فضیلت کی طرف اشارہ فرمادیا ہے۔ آپ ﷺ نے ایام کی تعین اس لئے نہیں فرمائی تا کہ امت پر توسّع ہو اور جن ایام میں بھی ان کو روزہ رکھنے میں سہولت ہو، انہی ایام میں روزہ رکھیں اور نبی کریم ﷺ کی اقتداء میں مشکل پیش نہ آئے۔

(۱۲) حدّثناھارون بن إسحاق الھمدانیّ ناعبدۃ بن سلیمان عن ھشام بن عروۃ عن أبیہ عن عائشۃ قالت کان عاشوراء یوماً یصومہ قریشٌ فی الجاھلیۃ وکان رسول اللہ ﷺ یصومہ فلمّا قدم المدینۃ صامہ وامر بصیامہ فلمّاافترض رمضان کان رمضان ھو الفریضۃ وترک عاشوراء فمن شاء صامہ ومن شاء ترکہ(۱).

ترجمہ: حضرت عائشہؓ سے روایت ہے کہ عاشور (دس محرم) کے دن کا روزہ قریش زمانہ جاہلیت میں رکھتے تھے اور نبی کریم ﷺ بھی یہ روزہ رکھتے تھے۔ پھر جب آپ ﷺ مدینہ ہجرت کرکے تشریف لائے تو اس دن کا روزہ خود بھی رکھا اور دوسروں کو بھی یہ روزہ رکھنے کا حکم دیا پھر جب رمضان کی فرضیت نازل ہوئی تو صرف رمضان ہی فرض روزہ رہا۔ اور آپ نے عاشورے کا روزہ (فرض رکھنا) چھوڑ دیا اب جس کا دل چاہے یہ روزہ رکھے اور جس کا دل چاہے اسے چھوڑ دے۔

عاشوراء، یہ دس محرم کیلئے مخصوص نام ہے۔ اس میں لیلۃ عاشوراء تھا لیکن غلبہ اسمیت کی وجہ سے اس کا موصوف ذکر نہیں کیا جاتا۔ جیسے الدنیا اور الآخرۃ کا موصوف الدار ذکر نہیں کیا جاتا۔

---

(۱) صحیح مسلم ۱/۳۵۷ باب صوم یوم عاشورآء، جامع ترمذی ۱/۱۵۸ کتاب الصوم باب ماجاء فی الرخصۃ فی ترک صوم عاشوراء، سنن ابی داؤد ۱/۳۳۸ باب صوم یوم عاشورآء، مؤطاامام مالک کتاب الصوم باب صیام یوم عاشورآء(۲۴۰)، السنن الکبریٰ للبیھقی ۴/۲۸۸ کتاب الصوم باب من زعم ان صوم عاشوراء کان واجباً ثم نسخ وجوبہ.(مختار)

قریش کے نزدیک صوم عاشوراء کی اہمیت: یصوم قریش فی الجاهلية، قریش جاہلیت کے زمانے میں یہ روزہ کیوں رکھتے تھے۔شراح نے لکھا ہے کہ چونکہ حضرت نوحؑ یا حضرت ابراہیم علیہ السلام کی شریعتوں میں یہ روزہ فرض تھا۔اس لئے وہ ان کی اتباع میں اس روزہ کو واجب سمجھتے تھے۔حضرت نوحؑ کی کشتی اس روز کنارے پر لگی تھی اور ابراہیمؑ کی ولادت بھی اسی روز ہوئی تھی۔علاوہ ازیں دس محرم کو قریش خانہ کعبہ کے غلاف پوشی کرتے تھے۔اس وجہ سے بھی یہ دن ان کے ہاں معظم تھا۔ایک روایت میں مذکور ہے کہ حضرت عکرمہؓ سے کسی نے اس روزہ کے بارے میں دریافت کیا تو آپؓ نے کہا کہ قریش سے جاہلیت میں ایک گناہ سرزد ہوا تھا جس کا ان کو شدت سے احساس ہوا۔کسی نے ان سے کہا کہ اگر عاشورے کا روزہ رکھ لو تو یہ گناہ معاف ہو جائے گا۔چنانچہ انہوں نے یہ روزہ رکھنا شروع کر دیا اور یہ بھی ممکن ہے کہ انہوں نے یہود کی اتباع میں اس دن کو اہمیت دی ہو۔

دس محرم کے یادگار واقعات: حضرت نوحؑ کی کشتی کے نجات اور ابراہیمؑ کی ولادت کے علاوہ یہ دن اور بھی بہت سے واقعات کی وجہ سے یادگار دن ہے۔چنانچہ حضرت آدمؑ کے توبہ کی قبولیت، موسیٰؑ کی فرعون سے نجات اور فرعون کی غرقابی، عیسیٰؑ کی ولادت اور رفع آسمانی، یونسؑ کی مچھلی کے پیٹ سے نجات، حضرت یوسفؑ کا کنویں سے نکلنا، حضرت ایوبؑ کی صحتیابی، حضرت ادریسؑ کا آسمان پر اٹھایا جانا، حضرت سلیمانؑ کا حکومت پر فائز ہونا اور دیگر بہت سے عظیم واقعات اسی دن ظہور پذیر ہوئے۔کہا جاتا ہے کہ اس دن وحشی جانور بھی روزہ رکھتے ہیں۔ واللہ اعلم،

یہود کے ہاں اس دن کی عظمت: قریش کے اس اہتمام کے علاوہ یہود بھی اس دن کا بہت زیادہ احترام کرتے تھے۔چنانچہ بخاری ومسلم دونوں میں آیا ہے کہ جب نبی کریم ﷺ ہجرت کر کے مدینہ تشریف لائے تو یہود کے بارے میں علم ہوا کہ وہ عاشورے کا روزہ رکھتے ہیں۔آپ ﷺ نے ان سے اس کی وجہ پوچھی۔تو انہوں نے بتایا کہ چونکہ اسی دن موسیٰؑ کو فرعون سے نجات ملی تھی اور فرعون غرق ہوا تھا۔لہٰذا موسیٰؑ نے بطور شکر یہ روزہ رکھا تھا۔ہم بھی اپنے پیغمبر کی پیروی میں یہ روزہ رکھتے ہیں۔تو آپ ﷺ نے فرمایا ''نحن احق بموسیٰ منکم ''یعنی ہم لوگ موسیٰؑ کی اتباع کے تم سے زیادہ مستحق ہیں۔چنانچہ

آپ ﷺ نے یہ روزہ رکھا اور امت کو بھی اس کا حکم دیا۔

فرضیت رمضان سے قبل اور بعد میں صوم عاشور کی نوعیت: کان رمضان هو الفريضة، یعنی اس کے بعد فرضیت صوم رمضان میں منحصر ہوگئی اس جملے سے یہ بات بخوبی معلوم ہوجاتی ہے کہ رمضان کی فرضیت سے قبل عاشورے کے روزے کو وجوب کا مقام حاصل تھا اور یہی احناف کا مسلک ہے جبکہ جمہور شوافع کہتے ہیں کہ عاشورے کا روزہ نہ پہلے واجب تھا نہ بعد میں۔ بلکہ پہلے تاکید کے ساتھ مستحب تھا بعد میں استحباب باقی رہا تاکید جاتی رہی، لیکن خود علامہ ابن حجرؒ نے اس رائے کی تردید کی ہے اور کئی قرآئن سے یہ ثابت کیا ہے کہ عاشورے کا روزہ واجب تھا۔ فرضیت رمضان کے بعد وجوب منسوخ ہوکر صرف استحباب مؤکد باقی رہا۔ وجوب کے درج ذیل دلائل کی طرف انہوں نے اشارہ کیا ہے۔

۱) آپ ﷺ سے اس کا امر ثابت ہے جیسا کہ زیر نظر حدیث میں آیا ہے۔

۲) تاکید کے لئے آپ ﷺ نے اس کا اعلان بھی فرمایا جیسا کہ مسلم کی حدیث میں حضرت سلمہ بن الاکوعؓ سے مروی ہے۔

۳) جولوگ یہ روزہ نہ رکھ سکے۔ ان کے لئے بھی اعلان فرمایا کہ شام تک امساک کریں کھانا پینا چھوڑ دیں۔

۴) ماؤں کو حکم دیا کہ وہ بچوں کو دودھ نہ پلائیں۔

۵) حضرت عائشہؓ اور ابن عباس سے روایت ہے کہ رمضان کی فرضیت کے بعد عاشورے کا روزہ چھوڑ دیا گیا اور چونکہ استحباب تو ترک نہیں ہوا بلکہ وفات تک آپ ﷺ نے اس کا اہتمام فرمایا۔ تو یہ دلیل ہے اس بات کی کہ ترک وجوب کا ہوا، نہ کہ استحباب کا۔

متابعت یہود کے وجوہات: شیخین کی جس حدیث کا ذکر ہم نے کیا ہے کہ نبی کریم ﷺ نے یہود سے پوچھ کر اس روزے کو اپنایا تھا۔ اس پر بظاہر یہ اشکال ہوتا ہے کہ نبی کریم ﷺ نے یہود کی متابعت کیوں فرمائی تو اس کے متعدد جواب دیئے گئے ہیں۔

اول یہ کہ نبی کریم ﷺ نے یہود میں سے مسلمان ہونے والوں سے یہ بات دریافت کی ہوگی نہ کہ کافر یہودیوں سے۔

دوم ممکن ہے کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ان یہود کی تصدیق نازل ہونے کے بعد اس روزے کا حکم مستقل نازل ہوا ہو۔

سوم یہ خبر سن کر آپ ﷺ نے اجتہاد کیا ہو اور سبب التزام اجتہاد ہی ہو نہ کہ اتباع یہود۔

چہارم یہ کہ عاشورے کا روزہ بجائے خود ایک مستحسن امر اور انبیائے سابقین کی روایت رہی تھی۔ آپ ﷺ نے یہود کی اتباع نہیں کی بلکہ انبیاء اور بالخصوص موسیٰ کی تقلید کی تھی اور اس خبر ملنے سے پہلے کی تھی حدیث مذکور کے الفاظ اس بات پر شاہد ہیں۔ چنانچہ آپ ﷺ نے فرمایا "نحن أحق بموسیٰؑ منکم" البتہ جو روزہ آپ ﷺ پہلے سے رکھتے تھے اتفاقاً یہود بھی رکھتے تھے۔ جس کا علم آپ ﷺ کو بعد میں ہوا۔

پنجم یہ کہ آپ ﷺ نے یہود کے استیلاف اور اسلام کی طرف رغبت دلانے کی خاطر ان سے موافقت کا ظاہری قول کیا ہو تا کہ وہ نبی کریم ﷺ کے قریب آنے سے نہ کترائیں لیکن جب وہ اپنی شرارتوں سے باز نہ آئے تو آپ ﷺ نے ان کی مخالفت اور تباعد کا فیصلہ فرمایا اور اخیر عمر میں ان کے ساتھ عبادات میں مشابہت بھی ناگوار رہا۔

بلکہ ایک حدیث میں یہود کے عدم اتباع کا عندیہ ہی آپ ﷺ سے مروی ہے چنانچہ آپ ﷺ نے فرمایا کہ اگر میں آئندہ سال زندہ رہا تو نو (۹) محرم کا روزہ بھی دس محرم کے ساتھ رکھوں گا۔ اور ایک حدیث میں لوگوں کو بھی حکم دیا ہے کہ یہود کی مخالفت کرو اور دسویں کے ساتھ نویں یا گیارھویں کا روزہ رکھا کرو۔

(۱۳) حدّثنا محمّدبن بشّار ثناعبدالرحمان بن مهديّ ثناسفيان عن منصورعن إبراهيم عن علقمة قال سالت عائشة أكان رسول اللهﷺ يخصّ من الأيّام شيئاقالت كان عمله ديمةً وايّكم يطيق ماكان رسول الله ﷺ يطيق(۱).

---

(۱)صحيح بخارى ۱/۲۶۷ كتاب الصوم باب هل يخصّ شيئاً من الايّام، صحيح مسلم ۱/۲۶۶ باب فضيلة العمل الدائم من صيام الليل، سنن ابى داؤد كتاب الصلوٰة باب ما يؤمر به القصد فى الصلوٰة ۱/۲۰۱ كتاب الصلوٰة باب مايؤمر به من القصة فى الصلوٰة.(مختار)

ترجمہ: حضرت علقمہؒ کہتے ہیں کہ میں نے حضرت عائشہؓ سے پوچھا کہ کیا حضور اقدس ﷺ بعض ایام کو عبادت کیلئے مخصوص فرمایا کرتے تھے؟ تو حضرت عائشہؓ نے فرمایا کہ (نہیں) نبی کریم ﷺ کا عمل دائمی ہوتا تھا اور تم میں سے کون اس عمل کی طاقت رکھتا ہے جس (عمل کی) حضور ﷺ طاقت رکھتے تھے۔

اعمال میں دوام واستقامت: **کان عملهُ دیمةً**، دیمۃ دوام سے فِعلةٌ کا صیغہ ہے۔اصل میں سردیوں میں آرام سے مسلسل برسنے والی بارش کو کہتے ہیں جو عموماً دن یا رات کے ایک تہائی حصے پر محیط ہوتا ہے بلکہ ملاعلی قاریؒ نے لکھا ہے کہ یہ اس کی کم از کم مقدار ہے۔علامہ ابن اثیر نہایہ میں لکھتے ہیں "**هو المطر الدائم فی السکون**(۱)"

یہاں آپ ﷺ کے مسلسل عمل کو اس قسم کی بارش سے تشبیہ کے طور پر دیمہ کہا ہے یعنی آپ کا عمل برسات کی موسلادھار بارش کی طرح نہیں تھا جو کہ گرج چمک کے ساتھ تھوڑی دیر برس کر تھم جاتی ہے بلکہ مسلسل برسنے والی بارش کی مانند غیر منقطع سلسلہ ہوتا تھا۔حدیث کا مطلب یہ ہے کہ آپ ﷺ روزہ رکھنے کیلئے ہفتے کے دنوں میں سے کسی دن کی تخصیص نہیں فرماتے تھے یہ مطلب نہیں کہ سال کے دنوں میں جن ایام کو ایک گونہ شرف حاصل ہے ان کا بھی لحاظ نہیں رکھتے تھے کیونکہ عرفہ کے دن اور عاشورے کی تخصیص روایات میں مصرّح ہے۔یا یہ مطلب ہے کہ ماہوار روزوں کا جو معمول تھا۔ان کے لئے آپ ﷺ ایام بیض کو مخصوص نہیں کرتے تھے۔

بلکہ کبھی مہینے کی ابتداء اور کبھی آخر میں بھی تین روزے رکھتے تھے۔لیکن حدیث کے الفاظ میں تعمیم ہے گویا آپ ﷺ کا تمام عبادات میں یہی طرز عمل تھا کہ ان پر دوام اور استقامت کے ساتھ عمل کرتے تھے۔

(۱۴) حدّثنا هارون بن إسحاق عن عبدة عن هشام بن عروة عن ابیه عن عائشة قالت دخل علیّ رسول اللّٰه ﷺ وعندی امرأةٌ فقال من هٰذه قلت فلانة لاتنام اللیل فقال رسول اللّٰه ﷺ علیکم من الأعمال

---

(۱)نهایة لابن الاثیر ج ۲ ص ۴۶۵

ماتطیقون فواللّٰہ لایملّ حتیّ تملّوا وکان أحبّ ذلک إلی رسول اللّٰہ ﷺ الذی یدوم علیہ صاحبہ(۱)۔

ترجمہ: حضرت عائشہؓ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ میرے پاس تشریف لائے اس حال میں کہ میرے پاس ایک خاتون بیٹھی ہوئی تھیں آپ ﷺ نے دریافت فرمایا کہ یہ کون ہے؟ میں نے کہا یہ فلاں عورت ہے جو رات بھر نہیں سوتیں (عبادت کرتی ہیں) آپ ﷺ نے فرمایا کہ تم نفل اعمال کو اتنا کرو جتنا تحمل ہو سکے خدا کی قسم اللہ تعالیٰ ثواب دینے سے کبھی تنگ نہیں آئے گا حتی کہ تم خود تنگ آجاؤ گے۔

وعندی امرأۃ ، اس عورت کا نام حولاء بنت تویت بن حبیب بن اسد بن عبدالعزی ہے۔ام المؤمنین حضرت خدیجہؓ کے قبیلہ سے تعلق ہے۔ بخاری اور مسلم دونوں نے اس کی تعین کی ہے۔ یہ نہایت پرہیز گار خاتون تھیں عبادت میں انہاک غایت درجہ کا تھا۔ بخاریؒ نے کتاب الایمان ج۱ص۱۱پر بھی حضرت عائشہؓ کی یہ حدیث ذکر کی ہے۔

<u>اللہ کے لئے لفظ ملال کے اطلاق کا مطلب:</u> **فواللّٰہ لایملّ حتّی تملّوا**، یہ ملال سے ہے جو کہ ''**استثقال الشیٔ ونفور النفس عنہ بعد محبۃ**'' یعنی کسی چیز میں رغبت کے بعد بے رغبتی اور دل تنگی کا نام ہے **لایملّ** کا فاعل مقدر ہے۔ یعنی **لایملّ اللّٰہ حتّی تملّوا**، اس جملے کا صریحی معنی تو یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اس وقت تک تنگ نہیں آتا جب تک تم تنگ نہ آؤ۔ لیکن اس ترجمے میں ایک اشکال ہے کہ حتیٰ کا تقاضا تو یہ ہے کہ بندہ کے تنگ آنے کے بعد اللہ تعالیٰ تنگ آجاتے ہیں حالانکہ ملال، استثقال اور تنگی اللہ تعالیٰ کے حق میں متعذر ومحال ہے۔ اس لئے بعض حضرات نے تو یہاں یہ جواب دیا ہے کہ یہ صرف مشاکلت اور مشابہت پر مبنی ہے اور بندہ کے ملال کے بعد اللہ تعالیٰ کے ثواب نہ دینے کو ملال سے تعبیر کیا گیا ہے۔

---

(۱)صحیح بخاری کتاب التھجد باب مایکرہ من التشدید فی العبادۃ ۱/۱۵۴،صحیح مسلم ۱/۲۶۷ باب فضیلۃ العمل الدائمن من قیام اللیل وغیرہ والامر بالاقتصاد فی لعبادۃ وھوان یاخذ منھا مایطیق الخ،السنن الکبریٰ للبیھقی ۳/۱۷ کتاب الصلوٰۃ باب القصد فی العبادۃ والجھد فی المداومۃ(مختار)

جیسے نسوا اللّٰہ فنسی ھم میں ہے۔جبکہ بعض شراح نے کہا ہے کہ حتیٰ واو کے معنی میں ہے پھر معنی یہ ہوگا کہ اللہ تعالیٰ تنگ نہیں آتے اور تم تنگ آجاؤ گے جبکہ بعض شراح نے اسے حین کے معنی میں لیا ہے یعنی اللہ تعالیٰ اس وقت بھی تنگ نہیں آتے جب تم تنگ آجاتے ہو۔اور ایک بہتر توجیہ یہ ہے کہ لایمّل کا معنیٰ ''لایقطع فضله و ثوابه'' سے ہونا چاہئے۔یعنی اللہ تعالیٰ تم کو نیک عمل کا ثواب اس وقت تک دیتا ہے جب تم اس کو رغبت سے کرتے رہو اور اگر تم ملول ہو کر بے دلی سے کرو گے تو فضل الٰہی متوجہ نہیں رہے گا۔اس جملے میں خطاب عام مومنین کو ہے۔اس لئے جمع مذکر کا صیغہ لایا ہے اور اگر چہ بظاہر عورتیں ہی حاضر مجلس ہیں لیکن حکم چونکہ عام ہے۔لہٰذا مومنین کو مومنات پر تغلیب دی ہے۔

وکان احبّ ذالک الخ، صحابہ کرام کو عبادت سے بے انتہا محبت تھی۔اس لئے کئی صحابہ اس میں حد سے زیادہ غلو کر جاتے تھے جس کو عموماً نبھانا مشکل ہو جاتا ہے۔اس لئے نبی کریم ﷺ ایسی عبادت کو پسند نہیں فرماتے تھے۔امام بخاریؒ نے اس تحقق کی ممانعت میں بہت سی ابواب منعقد کی ہیں۔فلیراجع الیه(۱).

---

(۱) بخاری شریف ج۱ص ۶۶۳،۶۶۴،۶۶۵،۶۶۶،

اسی ممانعت کی طرح اللہ تعالیٰ نے نصاریٰ کی مذمت کرتے ہوئے فرمایا ''ورھبانية ابتدعوها فمارعوها حقّ رعايته '' علامہ مناوی رحمہ اللہ کہتے ہیں۔اعلم انّ الناس فی العبادة علی طبقات اعلاها وأسناها طريقة المصطفیٰ ﷺ هذه المشار اليها بقوله "كنت لاتشاء الخ" ونفس الانسان هی دابة التی يسير عليها الی ربّه فمنهم من قام لدابته لماتحتاجه من علف وسقی واصلح عنانها بالمعروف واستعملها فيما هوبصدره وهوالتوسل بهاعلی الصراط المستقيم إلیٰ اللّٰه تعالیٰ، وهذه أعلیٰ المنازل، ومنهم من أجاعها فما أسرع أن يهلک. ومنهم من رفعها فعلفها أحسن علف فاوردها أعذب موردو جلّلها بانواع الزينة وقطع أوقاته فی خدمتها فهذابينه وبين الوصول حجاب وقدطردعن الباب ومنهم من انقطع عن العبادة واعطی نفسه شهواتها وقضیٰ بذالک مراده تعس خادم الحمارتعس عبدالدرهم والدينار والهدیٰ كله فی أتباع طريق المصطفیٰ ﷺ التی هی اوسط الطرق واعدلها وافضلها.(۱۲ مناوی علی هامش جمع الوسائلج ۲ ص۱۱۸)(اصلاح الدين)

(۱۵) حدّثنا أبو هشام محمّد بن يزيد الرفاعّی ثنا ابن فضيل عن الأعمش عن أبی صالح قال سالت عائشة و امّ سلمة أیّ العمل كان احبّ إلی رسول اللّٰه ﷺ قالتا ما ديم عليه و ان قلّ(۱).

ترجمہ: حضرت ابوصالحؒ کہتے ہیں کہ میں نے حضرت عائشہؓ اور ام سلمہؓ سے پوچھا کہ نبی کریم ﷺ کو کونسا عمل زیادہ پسند ہوتا تھا۔ دونوں نے فرمایا کہ وہ عمل جس کو ہمیشہ کیا جائے اگر چہ وہ تھوڑا کیوں نہ ہو زیادہ پسند ہوتا تھا۔

ما ديم عليه ان قلّ، گزشتہ دونوں حدیثوں اور زیر نظر حدیث میں اگر چہ روزے کا ذکر نہیں ہے لیکن چونکہ روزہ بھی ایک عمل ہے۔ اس لئے اس کا حکم بھی اس سے معلوم ہوتا ہے کہ نفل روزوں کو بھی اس حد تک رکھا جائے جس حد تک نبھایا جا سکے۔

(۱۶) حدّثنا محمّد بن إسماعيل ثنا عبداللّٰه بن صالح ثنی معاوية ابن صالح عن عمرو بن قيس أنّه سمع عاصم بن حميد قال سمعت عوف ابن مالک يقول كنت مع رسول اللّٰه ﷺ ليلة فاستاک ثمّ توضّأ ثمّ قام يصلّی فَقُمْتُ معه فبدأ فاستفتح البقرة فلايَمَرُّ بآية رحمة إلاّ وقف فسال ولايمُرُّ بآية عذاب إلاّ وقف فتعوّذ ثمّ ركع فمكث راكعاً بقدر قيامه ويقول فی ركوعه سبحان ذی الجبروت والملكوت والكبرياء والعظمة ثمّ سجد بقدر ركوعه ويقول فی سجوده سبحان ذی الجبروت والملكوت والكبرياء والعظمة ثمّ قرأ آل عمران ثم سورة سورة يفعل مثل ذلک(۲).

(۱) مسند احمد ۶/۲۸۹، مصنف عبدالرزاق رقم الحديث ۱۰۹۴، سنن ابن ماجه رقم حديث ۱۲۲۵

(۲) سنن ابی داؤد ۱/۱۳۴ كتاب الصلوٰة باب مايقول الرجل فی ركوعه و سجوده، مسند احمد ۶/۲۴ (مختار)

ترجمہ: عوف بن مالکؓ کہتے ہیں کہ میں ایک رات کو نبی کریم ﷺ کے پاس تھا حضور اقدس ﷺ نے مسواک فرمائی پھر وضو فرمایا پھر نماز پڑھنے کھڑے ہو گئے۔ میں بھی ساتھ (نیت باندھ کر) کھڑا ہو گیا۔ آپ ﷺ نے (نماز میں) سورۃ بقرہ شروع فرمائی پڑھتے ہوئے کسی بھی رحمت والی آیت پر گزرتے تو آپ ﷺ ٹھہر جاتے اور (رحمت کی) دعا فرماتے اور کسی بھی عذاب والی آیت پر گزرتے تو آپ ﷺ ٹھہر جاتے اور (عذاب سے) پناہ مانگتے تھے۔ پھر آپ ﷺ رکوع میں چلے گئے اور قیام کے مقدار آپ ﷺ رکوع میں ٹھہرے رہے۔ رکوع میں ''سبحان ذی الجبروت والملکوت والکبریاء والعظمۃ'' (باربار) پڑھتے رہے۔ پھر رکوع کے بقدر سجدہ کیا اور سجدے میں بھی ''سبحان ذی الملکوت والجبروت والکبریاء والعظمۃ'' پڑھتے رہے۔ پھر (دوسری رکعت میں) آپ ﷺ نے سورۃ آل عمران پڑھی۔ پھر (اگلی دو رکعتوں میں) ایک ایک سورۃ پڑھی۔ (رکوع اور سجدے میں بھی) وہی عمل کرتے رہے۔

عوف بن مالکؓ: ابو عبدالرحمٰن یا ابو محمد عوف بن مالک بن ابی عوفؓ کا تعلق اشجع قبیلے سے تھا مؤرخین کے مطابق فتح مکہ کے دن اپنے قبیلے کا جھنڈا انہی کے پاس تھا ۷ھ میں اسلام سے مشرف ہوئے۔ نبی کریم ﷺ نے ان کے اور حضرت ابوالدرداءؓ کے درمیان مواخاۃ قائم کی تھی۔ نبی کریم ﷺ کی وفات کے بعد حمص یا دمشق میں رہتے تھے۔ اور وہیں ۷۳ھ میں عبدالملک کے زمانے میں وفات پائی۔ آپؓ بہت غیور تھے ایک یہودی کی اس لئے خوب پٹائی کردی کہ اس نے ایک مسلمان عورت سے چھیڑ چھاڑ کی تھی۔ حضرت عمرؓ شام تشریف لائے تو اس یہودی نے شکایت کردی ان کو بہت غصہ آیا۔ لیکن تفتیش کی تو یہودی واقعی مجرم ٹھہرا۔ چنانچہ حضرت عوف بن مالکؓ کو کچھ نہ کہا۔ الٹا یہودی کو یہ کہتے ہی پھانسی دیدی کہ ہم نے ایسی حرکتوں کیلئے تم لوگوں سے صلح نہیں کی تھی۔

الاوّقف وتعوّذ، نماز کے اندر طلب رحمت اور پناہ طلبی پر اشکال کا جواب دیتے ہوئے علامہ حنفیؒ

نے کہا ہے کہ شاید یہ منسوخ ہو چکا ہے۔یا پھر یہ نبی کریم ﷺ کی خصوصیت ہوگی لیکن ملا علی قاریؒ کہتے ہیں یہ دونوں احتمال ضعیف ہیں۔ بلکہ چونکہ یہ نفل کا واقعہ ہے۔اور نفل میں ایسا کرنے میں کوئی حرج نہیں ہے فرض میں ممانعت ہے اور وہ یہاں مراد نہیں۔

ثم قرء آل عمران ثم سورة سورة ، یعنی "**ثم قرء فی الثالثه سورة وفی الرابعة سورةً**" باب العبادۃ میں مذکور حضرت حذیفہؓ کی روایت میں تصریح ہے کہ تیسری رکعت میں سورۃ نساء اور چوتھی میں مائدہ کی قراءت فرمائی **یفعل مثل ذالک** یعنی جس طرح پہلی رکعت میں طویل رکوع، قومہ اور طویل سجدہ کیا تھا اگلی رکعت میں وہی طریقہ اختیار کیا یونہی آپ آیۃ رحمت کے وقت سوال اور آیت وعید کے وقت تعوذ بھی کرتے رہے۔

<u>حدیث طول قراءۃ کا ترجمۃ الباب سے مناسبت:</u> اس حدیث کی مناسبت بظاہر معلوم نہیں ہوتی۔ اس وجہ سے علامہ قسطلانیؒ نے تو یہ کہہ دیا کہ یہ حدیث ناسخوں کی غلطی کی وجہ سے اس باب میں لایا گیا ہے۔دراصل یہ حدیث باب العبادۃ یا باب صلوٰۃ التطوع میں لانی چاہیے تھی بعض شراح نے یہ جواب دیا ہے کہ دراصل صحیح معنوں میں باب صلوٰۃ الضحٰی، باب التطوع اور باب الصوم کے عنوانات سرے سے موجود نہیں بلکہ ان ابواب کی تمام احادیث مشترکہ طور پر باب العبادۃ کے عنوان کے تحت ہیں اگر یہ درست ہو پھر تو سرے سے اشکال ہی نہیں ہے۔

جبکہ بعض شراح نے اس حدیث کی مناسبت یوں بیان کی ہے کہ گزشتہ احادیث میں عبادت میں اعتدال اور عدم غلو کا ذکر کیا گیا ہے تاکہ عبادت سے ملال پیدا نہ ہو۔اب اخیر میں یہ بیان فرماتے ہیں کہ شوق کے غلبہ کی وجہ سے کبھی کبھی اعتدال سے بھی بڑھ کر عبادت میں مبالغہ ہو جائے تو شدت اشتیاق کی وجہ سے یہ مذموم نہیں ہے۔ہاں اس قسم کے غلو کا التزام اس لئے درست نہیں ہے کہ اسے نبھانا کارے دارد۔

خلاصۂ باب

اس باب میں دراصل آپ ﷺ کے نفل روزوں کا ذکر مقصود ہے جبکہ ضمناً آپ ﷺ کی دیگر عبادات میں طرزِ عمل کا ذکر ہے۔ حتیٰ کہ فرض روزوں بلکہ نماز وغیرہ میں بھی اعتدال کا بیان ہے۔

آپ ﷺ نے رمضان کے بغیر کسی بھی مہینے کے سارے روزے نہیں رکھے اور نہ یہ کہ خود روزوں پر مداومت نہیں فرمائی۔ بلکہ امت کو بھی ایسے روزوں سے منع فرمایا۔ یہی معاملہ آپ ﷺ نے شب بیداری کے حق میں بھی برتا۔ ساری رات قیام سے آپ ﷺ منع فرمایا کرتے تھے۔ البتہ آپ ﷺ سال کے بعض ایام کے روزوں کا دیگر ایام کی نسبت زیادہ اہتمام فرماتے تھے جن میں شعبان کا مہینہ اور عاشورے کا دن قابل ذکر ہے۔ علاوہ ازیں ایام بیض اور مہینے کے اول اور آخر کو بھی دیگر ایام کی نسبت زیادہ اہمیت دی جاتی ہے۔

پھر جو عبادات بشمول روزہ آپ ﷺ شروع فرماتے تھے۔ تو اس پر دوام آپ ﷺ کو محبوب ہوتا تھا۔ حتیٰ کہ کسی عذر کی وجہ سے اگر روزہ چھوٹ جاتا تو اس کی قضاء کا بھی اہتمام فرماتے تھے۔

۴۴. باب ماجاء فی قرأة رسول اللّٰہ ﷺ

حضور اقدس ﷺ کی قرآن پاک پڑھنے کی کیفیت کا بیان

اس باب میں نبی کریم ﷺ کی قرآن پڑھنے کی کیفیت کا بیان ہے کہ آپ ﷺ کس انداز سے قرآن کریم پڑھتے تھے۔ باب میں آٹھ حدیثیں ذکر کی گئی ہیں۔

(۱) حدثنا قتیبة بن سعید ثنا اللیث بن شهاب عن ابن أبی ملکیة عن یعلی ابن مملک أنّه سال امّ سلمة عن قراء ة رسول اللّٰہ ﷺ فاذاھی تنعت قراء ة مفسّرة حرفا حرفا(۱).

ترجمہ: حضرت یعلیٰ بن مملک کہتے ہیں کہ انہوں نے حضرت ام سلمہؓ سے نبی کریم ﷺ کی قرأۃ کے بارے میں پوچھا تو وہ آپ ﷺ کی قرأۃ مفسّر یعنی ایک ایک حرف جدا جدا کر کے بیان کرنے لگیں۔

<u>ایک ایک حرف ادا کر کے پڑھنا:</u> **فإذاھی تنعت**، یعنی حضرت ام سلمہؓ نے نبی کریم ﷺ کی قرأۃ کی نقل اتارتے ہوئے توضیح فرمائی۔ اور ایک ایک حرف کو صاف اور علیٰحدہ علیٰحدہ ادا کرنا شروع کردیا۔ اکثر شراح نے اس عملی تشریح کو اظہر کہا ہے۔ اگرچہ یہ احتمال بھی ہے کہ اُمّ سلمہؓ نے زبانی توضیح کی ہو، عملی نمونہ پیش نہ کیا ہو۔ لیکن اس باب کی تیسری حدیث میں پہلی صورت کا وضاحت کے ساتھ بیان ہے۔

(۲) حدّثنا محمّد بن بشّار ثنا وھب بن جریر ابن حازم ثنا ابی عن قتادة قال قلت لانس بن مالک کیف کان قراء ة رسول اللّٰہ ﷺ قال مدّاً(۲).

---

(۱) سنن ابی داؤد ۲۱۴/۱ کتاب الصلوٰة باب کیف یستحبُّ الترتیل فی القرأة، جامع ترمذی ۵۸۵/۲ ابواب فضائل القرآن باب ماجاء کیف کان قرأة النبیّ ﷺ، السنن الکبریٰ للنسائی ۲۲/۵ کتاب فضائل القرآن باب الترتیل، السنن الکبریٰ للبیهقی ۱۳/۳ کتاب الصلوٰة(مختار)

(۲) صحیح بخاری ۷۵۴/۲ کتاب فضائل القرآن باب مدالقرأة، سنن ابی داؤد ۲۱۳/۱ کتاب الصلوٰة باب کیف یستحب الترتیل فی القرأة ، سنن النسائی ۱۵۷/۱ کتاب الافتتاح باب مدّالصوت بالقرأة ، سنن ابن ماجة ص ۹۵ کتاب اقامة الصلوٰة والسنة فیها باب ماجاء فی القرأة فی صلوٰة اللیل، السنن الکبریٰ للبیهقی ۵۲/۲ کتاب الصلوٰة(مختار)

ترجمہ: حضرت قتادہؓ کہتے ہیں کہ میں نے حضرت انس بن مالکؓ سے پوچھا کہ نبی کریم ﷺ کی قرأۃ کیسی تھی؟ انہوں نے کہا کہ آپ (قرآن کی حروف مدکو) کھینچ کر پڑھتے تھے۔

حروف مدّہ کالحاظ: مَدّاً، یعنی کانت قراء ته ذات مدّ او المعنی یَمُدُّ حروف المدّمداً مطلب یہ ہے جن حروف کو کھینچنا ہوتا ان کو کھینچ کر پڑھتے تھے لیکن حروف مدّہ کی تطویل میں بھی اعتدال ہوتا۔لہٰذا وصل اور درج کلام میں مدّ ایک الف سے زیادہ نہ ہو۔اور وقف کی صورت میں مدّ دو الف یا زیادہ سے زیادہ تین الف(۱) ہو۔تفصیل کیلئے قرأ حضرات اوران کی کتب سے مراجعت ضروری ہے۔

(۳) حدّثنا علّی بن حجر ثنا یحیٰی بن سعید الاموی عن ابن جریج عن ابن أبی ملیکة عن امّ سلمةؓ قالت کان النبیّ ﷺ یقطع قراء ته یقول الحمدللّٰه رب العٰلمین ثمّ یقف ثمّ یقول الرحمٰن الرحیم ثمّ یقف و کان یقرأ مالک یوم الدین(۲).

وقفوں کے ساتھ قراءت:

ترجمہ: حضرت ام سلمہؓ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ قرآن قطعہ قطعہ کرکے پڑھتے تھے (اس طرح کہ) الحمدللّٰه ربّ العالمین پڑھتے پھر وقف کر لیتے تھے۔پھر الرحمان الرحیم کہتے پڑھ کر ٹھر جاتے تھے اور (اگلی آیت میں اسم فاعل کے صیغے سے) مالک یوم الدین پڑھتے تھے۔

عن ابن أبی ملیکة الخ، اس حدیث کو امام ترمذی نے جامع ترمذی میں روایت کیا ہے لیکن وہاں یہ کہا ہے کہ یہ حدیث منقطع ہے کیونکہ اسی روایت کو ابن ابی ملیکہؒ دوسری سند کے ساتھ روایت کرتے

(۱) وامّاماابتدعه قرّاء زماننا حتّی ائمة صلواتنا انّهم یزیدون علی المدّالطبعی الی ان یصل قدر الفان واکثرور بّمایقصرون المدّالواجب فلامدّاللّٰه فی عُمُرهم ولا امدّفی امرهم قاله القاریؒ،

(۲) سنن ابی داؤد ۲۱۴/۱ کتاب الحروف القراء ت، جامع ترمذی ۵۸۶/۲ ابواب القراء ت عن رسول اللّٰه ﷺ باب فی فاتحة الکتاب، مصنف ابن ابی شیبة ۵۲۰/۲، کتاب الصلوٰة سنن دارقطنی ۳۰۷/۱ (مختار)

ہیں۔لیکن یعلی بن مملکؒ کے واسطے سے نہ کہ بلاواسطہ،لہٰذا بلاواسطہ روایت کرنا ایک راوی یعلیؒ کو چھوڑ دینا ہے لیکن شراح حدیث امام ترمذیؒ کی اس بات سے اتفاق نہیں کرتے کیونکہ ابن ابی ملیکہؒ مشہور تابعی ہیں۔ کم ازکم تیس صحابہ سے ملاقات ہوچکی ہے(۱)، اُم سلمہؓ کے ساتھ ملاقات کی خود انہوں نے تصریح بھی کردی ہے۔اسی وجہ سے یہ احتمال بہت قوی ہے کہ اس حدیث کو ابن ابی ملکیۃ نے پہلی بار یعلی بن مملکؒ کے واسطے سے سنا ہوگا پھر خود ام سلمہؓ سے سن لیا ہوگا۔ چنانچہ وہ کبھی اسے بالواسطہ روایت کرتے ہیں اور کبھی بلاواسطہ حضرت ام سلمہؓ سے نقل کرتے ہیں۔اس لئے زیر نظر حدیث منقطع نہیں ہے۔

یقول الحمدللّٰہ الخ،سورۃ فاتحہ کے بیان میں بسم اللہ نہ پڑھنا اور الحمدللہ سے ابتدا کرنا ہم احناف کے مذہب کیلئے تائید ہے۔کہ بسم اللہ سورۃ فاتحہ کا جزء نہیں ہے۔

ثم یقف الخ، جب آیت تام ہو لیکن مابعد کا کلام اس سے متعلق ہو جیسا کہ الرحمان الرحیم ماقبل کیلئے صفت ہے تو اس صورت میں آیت پر وقف اولیٰ ہے یا وصل؟

علامہ سجاوندیؒ اور جمہور نے اول الذکر کو افضل اور علامہ جزریؒ نے موخر الذکر کو اولیٰ قرار دیا ہے لیکن جواز وقف میں شک نہیں ہونا چاہیے کیونکہ اس جگہ خود نبی کریم ﷺ سے ہر آیت پر وقف مروی ہے اور آپ ﷺ سے زیادہ بہتر قراءۃ کسی کی نہیں ہوسکتی۔

<u>**مالک اور ملک کی قراءت:**</u> **وکان یقراء ملک یوم الدین**، حضرت ام سلمہؓ یہاں پر ''ملک'' کے تلفظ کا ذکر کرنا چاہتی ہیں کہ نبی کریم ﷺ مالک اسم فاعل یا ملک صفۃ مشبہ کے صیغہ سے پڑھتے تھے۔ اگرچہ دونوں قراتیں متواتر ہیں۔اول الذکر کا معنی مالک اور موخر الذکر کا معنی بادشاہ ہوتا ہے لیکن ام سلمہؓ کی اس روایت میں کس طرح ادا کیا گیا ہے۔اس میں کُتب حدیث کا اختلاف ہے۔امام ابوداؤدؒ، امام احمدؒ، امام بیہقیؒ،اور شمائل کے اس نسخہ میں مالک یعنی میم کے بعد الف سے روایت کیا گیا ہے۔جبکہ امام ترمذیؒ نے جامع ترمذی میں اور امام حاکمؒ نے اس لفظ کو ام سلمہؓ کی اس روایت میں الف کے بغیر یعنی ملک بمعنی بادشاہ روایت کیا ہے۔

---

(۱)قال ابن أبی ملیکۃ ادرکت ثلاثین من اصحاب النبیّ ﷺ کلھم یخافہ النفاق علی نفسہ الخ(بخاری ج ۱ ص ۱۲)(مختار)

(۴)حدّثناقتيبة بن سعيدثنااللیث عن معاوية بن صالح عن عبداللّٰه ابن أبی قيس قال سألت عاشئة عن قراء ة النبیّ ﷺ أكان يسّربالقراء ة ام يجهر قالت كل ذلك قدكان يفعل رُبّمااسرّوربّما جهر قلت الحمدللّٰه الذی جعل فی الامرسعة(۱).

ترجمہ: عبداللہ بن ابی قیسؓ کہتے ہیں کہ میں نے حضرت عائشہؓ سے نبی کریم ﷺ کی قراءۃ کے بارے میں پوچھا کہ آپ قرآن آہستہ پڑھتے تھے یا جہراً۔تو آپؓ نے فرمایا کہ دونوں طرح پڑھتے تھے۔کبھی آہستہ پڑھتے تھےاور کبھی زور سے۔میں نے کہا کہ اللہ تعالیٰ کاشکر ہے جس نے اس سلسلے میں (بھی) سہولت فرمائی ہے۔

<u>قراءۃ جہراًاورسراًمیں اعتدال:</u> سألت عن قراء ة النّبیّ ﷺ الخ،جامع ترمذی میں ابواب الوتر سے تھوڑا پہلے اسی حدیث کوامام ترمذیؒ نے روایت کیا ہے۔وہاں یہ تصریح ہے کہ عبداللہ ابن ابی قیسؒ نے سوال صلوٰۃ اللیل یعنی تہجد کی نماز میں قراءۃ کے بارے میں کیا تھا۔اور تہجد میں دونوں قسم کی قراءۃ جائز ہے بمقتضائے حال کبھی آہستہ پڑھنا بہتر ہوگا اور کبھی جہراًاولیٰ ہوگا۔مثلاً اگرسونے والوں یادوسری عبادت کرنے والوں یا مریض وغیرہ کو تکلیف ہوتو سراً بہتر ہے۔اوراگرآدمی تنہا ہواورنشاط اوراستحضار پیدا کرنا مطلوب ہوتو جہراًاولیٰ ہوگا۔البتہ اعتدال کا التزام ضروری ہے۔چنانچہ حضرت ابوبکرصدیقؓ آہستہ قراءۃ فرمایا کرتے تھے جبکہ حضرت عمرؓ جہراً قرأۃ فرماتے تھے۔آپ ﷺ نے دونوں کے موقف کے بارے میں پوچھااور پھر دونوں کواعتدال کاحکم دیاابوبکرؓکوذراجہر سےاورعمرؓکوتھوڑاآہستہ پڑھنے کاارشادفرمایا۔

(۵) حدّثنامحمودبن غيلان ثناوكيع ثنا مسعرعن أبی العلاء العبدیّ عن يحيیٰ ابن جعدة عن امّ هانی قالت كنت اسمع قراء ة

---

(۱)صحیح مسلم ۱/۱۴۴كتاب الحيض باب جوازنوم الجنب واستحباب الوضوٴله الخ، سنن ابی داؤد ۱/۲۱۰كتاب الصلوٰة باب فی وقت الوتر، جامع ترمذی ۱/۲۱۲كتاب الصلوٰة باب ماجاء فی قرأةالليل ، السنن الكبریٰ للبیهقی ۳/۱۲(مختار)

النبیّ ﷺ باللیل و اناعلی عریشی(۱).

ترجمہ: حضرت ام ہانی سے روایت ہے کہ میں نبی کریم ﷺ کی قراءت رات کے وقت سنتی تھی اس حالت میں کہ میں اپنی چارپائی پر لیٹی ہوتی تھی۔

عریش: **وانا علی عریشی الخ** ،عریش مکان کی چھت،تخت یا چارپائی،انگور کے پودے چڑھانے کیلئے جنگلے اور **کلُّ مایُستظل بہ** یعنی سایہ دار چھپر یا کچے چھت پر بولا جاتا ہے۔یہاں پر ملاعلی قاریؒ نے سریر یعنی چارپائی سے ترجمہ کیا ہے۔اور بعض شراح نے مکان کی چھت کا معنی لیا ہے۔ابوداودؒ نسائیؒ اور ابن ماجہؒ کی روایت میں ''**کنت أسمع و أنا نائمة علی فراش** ''کے الفاظ ہیں جو پہلے ترجمہ کی تائید کرتی ہیں۔یہ مکہ کا واقعہ ہے جب آپ ﷺ حرم میں نماز پڑھتے تھے حضرت ام ہانیؓ کا گھر حرم سے متصل تھا۔

(۲) حدثنا محمود بن غیلان ثنا أبو داود أنبانا شعبة عن معاویة ابن قرّة قال سمعت عبد اللّٰہ بن مغفّل یقول رأیت النبیّ ﷺ علی ناقته یوم الفتح و هو یقرأ انّا فتحنا لک فتحا مبینا لیغفر لک اللّٰہ ما تقدّم من ذنبک و ما تأخّر قال فقرأ و رجّع قال و قال معاویة ابن قرّة لو لا ان یجتمع النّاس علیّ لاخذت لکم فی ذلک الصوت و قال اللحن(۲).

ترجمہ: عبداللہ بن مغفلؓ فرماتے ہیں کہ میں نے فتح مکہ کے دن نبی کریم ﷺ کو اپنی اونٹنی پر سوار اس حالت میں دیکھا کہ آپ ﷺ ''**إنّا فتحنا لک فتحاً مبیناً**

---

(۱) سنن ابن ماجة ۹۶ کتاب اقامة الصلوٰة و السنة فیها باب ماجاء فی صلوٰة اللیل، مصنف ابن ابی شیبة ۱/۳۶۰،شرح السنة للبغوی ۴/۳۰ باب کیف القرأة باللیل رقم الحدیث ۹۱۸، (مختار)

(۲) صحیح بخاری ۲/۶۱۴ کتاب المغازی باب این رکز النبی ﷺ، صحیح مسلم کتاب صلوٰة المسافرین و قصرها باب ذکر قرأة النبی ﷺ، سنن ابی داؤد ۱/۲۱۴ کتاب الصلوٰة باب کیف یستحب الترتیل فی القرأة مصنف ابن ابی شیبة ۲/۴۷۸ کتاب الصلوٰة، السنن الکبریٰ للنسائی ۵/۲۲ کتاب فضائل القرآن باب الترجیح الخ(مختار)

لیغفرلک اللّٰہ ماتقدّم من ذنبک وماتاخّر ''پڑھ رہے تھے۔حضرت عبداللہ بن مغفّل کہتے ہیں کہ آپ ﷺ نے یہ سورۃ ترجیع کے ساتھ پڑھی۔معاویہ بن قرۃؓ (حضرت عبداللہ کے شاگرد) کہتے ہیں کہ اگرلوگوں کے مجھ پر جمع ہونے کا خوف نہ ہوتا تو میں اسی آواز اور لہجے میں تمہارے سامنے پڑھنے لگ جاتا۔

عبداللّٰہ بن مغفلؓ : ان کی کنیت ابوسعید، ابوعبدالرحمان یاابوزیادتھی۔مزنی صحابی ہیں بیعت رضوان میں حاضر تھےغزوہ تبوک میں تنگدستی کی وجہ سے شریک نہ ہوسکے۔جس کی وجہ سے رویا کرتے تھے اور''تولّوا واعینھم تفیض من الدّمع ''کے مصداق بنے۔حضرت عمرؓ نے نو دیگر صحابہ کی معیت میں ان کو بصرہ بھیجا تاکہ وہاں پرلوگوں کو دین کی تعلیم دے سکیں اور وہیں پر ۵۹ھ یا ۶۰ھ میں وفات پائی۔مرتے وقت وصیت فرمائی کہ میراجنازہ حضرت ابوبرزہ اسلمیؓ پڑھائیں۔چنانچہ وصیت کی تعمیل کی گئی۔رضی اللہ تعالیٰ عنہ

وھویقرء انّافتحناالخ، یہ آیت صلح حدیبیہ سے واپسی کے موقع پر نازل ہوچکی تھی لیکن فتح مکہ چونکہ صلح حدیبیہ سے وابستہ ہوچکی تھی اس لئے اس دن ان آیات کی تلاوت بہت مناسب تھی۔

مسئلہ ترجیع: وھویرجّع،ترجیع دراصل ردّ الصوت فی الحلق یعنی آواز کوحلق سے اتارچڑھاؤ کے ساتھ نکالنے کو کہتے ہیں اس کا ترجمہ تحسین الصوت سے بھی کیا جاتا ہےاور اشباع مدّ سے بھی۔کیونکہ جس تردید کا ہم ذکر کرچکے ہیں اس کے ساتھ تحسین اوراشباع آہی جاتا ہے لیکن عبداللہ بن مغفلؓ سے اس مقام پرخود ہی ترجیع کی صورت منقول ہے۔وہ کہتے ہیں کہ آپ ﷺ آ آ آ کرتے ہوئے پڑھتے تھے۔اب یہاں ترجیع سے مراد کیا ہے اورآیا آپ ﷺ بالقصد ترجیع کرتے تھے یااضطراری طور پرآپ ﷺ سے یہ صادر ہوا تھا۔اس سلسلہ میں شراح کے اقوال مختلف ہیں۔بعض حضرات نے اسے ایک اختیاری عمل قراردیا ہے اور تحسین الصوت کا معنی لیا ہے۔یعنی آپ ﷺ قصداً قرآن کو خوبصورت آواز میں پڑھا کرتے تھے۔

خوش آوازی سے پڑھنا: دوسرے احادیث میں اس عمل کو بیان بھی کیا گیا ہے۔چنانچہ ارشاد ہے

"زیّنوا القران باصواتکم" یعنی قرآن کوخوش آوازی سے پڑھ کرمزین کرو۔"لکلّ شی حلیة وحلیة القرآن حسن الصوت "یعنی ہر چیز کاایک زیور ہوتا ہےاور قرآن کا زیور خوبصورت آواز ہے۔ بلکہ فرمایا"لیس منّامن لم یتغنّ بالقرآن "یعنی جس نے قرآن کوخوش آوازی سے نہ پڑھا وہ ہم میں سے نہیں ۔حضرت ابوموسیٰؓ قرآن خوش آوازی سے پڑھتے تو آپ فرماتے"لقد اوتیت مزماراً من مزامیر اٰل داؤد" تجھے تو داودی خوش آوازی بخشی گئی ہے۔

اور ظاہر ہے کہ نبی کریم ﷺ فتح مکہ کے روز انتہائی خوش اور بڑی نشاط کی حالت میں تھے۔ایسی حالت میں ان آیات کا جذب وکیف کے ساتھ پڑھنا مزید خوش الحانی کا سبب بنتا تھا۔

<u>غیراختیاری ترجیع:</u> لیکن دوسری طرف بعض شراح نے یہ بھی ذکر کیا ہے کہ نبی کریم ﷺ کی جس ترجیع کا یہاں ذکر ہے وہ اضطراری تھا۔چونکہ آپ ﷺ اونٹنی پرسوار تھے اور وہ مسلسل حرکت میں تھی زمین ناہموار تھی۔نشیب وفراز کے وجہ سے اونٹنی کے ہچکولے کھانے کی وجہ سے آپ کی آواز نہ سنبھل سکی۔اور جہاں کوئی مدّ ہ آتا وہاں آ آ آ کی آواز نکل جاتی تھی۔علامہ ابن الاثیرؒ نے اس رائے کواختیار فرمایا ہے۔ جہاں تک عبداللہ بن مغفل کی طرف سے اس کی توضیح آ آ آ کے ساتھ منقول ہے۔تو محض حکایت اور نبی کریم ﷺ کے آواز کی تصویر ہے نہ یہ کہ اس طرح بالاختیار کرنا قابل تقلید عمل ہے۔

لولاان یجتمع الناس علیّ، یہ معاویہ بن قرّہ کا کلام ہے۔عبداللہ بن مغفّل سے ترجیع کی نقل سننے کے بعد انہوں نے یہ بات کہہ دی۔یعنی اگر لوگوں کے اجتماع کا خوف نہ ہوتا تو میں اس آواز کی توضیح کیلئے اس قراءۃ کی نقل اتار دیتا۔لیکن ڈر ہے کہ میری آواز سن کر کچھ لوگ فتنہ اور معصیت کا شکار ہونگے۔ مثلاً کوئی نبی کریم ﷺ کی اس ہیت کومنکر سمجھے یا استہزاء کرے تو مفتون ہوگا۔کوئی اس کی بے جاتقلید کرنے لگے تو منکر کا شکار ہوگا۔اور ہوسکتا ہے کہ ازدحام کی وجہ سے کچھ لوگوں کو تکلیف ہو۔

بہر حال اس سے یہ حکم بھی واضح ہوجاتا ہے کہ جگہ جگہ مجمع لگانا۔اور ہر بات کومجمع میں سنانا قرین مصلحت نہیں ہے۔ جہاں تک تلاوت قرآن پاک کی بات ہے تو اسے طبعی تحسین کے ساتھ بے تکلف اورآداب کے ساتھ پڑھنا مستحسن ہے۔لیکن تکلف کے ساتھ قوالوں،نعت خوانوں اور گویوں کی سُروں سے

پڑھناناجائز ہے۔

(۷) حدّثناقتیبة بن سعید ثانوح بن قیس الحدّانیّ عن حسام ابن مصکّ عن قتادة قال مابعث اللّٰہ نبیّاً إلّا حسن الوجه حسن الصوت وکان نبیّکمﷺحسن الوجه حسن الصوت وکان لایرجع(۱).

ترجمہ: حضرت قتادہؓ کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے کوئی بھی نبی مبعوث نہیں فرمایا جوخوبرواورخوش گلونہ ہو۔ اورتمہارا نبیﷺ بھی خوبرواورخوش آواز تھے (مگر) آپﷺ ترجیع نہیں کرتے تھے۔

قتادة ، ابوخطاب حضرت قتادہ بن دعامہ سدوسیؒ مشہور تابعی ہیں۔ کہتے ہیں کہ مادرزادنابینا تھے۔ بکر بن عبداللہ مزنی کہتے ہیں کہ ان سے زیادہ حافظے والا ہمارے علم میں نہیں ہے۔ وہ خود کہتے ہیں کہ میری کان نے جوسنا محفوظ کرلیا ۱۱۰ھ کے بعدوفات پائی۔

یہ حدیث حضرت قتادہ پر مقطوع ہے۔ علاوہ ازیں حسام بن مصک راوی بھی ضعیف بلکہ بقول طبرانیؒ متروک راوی ہیں اوران کی زیرنظر حدیث منکر حدیث ہے۔

<u>تعارض روایات ترجیع:</u> کان لایرجع، گزشتہ حدیث سے یہ حدیث متعارض ہے چنانچہ بعض علماء نے اس حدیث کوضعیف قرار دیکر گزشتہ حدیث کواس پر ترجیح دی ہے۔ بعض نے یہ جواب دیا ہے کہ یہاں بالقصد ترجیع کی نفی ہے جبکہ گزشتہ حدیث میں غیراختیاری ترجیع کا ذکر ہے۔ بعض نے یہ کہا ہے کہ آپﷺ گویّوں جیسے ترجیع نہیں کرتے تھے جبکہ تحسین الصوت تو جائز بلکہ مندوب ہے۔ گزشتہ حدیث میں متأخرالذکر معنی مراد ہے۔ یا ترتیل کے معنی میں ہے۔ علامہ بیجوریؒ نے یہ بھی کہا ہے کہ ممکن ہے کہ آپﷺ بعض اوقات میں ترجیع کرتے ہوں۔ جس کا ذکر گزشتہ حدیث میں ہوا ہے اور بالعموم نہ کرتے ہوں۔

(۸) حدّثناعبداللّٰہ بن عبدالرحمان ثنایحییٰ بن حسان ثناعبدالرحمان بن أبی الزنادعن عمروبن أبی عمروعن عکرمة عن

---

(۱)فتح الباری۷/۲۱۰

ابن عبّاس قال کان قرأۃ النبیّ ﷺ ربّما یسمعها من فی الحجرة وهو فی البیت(۱).

ترجمہ: حضرت عبداللہ بن عباسؓ کہتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ کی قراءۃ کبھی کبھی صحن میں موجود لوگ سن سکتے تھے جبکہ آپ کمرے کے اندر ہوتے تھے۔

یسمعها من فی الحجرة وهو فی البیت، حجرہ دراصل مکان محجور یعنی پتھروں سے محصور جگہ کو کہتے ہیں یوں اس کا اطلاق صحن پر بھی ہوسکتا ہے اور خود کمرے پر بھی اگر اول الذکر مراد ہو تو معنی یہ ہوگا کہ کمرہ میں قراءۃ کرتے ہوئے آپ زور سے قرآن پڑھتے۔ لیکن اتنا کہ صرف صحن میں سننا ممکن ہوتا تھا اس سے آگے نہیں سنا جا سکتا تھا۔ اور اگر موخر الذکر معنی مراد ہو تو پھر مراد یہ ہوگی کہ آپ کمرے کے اندر آہستہ آہستہ تلاوت فرماتے تھے یہاں تک کہ آپ ﷺ کی آواز کمرے سے باہر نہ نکلتی تھی البتہ کمرے کے اندر کبھی سنائی جانے لگتی۔

قراۃ بلند آواز سے ہو یا آہستہ حدیث نمبر۴ میں اس بارے میں کلام ہو چکا ہے۔

---

(۱) سنن ابی داؤد ۱/۱۹۴ کتاب الصلوٰۃ باب فی رفع الصوم بالقرأۃ فی الصلوٰۃ اللیل، السنن الکبریٰ للبیهقی ۳/۱۰ کتاب الصلوٰۃ، شرح السنة ۴/۲۹ باب کیف قرأۃ باللیل رقم الحدیث ۹۱۷، مسنداحمد ۱/۲۷۱(مختار)

خلاصۂ باب

اس باب میں نبی کریم ﷺ کی قراءت کا بیان ہے مجموعی طور پر روایات باب سے آپ ﷺ کی قراءت میں درج ذیل خوبیاں ظاہر ہورہی ہیں:

۱) آپ ﷺ مسلسل پڑھنے کی بجائے وقفوں کے ساتھ یعنی ٹھہر ٹھہر کر قرآن پڑھتے تھے۔

۲) حروف مدّہ کو آپ ﷺ کھینچ کر پڑھتے تھے۔

۳) جہر واخفاء میں آپ ﷺ اعتدال سے کام لیتے تھے جہر کرتے بھی تھے لیکن اتنا زور سے بھی نہیں پڑھتے تھے کہ دوسروں کو نا گوار گزرے۔

۴) خوش آوازی کے ساتھ پڑھتے تھے اور اصول وضوابط کے ساتھ حدود کے اندر رہ کر خوش آوازی سے پڑھنے کو پسند بھی فرماتے تھے۔

۵) حدود کے اندر ترجیع کو جائز سمجھتے تھے لیکن اختیاری طور اس سے کتراتے تھے۔

ایک حدیث میں آپ ﷺ نے خداوند کریم جلّ جلالہ کے دربار میں ایک انتہائی قابل توجہ بات یہ بتلائی کہ نبی خوش آوازی کے ساتھ کلام الٰہی کی قراءت کرے۔ چنانچہ فرمایا ''ماأذنَ اللّٰہ لشیٔ ماأذِن لنبیّ یتغنیّ بالقرآن'' (متفق علیہ)

یعنی اللہ تعالیٰ کے ہاں تمام باتوں سے زیادہ توجہ نبی کی خوش الحانی کے ساتھ کلام الٰہی کی تلاوت پر ہے۔ البتہ موسیقی کی لے میں قرآن پڑھنا مکروہ تحریمی ہے اور اگر تغیر کلمات کو مفضی ہو تو حرام ہے۔

۴۵. باب بکاء النبی ﷺ

نبی کریم ﷺ کے رونے کا بیان

بکاء بکی یبکی کا مصدر ہے۔ یہ بکا الف مقصورہ کے ساتھ بھی آتا ہے۔ اور بکاء الف ممدودہ کے ساتھ بھی مستعمل ہے۔ ملا علی قاریؒ اور علامہ مناویؒ دونوں میں فرق کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ الف مقصورہ کے ساتھ یہ ''**خروج الدمع مع الحزن**'' یعنی غم کی وجہ سے آنسو بہنے میں مستعمل ہے۔ جبکہ الف ممدودہ کے ساتھ بلند آواز کے ساتھ رونے کو کہتے ہیں۔ صاحب قاموس نے دونوں کو برابر سمجھا ہے۔ جبکہ بعض لوگوں نے یہ فرق بتایا ہے کہ اگر آواز غالب ہو تو الف ممدودہ اور اگر حزن غالب ہو تو الف مقصورہ استعمال ہوتا ہے۔

رونے کی دس قسمیں:

علامہ بیجوریؒ وغیرہ شراح نے رونے کی دس قسمیں لکھی ہیں۔ جس کی تفصیل کچھ یوں ہے۔

(۱) کسی پر رحم اور شفقت کی وجہ سے رونا۔ جیسے ماں بچے کی تکلیف پر روتی ہے۔

(۲) خوف وخشیۃ یعنی کسی کے ڈر کے وجہ سے رونا۔ مثلاً خوفِ خدا اور توبہ کے وقت کا رونا۔

(۳) محبت اور اشتیاق کا رونا۔ جیسے ابراہیمؑ اور نبی اکرم ﷺ کا بعض مواقع پر رونا۔

(۴) خوشی کا رونا۔ یہ انتہائی درجہ خوشی کے موقعہ پر ہوتا ہے۔

(۵) بے صبری کا رونا۔ جیسے مریض درد کی برداشت سے عاجز ہو کر روتا ہے۔

(۶) غم کی وجہ سے جیسے عزیزوں کی موت پر عموماً رویا جائے۔

(۷) بکاء مستعار جیسے عورتیں کبھی کبھی دوسروں کے لئے روتی ہیں۔

(۸) اجرت ومزدوری کے لئے رونا۔ جیسے پیشہ ور نائحات نوحہ کرتے وقت کمائی کے لئے روتی تھیں۔

(۹) موافقت کا رونا۔ جیسے بغیر سبب معلوم کئے کسی اور کو روتا ہوا دیکھ کر کبھی رویا جاتا ہے۔

(۱۰) بکاء کذب۔ جب کوئی گناہ گار گناہ پر مصر بھی ہو اور اس پر روئے بھی تو اسے جھوٹا رونا کہا جاتا ہے۔

اسے بکاء نفاق بھی کہتے ہیں۔

(۱) حدّثنا سوید بن نصر أناعبداللّٰه بن المبارک عن حمّاد بن سلمة عن ثابت عن مطرف و هو ابن عبداللّٰه بن الشّخّیر عن أبیه قال أتیت رسول اللّٰه ﷺ وهو یصلّی ولجوفه ازیز کازیز المرجل من البکاء(۱).

ترجمہ: عبداللہ بن الشخیرؓ کہتے ہیں کہ میں نبی اکرم ﷺ کے پاس آیا۔آپ ﷺ نماز پڑھ رہے تھے۔رونے کی وجہ سے آپ ﷺ کے سینے سے ایسی آواز نکل رہی تھی جیسے ہانڈی کے جوش کے وقت نکلتی ہے۔

عبداللّٰه بن الشخیرؓ، عبداللہ بن عوف بن کعب قبیلۂ قریش سے تھے۔بنو عامر بن صعصعہ کی شاخ سے ان کا تعلق ہے۔اس لئے ان کو عامری کہتے ہیں۔بصرہ میں سکونت پذیر تھے۔فتح مکہ کے بعد مسلمان ہوئے۔ان کے دو بیٹے مطرف اور یزید فضلاء تابعین میں سے ہیں۔امام بخاریؒ کے سوا دیگر اصحاب صحاح نے ان سے احادیث روایت کی ہیں۔

ازیز اور مرجل کے معنی: **ولجوفه ازیز الخ،** ازیز جوش کو بھی کہتے ہیں اور جوش کے وقت نکلنے والی آواز کو بھی کہتے ہیں۔یہاں دونوں مراد ہو سکتے ہیں۔

کازیز المرجل، مرجل کے متعلق اہل لغت کا اختلاف ہے۔بعض کا خیال ہے کہ پیتل کی ہانڈی کو کہتے ہیں۔بعض کا خیال پتھر اور بعض کے ہاں لوہے سے بنی ہانڈی کو کہتے ہیں۔لیکن علامہ ابن حجر عسقلانیؒ کے ہاں یہ مطلقاً ہانڈی کو کہتے ہیں(۲)۔

مطلب یہ ہے کہ آپ کے سینے سے جو ہچکیاں اٹھتی تھیں۔ان کی آواز ابلتے ہانڈی کی آواز جیسی

---

(۱)سنن ابی داؤد ۱/۱۳۷ کتاب الصلوٰة باب البکاء فی الصلوٰة، صحیح ابن حزیمه رقم حدیث ۹۰۰،صحیح ابن حبان رقم حدیث ۵۲۲، السنن الکبریٰ للبیهقی ۲/۲۵۱،شرح السنة رقم حدیث ۷۲۹ (۲)اور اس کو مرجل اس لئے کہا جاتا ہے لانه إذا نصب فکانه أقیم علی رجلین(المواهب اللدنیة ۲۳۲)

تھی۔آپ ﷺ کوخوف وخشیۃ (۱) کی یہ کیفیت سیدنا ابراہیمؑ سے وراثت میں ملی تھی۔ان کے بارے میں منقول ہے کہ ان کی سینے کے جوش کی آواز ایک میل تک سنائی دیتی تھی (۲)۔اور اسی وجہ سے ان کو اوّاہ کہا گیا ہے۔

یہ بھی ممکن ہے کہ یہ رونا شوق اور محبت کی وجہ سے ہو۔کیونکہ اللہ تعالیٰ کا عشق،شوق،وصال اور وفور تعلق آپ ﷺ کے ہاں انتہائی درجہ میں تھا۔

وجداورخوف کی حالت: شراح لکھتے ہیں کہ آپ ﷺ پر وجداورخوف کی یہ حالت تب طاری ہوتی تھی۔جب مناجات کے موقع پر آپ ﷺ پر صفات جلال کے ساتھ صفات جمال کی تجلّی ہوتی تھی۔ورنہ صرف صفات جلال کی برداشت تو کسی کے بس کی بات ہی نہیں۔اور صرف صفات جمال کی تجلّی کے موقع پر آپ ﷺ پر سرور وانبساط اور نورانیت کا انتہائی پرکشش مظاہرہ ہونے لگتا تھا۔اور اس وجہ سے اہل سلوک خوف ورجا اور جمال وجلال کے بین بین چلنے کی ترغیب دیا کرتے ہیں۔

(۲) حدثنا محمود بن غیلان ثنا معاویة بن هشام ثنا سفیان عن الأعمش عن إبراهیم عن عبیدة عن عبداللّٰه بن مسعود قال قال لی رسول اللّٰه ﷺ اقرأ علیّ فقلت یارسول اللّٰه ﷺ أقرأ علیک وعلیک انزل قال إنّی أحبُّ ان أسمعه من غیری فقرأت سورة النسآء حتّیٰ بلغت وجئنابک علیٰ هؤلاء شهیداً قال فرأیت عینی النبی ﷺ تهملان(۳).

---

(۱)اس لئے رسول اللہ ﷺ اللہ تعالیٰ سے یہ دعا مانگتے تھے اللّٰهمّ إنّی أسئلک قلباً خاشعاً اور دوسری روایت میں ہے أعوذبک من قلب لاتخشع(الحدیث) رسول اللہ ﷺ کے رونے کے بارے میں لکھتے ہیں وکان بکاءہ صلّی اللّٰه علیه وسلم تارة رحمة للامت وتارة خوفاً علی أمّته وتارة من خشیة اللّٰه وتارة عندسماع القرآن الخ(المناوی علی هامش جمع الوسائل ۲/۱۴۴)(مختار)

(۲)جمع الوسائل ج۲ص۱۴۴

(۳)صحیح بخاری ۲/۶۵۹ کتاب التفسیر سورة النساء باب کیف اذاجئنابک علی هولاء شهیداً، سنن ابی داؤد ۲/۱۵۹ کتاب العلم باب فی قصص،سنن ابن ماجة ص ۳۰۹ کتاب الذهد باب الحزان البکاء ، السنن الکبریٰ للبیهقی ۱۰/۲۳۱(مختار)

ترجمہ: عبداللہ بن مسعودؓ کہتے ہیں کہ نبی اکرم ﷺ نے مجھے حکم دیا کہ مجھے قرآن سناؤ۔ میں نے عرض کیا کہ یارسول اللہ ﷺ میں قرآن مجید آپ کو کس لئے سناؤں حالانکہ قرآن آپ ﷺ پرنازل ہوا ہے۔ نبی اکرم ﷺ نے فرمایا کہ ہاں میں چاہتاہوں کہ کسی اور سے سنوں۔ میں نے سورۃ النساء کی تلاوت شروع کی۔ یہاں تک کہ میں اس آیت پر پہنچا وجئنابک علیٰ ھٰؤلاء شھیدا، تو میں نے نبی اکرم ﷺ کی آنکھوں سے آنسو بہتے ہوئے دیکھے۔

<u>کسی اور سے قرآن سننے کے فوائد:</u> اقـرأ عـلـیّ، بخاری شریف اور مسلم شریف کی روایت میں تصریح ہے کہ اس وقت آپ ﷺ ممبر پر جلوہ افروز تھے جب ابن مسعودؓ کو قرآن سنانے کا حکم دیا تھا۔

أقـرءُ عـلیک وعلیک انزل، یعنی قرآن اترا ہی آپ پر ہے۔اب اس کا علم ہم سے زیادہ آپ ہی کو ہے۔تو میری قرأت آپ پر بے فائدہ، خلاف حکمت اور خلاف ادب معلوم ہوتی ہے۔

أحـبّ ان أسمعه من غیری (۱)، کسی اور سے سننے میں چونکہ کچھ خاص فوائد ہیں۔اس لئے آپ ﷺ نے اس کا تقاضا کیا۔

مثلاً اول یہی ہے کہ سنتے سنتے قرآن میں خوب تدبر اور معانی ومفاہیم پر یکسو ہوکر سوچا جاسکتا ہے۔ جو کہ خود قرآن پڑھنے کے وقت نہیں ہوسکتا۔ کیونکہ قاری الفاظ کی تصحیح اور اپنے حافظہ کی طرف توجہ میں مشغول ہوتا ہے۔

دوم یہ کہ نبی اکرم ﷺ کو جبرئیلؑ سے قرآن سننے کی عادت پڑ گئی تھی اور عادت طبعی طور پر مرغوب ہوتی ہے۔

سوم یہ کہ امت کو قرآن سننے سنانے کی اہمیت معلوم ہوجائے اور تنبیہ ہو کہ عرض القرآن یعنی قرآن مجید کا دور ایک سنت عمل ہے۔

---

(۱)اس روایت سے یہ مسئلہ مستنبط ہوتا ہے کہ کسی فاضل کا مفضول سے استفادہ میں استنکار نہیں کرنی چاہئے۔اسلاف میں روایت الاکـابـر عـن الاصاغر کی بہت ساری مثالیں ہیں۔اس لئے علامہ بیجوریؒ نے لکھا ہے فـقـد کان کثیراً من السلف یستفیدون من طلبتھم (المواھب الدنیة ۲۳۲)

آپ ﷺ کا گواہوں کا گواہ بننے کے شدت احساس سے رونا: اس دن لوگوں کا کیاحال ہوگا جس دن ہر پیغمبراوراس کی امت کوحاضر کیا جائے گا۔اوران کا نبی ان پر یہ گواہی دے گا کہ انہوں نے میری دعوت کوقبول کیا تھا یا نہیں۔

دوسرے نبیوں کی طرح نبی اکرم ﷺ بھی اپنی امت کے لئے گواہ ہونگے۔

حضرت تھانویؒ اس آیت کے خلاصۂ تفسیر میں فرماتے ہیں:

سواس وقت بھی کیا حال ہوگا جبکہ ہر امت میں سے ایک ایک گواہ کوحاضر کریں گے۔اور آپ کو ان لوگوں پر(جن کا آپ سے سابقہ ہوا ہے) گواہی دینے کے لئے حاضر فرمائیں گے(یعنی جن لوگوں نے خدائی احکام دنیا میں نہ مانے ہوں گے) ان کے مقدمہ کی پیشی کے وقت بطور سرکاری گواہ کے انبیاء علیہم السلام کے بیانات سنے جائیں گے۔ جو جو معاملات انبیاء کی موجودگی میں پیش آئے تھے۔ سب ظاہر کردیں گے۔اس شہادت کے بعد ان مخالفین پر جرم ثابت ہوکر سزا دی جائے گی۔

(اگلی آیت میں اس حال کا ذکر ہے) چنانچہ فرمایا اس روز یہ حال ہوگا کہ جن لوگوں نے کفر کیا ہوگا۔اور رسول اللہ ﷺ کی نافرمانی کی ہوگی۔ وہ اس بات کی آرزو کریں گے کہ کاش ہم زمین کے پیوند ہوجائیں۔اور وہ اللہ تعالیٰ سے کسی بات کونہیں چھپائیں گے۔

فرأیت عینی رسول اللہ ﷺ، دوسری روایت میں ہے کہ آپ ﷺ نے حضرت ابن مسعودؓ کومزید قرأت سے منع فرمایا۔(**قال حسبک الان**) یعنی بس یہی کافی ہے(۱)۔دوسری طرف آپ رو رہے تھے۔(۲)

---

(۱)اس جملہ سے اس مسئلہ کا استنباط ہوتا ہے کہ مصلحت کے تحت تلاوت کلام پاک بند کرنے کو کہا جاسکتا ہے۔علامہ ملاعلی قاریؒ نے لکھا ہے **فیہ جواز امر السامع للقاری بقطع القرأۃ اذا عرض لہ امر**(**جمع الوسائل ۱۴۶/۲**) اس کے علاوہ چونکہ صحیحین میں مذکور ہے کہ آنحضرت ﷺ منبر پر تشریف فرما تھے۔اس لئے علامہ مناویؒ اور ملاعلی قاریؒ نے فرمایا کہ اگر کوئی شخص منبر یا اونچی جگہ پر بیٹھا ہوتو وہ نیچے بیٹھنے والے کی تلاوت سُن سکتا ہے۔شرعاً اس میں کوئی قباحت نہیں۔(جمع الوسائل والمناوی علی حامش جمع الوسائل ۱۴۶/۲)(مختار)

(۲)علامہ نوویؒ نے لکھا ہے کہ تلاوت کلام پاک کے دوران رونا مستحب ہے۔ یہ عارفین کی علامت اور صالحین کی عادت ہے(کتاب الاذکار ص۹۰)(مختار)

استماعِ قرآن سے رونے کے اسباب: رونے کے متعدد اسباب بیان کئے گئے ہیں۔

(۱) اس وقت آپ استماعِ قرآن کی وجہ سے رونے لگے تھے اور قرآن مجید سنتے وقت رونا اہل اللہ کی شان ہے۔ جیسے ارشادِ ربّانی ہے کہ **اذاتتلی علیهم ایت الرحمٰن خرّوا سُجداً وبُکیا**. (جب ان پر رحمٰن کی آیتیں پڑھی جاتی ہےتو وہ زمین پر سجدہ کرتے ہوئے اور روتے ہوئے گر جاتے ہیں) (مریم ۵۸)

إنّ الذین اوتوا العلم من قبله اذایتلی علیهم یخرّون للاذقان سجّداًویقولون سجن ربنا ان کان وعدربنا لمفعولا ویخرّون للاذقان یبکون ویزیدهم خشوعاً. (الأسراء ۱۰۷ تا ۱۰۹)

(بیشک جن لوگوں کو اس سے پہلے کتاب دی گئی ہے جب ان پر کتاب اللہ پڑھی جاتی ہے۔ تو وہ ٹھوڑیوں کے بل گرتے ہیں۔ روتے ہوئے)

(۲) ممکن ہے کہ آپ ﷺ کا رونا محشر کے حالات کے تصور اور شدائد کے استحضار کی وجہ سے تھا۔ جن کا ان آیات میں ذکر ہے۔

(۳) بعض مفسرین کے نزدیک گواہی کی شدت کا احساس کر کے آپ روئے۔ کیونکہ یہ گواہی عظیم دربار میں ہوگی۔ دوسری طرف گواہی تمام امت پر ہے جن میں حاضر وغیر حاضر سب شامل ہیں۔

ایک حدیث میں آپ ﷺ سے یہی مروی ہے کہ اے اللہ جو لوگ میرے سامنے موجود نہیں ان پر کیسے گواہی دوں گا۔

(۴) یہ احتمال بھی ہے کہ گناہ گاروں کے حال پر شفقت کی وجہ سے آپ روئے تھے کیونکہ آپ ﷺ کی گواہی کی وجہ سے کچھ لوگ جہنم میں بھی جائیں گے۔

اور یہ رؤف اور رحیم پیغمبر کے لئے نا قابل برداشت ہے۔ اگر چہ اللہ کے حکم کی وجہ سے آپ گواہی بھی ضرور دیں گے۔

تنبیہ: نبی اکرم ﷺ اگر چہ سماعِ قرآن کے وقت روئے تھے لیکن جلد ہی آپ ﷺ نے ابن مسعودؓ کو تلاوت سے روکا۔ اس کی وجہ علماء نے یہ لکھی ہے کہ سماع کے وقت وجد اور انفعال کی کیفیت کبھی کبھی مقاصد میں آڑے آتی ہے۔

اس لئے آپ ﷺ نے امت کو یہ تعلیم دی کہ صبر اور برداشت اور وقار وسکون کا دامن ایسی حالت میں بھی نہ چھوٹے۔آپ کی یہی صفت اور یہی تعلیم ابوبکر صدیقؓ نے قبول کی تھی۔اور وفات نبوی کے موقعہ پر نہایت متانت اور صبر واستقامت کے ساتھ آپ ﷺ نے امت کو سنبھالا دیا۔مگر عمرؓ برداشت نہ کر سکے۔ فراقِ حبیب کے صدمہ کی وجہ سے ان کا برا حال ہو گیا تھا۔

(۳) حدّثناقتیبة ثناجریرٌ عن عطاء بن السائب عن أبیه عن عبداللّٰه ابن عمرو قال انکسفت الشّمس یوماً علی عهدرسول اللّٰه ﷺ فقام رسول اللّٰه ﷺ یصلّی (۱) حتّیٰ لم یکدان یرکع ثمّ رکع فلم یکدان یرفع راسه ثمّ رفع راسه فلم یکدان یسجد ثمّ سجدفلم یکدان یرفع رأسه فجعل ینفخ ویبکی ویقول ربّ الم تعدنی ان لا تعذّبهم وانافیهم ربّ الم تعدنی الاتعذبهم وهم یستغفرون ونحن نستغرک فلمّا صلّی رکعتین انجلت الشّمس فقام فحمداللّٰه تعالیٰ واثنی علیه ثمّ قال إنّ الشّمس والقمر اٰیتان من اٰیات اللّٰه فاذاانکسفافافزعواالی ذکراللّٰه تعالیٰ(۲).

ترجمہ: عبداللہ بن عمرو بن العاصؓ کہتے ہیں کہ نبی اکرم ﷺ کے زمانہ میں ایک دن سورج گرہن ہوا تو نبی اکرم ﷺ (مسجد میں) نماز پڑھنے کے لئے چلے گئے اور

---

(۱)صلوٰۃ کسوف کے حکم کے بارے میں علامہ بنوریؒ نے لکھا ہے ثم اختلف فی حکمها فالجمهور علی أنّها سنة مؤکدة ذهب مشائخ الحنفیة إلی وجوبهاونصّ به صاحب الأسرار وصرّح به أبوعوانة وعن مالک أنه أجراهامجری الجمعة وقیل فرض کفایة کذا فی العمدة واستبعد الأخیر(معارف السنن ۵/۲) جمہور کے نزدیک سنت مؤکدہ بعض کے نزدیک واجب،امام مالک نے جمعہ کی طرح فرمایا ہے جبکہ بعض کے نزدیک فرض کفایۃ ہے۔(مختار)

(۲)سنن ابی داؤد ۱/۱۷۶ کتاب الصلوٰة باب من قال یرکع رکعتین، مصنف ابن ابی شیبة ۲/۴۶۷، صحیح ابن حزیمة رقم حدیث ۱۳۷۹، المستدرک للحاکم ۱/۳۲۹(مختار)

نماز پڑھنا شروع کی۔اور اتنی دیر تک قیام کیا کہ قریب تھا کہ رکوع نہ کریں۔پھر رکوع میں (اتنی دیر لگادی کہ) قریب تھا کہ رکوع سے سر نہ اٹھائیں۔پھر سر اٹھا کر (اتنی دیر تک) کھڑے رہے کہ قریب تھا کہ سجدہ میں نہ جائیں۔پھر سجدہ میں جا کر (اتنی دیر تک) پڑے رہے کہ قریب تھا کہ سجدے سے سر نہ اٹھائیں۔پھر سجدے سے سر اٹھ کر (اتنی دیر تک) بیٹھے رہے کہ قریب تھا کہ دوسرے سجدے میں نہ جائیں۔پھر دوسرے سجدے میں جا کر (اتنی دیر تک) پڑے رہے کہ قریب تھا کہ سجدے سے سر نہ اٹھائیں۔(پھر اس طرح دوسری رکعت ادا کرنے کے بعد آخری سجدے میں) زور زور سے سانس لیتے رہے اور یہ کہتے ہوئے روتے رہے کہ اے میرے رب! کیا تم نے میرے ساتھ یہ وعدہ نہیں کیا تھا کہ میری موجودگی میں آپ میری امت کو عذاب نہ دوگے۔اے میرے رب! کیا آپ نے میرے ساتھ یہ وعدہ نہیں کیا تھا کہ آپ ان کو عذاب نہ دوگے جب تک وہ استغفار کرتے رہیں گے اور ہم سب کے سب استغفار کرتے رہے۔جب نبی اکرم ﷺ دو رکعات نماز سے فارغ ہوگئے (تو سورج گرہن ختم ہوکر) سورج روشن ہو چکا تھا۔اس کے بعد نبی اکرم ﷺ اٹھے اور اللہ تعالیٰ کی حمد وثنا کے بعد فرمایا کہ سورج اور چاند اللہ تعالیٰ کی نشانیوں میں سے دو نشانیاں ہیں جب ان (میں سے کسی ایک) پر گرہن آئے تو اللہ تعالیٰ کی طرف (پناہ لینے کے لئے) متوجہ ہو جایا کرو۔

<u>کسوف اور خسوف:</u> **انکسف الشمس الخ، کسفت الشمس** اور **انکسفت** دونوں کا استعمال درست ہے۔**فرّاء** نے **انکسف** کے استعمال کو غلط بتایا ہے۔لیکن حدیث میں استعمال کے بعد اسے غلط کہنا غلط معلوم ہوتا ہے۔البتہ اس میں اختلاف ضرور پایا جاتا ہے کہ کسوف اور خسوف میں کونسا لفظ سورج گرہن کے لئے اور کونسا چاند گرہن کے لئے استعمال ہوتا ہے۔ملا علی قاریؒ کہتے ہیں کہ لغت میں دونوں لفظ دونوں مفاہیم میں مستعمل ہوتے ہیں۔

علامہ ابن حجرؒ کہتے ہیں کہ فقہاء کے ہاں کسوف سورج اور خسوف چاند گرہن کے لئے استعمال ہوتا ہے۔ جوہریؒ نے اسے افصح اور بعض نے اسے متعین کہا ہے۔ قرآن مجید میں بھی خسف چاند کے لئے استعمال ہوا ہے (اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے **فاذابرق البصر وخسف القمر**) اور یہی استعمال سائنسی تحقیق سے زیادہ اقرب ہے۔ کیونکہ لغت میں خسف زمین میں دھنسنے کو کہتے ہیں۔ اور چاند گرہن کے وقت چاند پر زمین کا سایہ ہوتا ہے۔ جبکہ کسف چہرے پر کسی چیز کے پڑنے کو کہتے ہیں۔ اور سورج گرہن کے موقع پر سورج اور ہمارے درمیان چاند حائل ہوجاتا ہے جو سورج کے چہرے کو چھپا دیتا ہے۔ علامہ مناویؒ نے بھی اس تحقیق کو ذکر کیا ہے(۱)۔

ابراہیم کی وفات: **علیٰ عھد رسول اللہ ﷺ** ، یہ وہ دن تھا جب سیدنا ابراہیم بن رسول اللہ ﷺ کا وصال ہوا تھا۔ اس کی صحیح تاریخ کیا ہے۔ اس کے بارے میں اہل تاریخ کا اختلاف ہے۔ جمہور کا خیال ہے کہ ان کی وفات ربیع الاول ۱۰ھ میں ہوئی تھی۔ بعض نے رمضان ۱۰ھ کا ذکر کیا ہے۔ جبکہ بعض نے ذی الحجہ ۱۰ھ کا ذکر کیا ہے۔ لیکن مؤخر الذکر غلط ہے۔ کیونکہ ذی الحجہ ۱۰ھ میں نبی اکرم ﷺ مکہ میں تھے۔ جبکہ ابراہیم کی وفات بالاتفاق مدینہ میں ہوئی تھی۔ بعض حضرات نے سیدنا ابراہیم کی وفات ۹ھ کو اور امام نوویؒ نے سن حدیبیہ یعنی ۶ھ کو بھی ذکر کیا ہے(۲)۔

---

(۱) مناوی ج۲ ص۱۴۹

(۲) حضرت سیدنا ابراہیم بن النبی ﷺ کی تاریخ وفات میں ملا علی قاریؒ کی عبارات میں تفاوت پایا جاتا ہے۔ انہوں نے جمع الوسائل ج۲ ص۱۴۹ پر تمریض کے صیغے قیل سے ۹ھ کو تاریخ وفات بتلایا ہے لیکن چند صفحات بعد ص۱۵۵ پر لکھتے ہیں "**ولدت (ماریةؓ) ابراهيم في ذى الحجة سنة ثمان ومات وله سبعون يوما على خلاف فيه**" یعنی ابراہیم کی ولادت ذی الحجہ ۸ھ میں ہوئی اور ان کی وفات ستر دن بعد ہوئی۔ دوسری طرف مرقاۃ کے حوالے سے مشکوٰۃ کے حاشیہ پر منقول ہے کہ "ابراہیمؓ ذی الحجہ ۸ھ میں پیدا ہوئے اور چھ ماہ کی عمر میں وفات پائی جبکہ بعض نے اٹھارہ ماہ بعد (جمادی الثانی ۱۰ھ میں وفات پانے کا ذکر کیا ہے۔ اور بعض نے منگل دس ربیع الاول ۱۰ھ کو ان کی تاریخ وفات بتلائی ہے" **واللہ اعلم بالصواب . ۱۲** (اصلاح الدین) جبکہ ماہر فلکیات محمود پاشا نے زائچے اور جنتری سے حساب لگایا ہے۔ اس کے مطابق یہ واقعہ ۲۸ یا ۲۹ رشوال ۱۰ھ بمطابق ۲۷ جنوری ۶۳۲ء آٹھ بج کر تیس منٹ پر ہوا۔ (فتح الملہم ۲/۴۵۲) (مختار)

البتہ امام نوویؒ اور ملا علی قاریؒ نے اس پر محدثین کا اتفاق ذکر کیا ہے کہ صلوٰۃ کسوف آپ ﷺ نے صرف ایک بار مدینہ میں ادا کی تھی۔ صحیح ابن حبان میں روایت ہے کہ ۵ھ میں خسوف قمر ہوا تھا۔ اس میں بھی آپ ﷺ نے اور دیگر صحابہؓ نے نماز خسوف پڑھی تھی اور اس کو اسلام کا پہلا خسوف کہا گیا ہے۔

فلم یکن ان یسجد ثم سجد، یعنی طویل رکوع کے بعد طویل قومہ کیا اور سجدہ میں گئے۔ اس حدیث میں تصریح ہے کہ صرف ایک رکوع کرنے کے بعد آپ ﷺ نے سجدہ کیا تھا۔ یہ مسئلہ اختلافی ہے کہ صلوٰۃ کسوف میں ایک رکوع ہے یا متعدد بعض روایات میں متعدد رکوعات ذکر ہے۔ اور اس کو تعدد واقع پر محمول نہیں کیا جاتا ہے۔ کیونکہ مکہ میں نماز کسوف الشمس صرف ایک بار پڑھی جانے پر محدثین کا تقریباً اتفاق ہے۔ ہم پہلے ذکر کر چکے ہیں۔

<u>کسوف وخسوف کی حکمتیں:</u> اللہ تبارک وتعالیٰ سورج چاند ستاروں کو ایک نظام الاوقات کے تحت جاری رکھے ہوئے ہیں۔ ان میں ہمارے لئے عظیم فوائد رکھے ہیں۔ لیکن کبھی کبھی گرہن کی وجہ سے عارضی طور پر سورج کی روشنی اور کبھی چاند کی روشنی سے محروم کردیتے ہیں۔ اس معروضی حالت میں حکمت بندوں کو تنبیہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اس حالت کو مستمر کرنے پر قادر ہیں۔ اور اگر ان میں سے کسی بھی جرم کی روشنی پر مستقل پابندی لگ جائے تو یہ انسان کے لئے عظیم خسارے کا باعث ہے۔ جیسا کہ طبیعات کے ماہرین کا اس پر اتفاق ہے۔ چنانچہ سورج گرہن ایک عبرتناک تازیانہ ہے۔ آگے حدیث میں بھی اسے ''آیۃ'' کہہ کر تنبیہ کی گئی ہے۔

اب اگر گردش کے اصول اور طبعی اسباب گرہن کا سبب بن جائیں تو بھی اس کے علامت ہونے میں کوئی استبعاد نہیں۔ اور پھر بھی ان اجرام میں گرہن ایک عبرتناک نشانی ہے۔ کیونکہ اصل متصرف سے اغماض اور ماورائے اسباب علۃ کی تاثیر سے صرف نظر نامناسب بلکہ ناممکن ہے۔ جیسے رات دن کی تبدیلی میں اللہ تعالیٰ نے صراحتاً فرمایا ہے کہ یہ قدرت الٰہیہ کی نشانات ہیں۔

<u>صلوٰۃ کسوف وخسوف اور فقہاء کے آراء:</u> پھر کسوف وخسوف کے موقعہ پر کیا کرنا چاہئے۔ ہمارے نزدیک اگر نماز جمعہ کے شرائط موجود ہوں تو امام کے لئے دو رکعات نماز باجماعت پڑھنا سنت

مؤکدہ ہے۔اور اگر جمعہ کے شرائط موجود نہ ہوں تو لوگ انفرادی طور پر دو رکعات نماز پڑھیں۔البتہ یہ نماز عام نماز کی طرح ہوگی۔ ہر رکعت ایک رکوع اور دو سجدوں پر مشتمل ہوگی۔ یہی مذہب ابراہیم نخعیؒ، سفیان ثوریؒ، ابن ابی لیلیٰؒ، ابن زبیرؓ اور ابن عباسؓ سے بھی مروی ہے۔

لیکن ائمہ ثلاثہ کے نزدیک ہر رکعت میں دو دو رکوع اور دو دو سجدے ہوں گے۔ بلکہ امام احمدؒ کے نزدیک ہر رکعت میں تین تین رکوع کرنا بھی جائز ہے۔

اس کی رکوع کی تعداد اور کیفیت میں وارد روایات: صلوٰۃ کسوف میں رکوع کی تعداد اور کیفیت میں وارد روایات پانچ قسم ہیں۔

(۱) امام ترمذیؒ نے عبداللہ بن عمرو بن العاصؓ سے ایک روایت نقل کی ہے جس میں ایک رکوع ہر رکعت میں مذکور ہے۔اس طرح امام احمدؒ کے ہاں محمود بن بسیدؓ کی حدیث میں بھی ہر رکعت میں ایک رکوع ذکر ہے۔امام ابوداؤدؒ اور امام نسائیؒ نے سمرہ بن جندبؓ سے بھی یہی کیفیت روایت کی ہے۔نیز دونوں نے قبیصہ بن مخارق ہلالیؓ سے روایت کیا ہے۔جس کے الفاظ یہ ہیں ''فصلّوا کأحد صلوٰۃ صلیتموھا من المکتوبۃ'' عبداللہ بن مسعودؓ، مغیرہ بن شعبہؓ، ابوبکرؓ، عبداللہ بن عمرؓ اور نعمان بن بشیرؓ بھی ہر رکعت میں ایک رکوع روایت کرتے ہیں۔

(۲) بخاری اور مسلم میں حضرت اسماءؓ وغیرہ سے دو دو رکوع ہر رکعت میں مروی ہیں۔

(۳) مسلم اور ابوداؤد کی بعض روایات میں تین تین رکوع ہر رکعت میں ذکر ہیں۔

(۴) چار چار رکوع ہر رکعت میں ابوداؤد اور مسلم کی روایات میں مذکور ہیں۔

(۵) پانچ پانچ رکوع فی رکعت بھی ابوداؤد کی ایک روایت سے معلوم ہوتی ہے۔

اور حق یہ ہے کہ یہ تمام روایات ایک ہی موقع کے متعلق مروی ہیں۔ کیونکہ تمام واقعات میں سیدنا ابراہیم کی وفات کے دن سورج گرہن کا ذکر ہے۔

جمہور کے نزدیک دو رکوع فی رکعت والی احادیث قوی اور معمول بہا ہیں۔ان کے علاوہ دیگر روایات کو وہ ضعف کی وجہ سے معلول اور غیر معمول بہ قرار دیتے ہیں۔

احناف کے دلائل: جبکہ احنافؒ بوجوہ ایک رکوع والی احادیث کو معمول بہا قرار دیتے ہیں۔ اس لئے کہ

(۱) اولاً تو ہماری احادیث آثار صحابہ سے مؤیّد ہیں۔ چنانچہ امام بخاریؒ نے عبداللہ بن زبیرؓ کا اثر ذکر کیا ہے۔ جبکہ طبرانی اور مسند احمد وغیرہ میں حضرت عثمان بن عفانؓ کا اثر مذکور ہے۔ اور دونوں حضرات توحّد رکوع کے قائل ہیں۔

(۲) پھر جب تفرّدِ رکوع اور تعددِ رکوع کے بارے میں روایات مختلف قسم کے وارد ہیں تو صلوٰۃ کسوف کو دیگر معتاد نمازوں پر قیاس کرنا ہی افضل اور اچھا لگتا ہے۔

(۳) علاوہ ازیں جب دو سے زیادہ رکوع والی روایات بھی موجود ہیں تو صرف دو رکوع والی احادیث کو لینا اور باقی کو چھوڑنا ایک خاص عذر کا تقاضا کرتا ہے جو تمہارے پاس نہیں ہے۔ اور اگر ہے تو وہی عذر ہمارے لئے بھی دو رکوع والی احادیث کے چھوڑنے میں دلیل ہوگی۔

(۴) نیز ہماری احادیث قولی ہیں جو فعلی پر راجح ہیں۔

(۵) علاوہ ازیں متعدد رکوع والی روایات مستورات یا صغار صحابہ سے مروی ہیں جبکہ کبار صحابہ توحّد رکوع روایت کرتے ہیں۔ اور ظاہر ہے کہ مستورات اور صغائر پر اشتباہ زیادہ ممکن ہے۔ کیونکہ وہ آخری صفوں میں کھڑے ہو کر نماز پڑھتے ہیں۔

(۶) بعض احناف نے ان روایات کو جمع کرنے کی کوشش کی ہے۔ چنانچہ مبسوط اور بدائع میں یہ کہا گیا ہے کہ دراصل نبی اکرم ﷺ نے طویل رکوع کیا تھا۔ جیسا کہ زیرِ نظر شمائل ترمذی کی حدیث میں صراحۃً مذکور ہے۔ تو اگلی صف کے کچھ لوگوں کو شبہ ہوا کہ شاید نبی کریم ﷺ سر اٹھا چکے ہیں۔ لہٰذا انہوں نے سر اٹھا کر دیکھا۔ پچھلی صف والوں نے اگلی صف کی اتباع میں رکوع سے سر اٹھایا۔ پھر اگلی صف والے نبی اکرم ﷺ کو دیکھ کر واپس رکوع میں گئے۔ تو پچھلے صف والوں نے سمجھا کہ شاید دوبارہ نبی کریم ﷺ رکوع میں چلے گئے۔ حالانکہ یہ نبی اکرم ﷺ کی وہی پہلی رکوع تھی۔ پھر ہو سکتا ہے کہ دوبارہ ایسی نوبت آئی ہو اور پچھلے صف والوں نے اسے تکرار پر محمول کر کے تیسرا رکوع سمجھا ہو۔ اور یہی رکوع کی تعدّد کی روایت کا

منشأ بنا۔

(۷) کچھ احناف کہتے ہیں کہ نبی اکرم ﷺ نے جب طویل رکوع کیا تو صف اول سے تعبیر تکرار رکوع کی صورت میں صحابی نے کی ہو۔ جیسے زید بن خالد جہنیؓ کی حدیث میں آتا ہے کہ **فصلّی رکعتین خفیفتین ثمّ صلّی رکعتین طویلتین طویلتین طویلتین.** تو اس سے مراد طول ہے تکرار نہیں ہے۔ یہاں بھی صرف طول سے تعبیر تکرار رکوع کی صورت میں کی گئی ہے۔

(۸) جبکہ بعض کہتے ہیں کہ دوسری رکوع نماز کی رکوع نہیں تھی۔ بلکہ بعض آیات غریبہ کے مشاہدہ کی وجہ سے تھی۔ جیسے کہ بعض روایات میں آیا ہے کہ اس نماز میں آپ ﷺ کو جنت اور جہنم کا مشاہدہ کروایا گیا تھا۔ تو ہوسکتا ہے کہ آیات کے مشاہدہ کے بعد آپ ﷺ تواضعاً دوبارہ رکوع میں گئے ہوں۔ اس طرح یہ تعدد نبی ﷺ کی خصوصیت بھی ہوسکتی ہے۔ دیگر لوگوں کا یہ حکم نہیں ہوگا۔

<u>نفخ اور بکاء:</u> **ثمّ رفع رأسه فلم یکدان یسجد،** یعنی دونوں سجدوں کے درمیان میں بھی بہت طویل جلسہ کیا۔ حتیٰ کہ قریب تھا کہ دوسرے سجدے کو نہ جائیں۔ سجدوں کے درمیان طویل جلسہ صرف اسی ایک حدیث میں مروی ہے۔ اور جمہور ائمہؒ کے نزدیک یہ طوالت غیر مختار ہے۔ امام غزالیؒ کہتے ہیں کہ اس پر آئمہ کا اتفاق ہے۔

فجعل ینفخ ویبکی، اس میں ترجمۃ الباب سے مطابقت ہے۔ یعنی آپ ﷺ سجدے میں پڑے پڑے جوش کے ساتھ سانس لیتے تھے اور روتے رہتے تھے۔ ایک روایت میں ہے کہ **ثمّ نفخ فی آخر سجوده فقال اف اف الخ** (۱)۔ اس پر ایک اشکال ہے کہ ایسا جوش کے ساتھ سانس لینا جس سے حروف پیدا ہوں مفسد صلوٰۃ ہے۔ تو آپ ﷺ سے کیسی صادر ہوسکتی ہیں۔ لیکن اس کا جواب یہ ہے کہ یہاں ایسی پھونکیں مراد نہیں ہے جس سے آواز یا حروف پیدا ہوں بلکہ یہ صرف ان سانسوں سے تعبیر ہے۔ جو زور سے نکل رہی تھیں۔ ان کو اگر نفخ کہا گیا ہے تو وہ بھی صرف حکایۃً کہا گیا ہے۔ اور اگر اف اف کہا گیا تو

(۱) ثمّ سجد فلم یکن یرفع ثمّ رفع وفعل فی الرکعة الاخری مثل ذالک ثم نفخ فی آخر سجوده فقال اف اف ثمّ قال رب ألم تعدنی الخ (ابوداؤد ج ۱ ص ۱۷۶)

وہ بھی صرف تعبیر کی ضرورت کی وجہ سے۔ جیسے عرب لوگ کوّے کی آواز سے غاق کہہ کر تعبیر کرتے ہیں۔ حالانکہ وہاں کوئی عین الف یا قاف کا حرف ادا نہیں ہوتا۔

<u>نزول مصائب میں استغفار وانابت:</u> **ربّ ألم تعدنی ان لا تعذبهم و انافیهم الخ،** یہ اس قرآنی وعدہ کا ذکر ہے جس کو انفال کی اس آیت میں ذکر کیا گیا ہے۔"**وما کان اللّٰه لیعذبهم و انت فیهم وما کان اللّٰه معذبهم وهم یستغفرون(انفال ۳۲)**

یعنی اللہ تعالیٰ ان کو آپ کی موجودگی میں اور استغفار کرتے ہوئے عذاب نہیں دے گا۔

پھر فرمایا کہ"**ونحن نستغفرک**"یعنی اس وقت تو میری موجودگی میں میری امت اور میں سب استغفار کرتے رہتے ہیں۔ لہٰذا اس کا تقاضہ یہ ہے کہ ہمیں عذاب سے محفوظ فرما۔

چونکہ خسوف کسوف کبھی کبھی عذاب کی علامت ہوتی ہے اور کبھی کبھی عذاب کی عموم کا خطرہ ہوتا ہے۔ اس لئے آپ ﷺ نے تضرع سے دعا کی۔ نیز اس دعا میں امت کو ایک تعلیم بھی مقصود تھی کہ مصائب کے نزول کے وقت انابت اور رجوع الی اللہ ضروری ہے۔ پھر اگرچہ یہاں موجودہ صورت میں رفع عذاب موعود تھا۔ لیکن ہر وعدہ کچھ شرائط سے مشروط اور بعض قیود کے ساتھ مقید ہوتا ہے۔ اس لئے پھر بھی نزول عذاب یا عموم عذاب کا خطرہ تھا۔ اس وجہ سے دعا کی ضرورت تھی۔ جو آپ ﷺ نے فرمادی۔

<u>اوہام جاہلیت کی تردید کے لئے خطبہ:</u> **فقام فحمدالله،** یعنی نماز اور گرہن کے خاتمے کے بعد آپ ﷺ منبر پر وعظ فرمانے کے لئے کھڑے ہوگئے۔ اور جہالت کے اوہام کے ابطال کے لئے ارشاد فرمایا کہ **انّ الشمس و القمر آیتان من آیات اللّٰه الخ،** جاہلیت کے اوہام میں سے ایک وہم تو یہ تھا کہ سورج یا چاند گرہن صرف اس روز ہوتے ہیں جب کوئی عظیم ہستی پیدا ہوئی ہو یا وفات ہونے والی ہو۔ دوسری طرف کواکب پرستی کے زیر اثر علم نجوم والوں کا کہنا تھا کہ سورج، چاند اور دیگر اجرام سماوی میں تغیرات زمین میں واقعات وحوادث کے لئے حقیقی علتیں ہیں۔

چونکہ اتفاق ایسا پیش آیا کہ جس روز مذکورہ سورج گرہن ہوا تھا اسی روز حضور اقدس ﷺ کے چھوٹے بیٹے سیدنا ابراہیم کا وصال ہوا تھا جو کہ جاہلیت کے ان غلط اوہام کے لئے ایک مؤید اور مزید گمراہ

کُن تصورات وخیالات کا منشا بن سکتا تھا۔ آپ ﷺ کی حساس اور اوہام پرستی سے متنفر طبیعت نے اس خطرے کوتاڑ دیا۔ لہٰذا فوراً اس کے ازالے کے لئے کھڑے ہو گئے۔ اور لوگوں کو تنبیہ فرمائی کہ دیکھو سورج چاند اللہ تعالیٰ کی قدرت کاملہ اور تصرف نافذہ کی علامتیں ہیں۔ ان کا گرہن اس بات کی عظیم دلیل ہے کہ جو کچھ عالم میں ہوتا رہتا ہے وہ خدائے ذوالجلال کے ارادے سے ہورہا ہے۔ کبھی تو ان اجرام سماوی سے روشنی بکھیرنے کا کام لے رہا ہے اور کبھی ان کے عجز ومجبوری کا معائنہ کروانے کے لئے ان کی روشنی چھین لیتا ہے۔ تو جب اسباب تکوین سے لیس یہ اجرام مجبور ومقہور ہیں تو ان سے نفع وضرر کی امیدیں باندھنا اور حوادث ارضی میں ان کو دخیل سمجھنا حماقت کے سوا کچھ نہیں۔

اس مضمون کی تائید اس حدیث سے ہوتی ہے جس میں آیا ہے

انّ الشمس والقمر لاینکسفان لموت احدو لالحیاته ولکنّهما آیتان من آیات اللّٰه و انّ اللّٰه اذاتجلّی لشئ من خلقه خشع له(جمع الوسائل ج۲ ص۱۰)

سورج یا چاند گرہن کسی کی موت یا ولادت سے نہیں ہوتا۔ بلکہ یہ اللہ کی قدرت کاملہ کی نشانیاں ہیں۔ اور جب اللہ تعالیٰ اپنی مخلوق میں سے کسی چیز پر تجلّی فرماتے ہیں تو وہ عاجزی اختیار کرلیتی ہے۔

اس حدیث میں یہ تصریح ہے کہ ان دونوں کا گرہن اللہ تعالیٰ کے لئے عاجزی اور خشوع کا سبب ہے اور اس کا راز یہی ہے کہ جب رب ذوالجلال اپنی صفت جلال کی تجلّی فرماتے ہیں تو عالم کا جمال حسی جو نور کی شکل میں ہے عظمت الٰہی اور ہیبت کے مارے دب جاتا ہے۔ اس حکمت کا ادراک کر کے حضرت طاؤسؒ نے جب سورج گرہن دیکھا تو روتے روتے فرمایا ''**ھی اخوف لِلّٰه منّا** '' یعنی سورج ہم سے زیادہ خدا سے ڈر رہا ہے۔

یا پھر کلام نبوی ﷺ کا مطلب یہ ہے کہ سورج گرہن اور چاند گرہن کے بارے میں اہل جاہلیت کے خیالات باطل ہیں اور ان کے ساتھ خوف ورجا کا تعلق فاسد خیال ہے۔

<u>آیات اللہ کے ذریعہ تخویف عباد:</u> دراصل ان کی روشنی چھین کررب کائنات صرف یاددہانی کرارہا ہے۔کہ قوت ونور کے یہ خزانے سارے کے سارے میری ملک اورزیر تصرف ہیں۔اگروہ چاہے تو اس کے نور کو چھین لے اورانسان عظیم نعمتوں سے محروم ہوجائے کیونکہ ظاہر ہے سورج چاند کے بغیر زندگی اجیرن ہوکر رہ جائے گی۔اس طرح ان کا بے نور ہونا عذاب الٰہی کی علامت اوراللہ سے باغیوں کے لئے ذریعہ عبرت ہے۔اسی مضمون کوایک حدیث میں صراحۃً بیان فرمایا ہے:

إنّماهذه الآيات يخوف اللّٰه بها فاذا كسفافافزعوا الىٰ الصلوٰة (۱)

ان نشانیوں سے اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کوڈراتے ہیں۔لہٰذا ان کا گرہن ہوجائے تو نماز پڑھاکرو۔

بخاری شریف میں ہے"**ولكن يخوف اللّٰه بها عباده فاذارأيتم شيئا من ذالك فافزعوا الىٰ ذكر اللّٰه ودعاءه واستغفاره**(۲)

بلکہ انہوں نے تخویف عباد کے عنوان سے ترجمۃ الباب قائم کیا ہے(بخاری ج۱ص۱۴۵)

نسائی کی ایک روایت میں ہے کہ"**فاذا رأيتموهافصلوا وتذكروا الخوف**"زیرنظر حدیث میں نبی اکرم ﷺ کا تضرع اوراستغفار بھی لحوق خوف کی واضح دلیل ہے۔

لہٰذا یہ بھی کہا جاسکتا ہے کہ علامت سے مرادعلامت عذاب اورقہرالٰہی ہے۔

<u>کسوف کے وقت خطبہ مسنون ہے یانہیں:</u> اس حدیث میں مذکور ہے کہ نبی اکرم ﷺ نے نماز کسوف کے بعدامت کوکچھ ارشادات فرمائے۔دیگراحادیث بھی اس پرشاہد ہیں کہ آپ ﷺ نے اس روز وعظ فرمایا تھا۔اس وجہ سے شوافع کے ہاں نماز کسوف میں خطبہ مستحب عمل ہے۔جبکہ احناف،امام مالک اور امام احمد رحمہم اللہ کے نزدیک صلوٰۃ کسوف میں خطبہ نہیں ہے۔بلکہ نماز کے بعد اس وقت تک ذکر دعا اور استغفار کرنا مسنون ہے جب تک سورج گرہن ختم نہ ہو۔صاحب ہدایہ اورعلامہ حصکفیؒ نے اس کی تصریح

(۱)ابوداؤد ج۱ ص۱۷۳

(۲)بخاری شریف ج۱ ص۱۴۵

کی ہے۔لیکن علامہ شامیؒ نے خلاصہ اور قاضی خان کے حوالہ سے نماز کسوف کے بعد خطبہ پر اتفاق کا قول بھی نقل کیا ہے۔ **کما فی فتح الملهم ج ۲ ص ۴۵۴**

ملاعلی قاریؒ نے حدیث میں خطبہ کے ذکر سے جواب یوں دیا ہے۔کہ دیکھو نبی اکرم ﷺ نے کسوف کے دوران مسنون اعمال کا تفصیل سے حکم دیا ہے جن میں نماز ہے، صدقہ ہے، اعتاق ہے، ذکر ہے، دعا ہے، استغفار ہے۔لیکن کسی بھی حدیث میں خطبہ کا حکم نہیں دیا ہے۔ جہاں تک کہ آپ ﷺ کے خطبہ کا تعلق ہے۔تو وہ کسوف کے لئے نہیں تھا بلکہ اس سے پیدا ہونے والے اوہام کے ابطال کی کوشش تھی۔ اس لئے اسے نماز کسوف کا حصہ نہیں بنانا چاہئے۔

کائنات کے طبعی اصول وضوابط قدرت الٰہی کے منافی نہیں: یہاں یہ شبہ ہوسکتا ہے کہ سورج یا چاند گرہن کے لئے تو طبعی اسباب موجود ہیں۔دونوں کی گردش سے پیدا ہونے والی مخصوص حالت کی وجہ سے یہ حوادث رونما ہوتے رہتے ہیں۔اور علم ہیئت والوں نے بعض اصول وضوابط کی بنیاد پر اس کا طبعی ہونا ثابت کر دیا ہے۔لہٰذا ان کو تازیانہ الٰہی کہنا یا علامات ونشانیاں کہنا درست نہ ہوگا۔لیکن یہ شبہ انتہائی بے جا ہے۔کیونکہ کسی حادثے کا کسی سبب کے تحت ہونا اور طبعی ضوابط سے مقید ہونا نہ تو قدرت الٰہی کے کمال پر دلالت کے منافی ہے نہ تخویف اور تنبیہ سے۔قرآن مجید نے سماوی اور ارضی مخلوقات، اجرام کا طلوع وغروب ان میں تغیرات اور الٰہی تصرفات کو بارہا بطور استدلال اور بطور عبرت پیش کیا ہے۔اور حقیقت یہی ہے کہ اہل طبیعات اگر ظاہر پرستی کی مرض سے جانبر ہو جائیں تو۔

برگ درختان سبز درنظرِ ہوشیار ہرورقے دفتر یست زمعرفت کردگار

ایک عارف باللہ ان حوادثِ روزگار کو دوسری نظر سے دیکھ رہا ہے۔جن کو طبعیات کا عالِم محض ایک عادی اور ماتحت الاسباب تغیرات سمجھ رہا ہے۔

اللہ جل جلالہ نے ان آیات کو اولی الابصار کے لئے آیات ٹھہرایا ہے۔ بصیرت سے محروم عقل کے اندھوں کے لئے نہیں۔

(۴) حدثنا محمود بن غيلان ثنا أبو أحمد ثنا سفيان عن عطاء ابن

السائب عن عكرمة عن ابن عباس قال أخذ رسول اللّٰه ﷺ إبنة له تقضى فاحتضنهافوضعها بين يديه فماتت وهى بين يديه وصاحت أمّ أيمن فقال يعنى النّبىّ ﷺ أتبكين عند رسول اللّٰه ﷺ فقالت الست اراک تبكى قال انى لست ابكى انّما هى رحمة إنّ المؤمن بكل خير على كل حالٍ إنّ نفسه تنزع من بين جنبيه وهو يحمداللّٰه تعالىٰ(۱).

ترجمہ: حضرت عبداللہ بن عباسؓ فرماتے ہیں کہ نبی اکرم ﷺ نے اپنی قریب الوفات بیٹی کو گود میں لیا۔ پھر اسے اپنے سامنے رکھا۔ (اسی حالت میں) حضور اقدس ﷺ کے سامنے اس کی وفات ہوگئی۔ (حضور اقدس ﷺ کی باندی) ام ایمنؓ روتی ہوئی چلائی۔ نبی اکرم ﷺ نے فرمایا۔ کیا رسول خدا کے ہوتے ہوئے تم چلاتی ہو۔ وہ بولیں کہ یارسول اللہ میں تجھے بھی تو روتا ہوا دیکھتی ہوں۔ آپ ﷺ نے فرمایا میں (تیری طرح رونا) نہیں روتا۔ میرے آنسو تو رحمت کے آنسو ہیں۔ بیشک مؤمن ہر حال میں خیر ہی میں رہتا ہے۔ حتیٰ کہ اس کی روح اس کی پہلوؤں کے درمیان سے نکل جاتی ہے۔ اور وہ اللہ کی حمد ادا کرتا رہتا ہے۔

<u>حضور اقدس ﷺ کے سامنے مرنے والی بیٹی سے کیا مراد ہے:</u> اخذرسول اللّٰه ابنة له، اس لڑکی سے کون مراد ہے۔ چونکہ نبی اکرم ﷺ کی تمام بیٹیاں بڑی ہو کر وفات پائی ہیں۔ اس لئے ان کا حقیقۃً بیٹی ہونا بھی بعید ہے۔ اور اگر مجازاً کسی بیٹی کی بیٹی مراد ہو تو وہ اگر چہ لغۃً تو محتمل ہے۔ مگر تاریخی لحاظ سے یہ بھی محل نظر ہے کیونکہ آپ ﷺ کی زندگی میں آپ ﷺ کی نواسی کا انتقال ثابت نہیں۔ اگر چہ مسند احمد کی ایک روایت میں ہے کہ آپ ﷺ کے پاس امامہ بنت ابی العاص جو زینبؓ کی بیٹی تھیں۔ نزع کی حالت میں لائی گئی۔ مگر دوسری روایات میں مذکور ہے کہ امامہ بنت زینبؓ تو حضرت علیؓ کی عقد میں آئی تھیں۔ لہٰذا وہ تو نبی اکرم ﷺ کی وفات کے بعد بھی زندہ تھیں۔

---

(۱)مجمع الزوائد ۱۸/۳ ،مصنف ابن ابی شیبة ۳۹۴/۳، مسنداحمد ۲۶۸/۱، صحيح ابن حبان رقم ۲۴۶۷(مختار)

اس کے تین جوابات منقول ہیں۔

اول یہ کہ یہاں پر اسی امامہؓ کا واقعہ مذکور ہو مگر وہ مری نہیں تھی۔اور نبی ﷺ کی دعاؤں کی وجہ سے پھر جانبر ہوگئیں۔زیر نظر حدیث میں وفات سے قرب وفات مراد ہے۔اور حضرت ام ایمن کا رونا اس لئے تھا کہ وہ سمجھی کہ وفات پا چکی ہیں۔

دوسرا جواب یہ دیا گیا ہے کہ یہاں پر دراصل ابنہ کا لفظ تھا۔کسی راوی کے وہم کی وجہ سے اسے ابنۃ بنا دیا گیا ہو۔اور نبی اکرم ﷺ کے فرزندان کی زندگی میں کم سنی کی حالت میں وفات پائے تھے۔

تیسرا جواب بعض حضرات نے یہ دیا ہے کہ دراصل یہاں ''ابن ابنۃٍ '' تھا۔کسی راوی کو وہم ہوا اور اسے ابنۃ بنا دیا گیا ہے۔یعنی نبی اکرم ﷺ کا کوئی نواسا وفات ہونے والا تھا اور آپ ﷺ اس کی وجہ سے روئے تھے۔اور یہ بات بھی تاریخ کے لحاظ سے درست ہے کیونکہ بعض روایات کے مطابق عبداللہ بن عثمان جو حضرت رقیہ کے فرزند تھے صغرسنی میں آپ ﷺ کے سامنے وفات پائے تھے۔اور آپ ﷺ ترحماً روئے تھے۔نیز مسند بزار میں مروی ہے کہ حضرت فاطمہؓ کے بیٹے حضرت محسنؓ صغرسنی میں وفات پائے تھے۔اور حضرت فاطمہؓ نے آپ کو بھی وفات کے وقت بلایا تھا۔

تقضی: قضی یقضی سے واحد مؤنث کا صیغہ ہے۔جو موت کے معنی میں مستعمل ہے۔لہٰذا تقضی کے معنی ہیں تموت یعنی وفات پانے والی تھی۔بعض حضرات کا قول ہے کہ یہاں موت کے معنی میں نہیں بلکہ اشراف علی الموت یعنی قریب موت میں مستعمل ہے۔کیونکہ موصوفہ کی وفات نہیں ہوئی تھی۔جبکہ بعض حضرات کا خیال ہے کہ قضیٰ کا اصل معنی انقطاع شئ اور انتہاء ہے۔یہاں معنی یہ ہوگا کہ ختم ہونیوالی تھی۔

فاحتضنھا ،احتضان سے ہے۔جو بغل میں لینے کو کہتے ہیں۔یعنی آپ ﷺ نے اسے پہلو میں لیا۔لیکن مجازاً گود میں لینے کے لئے مستعمل ہے۔کیونکہ حضن پہلو کی جانب سینے کے زیرین حصے کو کہتے ہیں(۱)۔

---

(۱)الحضن ھو الصدر ممّا دون الابط الی الکشح و من کل شئ ناحیتہ و جانبہ (المعجم الوسیط)

نسائی کی روایت میں ہے وضمھا الیٰ صدرہ

أمّ ایمنؓ: فصاحت أمّ ایمن، یعنی جب بیٹی کی وفات ہوئی۔ تو ام ایمن چیخ مار کر روئیں۔ ام ایمنؓ نبی اکرم ﷺ کو والد سے میراث میں ملی تھیں۔ حضرت خدیجہؓ سے نکاح کے بعد آپ ﷺ نے اسے آزاد کر دیا۔ اور اپنے متبنیٰ زید بن حارثہؓ سے اس کا نکاح کر دیا۔ حضرت ام ایمنؓ غزوۂ احد میں بھی شرکت کر چکی تھیں۔ اور حضرت عمرؓ کی شہادت کے بیس دن بعد وفات پا گئیں۔ ان کے بیٹے ایمنؓ اور اسامہؓ دونوں کا شمار عظیم صحابہ میں ہوتا ہے۔

اُمّ ایمن اور حضور اقدس ﷺ کے رونے میں فرق: ألستُ اراک تبکی، کیا میں آپ کو روتا ہوا نہیں دیکھتی؟ ام ایمنؓ کے خیال میں رونے کی تمام صورتیں یکساں تھیں۔ اس لئے آپ ﷺ کے آنسو بہنے اور اپنی چیخوں کے درمیان فرق نہ کر سکیں۔

انی لست ابکی ، میں نہیں روتا۔ آپ ﷺ کے کلام کے دو معنی ذکر کئے گئے ہیں۔ اول یہ کہ تیری طرح ناجائز اور ممنوع رونا نہیں روتا۔ بلکہ میرا رونا صبر و رضا کے ساتھ ہے۔ جبکہ تیری چیخوں میں جزع اور بے صبری ہے۔ دوم یہ کہ تیرا رونا اختیاری فعل ہے جبکہ میرا رونا بے اختیار اور جوش رحمت سے مغلوبیت کی بناء پر ہے۔ اس لئے میں اپنے اختیار سے نہیں روتا اور تم اپنے اختیار سے روتی ہو۔

انما ھی رحمۃ، "ھی" کا ضمیر بکاء کو راجع ہے۔ جو مصدر ہے اور مصادر مذکر و مؤنث دونوں طرح مستعمل ہوتے ہیں۔ یا پھر یہ ضمیر خبر کی رعایت کی وجہ سے مؤنث لایا گیا ہے۔ جو مؤنث ہے یہ بھی محتمل ہے۔ یہ قطرۃ اور دمعۃ کو راجع ہو۔ بہرحال اس حدیث میں نبی اکرم ﷺ کا رونا مذکور ہے۔ اور اس میں ترجمۃ الباب کے ساتھ موافقت ہے۔

لیکن اس پر اشکال ہے کہ حضرت عائشہؓ سے مروی ہے کہ

مابکی رسول اللّٰہ ﷺ علیٰ میت إنّما غایۃ حُزنہ ان یمسک لحیتہ

نبی اکرم ﷺ کبھی بھی کسی میت پر نہیں روئے۔ آپ ﷺ انتہائی غم میں زیادہ سے زیادہ داڑھی کو پکڑ لیتے تھے۔

اس کا جواب یہ ہے کہ حضرت عائشہؓ کی حدیث کا مطلب یہ ہے کہ آپ ﷺ کبھی بھی تاسف اور جزع کا رونا نہیں روئے۔ حزن ورحمت کے آنسو کی نفی مقصود نہیں۔ جو متعدد روایات سے ثابت ہیں۔

انّ نفسه تنزع من بين جنبيه و هو يحمدالله، اس کا مطلب یہ ہے کہ مؤمن کے لئے ایسا ہونا چاہئے کہ روح نکلتے ہوئے بھی رضائے الٰہی اور شغل بالحق میں محو ہو۔ اور اللہ کی حمد وثنا میں مستغرق ہو۔ موت کو بھی محبوب کی طرف سے تحفہ سمجھ کر خندہ روئی سے قبول کر لے۔

(۵) حدّثنامحمّدبن بشّار ثنا عبدالرحمٰن بن مهدى ثنا سفيان عن عاصم بن عبيدالله عن القاسم بن محمّد عن عائشة أنّ رسول اللهﷺ قبّل عثمان بن مظعون وهوميت وهو يبكى اوقال وعيناه تهرقان(۱).

ترجمہ: حضرت عائشہؓ سے روایت ہے کہ نبی اکرم ﷺ نے عثمان بن مظعونؓ کو اس وقت بوسہ دیا جب وہ وفات پاچکے تھے۔ اس حالت میں کہ آپ ﷺ رورہے تھے۔ یا راوی نے یہ کہا کہ آپ ﷺ کے آنسو ٹپک رہے تھے۔

<u>حضرت عثمان بن مظعونؓ:</u> **قبّل عثمان بن مظعونؓ**، حضرت عثمان بن مظعونؓ جلیل القدر صحابی ہیں۔ نبی اکرم ﷺ کے رضاعی بھائی بھی ہیں۔ ابتدائے اسلام کے زمانہ میں صرف تیرہ مسلمانوں کے بعد مسلمان ہوئے۔ زمانہ جاہلیت میں بھی کبھی شراب کو منہ نہیں لگایا۔ اسلام کے بعد سب سے پہلے حبشہ اور پھر مدینہ منورہ ہجرت کی(۲)۔ اور یہیں شعبان ۲ھ میں ان کا انتقال ہوا۔ مدینہ میں مہاجرین میں سب سے

(۱)سنن ابی داؤد ۹۵/۲ کتاب الجنائز باب فی تقبیل المیت، جامع الترمذی ۱۸۱/۱ ۳ کتاب الجنائز باب ماجاء فی تقبیل المیت، سنن ابن ماجة ص ۱۰۵ کتاب الجنائز باب ماجاء فی تقبیل المیت ، السنن الکبریٰ للبیهقی ۴۰۷/۳(مختار)

(۲)رسول اللہ ﷺ نے ان کا بھائی چارہ حضرت ابوالہیثم بن التمان کے ساتھ کیا۔ غزوۂ بدر میں بھی شریک ہوئے۔ اور واپسی پر بیمار ہوئے اور ۲ھ کو وفات پاگئے۔ جب آپؓ کا جنازہ اٹھایا گیا تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا **طوبی لک یا عثمان لم تلبسک الدنيا ولم تلبسها**(جمع الوسائل ۱۵۳/۲) اے عثمان تیرے لئے بشارت کہ نہ تو نے دنیا پہنی اور نہ دنیا تجھے پہن سکی۔ (مختار)

پہلے انتقال آپؓ کا ہوا تھا۔حضور اقدس ﷺ کو بہت عزیز تھے۔ان کے وفات کے بعد ان کا بوسہ لیا اور روئے۔نیز آپ ﷺ نے فرمایانعم السلف هولنا

هـو يبكى، آپ ﷺ بہت روئے یہاں تک کہ روایات کے مطابق آپ ﷺ کے آنسو حضرت عثمانؓ کے چہرے پر بھی ٹپکنے لگے(۱)۔

اوقـال عيـنـان تهراقان، راوی کو شک ہے کہ ان دونوں جملوں میں سے کونسا جملہ کہا گیا ہے۔لیکن مطلب ایک ہی ہے۔تهـراقـان میں راء کے بعد الف مروی ہے۔اس کی صرفی تحقیق میں کچھ تفصیل ہے۔اس کلمہ کا اصل اراق یُریق اراقة ہے۔جو مائع چیز کے گرانے کے لئے مستعمل ہوتا ہے۔پھر کبھی کبھی اراق کا ہمزہ ہاء سے بدل دیا جاتا ہے۔اورهراق يهريق بولا جاتا ہے۔کبھی کبھی اهـرق يهرق اهراقاً مستعمل ہوتا ہے اور کبھی اهراق يهريق اهراقةً استعمال ہوتا ہے۔مؤخر الذکر تعریف کے لئے دو توجیہہ کی جاتی ہیں۔

<u>لفظ اراق اور اهراق کی تحقیق:</u> اول یہ کہ دراصل اہراق ارق ہی تھا۔لیکن اراق میں تعلیلات کی کثرت کی وجہ سے بنائے کلمہ ضعیف ہوگئی تھی۔کیونکہ اراق اروق یااریــــق سے بنا ہے۔جس میں پہلے حرف علت کو ساکن کر کے حرکت راء کو منتقل کی گئی۔پھر حرف علت کو الف سے بدل دیا گیا۔کلمہ کے وہن کو دور کرنے کے لئے ایک ہاء کو زائد لایا گیا۔لہٰذا اہراق بن گیا۔پھر اس زیادت کو پورے باب کا حصّہ بنا دیا گیا۔جبکہ بعض کہتے ہیں کہ اراق کے ہمزہ کو ہاء سے بدل دیا گیا۔ہراق بنا،پھر بدل اور مبدل منہ دونوں کو جمع کرتے ہوئے،ہمزہ محذوفہ کو دوبارہ لایا گیا۔بہرحال یہ کلمہ ہرلحاظ سے صرفی قوانین کو بالائے طاق رکھ کر مستعمل ہوتا ہے۔یہاں بعض نسخوں میں تہرقان الف کے بغیر منقول ہے۔یہ اهــرق يهــرق سے ہے۔اورعلامہ جوہری نے اسے اراق کی طرح مستقل لغۃ قرار دیا ہے۔

---

(۱) ملاعلی قاریؒ نے ابن الجوزی کی کتاب الوفاء کے حوالہ سے حضرت عائشہؓ کی روایت نقل کی ہے۔**قـالـت لـمـامـات عثـمـان بـن مـظعون كشف النّبيّ ﷺ الثوب عن وجهه وقبّل بين عينيه ثمّ بكىٰ طويلاً فلما رفع عن السريرقال طوبى لک يا عثمان لم تلبسک الدنيا ولم تلبسها (جمع الوسائل ۲/۱۵۳)(مختار)**

(۲) حدّثنا إسحاق بن منصور أنا أبوعامر ثنا فليح وهو ابن سليمان عن هلال بن عليّ عن أنس بن مالک قال شهدنا ابنة لرسول اللّٰه ﷺ ورسول اللّٰه ﷺ جالس على القبر فرأيت عينيه تدمعان فقال أفيكم رجل لم يقارف الليلة قال أبوطلحة أنا قال انزل فنزل فی قبرها(۱).

ترجمہ: حضرت انسؓ فرماتے ہیں کہ ہم نبی اکرم ﷺ کی ایک صاحبزادی کی نماز جنازہ میں شریک تھے۔ نبی اکرم ﷺ قبر کے پاس تشریف فرما تھے۔ میں نے دیکھا آپ ﷺ کی آنکھوں سے آنسو جاری تھے۔ آپ ﷺ نے فرمایا کیا تم لوگوں میں سے کوئی ایسا ہے جس نے آج رات جماع نہیں کیا ہو۔ حضرت ابوطلحہؓ نے عرض کیا کہ میں ہوں۔ آپ ﷺ نے حکم دیا کہ تم قبر میں (مرحومہ کی تدفین کے لئے) اتر جاؤ۔ چنانچہ وہ قبر میں اتر گئے۔

مرنے والی بیٹی رقیہؓ تھی یا ام کلثومؓ: شهدنا ابنة لرسول اللّٰه ﷺ، بعض لوگوں نے ابنة الرسول ﷺ کا مصداق حضرت رقیہؓ بتایا ہے۔ لیکن یہ درست نہیں ہے۔ کیونکہ حضرت رقیہؓ کی تدفین میں نبی اکرم ﷺ کو شرکت کا موقعہ نہیں ملا۔ ان کی وفات کے موقعہ پر آپ ﷺ غزوۂ بدر میں مشغول تھے۔ بعد میں آپ ﷺ نے اُم کلثومؓ کا نکاح حضرت عثمانؓ سے کر دیا تھا۔ اس لئے اکثر شرّاح نے حضرت اُم کلثومؓ کو اس کا مصداق ٹھہرایا ہے۔ آپ ﷺ کی یہ دونوں صاحبزادیاں یعنی رقیہؓ اور ام کلثومؓ ابولہب کے بیٹوں عتبہ اور عتیبہ کے نکاح میں تھیں۔ جب "تبت يدا ابی لهب" نازل ہوئی تو والدین کے حکم سے دونوں نے ان کو طلاق دیدی۔ رقیہؓ رمضان ۲ھ میں وفات ہوئیں تو ۳ھ میں آپ ﷺ نے اللہ تعالیٰ کے حکم سے ام کلثومؓ کا نکاح حضرت عثمانؓ سے کر دیا۔ ام کلثومؓ اور فاطمہؓ میں کونسی چھوٹی تھیں۔ اس میں اہل سیر کا اختلاف ہے۔ ام کلثومؓ کی کوئی اولاد نہیں ہوئی تھی۔

---

(۱) صحيح بخاری ۱/۱۷۱ کتاب الجنائز باب قول النبیّ ﷺ يعذب الميت ببكاء اهله عليه، شرح السنة رقم حديث ۱۵۱۳، السنن الكبریٰ للبيهقی ۵۳/۴ كتاب الجنائز (مختار)

لفظ مقارفۃ سے مراد: أفیکم رجل لم یقارف اللیلۃ، قارف یقارف مقارفۃ کے معنی گناہ کا ارتکاب کرنا ہیں۔ نیز یہ جماع کرنے کے معنی میں بھی مستعمل ہے۔

ابن اثیرؒ نے نہایہ میں دونوں معنوں کا ذکر کیا ہے۔ کہتے ہیں "قارف الذنب اذا دناہ وقارف امرأتہ اذاجاء ھا "الخ

امام بخاریؒ نے ابن المبارکؒ کے حوالہ سے فلیحؒ سے یہ تفسیر ذکر کی ہے کہ اراہ یعنی الذنب تو اس تقدیر میں لم یقارف کا مفعول بہ الذنب مقدر ہے۔ اور ترجمہ یہ ہوگا کہ تم میں سے کوئی ہے جس نے آج رات کوئی گناہ نہیں کیا ہو۔ البتہ اس پر اشکال کیا جاتا ہے کہ جواب میں ابوطلحہؓ کا یہ کہنا کہ میں ہوں۔ اعجاب اور خودستائی کے زمرے میں آئے گا۔ نیز ضمناً دوسرے حاضرین کے لئے ارتکاب معصیت کا اثبات بھی ہوجائے گا۔ حالانکہ دونوں باتیں بعید از قیاس ہیں۔ اس لئے صاحب نہایہ نے بھی یہاں دوسرے معنی کو ترجیح دیتے ہوئے کہا ہے "ومنہ الحدیث فی دفن ام کلثومؓ"

علامہ ابن حزمؒ نے بھی اس کو ترجیح دی ہے۔ اور اس کی تائید اس روایت سے بھی ہوتی ہے جسے امام بخاریؒ نے تاریخ اوسط میں اور امام حاکم نے مستدرک میں ذکر کیا ہے۔

"لایدخل القبر احد قارف اھلہ البارحۃ فتنحیٰ عثمان" اور اکثر شراح نے اس ترجمہ کو زیادہ راجح قرار دیا ہے۔

جماع نہ کرنے والوں کو ترجیح میں حکمت: مگر اس میں یہ بات قابل توجہ ہے کہ جماع نہ کرنے والوں کو دوسروں پر ترجیح دینے میں کونسی حکمت پوشیدہ ہے اس کی دو وجہ ذکر کی گئی ہیں۔

اول یہ کے جو شخص زمانہ قریب میں جماع سے محفوظ ہو اس کا نفس ترکِ قضائے شہوت کی وجہ سے مطمئن ہوتا ہے۔

گویا وہ مردانہ تقاضوں اور رغبتوں کو ماضی بعید کا حصہ جان کر بھول چکا ہے۔ اور قبر کے ساتھ یہ حالت بہت ہی انسب ہے۔

علامہ مناویؒ لکھتے ہیں۔ وجہ یہ ہے کہ

إنّ الحديث العهد بالجماع قد يتذكر ذالک فيذهل عما يطلب من احكام الالحاد و احكامه(۱)

تازہ جماع کئے ہوئے شخص کو کبھی کبھی یہ کام یاد آجاتا ہے تو وہ تدفین کے احکام سے غافل اور اس کو احسن طریقہ سے انجام دینے سے قاصر رہتا ہے۔

حضرت عثمانؓ پر لطیف تعریض: دوسری وجہ جسے اکثر شراح نے ترجیح دی ہے وہ یہ ہے کہ دراصل اس میں حضرت عثمانؓ پر تعریض اور ان کے قصور پر تنبیہ مقصود ہے۔ ہوا یوں کہ جس رات کو سیدہ ام کلثومؓ کا انتقال ہوا تھا اسی رات کو سیدنا عثمانؓ نے اپنی ایک لونڈی سے ہمبستری کی تھی۔ چنانچہ آپ ﷺ نے یہ حکم دیا کہ جماع نہ کرنے والے قبر میں اتریں۔ یہ سیدنا عثمانؓ کو تنبیہ تھی۔ کہ جماع میں شغل کی وجہ سے حضور اقدس ﷺ کی لخت جگر کی مرض وفات میں جس کے نکاح کا حکم جبرئیلؑ لائے تھے۔ تیمارداری سے غفلت ضرور ہوئی ہوگی۔ لہٰذا آپ ﷺ نے عتاباً انہیں قبر میں اترنے سے روکا۔

لیکن ظاہر ہے کہ عتاب کسی گناہ پر نہیں تھا۔ کیونکہ ام کلثومؓ طویل المیعاد مرض میں مبتلا تھیں۔ اور کس کو علم تھا کہ اس رات کو وہ وفات پانے والی ہیں۔ اس لئے اگر حضرت عثمانؓ اس رات ایک جائز عمل میں مشغول ہوئے تو اسے گناہ تو نہیں کہا جا سکتا۔ البتہ حضرت عثمانؓ سے وفور محبت اور شدت تعلق کی بناء پر آپ ﷺ نے بغیر جرم کی یہ لطیف تنبیہ کی ہو جو ہمیشہ اپنے اور صرف محبّین ومحبوبین کو ہوا کرتی ہے تو کچھ بعید نہیں ہے۔

غیر محرم کی عمل تدفین میں شرکت کا حکم: یہ بھی واضح رہے کہ قبر میں اترتے وقت حضرت ابوطلحہؓ اکیلے نہیں تھے بلکہ اس خدمت میں حضرت علیؓ، حضرت فضل بن عباسؓ اور اسامہ بن زیدؓ بھی شریک تھے (۲)۔ اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ محارم کی موجودگی میں بھی غیر محرم کسی عورت کو قبر میں اتار سکتے ہیں۔ اور شاید نبی اکرم ﷺ نے بیان جواز کے لئے ہی یہ عمل ان سے کروایا ہو۔ البتہ مستحب یہی ہے کہ یہ خدمت محارم خود انجام دیں۔ کمافی البحر الرائق

---

(۱)شرح الشمائل للمناوی علی هامش جمع الوسائل ۱۵۴/۲

(۲)الاصابة ج۷ ص ۳۶۹

امام طحاویؒ کی توجیہ: گزشتہ طویل بحث اوراشکالات وجوابات کی وجہ سے امام طحاویؒ سے یہ مروی ہے کہ زیرنظر حدیث میں دراصل تصحیف کی گئی ہے اور یہ لفظ لم یقارف کی بجائے لم یقاول تھا۔ جس کا معنی یہ ہے کہ جس شخص نے کسی دوسرے کے ساتھ مقاولہ یعنی بحث اور تو تو میں میں نہ کی ہو۔اور چونکہ عشاء کے بعد سمر یعنی گپ شپ سے نہی مروی ہے۔اس لئے کلام کا معنی یہ ہوگا کہ جو شخص آج رات عشاء کے بعد کسی سے بحث ومباحثہ اور گپ شپ سے باز رہا ہو وہ قبر میں اترے اور تدفین کا کام کرے۔ لیکن حق یہ ہے کہ حضرت عثمانؓ پر تعریض یا دوسری مصلحتوں کی خاطر آپ ﷺ کی مراد جماع ہو۔تو اس میں کوئی استبعاد نہیں اور امام طحاویؒ بلاوجہ تکلفات پر اتر آئے ہیں۔

حضور اقدس ﷺ کی اولاد: نبی اکرم ﷺ کے صاحبزادوں کے بارے میں اہل سیر کا اختلاف مروی ہے۔اس سلسلے میں آٹھ نام لئے جاتے ہیں۔

(۱)قاسم (۲)ابراہیم (۳)عبداللہ (۴)عبدمناف (۵)الطیّب

(۶)المطیب (۷)الطاہر (۸)المطہر

ان میں اول الذکر دو پر اتفاق ہے۔اکثریت کے قول کے مطابق آپ ﷺ کے تیسرے بیٹے کا نام عبداللہ تھا۔بقیہ پانچ کے بارے میں راجح بات یہ ہے کہ یا تو ثابت نہیں یا قاسم اور عبداللہ کے القاب کے طور پر مروی ہیں۔ان میں سے قاسم اور عبداللہ حضرت خدیجہؓ اور ابراہیم حضرت ماریہ قبطیہؓ کی بطن سے تھے۔

صاحبزادیوں میں حضرت زینبؓ، حضرت رقیہؓ، حضرت فاطمہؓ اور حضرت ام کلثومؓ تمام کی تمام حضرت خدیجہؓ کے بطن سے پیدا ہوئی تھیں۔ان میں صرف حضرت فاطمہؓ آپ ﷺ کی وفات کے بعد چھ ماہ تک زندہ رہیں۔دیگر صاحبزادیاں آپ ﷺ کی حین حیات وفات پائی تھیں۔

پھر آپ ﷺ کی بڑی صاحبزادی زینب کی بیٹی امامہ بھی زمانہ شباب کو پہنچ چکی تھیں۔لیکن حضرت فاطمہؓ کی اولاد کو فضیلت حاصل ہے۔جن میں حسنین اور ان کی اولاد سب سے افضل اور ان کے بعد عبداللہ بن جعفرؓ کی وہ اولاد افضل ہے جو کہ زینب بنت علی (زینب بنت فاطمہؓ) کے بطن سے ہوئی تھی۔

فصلی اللّٰہ علی نبیہ وعلی آلہ الطیبین الطاھرین

خلاصۂ باب

دنیا میں رہتے ہوئے انسان کا واسطہ خوشی اور غم دونوں سے پڑتا ہے۔اسی طرح ہنسی مذاق اور رونے دھونے کی دونوں کیفیتیں انسان کو عارض ہوتی ہیں۔لیکن حق یہ ہے کہ مسرتوں اور مستیوں میں وہ فائدے نہیں ہیں جو شکستہ دلی میں حاصل ہوتی ہیں۔اسی حکمت کو ایک شاعر نے یوں بیان کیا ہے ؎

نہ بچا بچا کے رکھو اسے کہ یہ آئینہ ہے وہ آئینہ
جو شکستہ ہو تو عزیز تر ہے نگاہ آئینہ ساز میں

جتنا بھی انسان حقیقت شناسی سے قریب تر ہوتا ہے اور اپنے عجز و بے بسی کا تماشہ دیکھتا ہے۔اتنا ہی اس پر انکسار اور غلبہ بکاء زیادہ ظاہر ہوتا ہے۔نبی کریم ﷺ نے ایک حدیث میں اسی طرف اشارہ فرمایا ہے **لو تعلمون مااعلم لضحکتم قلیلاً ولبکیتم کثیراً** (۱)۔

ترجمہ: اگر ان حقائق کا تم کو علم ہو جائے جن کا مجھے پتہ ہے تو تم ہنسو گے کم اور روؤ گے زیادہ۔

اس کے مقابلے میں کثرت ضحک کو آپ ﷺ نے موتِ قلب کا ذریعہ کہا ہے۔ظاہر ہے نبی اکرم ﷺ سے زیادہ حقائق شناسی کسی کو نہیں ہے۔اس لئے آپ ﷺ کی ہنسی مذاق بہت محدود تھی۔اور رونے کے مواقع بکثرت تھے۔آپ ﷺ کے رونے کے لئے شراح نے متعدد وجوہات ذکر کی ہیں۔مثلاً

(۱) رحمت وشفقت: جیسے میت پر آپ ﷺ کا رونا ثابت ہے۔اور باب کی مؤخرالذکر احادیث میں اس کا ذکر ہے۔

(۲) امت پر خوف کی وجہ سے: جیسی دوسری حدیث میں آپ ﷺ کا رونا مذکور ہے۔

(۳) خوف الٰہی اور خشیۃ کے غلبہ کی وجہ سے: جیسے کسوفِ شمس کے وقت ہوا تھا۔

---

(۱) بخاری شریف ج۱ص۱۴۲، ج۲ص۷۸۶

(۴) اشتیاق ومحبت کی وجہ سے: جیسے استماع قرآن کے وقت یا دورانِ نماز مناجات کے وقت ہوتا تھا۔

(۵) رنج وحزن کی وجہ سے بھی آپ ﷺ روئے ہیں۔ جیسے ابراہیمؓ کی وفات کے وقت آپ ﷺ نے فرمایا ''**انابفراقک یاابراھیم لمحزونون**''(۱)

بایں ہمہ آپ ﷺ کا رونا جزع وفزع اور بے صبری کا رونا نہیں تھا۔ جس سے آپ ﷺ عموماً منع فرمایا کرتے تھے۔

---

(۱) بخاری شریف ج۱ ص۱۷۴

۴۶. باب ماجاء فی فراش رسول اللّٰہ ﷺ

رسول اللہ ﷺ کے بستر کا بیان

فراش فعال کے وزن پر مفعول یعنی مفروش کے معنی میں ہے۔ جیسے لباس بمعنی ملبوس ہے۔ ہر اس چیز کو کہتے ہیں جو بیٹھنے یا لیٹنے کیلئے بچھائی جائے۔ یعنی نبی کریم ﷺ کی بستر کے بارے میں یہاں احادیث لائی جائیں گی۔ مصنف نے دو احادیث کا یہاں ذکر کیا ہے۔

(۱) حدّثنا علیّ بن حجر انا علیّ بن مسهر عن هشام بن عروة عن أبیه عن عائشة قالت إنّما کان فراش رسول اللّٰه ﷺ الذی ینام علیه من ادم حشوه لیف(۱).

ترجمہ: حضرت عائشہؓ فرماتی ہے کہ نبی کریم ﷺ کا وہ بسترہ جس پر آپ ﷺ آرام فرمایا کرتے تھے، چمڑے کا تھا، جو کھجور کی درخت کی چھال سے بھرا ہوا تھا۔

کان فراش الخ نبی کریم ﷺ کے بارے میں یہ بات پہلے بھی ذکر کی جا چکی ہے کہ آپ ﷺ کا فقر اختیاری تھا۔ اور اس میں حکمتیں تھیں۔ لباس، کھانے پینے اور مسکن کی طرح بسترے میں سادگی اور فقر عیاں تھا۔ چمڑے کا بسترہ اور اندر سے کھجور کی چھال سے بھرا ہوا تھا۔ یہ اس زمانے میں استعمال کئے جانے والے عام بستروں کی نسبت زیادہ سادہ تھا۔ علامہ عصام کہتے ہیں کہ اگر ازواج مطہرات کا خیال نہ ہوتا تو شاید نبی کریم ﷺ اس بسترے کو بھی اختیار نہ فرماتے بلکہ زمین پر سونے کو ترجیح دیتے۔

اس حدیث سے یہ بات معلوم ہو رہی ہے کہ اگر چہ ایسے بسترے کا استعمال جائز ہے جسے ملائم بنانے کیلئے اندر سے بھرا گیا ہو لیکن زیادہ ملائم اور گداز بسترہ نیند کے غلبہ کا باعث بنتا ہے۔ جو عبادت میں خلل انداز ہوتا ہے۔ لہٰذا اس سے احتراز کرنا چاہیے۔

---

(۱) صحیح مسلم ۲/۲۰۲ کتاب اللباس والزینة باب التواضع فی اللباس الخ، جامع ترمذی ۱/۴۳۹ ابواب اللباس باب ماجاء فی فراش النبیّ ﷺ، مسند احمد ۶/۴۸ ومصنف ابن ابی شیبة(مختار)

اَدم ادیم کی جمع ہے جو پختہ چمڑے یا بالخصوص سرخ چمڑے کو کہتے ہیں۔ حشوہ لیف حشو محشو کے معنی میں ہے اور لیف لیــفة کی جمع ہے۔ کھجور کے تنے پر اس کی شاخ کے اگنے کی جگہ جو جالی نما چھال ہوتی ہے۔ لیفة کہلاتا ہے۔

(۲) حدّثنا ابو الخطّاب زیاد بن یحییٰ البصریّ ثنا عبداللّٰہ بن میمون انا جعفر بن محمّد عن أبیه قال سئلت عائشة ما کان فراش رسول اللّٰہ ﷺ فی بیتک قالت من اَدَم حشوہ لیف وسئلت حفصة ما کان فراش رسول اللّٰہ ﷺ فی بیتک قالت مسحاً نثنیه ثنیتین فینام علیه فلمّا کان ذات لیلة قلت لو ثنیته اربع ثنیات کان اوطاله فثنیناه باربع ثنیات فلمّا اصبح قال ما فرشتمونی اللیلة قالت فقلنا هو فراشک إلاّ انّا ثنیناه باربع ثنیاتٍ قلنا هو اوطا لک قال ردوّه لحالته الاولیٰ فانّه منعتنی وطاته صلوتی اللیلة.

ترجمہ: حضرت عائشہؓ سے پوچھا گیا کہ آپ کے حجرے میں نبی کریم ﷺ کا بستر ہ کیسا تھا۔ بولیں چمڑے کا تھا جس کے اندر کھجور کی چھال بھری ہوئی تھی۔ اور حضرت حفصہؓ سے پوچھا گیا کہ آپ کے حجرے میں نبی کریم ﷺ کا بستر ہ کیسا تھا۔ وہ بولیں کہ ایک ٹاٹ تھا جس کو دھرا کر کے ہم بچھا لیتے تھے اور آپ ﷺ اس پر آرام فرماتے۔ ایک رات کو میں نے سوچا کہ اگر اس بستر ے کو میں چوھرا کر کے بچھا دوں تو یہ مزید آپ ﷺ کیلئے نرم (اور آرام دہ) ہو جائے گا۔ چنانچہ میں نے اسے چوھرا کر کے بچھا دیا۔ صبح ہوئی تو آپ ﷺ نے پوچھا کہ آج رات تم لوگوں نے میرے لئے کیسے بستر ہ لگایا تھا۔ ہم نے عرض کیا کہ وہ تو آپ ﷺ کا وہی بستر ہ تھا صرف ہم نے اسے چوھرا کر کے بچھایا تھا۔ ہمارا خیال تھا کہ یہ آپ ﷺ کیلئے زیادہ نرم ہوگا۔ آپ ﷺ نے حکم دیا کہ اسے واپس پہلی حالت پر لگا دو۔ کیونکہ اس کی نرمی نے آج رات مجھے تہجد کی نماز سے منع کیا۔

جعفر بن محمّد: حضرت جعفر سے امام جعفر الصادقؒ اور ان کے والد محمد بن علی امام باقرؒ مراد ہیں۔ جو امام زین العابدین علی بن الحسین کے فرزند ہیں لیکن چونکہ امام محمد باقرؒ کی ملاقات عائشہؓ سے نہ ہوئی ہے نہ حفصہ سے۔ اس لئے یہ حدیث منقطع ہے لیکن امام باقرؒ جیسے ثقہ کا ارسال، حدیث کی صحت میں مضر نہیں ہے۔

مِسحا مسح کھردرے ٹاٹ کو کہتے ہیں۔

فلما کان ذات لیلة کان تامہ ہے ذات کا لفظ مقحم اور زائد ہے اور اس تقدیر پر ذاتُ لیلةٍ فاعلیت کی بنا پر مرفوع ہے۔

ما فرشتمولی یہاں صیغۂ جمع مذکر کا ذکر کیا ہے لیکن مخاطب صرف حضرت حفصہؓ ہیں۔ اس کا ایک جواب تو یہ دیا گیا ہے کہ یہ صیغہ تعظیماً استعمال کیا ہے جیسے موسیٰؑ نے اپنی بی بی کو خطاب فرمایا تھا۔ **قال لاھلہ امکثوا انّی آنست نارا** ۔ اور دوسرا جواب یہ دیا گیا ہے کہ شاید خدام کو خطاب ہو جن میں مرد غلام بھی ہو سکتے ہیں۔ اور انہی کو تغلیب دیکر یہ صیغہ لایا گیا ہے۔

منعتنی وطاتہ صلواتی یعنی گداز ہونے کے سبب نیند غفلت کی آئی اور آنکھ نہ کھل سکی۔ اس حدیث میں حضرت عائشہؓ اور حضرت حفصہؓ سے بستر ے کے بارے میں پوچھا گیا ہے۔ دوسری امہات المومنین کا ذکر نہیں ہے، اس کا سبب بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ حضرت عائشہؓ اور حفصہؓ، حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ کی صاحبزادی ہیں۔ دونوں کا مقام نبی کریم ﷺ کے ہاں بہت بڑا ہے۔ جس کی وجہ سے ان کے حجروں میں دیگر ازواج مطہرات کی نسبت پُر تکلف بستر ہ ہونا چاہئے تھا۔ اس سے بھی زیادہ ناقص بستر ہ ہونا ظاہر بات ہے۔

آپ ﷺ کے بستروں کے بارہ میں روایات: اس باب میں نبی کریم ﷺ کے دو بستروں کا بیان ہے۔ ایک چمڑے کا جبکہ دوسرا ایک ٹاٹ کی صورت میں تھا۔ دوسری احادیث میں آپ ﷺ کے بستر ے کے بارے میں مزید تفصیل بھی مذکور ہے۔ مثلاً بخاری شریف کی ایک حدیث میں ہے کہ صرف چٹائی پر بھی سوئے ہیں جو کہ آپ ﷺ کے پہلو میں نشانات چھوڑ دیتا تھا۔ بیہقی میں ہے کہ ایک عورت آپ ﷺ کے

لئے اون سے بھرا ایک بستر ہ ہدیہ کر گئیں۔ آپ ﷺ نے حضرت عائشہؓ سے اصرار کر کے بستر ہ واپس کروایا۔ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ نے آپ ﷺ کے پہلو میں چٹائی کے نشانات دیکھے۔ تو عرض کیا کہ اس سے کوئی بہتر بستر ہ بنانے کی ہمیں اجازت دیجئے لیکن آپ ﷺ نے منع فرمایا۔ حضرت عمرؓ نے ایک دفعہ آپ ﷺ کو چٹائی پر لیٹے ہوئے دیکھا تو روئے اور بولے کہ قیصر وکسریٰ تو نفیس بستروں پر آرام کر لیتے ہیں اور آپ ﷺ کیلئے بستر ہ نہیں ہے۔ آپ ﷺ نے فرمایا کہ کیا تو اس پر راضی نہیں کہ اُن کیلئے دنیا اور ہمارے لئے آخرت ہو۔ اسی طرح کا ایک واقعہ حضرت ابن مسعودؓ کے ساتھ پیش آیا تھا۔ حضرت انسؓ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ زمین پر سوتے تھے۔ زمین پر بیٹھتے اور کھانا کھاتے تھے۔

ان روایات سے بستر ے کے حق میں آپ ﷺ کی بے تکلفی خوب ظاہر ہوتی ہے۔ تعداد کے لحاظ سے بستر ے کے حق میں آپ ﷺ نے تحدید کا بھی ارشاد فرمایا ہے چنانچہ مسلم شریف کی ایک حدیث میں ارشاد ہے کہ (گھر میں) ایک بستر ہ آدمی کا، ایک اس کی بیوی کا، ایک مہمان کیلئے اور ایک شیطان کیلئے ہوتا ہے۔ یعنی ضرورت سے زائد بستر ہ اسراف وتبذیر بن کر شیطان کی خوشی کا باعث بنتا ہے۔

۴۷. باب ماجاء فی تواضع النبیﷺ

رسول اللہﷺ کی تواضع وانکساری کا بیان

<u>تواضع کا معنیٰ:</u> تکبر وخود پسندی سے اجتناب اور اپنے آپ کو دوسروں کی نسبت کم تر اور دوسروں کو اعلیٰ وبرتر سمجھنا تواضع ہے۔ یہ وہ عظیم صفت ہے جو بلندی اور عظمت اور رفعت کا سبب بنتا ہے۔ تواضع دراصل وضع یضع سے تفاعل کا مصدر ہے۔ جس میں تکلف کی خاصیت موجود ہے یعنی تواضع بتکلف خود کو وضیع اور ادنیٰ ظاہر کرنے کو کہتے ہیں(۱)۔

نبی کریمﷺ میں یہ صفت بدرجۂ اتم موجود تھی۔ سینکڑوں واقعات اس پر شائد ہیں۔ یہاں مصنف بطور نمونہ چند کا ذکر فرماتے ہیں۔

(۱) حدّثنااحمد بن منیع وسعیدبن عبدالرحمٰن المخزومیّ وغیر واحدقالوا اناسفیان بن عیینة عن الزهریّ. عن عبیداللّٰه عن عبداللّٰه ابن عباس عن عمربن الخطّاب قال قال رسول اللّٰهﷺ لاتطرونی کماأطرت النصارٰی عیسیٰ بن مریم إنّمااناعبداللّٰه فقولواعبداللّٰه ورسوله(۲).

ترجمہ: حضرت عمرؓ کہتے ہیں کہ نبی کریمﷺ نے ارشاد فرمایا کہ میری توصیف میں حد سے نہ بڑھو جیسا کہ نصاریٰ حضرت عیسیٰؑ کی تعریف میں حد سے گزر گئے ہیں۔

---

(۱)اورصوفیہ کے ہاں تواضع تلل القلوب لعلاّم الغیوب بالتسلیم لمجاری احکام الحق(جمع الوسائل ۲/۱۶۱) سے عبارت ہے اورعرفاً خروج الانسان عن مقتضیٰ جاهه وتنزله عن مرتبة أمثاله اور محققین کے ہاں التواضع هوأن لایری العبد لنفسه مزیة ویری الحالة التی هوفیها اعظم من أن یستقحا(الاتحافات ۳۵۲)(مختار)

(۲)صحیح بخاری ۱/۴۹۰ کتاب احادیث الانبیاء باب قول اللّٰه واذکرفی الکتاب مریم الخ دارمی ۲/۳۲۰،مسنداحمد ۱/۲۳(مختار)

میں تو اللہ تعالیٰ کا بندہ ہوں تم (بھی میرے بارے میں) یہی کہو۔ کہ وہ اللہ کا بندہ اور رسول ہے۔

لاتطرونی کمااطرت النصاریٰ عیسیٰ بن مریم اطراء مدح سرائی میں حد سے تجاوز کرنے کو کہتے ہیں۔ کسی کی جائز اور مناسب تعریف کرنا بری بات نہیں ہے۔ لیکن کسی کے مرتبے کو اتنا بڑھا کر پیش کرنا جس کا وہ مستحق نہ ہو۔ اطراء کہلائے گا۔ مثلاً کسی عام قسم کے عالم کو غزالی دوران، رازئ زمان اور ابوحنیفۂ وقت کہا جائے۔

<u>فرعونیت کی وبا اور اس کی پہچان:</u> آج ہمارے طبقہ میں یہ مرض ہے کہ ان کے لئے اگر القاب کم استعمال ہوں تو ناراض ہوجاتے ہیں۔ اگر اشتہار میں نام دوسرے نمبر پر یا تیسرے نمبر پر یا چھوٹا لکھا جائے یا دوران جلسہ استقبال اور ستائش میں مبالغہ نہ کیا جائے تو خفا ہوجاتے ہیں۔

ایک دفعہ اسلام آباد میں حضرت مولانا مفتی محمودؒ کے ساتھ گورنمنٹ ہاسٹل میں بیٹھا تھا۔ انہوں نے اسی عیب کے بارے میں فرمایا کہ یہ ایک بڑی اور عجیب فرعونیت ہے۔ خصوصاً علماء میں بہت زیادہ ہے۔ پھر فرمایا آؤ یہ سوچیں کہ آیا یہ ہم میں بھی ہے یا نہیں۔ میں نے عرض کیا کہ اگر جلسہ میں استقبال کم ہو۔ سپاسنامہ زوردار اور مبالغہ آمیز نہ ہو اور ستائش کے نعرے کم لگائے جائیں تو کیا ہمیں اس پر غصہ آتا ہے؟ انہوں نے فرمایا واقعی اس عیب کا معلوم کرنا بڑا مشکل کام ہے ہر شخص کہتا تو یہ ہے کہ میں اس سے پاک ہوں۔ لیکن درحقیقت یہ مہلک مرض اس میں ہوتا ہے۔ جو عالم کیلئے موت ہے اور اسی اطراء کی وجہ سے علماء کی کوششوں میں برکتیں معدوم ہوتی جارہی ہیں۔

بہرحال مدح میں حد سے تجاوز اور مبالغہ آرائی کرنا اطراء ہے۔ مثلاً یہ کہ نبی کریم ﷺ بشر نہیں نور ہیں۔ عالم الغیب ہیں۔ ان کی ذات اللہ تعالیٰ کی ذات میں تحلیل ہے الگ نہیں۔ بریلویت کے اس قسم کے خرافات اطراء کے زمرے میں آتے ہیں۔

کمااطرأت النصاریٰ عیسی ابن مریم یعنی جس طرح نصاریٰ نے عیسیٰؑ کی مدح میں مبالغہ آمیزی کی اس کو عبدیت سے نکال کر الوہیت کی صفات سے متصف کیا تم لوگ ایسے نہ کرنا۔

حضرت عیسیٰؑ کے بارے میں عیسائی عقیدہ: عیسائیوں کا حضرت عیسیٰؑ کو ابن اللہ کہنا نیز ثالث ثلاثہ کہنا اطراء ہے۔ آپ ﷺ نے صحابہؓ کو اس ممکنہ اطراء سے منع کرتے ہوئے ارشاد فرمایا کہ مجھے عبداللہ اور رسول اللہ کہا کرو۔ اس سے آگے نہ بڑھو۔

(۲) حدّثنا علیّ بن حجر انا سوید بن عبدالعزیز عن حمید عن أنس بن مالک إنّ امراۃ جاء ت إلٰی النبیّ ﷺ فقالت إنّ لی الیک حاجۃ فقال اجلس فی ایّ طریق المدینۃ شئت اجلس الیک(۱).

ترجمہ: حضرت انسؓ سے روایت ہے کہ ایک عورت نبی کریم ﷺ کے پاس آئی اور عرض کیا کہ مجھے آپ ﷺ سے ایک بات (تنہائی میں) کہنی ہے۔ آپ ﷺ نے فرمایا کہ مدینہ کی کس گلی میں تم بیٹھو۔ میں (وہیں آکر) تیری بات سننے کیلئے بیٹھوں گا۔

نبی کریم ﷺ تواضع کے پیکر: إنّ لی عندک حاجۃ الخ ایک عورت نبی کریم ﷺ کے پاس آئیں(۲)۔ اور کہا کہ میرا تو ایک کام ہے۔ ظاہر ہے کہ وہ کام ایسا ہے جو کہ عورت حاضرین سے چھپانا چاہتی تھی گویا یہ عورت نبی کریم ﷺ کو اپنے ساتھ اٹھنے کا کہہ رہی تھیں۔ ایسے میں عموماً بڑے لوگوں کو غصہ آتا ہے لیکن آپ ﷺ نے یہ بات محسوس کرنے کی بجائے جواب دیا کہ تم تو یہاں آئی ہو تم جہاں بھی چاہو کسی بھی گلی کوچے میں بیٹھ جاؤ۔ میں وہیں آؤں گا۔ یہ شرم کی بات ہی نہیں کہ ایک ادنیٰ درجے کی عورت کے پاس سردار کونین ﷺ آئیں۔ روایات میں یہ بھی آتا ہے کہ اس عورت کی عقل میں کچھ فتور تھا۔ وہ مدینہ کی گلیوں میں بیٹھا کرتی تھی۔ اسی وجہ سے نبی کریم ﷺ نے گلی میں بیٹھنے کا کہا۔ اور ہوسکتا ہے کہ

---

(۱) سنن ابی داؤد ۲/۲۱۵ کتاب الادب باب فی الجلوس فی الطرقات، مسند احمد ۳/۹۸ (مختار)

(۲) علامہ عبدالجواد الدومی نے لکھا ہے لم یقف الشرّاح علی اسم المرأۃ الاتحافات ۳۵۷، البتہ علامہ بیجوریؒ نے لکھا ہے وفی بعض الحواشی الشفاء اسمها ام زفر ماشطہ خدیجۃ ونوزع فیہ وکان فی عقلها شئ کمافی مسلم (المواھب الدنیۃ ۲۰۵) (مختار)

نبی کریم ﷺ نے اس کے عقل کے فتور کی وجہ سے ازواج مطہرات سے دور رکھنا چاہا۔اس لئے گھر کی بجائے اس کے ساتھ گلی میں ملنے کا کہا۔اور ممکن ہے کہ ایسا آپ ﷺ نے اس عورت کی حاجت روائی میں عجلت کرنے کی غرض سے کیا ہو۔بہرحال روایات میں یہ بھی آیا ہے کہ آپ نے اٹھ کراس کے ساتھ ملاقات کی۔اور صحابہ کی جماعت سے ہٹ کراس کی بات سن لی۔

سیدالکونین کی اس تواضع کی کوئی نظیر نہیں ملتی کہ ایک فاترالعقل خاتون کا بھی اتنالحاظ رکھا۔بخاری شریف کی روایت میں تصریح ہے کہ یہ انصاری عورت تھی اور بعض روایات میں آیا ہے کہ یہ عورت حضرت خدیجہؓ کی خادمہ ام زفرؓ تھیں۔بعض روایات میں یہ بھی آیا ہے کہ اس وقت اس کے ساتھ اس کا چھوٹا بچہ بھی تھا۔ حضرت انسؓ کی روایت میں آیا ہے۔کہ مدینہ کی کوئی باندی آ کر نبی کریم ﷺ کا ہاتھ پکڑ لیتی تھی اور جہاں مرضی ہوتی لے جاتی تھی۔نسائی کی روایت میں ہے کہ مسکین مرداورعورتوں کی ضروریات پوری کرنے میں آپ ﷺ نہیں شرماتے تھے۔بعض روایات کے مطابق جب کوئی شخص آپ ﷺ کے ساتھ ہاتھ ملاتا۔ تو آپ ﷺ اس وقت تک ہاتھ نہیں چھوڑتے تھے۔جب تک وہ خود نہ چھوڑتا۔آپ ﷺ نے مروت، حیااور کریمانہ اخلاق کے یہ بھی خلاف سمجھا کہ ہاتھ کھینچیں تا کہ اس شخص کو یہ احساس نہ ہو کہ نبی کریم ﷺ میرے آنے اور ملنے کی وجہ سے کبیدہ خاطر ہیں۔اگر چہ بعض اوقات تو جلدی بھی ہوتی ہے اور مجبوریاں بھی ہوتی ہیں۔لیکن آئندہ روایات آئیں گی کہ آپ ﷺ کے اخلاق کریمانہ ایسے تھے کہ کوئی بھی آپ ﷺ سے ملاقات کرتا تو جب تک وہ شخص منہ نہ پھیرتا آپ ﷺ منہ نہیں پھیرتے تھے۔مجلس میں بیٹھتے تو حاضرین کی طرف کبھی پاؤں نہیں پھیلاتے تھے بلکہ اپنے زانو بھی دوسروں کے آگے نہیں بڑھاتے تھے۔آپ ﷺ کی آمد کے موقعہ پر اہل مجلس میں سے کوئی تعظیماً اٹھنے کی کوشش کرتا تو آپ ﷺ منع کرتے ہوئے فرماتے ''لاتقوموا کمایقوم الاعاجم''یعنی میں عجمیوں کی طرح پروٹوکول کا دل دادہ نہیں۔میں تو عبد ہوں۔

(۴) حدّثنا علیّ بن حجر انا علی بن مسهر عن مسلم الاعور عن أنس بن مالک قال کان رسول اللّٰه ﷺ یعود المریض ویشهد الجنازة ویرکب الحمار ویجیب دعوة العبد وکان یوم بنی

قریظة علی حمار مخطوم بحبل من لیف علیه إکاف من لیف(۱).

ترجمہ: حضرت انسؓ سے روایت ہے کہ نبی کریمﷺ بیمار لوگوں کی عیادت فرماتے تھے۔ جنازے میں شریک ہوتے تھے۔ گدھے پر سواری فرماتے تھے۔ غلام کی دعوت بھی قبول فرماتے تھے۔ بنوقریظہ کے ساتھ لڑائی کے دن آپﷺ گدھے پر سوار تھے۔ جس کی لگام کھجور کی چھال سے بنی ہوئی رسی تھی اور اس پر کاٹھی بھی کھجور کی چھال کی تھی۔

<u>نبی کریمﷺ کا کافر کی عیادت کرنا:</u> **یعود المریض** بیماروں کی عیادت کرتے جنازہ میں شمولیت فرماتے۔ ایک یہودی نوجوان بلکہ عبداللہ بن ابی کی بھی عیادت کی تھی اور اس کے جنازہ میں بھی شریک ہوئے۔ نادار صحابہ کی عیادت تو معمول کی بات تھی۔ بوقت ضرورت گدھے کی سواری کرتے۔ غلاموں کی دعوت بھی قبول کرتے۔ یہ سب ایسے ادنیٰ کام ہیں۔ جو کہ عرفاً بادشاہوں کو زیب نہیں دیتے۔ نہ امیر لوگ یہ گوارا کرتے ہیں۔ خصوصاً دشمن پر حملہ کرتے وقت تو خوب شان وشوکت کا اظہار کیا کرتے ہیں۔ تاکہ ان پر رعب چھا جائے۔ لیکن آپﷺ میں یہ تعلّی نہ تھی۔

آپﷺ نے عین اس حالت میں بھی گھوڑے اور شان وشوکت کے دوسرے سامان کا طلب نہ کیا۔ حالانکہ اس وقت ایک اشارہ سے ہر چیز مہیا ہو سکتی تھی۔ چنانچہ بنوقریظہ پر حملے کے روز آپﷺ گدھے پر سوار تھے۔ جس کی لگام بھی کھجور کی چھال سے تھی۔ اور اس پر پالان بھی کھجور کی چھال کا بنا ہوا پڑا تھا۔ اس حالت میں آپﷺ اپنی عبدیت اور تواضع کا مظاہرہ کر رہے تھے۔

<u>حضرت عمرؓ کی تواضع کی مثال:</u> حضرت عمرؓ نے فتح بیت المقدس کے موقعہ پر اس سنت کی اقتداء کا بہترین نمونہ پیش فرمایا۔ ان کے ہمراہ ان کا غلام اسلم تھا۔ ایک ہی سواری تھی۔ حالانکہ شام کی فتح کا عظیم الشان کارنامہ انجام پایا تھا۔ اور وہ جنگ جیتی جا چکی تھی۔ جس کے ہر ہر معرکے میں سینکڑوں رومی کام آتے

---

(۱) سنن ابن ماجة ص۱۶۶ کتاب التجارات باب ما للعبدان یعطی ویتصدق، جامع ترمذی ۱/۱۹۷ کتاب الجنائز، (مختار)

تھے۔دوسری طرف سے روم کے بادشاہ،سپہ سالار اور جرنیل شان وشوکت سے آتے۔سب سونے چاندی میں ڈوبے ہوئے ہوتے تھے۔حتیٰ کہ ان کی زرہیں بھی سونے کی ہوتی تھیں۔تلوار جواہرات سے دمک رہی ہوتی تھیں۔واقدی نے فتوح الشام میں ان کی حالت کا خوب نقشہ کھینچا ہے۔لیکن ایسے لوگوں کا مقابلہ کر کے اور انہیں شکست دے کر فاتحانہ انداز سے حضرت عمرؓ شام آتے ہیں۔ ایک سواری پر آپؓ اور غلام باری باری سوار ہوتے ہیں۔جب قریب آئے اس وقت اتفاق سے غلام کی باری تھی۔غلام نے منت کی کہ اب آپ سوار ہو جائیں کیونکہ آپﷺ فاتح اعظم کی حیثیت سے شام میں داخل ہونے والے ہیں لیکن آپ نے انکار کر دیا۔اور آپ غلام کو سوار کئے خود لگام پکڑے بیت المقدس میں داخل ہوئے۔

حضرت ابوعبیدہ بن الجراحؓ کمانڈر انچیف تھے۔استقبال کیلئے آئے تھے۔درخواست کی اب تو کچھ شان وشوکت کی ہیئت ہونی چاہیے۔پیوند بھرے کپڑوں کو تبدیل کر دیں کیونکہ ہرقل اور دیگر صنادید روم آپ سے ملنے آئیں گے۔آپؓ نے بڑی بے دلی سے کچھ دیر کیلئے کپڑے بدلے۔لیکن پھر فوراً واپس کر دیئے۔اور فرمایا **نحن قومٌ اعزّنا الله بالاسلام**۔یعنی ہم لوگوں نے اسلام کی وجہ سے عزت پائی ہے۔اب اسلام کے سوا عزت کے دوسرے ذرائع سے اجتناب کرنا چاہیے۔کہا جاتا ہے کہ بعض کتب الٰھیّہ میں یہ پیش گوئی کی گئی تھی کہ بیت المقدس کا فاتح پھٹے پرانے کپڑوں میں غلام کی سواری کا لگام تھامے ہوئے آئے گا۔اس لئے آپ کے دل میں اللہ تعالیٰ نے یہ بات ڈال دی تاکہ یہ پیش گوئی پوری ہو سکے۔اگر آپ ٹھاٹ بھاٹ سے آتے تو یہ پیش گوئی غلط ہو جاتی اور لوگ تردد میں ہوتے کہ یہ اس پیش گوئی کے مصداق ہے یا نہیں۔بہرحال حضرت عمرؓ نے اس بات میں نبی کریمﷺ کی تاسّی کی تھی۔اور اسی تواضع نے انہیں دنیوی لحاظ سے بھی بام عروج پر پہنچایا۔

<u>ایک فقہی اشکال:</u> **ویجیب دعوة العبد** یہاں پر ایک فقہی اشکال ہوتا ہے کہ غلام تو مال کا مالک نہیں بن سکتا۔اس کے قبضے میں سارا مال اس کے مالک کا مملوک ہوتا ہے۔تو اس کی دعوت قبول کر کے نبی کریمﷺ نے بلا اجازت غلام کے مالک کا مال کیسے کھایا۔

اس اشکال کی وجہ سے بعض لوگوں نے "**ویجیب دعوة العبد**" کا ترجمہ یہ کیا ہے کہ آپﷺ

کسی غلام کے بلانے پر لبیک کہتے تھے۔یعنی اگر وہ مدد کیلئے پکارتا تو آپﷺ حاضر ہو جاتے تھے لیکن حدیث کے سیاق وسباق کی وجہ سے اس معنی کا بُعد ظاہر ہے۔ بلکہ امام ترمذیؒ نے اس حدیث کو تواضع کے باب میں لایا ہے تو یہی معنی ہی مستنبط ہونے چاہئیں جبکہ مذکورہ توجیہ میں تواضع کی جہت مفقود ہے۔

اس لئے علامہ مناوی نے تو یہ جواب دیا ہے کہ نبی کریمﷺ کی خصوصیات میں سے ایک یہ بھی ہے۔کہ آپ جس کے مال کو جس وقت بھی چاہیں لے سکتے ہیں اور اس میں تصرف کر سکتے ہیں۔اس لئے مالک کی لاعلمی یا اس کے اجازت کے نہ ہونے سے آپﷺ کے حق میں کوئی فرق نہیں پڑتا۔اللہ تعالیٰ خود فرماتے ہیں کہ ''النبی اولیٰ بالمؤمنین من أنفسهم''(الآیۃ)

مگراس جواب کی بہ نسبت ملاعلی قاریؒ نے جو دیگر جوابات کئے ہیں راجح معلوم ہوتے ہیں۔جو یہ ہیں اول(۱) یہ کہ یہاں ماذون لہ غلام کا ذکر ہے۔اور ماذون لہ کیلئے جائز ہے کہ وہ معروف طریقے سے مہمان کی مہمان نوازی کرے۔اسی لئے بعض روایات میں ''ویجب دعوۃ المملوک'' کے الفاظ مروی ہیں۔دوم(۲) یہ کہ یہاں پر آزاد شدہ غلام مراد ہے۔اور''ماکان'' یعنی زمانہ گزشتہ کے اعتبار سے اسے غلام کہا گیا ہے اور یہ بھی تواضع ہے کہ معاشرے کے اس ادنیٰ طبقہ کی دعوت بھی قبول فرمائی۔سوم(۳) یہ کہ ہوسکتا ہے کہ یہاں مراد یہ ہو کہ مالک کے گھر اس کی غلام کی دعوت پر بھی جاتے تھے۔یعنی اگر مالک خود دعوت دینے کی بجائے غلام کو بھیج دیتا تو بھی قبول فرماتے تھے یہ استنکاف نہ تھا کہ خود کیوں نہیں بلایا۔

(۴) حدثنا واصل بن عبدالاعلی الکوفیّ ثنامحمّدبن فضیل عن الأعمش عن أنس بن مالک قال کان رسول اللّٰهﷺ یدعی الی خبز الشعیر والاهالة السنخة فیجیب ولقد کانت له درعٌ عندیهودی فماوجدمایفکّهاحتیّ مات(۱).

ترجمہ: حضرت انس بن مالکؓ کہتے ہیں کہ نبی کریمﷺ کو جو کی روٹی اور باسی چربی کھانے کی دعوت بھی اگر دی جاتی تو آپﷺ قبول فرماتے تھے۔اور آپﷺ

(۱) السنن الکبریٰ للبیهقی۶/۳۶کتاب الرهن باجواز الرهن، مسنداحمد۳/۱۰۲ (مختار)

کی ایک زرّہ ایک یہودی کے پاس (رہن) تھی آپ ﷺ نے موت تک اتنا مال نہیں پایا۔ کہ وہ زرہ چھڑا سکیں۔

<u>رسول اللہ ﷺ کا ہر کسی کے دعوت پر جانا:</u> **خبز الشعیر** کسر نفسی اور نہایت بے تکلفی کی وجہ سے لوگ آپ ﷺ کو جو کی روٹی اور ناقص کھانے پر بلانے کی جرأت بھی کرتے تھے اگر لوگ سمجھتے کہ آپ تکلفات اور اعزاز و اکرام کے خواہشمند ہیں مرغ پلاؤ وغیرہ کے بغیر کسی کے ہاں نہیں جاتے۔ تو ہر کسی کو دعوت کی ہمت نہ ہوتی۔ لیکن چونکہ آپ ﷺ کی تواضع کا ہر کسی کو علم تھا کہ آپ ﷺ فقیری پسند فرماتے ہیں۔ اور غریب و امیر ہر کسی کی دعوت پر لبیک کہتے ہیں۔ لہٰذا آپ ﷺ کو انتہائی ناقص کھانے کی دعوت بھی اگر دی جاتی تو آپ ﷺ قبول کرنے میں ہچکچاہٹ محسوس نہیں فرماتے تھے۔

والاھالۃ السنخۃ اھالۃ چربی یا پگھلی ہوئی چربی کو کہتے ہیں لوگ اسے سالن کی طرح بھی استعمال کرتے ہیں جبکہ سَنَخ اور زَنَخ کا معنی تغیّر وفَسَدَ یعنی بدبودار ہونا ہے۔ چربی اور چربی ملا سالن وقت گزرنے سے باسی اور بدبودار ہو جاتا ہے۔

لیکن یہاں یہ شبہ ہوتا ہے۔ کہ نبی کریم ﷺ یا انسؓ کو دعوت دیتے وقت کیسے پتہ چلا کہ جو کی روٹی یا باسی چربی پر بلایا جا رہا ہے۔ حتیٰ کہ تواضع ثابت ہو سکے۔ تو اس کا جواب یہ ہے کہ ممکن ہے کہ دعوت دینے والے نے تصریح کر دی ہو کہ کھانا اس قسم کا ہے اور ممکن ہے کہ نبی کریم ﷺ نے داعی کی حالت زار اور روز مرہ کے کھانے سے یہ اندازہ لگایا ہو کہ اس داعی کے ہاں ملے گی تو صرف یہی چیز ملے گی اور کچھ نہیں ہوگا۔

<u>نبی کریم ﷺ کا زرع گروی رکھوانا:</u> **ولقد کانت له درع عند یھودی** الخ اس زرہ کا نام ذات الفضول تھا جو حضرت سعد ابن عبادہؓ نے آپ ﷺ کو ہدیہ کیا تھا اور جس یہودی کے پاس گروی رکھا تھا اس کا نام ابوالشحم بن الارس تھا۔ آپ ﷺ نے تیس صاع جو اور ایک روایت کے مطابق بیس صاع جو لیکر زرہ کو اس کے پاس گروی رکھا تھا۔ نبی کریم ﷺ کی وفات کے بعد حضرت ابوبکر صدیقؓ نے اسے واگزار کر کے حضرت علیؓ کو دیدی۔ جبکہ بعض روایات کے مطابق خود حضرت علیؓ نے یہودی سے یہ زرہ چھڑا لی تھی۔

<u>صحابہ کرام کی بجائے یہودی سے قرض:</u> یہاں یہ اشکال ہوتا ہے کہ نبی کریمﷺ نے صحابہ کرامؓ کی بجائے یہودی سے قرض لے کر رہن کیوں رکھا تھا۔ حالانکہ صحابہ کرام میں بھی تو دولتمند صحابہ موجود تھے۔ بالخصوص نبی کریمﷺ کی زندگی کے آخری حصہ میں صحابہ اتنے نادار بھی نہیں تھے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ ہوسکتا ہے کہ نبی کریمﷺ نے بیان جواز کیلئے یہ عمل کیا ہو کہ کافر اور یہودی کے ساتھ اس قسم کا معاملہ جائز ہے۔ اگر چہ وہ ''اکّالون للسحت''(حرام خور) قوم سے تعلق رکھتا ہو یا ہوسکتا ہے کہ صحابہ کرامؓ میں کوئی شخص بھی ایسا نہ ہو جس کے پاس ضرورت سے زیادہ غلّہ موجود ہو جبکہ یہود کے ہاں ذخیرہ اندوزی اور منافع خوری ایک عادت تھی وہاں غلّہ مل جانا آسان تھا اور یہ بھی ممکن ہے کہ آپﷺ نے صحابہ کرامؓ سے اس لئے قرض نہ مانگا کہ صحابہ آپﷺ کو قرض دینے کی بجائے مفت میں غلہ لینے پر مجبور کرتے۔ اور قیمت یا دوسرا عوض لینے سے بھی انکار کرتے اور یہ حمیت نبوی اور استغناء محمدی سے خلاف ہوتا۔ لہٰذا آپﷺ نے یہودی سے قرض لے کر رہن رکھا۔ اور ظاہر ہے کہ زندگی میں دولتمند صحابہ کو اس کی اطلاع بھی نہیں دی ورنہ وہ زرہ واپس کروا لیتے تھے۔

اب بظاہر یہ بات دل میں کھٹکتی ہے کہ حدیث کے آخری حصے کا ترجمۃ الباب سے تعلق ظاہر نہیں ہوتا یعنی اس میں تواضع کا اثبات نہیں ہے اور یہی بات بعض شراح نے کہہ دی ہے کہ آخری حصہ میں تواضع کی کوئی بات نہیں صرف اتمام حدیث کیلئے اس کو ذکر کیا ہے لیکن ملاعلی قاریؒ اور دیگر شراح نے لکھا ہے کہ اس عمل میں بھی تواضع متحقق ہے اس لئے کہ بظاہر اگر نبی کریمﷺ صحابہ کرامؓ کے سامنے زرہ بطور رہن پیش کر کے غلہ کا تقاضا فرماتے تو اول تو رہن نہ لیتے اور لیتے بھی تو زیادہ غلہ بطور قرض بلکہ مفت دیتے جس سے نبی کریمﷺ کی قدر افزائی کا اظہار ضرور ہوتا۔ بایں ہمہ آپﷺ نے اپنے منصب وعظمت اور صحابہؓ کے دلوں میں وقعت سے صرف نظر کر کے ان کی بجائے ایک یہودی سے قرض کی درخواست کی۔ جو تواضعاً بھی ہوسکتا ہے بلکہ یہ جہت اس عمل میں اقویٰ ہے۔

فما وجد مایفکّھا الخ ۔یعنی وفات تک اتنا کچھ ہاتھ نہیں آیا کہ رہن چھڑا سکے۔ اور اگر ہاتھ آیا بھی ہو تو بھی صدقہ کر چکے ہونگے۔ اس لئے کہ قرض کی مدت ابھی باقی ہوگی۔

(۵) حدّثنا محمود بن غیلان ثنا أبو داؤد الحفریّ عن سفیان عن الربیع بن الصبیح عن یزید بن أبانٍ عن أنس بن مالک قال حجّ رسول اللّٰہ ﷺ علی رحل رثٍ علیه قطیفة لاتساوی اربعة دراهم فقال اللّهمّ اجعله حجّالاً ریاء فیه ولاسمعة(۱).

ترجمہ: حضرت انسؓ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے ایک بوسیدہ پالان پرسوار ہوکر حج کیا۔اس پالان پرایک جھالروالا کپڑا تھا جوچار درہم کے برابر بھی نہ تھا آپ ﷺ نے دعا مانگی اے اللہ اس حج کوایسا حج بنادے جس میں نمائش ہونہ شہرت۔

عن الربیع بن صبیح عن یزید بن أبان یہ دونوں راوی ضعیف ہیں جس کی وجہ سے علامہ ابن حجر وغیرہ نے اس حدیث کوضعیف کہاہے اوراگرچہ اس کے بعض شواہد بھی ہیں لیکن وہ بھی ضعیف ہیں۔

نبی کریم ﷺ نے صرف ایک حج کیا: علی رحل رثٌ نبی کریم ﷺ نے آخری اورایک حج کیا ہے۔ اسلامی مملکت قائم ہوچکی تھی۔جزیرۃ العرب اسلامی پرچم تلے آچکا تھا۔ملک کے گوشے گوشے سے مسلمان آنیوالے تھے۔ایسے موقعہ پرتو چاہیے تھا کہ خوب شان وشوکت سے حج کیلئے آئیں تاکہ عظمت ظاہر ہوجائے اوراطراف وقبائل کے نومسلم مسلمانوں نیز دیگراقوام پراسلامی حکومت کی دھاک بیٹھ جائے لیکن اس سفر میں بھی آپ ﷺ ایک بوسیدہ پرانے پالان میں سوار ہوکر حج کوآئے اوراس پالان پرکپڑے کاایک ٹکڑا تھا جوکہ چاردرہم کے برابر بھی نہ تھا۔یہاں پربعض شراح نے علیہ قطیفۃ کی ضمیر نبی کریم ﷺ کوراجع کی ہے لیکن ملاعلی قاریؒ وغیرہ نے اس کا پرزوررد کیاہے اس باب میں آئندہ ایک حدیث اور دیگراحادیث بھی اس کے منافی ہیں۔ویسے آدمی پرپڑے ہوئے کپڑے کوقطیفہ نہیں کہتے بلکہ قطیفہ اس کپڑے کوکہتے ہیں جوکسی چیزکوڈھانپنے کیلئے ہواوراس کے جھالروغیرہ بھی ہوں۔اور یہ مردوں کے لباس میں نہیں ہوتا۔

---

(۱)سنن ابن ماجة۲۰۷ کتاب المناسک باب الحج علی الرحل، مصنف ابن ابی شیبة۱۰۶/۴ کتاب المناسک، الحلیلة الاولیاء لابی نعیم۵۴/۳(مختار)

لاریاء فیہ و لاسُمعۃ ایسی حالت میں بھی ریاونمود اور شہرت سے پناہ مانگی۔ریاءدکھلاوے کو کہتے ہیں یعنی کسی کو دکھانے کے غرض سے عمل کرنا جبکہ سمعۃ کا معنی ہے کسی کو سنوانا۔یعنی تشہیر کی غرض سے عمل کرنا۔لیکن مقصد کے لحاظ سے دونوں ایک ہیں یعنی للھیت کے بغیر کوئی نیک عمل کرنا۔نبی کریمﷺ کے عمل میں ریاءاور سمعۃ کا احتمال بھی نہیں ہوتا تھا۔آپﷺ نے امت کی تعلیم کیلئے یہ دعافرمائی تھی تاکہ وہ ریاءوسمعۃ سے محفوظ رہنے کی کوشش اور دعا کریں۔

<u>دورحاضر کےلیڈراورشہرت پسندی:</u> سبحان اللہ۔آج کے لیڈرتو معمولی کام بھی کریں تو اخباروں اورٹی وی پراعلان کرواتے ہیں۔حج سے آنے سے قبل ایک ماہ پہلے کارڈ چھاپے جاتے ہیں۔تمام لوگوں کواطلاع دی جاتی ہے حج کرنیوالا واپسی میں کراچی میں بیٹھ جاتا ہےلوگوں کواطلاع دیتا ہےاوروقت بتادیتا ہےتاکہ خوب انتظامات اوراستقبال کا بندوبست ہوجائے بعد کے اسلامی بادشاہوں کا حال بھی نبی کریمﷺ کے اس عمل سے کوسوں دوررہا۔ کہتے ہیں کہ غالبًا ہشام بن عبدالملک جب حج کوآیاتو چارسواونٹوں پراس کاصرف لباس اوردیگرضروریات کولادا گیا تھا۔اوراسی وجہ سےاسلامی حکومت کا نقشہ بدلنےلگا۔اور بالآخرزوال پرمنتج ہوا۔

اس کے برعکس نبی کریمﷺ اورصحابہ کرامؓ نے حج میں تو بیش قیمت قربانی پیش کی۔خودنبی کریمﷺ نے ایک سواونٹ قربانی کرکے مساکین میں تقسیم کئے۔حضرت عمرؓ نے ایسےاونٹ کی قربانی دی جس کوتین سودینار کے عوض آپؓ سے طلب کیا گیا تھا۔مگرآپؓ نے بیچنے سے انکارکردیا۔دوسرے صحابہ کا اخلاص بھی قابل داد ہےلیکن نمائش اورشہرت سے پناہ طلبی بھی ساتھ ساتھ رہی۔

(۲) حدثنا عبداللّٰہ بن عبدالرحمٰن انا عفان انا حمّاد بن سلمة عن حُميد عن أنس قال لم يكن شخص أحبّ اليهم من رسول اللّٰہﷺ قال وكانوا اذا رأوه لم يقوموا لما يعلمون من كراهيته لذلك(۱)۔

---

(۱)جامع ترمذی ۲/۱۰۴ کتاب الادب باب ماجاء فی كراهية قيام الرجل، مسنداحمد۳/۱۳۲ (مختار)

ترجمہ: حضرت انسؓ سے روایت ہے کہ صحابہ کرامؓ کو نبی کریمﷺ کی نسبت کوئی شخص زیادہ محبوب نہیں تھا۔اس کے باوجود جب صحابہ نبی کریمﷺ کو دیکھتے تو کھڑے نہیں ہوتے تھے کیونکہ وہ جانتے تھے کہ نبی کریمﷺ اس کو ناپسند فرماتے ہیں۔

قیام تعظیمی کا حکم: **لمایعلمون من کراھیتہ لذالک** یہ کراہیۃ تواضعاً تھی۔ورنہ وہ سیدالبشر وخیرالخلق ہیں۔ جب دوسروں کیلئے قیام مطلقاً ناجائز نہیں تو آپﷺ کیلئے بھی ناجائز نہیں تھالیکن تواضعاً آپﷺ ناپسند فرماتے تھے۔ اورصحابہ کرامؓ بھی اپنی محبت وعقیدت کے مقابلے میں آپﷺ کی مرضی کو ترجیح دیتے تھے۔ اگرچہ کبھی کبھی آپﷺ کیلئے صحابہ کا کھڑا ہونا بھی ثابت ہے۔لیکن کھڑے ہونے کا نہ تو صحابہ نے التزام کیا تھا نہ نبی کریمﷺ کو یہ پسند ہوتا تھاہاں صحابہ خوداپنی محبت ظاہر فرمادیتے تھے۔

کسی کی تعظیم کیلئے کھڑے ہونے میں فقہاء نے چندصورتیں لکھی ہیں۔بعض مقامات ایسے ہیں جہاں کھڑاہونا حرام ہے۔مثلاًوہ جگہ جہاں اس شخص میں جس کے لئے کھڑاہواجائے یقیناً تکبر پیدا ہوتا ہو تو وہاں کھڑاہوناناجائز ہے۔قاضی عیاضؒ نے لکھا ہے کہ اگر بڑا آدمی بیٹھا ہواور اتباع تعظیماً کھڑے رہیں تو یہ صورت بھی ناجائز ہے۔ اوراگر تکبر کا اندیشہ اوراحتمال ہے تو مکروہ ہے اوراگر تکبر کا احتمال بھی نہیں تو جائز ہے۔اوراگرسرے سے تکبر کا نام نہ ہومحض خدمت واکرام ہوتو مستحب بھی ہے۔مثلاً کوئی مہمان باہر سے آئے تو کھڑا ہونا چاہیے۔اس طرح امام نوویؒ نے فرمایا کہ مشائخ اوراہل علم کیلئے اکراماً کھڑے ہونا چاہیے۔کیونکہ یہ دراصل کسی ذات کا نہیں بلکہ علم وتقویٰ کا احترام ہوتا ہے۔

ابوداؤدؒ کی روایت میں ہے کہ **کان رسول اللہﷺ یجلس معنافی المسجد فاذا قام قمناقیاماً حتی نراہ قددخل بعض بیوت ازواجہ.** یعنی آپﷺ ہماری مجلس سے اٹھتے تو جب تک کسی حجرے میں داخل نہ ہوتے ہم کھڑے رہتے(**اخرجہ عن ابی ھریرۃ**) اسی طرح نبی کریمﷺ نے انصار کو حضرت سعد بن معاذؓ کیلئے کھڑے ہونے کا حکم دیا تھا۔**قوموإلیٰ سیدکم**

لہٰذا شیخ عالم اوراستاد کو تو چاہیے۔کہ وہ اپنے عقیدتمندوں سے کھڑے ہونے کی طمع نہ کرے۔

لیکن طالب علم، مرید اور چھوٹوں کو چاہیے کہ وہ شیوخ اور بڑوں کا احترام کریں اور ہمیشہ نہیں تو کبھی کبھی اس کی آمد کے موقع پر احتراماً کھڑے ہوں۔ کیونکہ بڑا اپنے نفس کو قابو کرنے پر مامور ہے۔ جبکہ چھوٹا ادب واحترام پر مامور ہے۔

(۷) حدثنا سفیان بن وکیع ثنا جمیع بن عمر بن عبدالرحمٰن العجلّی ثنی رجل من بنی تمیم من ولدابی ہالة زوج خدیجة یکنّی أباعبداللّٰه عن ابن لابی ہالة عن الحسن بن علیّ رضی اللّٰه عنهما قال سالت خالی ہندبن أبی ہالة وکان وصافاً عن حلیة النبیّﷺ وأنا أشتهی أن یصف لی منها شیئاً فقال کان رسول اللّٰهﷺ فخمامفخّماً یتلألو وجهه تلألوالقمر لیلة البدرفذکر الحدیث بطوله قال الحسن فکتمتها زماناثمّ حدّثته فوجدته قدسبقنی الیه فساله عمّاسالته عنه ووجدته قدسال أباه عن مدخله وعن مخرجه وشکله فلم یدع منه شیئاً قال الحسین فسالت أبی عن دخول رسول اللّٰهﷺ فقال کان إذا أوی إلیٰ منزله جزّء دخوله ثلاثة أجزاء جُزءً لِلّٰه عزّوجلّ وجزءً لاهله وجزءً لنفسه ثمّ جزّءَ جزء ہ بینه وبین الناس فیردّذلک بالخاصة علی العامة ولایدّ خرعنهم شیئًا وکان من سیرته فی جزء الامّة ایثاراهل الفضل باذنه وقسّمه علی قدرفضلهم فی الدین فمنهم ذوالحاجة ومنهم ذوالحاجتین ومنهم ذوالحوائج فیتشاغل بهم ویشغلهم فیمایصلحهم والامّة من مسئلتهم عنه واخبارهم بالذی ینبغی لهم ویقول لیبلّغ الشّاهدمنکم الغائب وابلغونی حاجة من لایستطیع ابلاغها فانّه من أبلغ سلطاناحاجة من لایستطیع ابلاغها ثبّت اللّٰه قدمیه یوم القیٰمة ولایذکرعنده إلاّذلک ولایقبل من

احـدغیـره یـدخـلـون روّاداً ولایـفترقون إلاّعن ذواق ویخرجون ادلّة یـعنی علی الخیرقال فسألته عن مخرجه کیف کان یصنع فیه قال کان رسـول الـلّٰهﷺ یخزن لسانه إلاّفیمایعنیه ویؤلّفهم ولاینفرهم ویکرم کـریـم کـل قوم ویولیه علیهم ویحذرالناس ویحترس منهم من غیران یـطـوی عـلـی احـد مـنـه بشره ولاخلقه ویتفقداصحابه ویسأل الناس عـمّـافـی الـناس ویُحسّن الحسن ویقوّیه ویقبّح القبیح ویوهّیه معتدل الامـرغیـرمـختـلف ولایـغـفـل مخافة ان یغفلواویملوالکل حال عنده عتـادلایـقـصـر عـن الـحـق ولایـجاوزه الذین یلونه من الناس خیارهم أفـضـلهم عنده أعمّهم نصیحة وأعظمهم عنده منزلة أحسنهم مواساة ومـوازرة قال فسألته عن مجلسه فقال کان رسول اللّٰهﷺ لایقوم ولایـجـلـس الاعـلـی ذکـر واذا انتهـیٰ الـی قوم جلس حیث ینتهی به الـمـجـلس ویامربذلک یعطی کل جلسائه بنصیبه لایحسب جلیسه ان احـدأاکـرم عـلیـه مـنـه مـن جالسه اوفاوضه فی حاجة صابرة حتّیٰ یـکون هوالمنصرف منه ومن سأله حاجته لم یردّه إلاّبهاااوبمیسورمن القول قدوسع الناس بسطه وخلقه فصارلهم اباًوصاروا عنده فی الحق سـواء مـجـلسـه مجلس علم وحیاء وصبروامانة لاترفع فیه الأصوات ولاتـوبـن فیـه الـحـرم ولاتـنثی فلتاته متعادلین یتفاضلون فیه بالتقویٰ متـواضـعیـن یـوقّـرون فیــه الـکبیـر ویـرحمون فیـه الصغیر ویؤثرون ذاالحاجة ویحفظون الغریب.

---

(۱)صحیح بخاری لم اجده فی هذاالباب کتاب العلم باب من اعادالحدیث ثلاثا، جامع ترمذی لم اجـده فـی هـذا البـاب کتـاب الاستیـذان بـاب مـاجـاء فـی کـراهیة ان یقول علیک السلام، مسنداحمد۲۱۳/۳(مختار)

ترجمہ: امام حسنؓ کہتے ہیں کہ میں نے اپنے ماموں ہند بن ابی ہالہ سے (نبی کریم ﷺ کے حلیہ) کے بارے میں پوچھا وہ نبی کریم ﷺ کے حلیہ مبارکہ کے بیان میں ماہر تھے۔ مجھے ان سے حلیہ کے بارے میں سننے کا اشتیاق تھا۔ (میرے پوچھنے کے بعد) انہوں نے کہا کہ نبی کریم ﷺ ذاتی طور پر باعظمت اور لوگوں کی نظروں میں بلند مرتبہ تھے۔ آپ ﷺ کا چہرہ چودھویں رات کی چاند کی طرح چمکتا تھا۔ اس حدیث کو امام حسن نے پوری طرح سنادیا۔ حضرت حسنؓ کہتے ہیں کہ میں نے یہ حدیث (بوجوہ) ایک مدت تک (اپنے بھائی) حسینؓ سے چھپائے رکھی پھر اس حدیث کو میں نے حضرت حسینؓ کے سامنے بیان کیا تو معلوم ہوا کہ مجھ سے بھی پہلے حضرت حسینؓ کی رسائی اس حدیث تک ہوچکی تھی۔ وہ اپنے ماموں سے اس حدیث کے بارے میں خود دریافت کرچکے تھے (بلکہ) یہ بھی معلوم ہوا کہ وہ اپنے والد (حضرت علیؓ) سے بھی حضور اقدس ﷺ کے گھر کے اندر اور گھر سے باہر کے طور طریقے اور دیگر عادات واطوار کے سلسلے میں معلوم کرچکے تھے اور قابل بیان چیز نہیں چھوڑی تھی چنانچہ حضرت حسینؓ کہتے ہیں کہ میں نے اپنے والدؓ سے حضور ﷺ کے درون خانہ حالات دریافت کئے تو انہوں نے فرمایا کہ نبی کریم ﷺ جب مکان کے اندر تشریف لے جاتے تو اوقات کو تین حصوں میں تقسیم فرماتے تھے۔ ایک حصہ اللہ تبارک وتعالیٰ کے لئے مخصوص فرماتے، دوسرا حصہ اہل خانہ کے حقوق کی ادائیگی کیلئے اور تیسرا حصہ خود اپنے راحت وآرام کیلئے مختص فرماتے تھے۔

پھر اپنے حصے کو دو حصوں پر اپنے اور لوگوں کے درمیان تقسیم فرماتے تھے۔ (اس طرح افادۂ عام کیلئے) خواص صحابہ کے ذریعے اس جزء کو عوام تک پہنچادیتے تھے اور عوام وخواص سے کوئی چیز پوشیدہ نہیں رکھتے تھے (بلکہ ہر قسم کا افادہ عام فرماتے تھے) امت کے اس جزء میں آپ ﷺ کا طریقہ یہ تھا کہ اہل علم وفضل

کو(ملاقات کی اجازت) میں دوسروں پر ترجیح دیتے تھے۔اور دینی وعلمی فضیلت کے اعتبار سے اس وقت کو اہل فضل پر تقسیم کیا کرتے تھے۔اہل فضل میں سے کوئی تو ایک ضرورت لیکر حاضر ہوتا اور کوئی دو کام لیکر آتا اور کوئی متعدد حاجات لیکر پیش ہوتا۔ آپ ﷺ ان کی حاجت براری میں مصروف ہوجاتے اور ان کو بھی ایسے امور میں مشغول فرماتے جو خود ان کیلئے اور دیگر امت کیلئے مفید ہوں بسبب صحابہ کرام کے سوال اور نبی کریم ﷺ کی طرف سے مناسب جواب کے آپ ﷺ یہ بھی فرماتے تھے(مجھ سے استفادہ کرنے والے) حاضرین غائب لوگوں تک پہنچادیا کریں۔اور فرماتے کہ اُن ضرورتمندوں کی حاجتیں مجھ تک پہنچایا کرو جو(کسی وجہ سے) اپنی حوائج مجھ تک نہیں پہنچاسکتے۔ کیونکہ جو شخص کسی بااختیار تک کسی ایسے شخص کی حاجت پہنچاتا ہے جو خود اپنی حاجت اس تک نہیں پہنچاسکتا تو اللہ تعالیٰ قیامت کے روز اس کو ثابت قدم رکھیں گے۔حضور اقدس ﷺ کے پاس انہی(مفید) باتوں کے علاوہ کسی (فضول) بات کا تذکرہ نہیں ہوتا تھا اور نہ آپ ﷺ کسی سے کارآمد باتوں کے علاوہ کوئی بات سنتے۔صحابہ کرامؓ آپ ﷺ کی مجلس میں طالب(خیرو ارشاد) بن کرآتے اور وہاں سے بغیر کچھ چکھے نہیں ٹلتے تھے مجلس سے نکلتے وقت یہ لوگ رہنما بن کر نکلتے۔ یعنی رشد وہدایت کے رہنما۔

حضرت حسینؓ کہتے ہیں کہ پھر میں نے اپنے والد سے حضور اقدس ﷺ کی خارجی زندگی کے بارے میں پوچھا کہ گھر کے باہران کے طور طریقے کیسے تھے تو حضرت علیؓ نے جواب دیا کہ آپ ﷺ بامقصد باتوں کے سوا اپنی زبان کی حفاظت فرماتے تھے۔ (لایعنی باتیں نہیں کرتے تھے) وہ اپنے صحابہؓ میں الفت ومحبت پیدا فرماتے تھے۔اور ہرقوم کے عزتمند اشخاص کو خصوصی عزت دیتے تھے اور انہی کو ان کے قوم پر عہدہ دار بنادیتے تھے۔اسی کو اس قوم پر متولی بناتے تھے۔لوگوں کو(عذاب الٰہی سے

یا دوسرے بدقماش لوگوں سے) ڈراتے تھے(۱) اور خود بھی لوگوں سے بچنے کی کوشش فرماتے۔

بایں ہمہ کسی کو بھی اپنی خندہ پیشانی اور خوش اخلاقی سے محروم نہیں رکھتے تھے۔ غیر حاضر ساتھیوں کے بارے میں دریافت فرماتے تھے۔ لوگوں کے حالات کے بارے میں لوگوں سے پوچھتے تھے۔ ان کے اچھے کاموں کی تحسین اور تائید وتقویت فرماتے اور بری باتوں کی مذمت کر کے ان کا ازالہ فرماتے تھے۔ آپﷺ اپنے کاموں میں اعتدال سے کام لیتے تھے اور اختلاف (افراط وتفریط اور رنگارنگی) سے بچتے تھے۔ آپﷺ لوگوں کی اصلاح سے غافل اور بے فکر نہ بنتے۔ اس خوف کی وجہ سے کہ پھر وہ بھی دین سے غافل ہو جائیں گے۔ یا پھر بے اعتدالی کی وجہ سے دین سے اکتا جائیں گے (یا تن آسانی کا شکار ہو کر دین چھوڑ دینگے) ہر کام کیلئے آپﷺ کے پاس خصوصی تیاری تھی۔ حق کی اقامت میں کبھی کوتاہی نہ برتنے دیتے نہ حق سے تجاوز فرماتے۔ جو لوگ آپﷺ کی قربت اختیار کر چکے تھے وہ لوگوں میں سے سب سے بہتر اشخاص تھے۔ آپﷺ کے نزدیک وہی شخص سب سے افضل تھا جس کی خیرخواہی سب سے زیادہ لوگوں کے لئے ہوتی۔ اور سب سے عظیم المرتبہ شخص وہ ہوتا تھا جو لوگوں کی مؤاسات وغمخواری اور ان کی معاونت میں سب سے بڑھ کر ہو۔

حضرت حسینؓ کہتے ہیں کہ پھر میں نے اپنے والد سے نبی کریمﷺ کی مجلس کے بارے میں دریافت کیا تو انہوں نے بتایا کہ نبی کریمﷺ اللہ تعالیٰ کی ذکر کے ساتھ ہی اٹھتے اور ذکر کے ساتھ ہی بیٹھتے۔ اور جب کسی مجمع میں تشریف لے جاتے تو جہاں

---

(۱) یہ ترجمہ اس صورت میں ہوگا کہ یحذّر کا صیغہ ذال کی تشدید کے ساتھ باب تفصیل سے ہو اور اگر یہ ثلاثی مجرد سے ہو تو یاء اور ذال مفتوح ہونگے اور مطلب یہ ہوگا کہ آپﷺ بدقماش لوگوں سے بچتے۔ یوں بعد کا جملہ محض تاکید کیلئے لایا گیا ہے۔ ولیراجع الی الشروح فانّ فی اللفظ احتمالات وروایات (اصلاح الدین)

تک (بلاتکلف) رسائی ہوتی وہیں بیٹھ جاتے تھے۔اور لوگوں کو بھی اس کا حکم فرماتے تھے (کہ جہاں پر جگہ ملے بیٹھیں) اپنے ہم نشینوں میں سے ہر ایک کو اس کے استحقاق کے مطابق حصہ دیتے تھے ان کا کوئی ہم نشین یہ نہیں سمجھتا تھا کہ (حاضرین میں سے) کوئی شخص اس کی نسبت نبی کریمﷺ کے ہاں زیادہ قابل احترام ہے۔ جو شخص آپﷺ کے پاس بیٹھتا یا کسی ضرورت میں آپﷺ سے مراجعت کرتا۔تو نبی کریمﷺ اطمینان اور یکسوئی کے ساتھ اس کے پاس بیٹھے رہتے یہاں تک کہ وہ شخص خود ہی واپس چلا جاتا۔اور جو شخص آپﷺ سے کوئی چیز مانگتا تو آپﷺ اس کی مطلوب چیز بخشش فرما کر اسے لوٹاتے۔یا پھر شائستہ کلام کے ساتھ اسے واپس فرماتے۔ آپﷺ کی خندہ روئی اور کریمانہ اخلاق تمام لوگوں کیلئے تھی۔ سو آپﷺ امت کے لئے باپ کی طرح تھے اور سب لوگ حقوق کی وصولیابی میں آپﷺ کے ہاں برابر تھے۔

آپﷺ کی مجلس علم،حیاء،صبر اور امانت کی مجلس ہوتی تھی۔اس میں ایک دوسرے پر آوازیں بلند نہیں کی جاتی تھیں نہ اس میں کسی کی حرم پر تہمتیں باندھی جاتی تھیں نہ اس مجلس میں صادر ہونے والے لغزشوں کی تشہیر کی جاتی تھی۔اہل مجلس سب کے سب آپس میں برابر شمار ہوتے تھے۔البتہ تقویٰ کی بنیاد پر ان کو ایک دوسرے پر فضیلت حاصل ہوتی تھی حالت یہ تھی کہ وہ ایک دوسرے کے لئے عاجزی اختیار کرتے تھے۔صحابہ کرامؓ آپﷺ کی مجلس میں بڑوں کی عزت کیا کرتے تھے۔ چھوٹوں پر شفقت کرتے تھے حاجت مندوں کو اپنے اوپر ترجیح دیتے تھے اور مسافروں کی رعایت واکرام کیا کرتے تھے۔

<u>حضرت جمیع بن عمیر:</u> حدثنا جمیع بن عمیر جُمیع تصغیر کے صیغہ کے ساتھ پڑھا جاتا ہے۔اس کے والد کا نام بھی مصغّر "عمیر" ہے۔یہاں بعض نسخوں میں "عُمَر" اور بعض میں "عمرو" آیا ہے یہ دونوں

درست نہیں ہیں(۱) زوج خدیجة یہ ابو ہالہ سے بدل واقع ہوا ہے۔نہ کہ رجل من بنی تمیم سے۔ عن ابن لابی ھالة ابو ہالہ کے بیٹے سے یہاں اس کے پوتے مراد ہیں۔اس کا نام عمر ہے جبکہ ملا میرکؒ نے اس کا نام ہند بتلایا ہے۔جبکہ اس کے والد کا نام بھی ہند بن ابی ہالہ ہے بلکہ ابوعبیدؒ نے تو ابو ہالہ کا نام بھی ہند بتایا ہے یوں اس راوی اس کے والد اور اس کے دادا تینوں کا ایک ہی نام بنتا ہے(۲)۔باب خلق النبیﷺ کی ساتویں حدیث میں اس سند کا تفصیلی ذکر موجود ہے۔ہند بن ابی ہالہ نبی کریمﷺ کے لے پالک بیٹے اور حضرت خدیجہؓ کے بھی بیٹے ہیں۔یہ حضرت حسنؓ کے سوتیلے ماموں لگتے ہیں۔

و کان وصّافاعن حلیة رسول اللهﷺ ہمارے ماموں حضور اقدسﷺ کی شکل وشباہت کی باریکیاں اور باریک سے باریک عادات وصفات بیان کرتے تھے گویا وہ اس علم شمائل کے سپیشلسٹ تھے۔**و انا اشتھی ان یصف لی شیأً منھا** دوسری جگہ اس کے ساتھ ایک جملہ اور بھی ہے کہ **أتعلق به** یعنی میرے نانا جان کی عادات واخلاق کی تفصیل معلوم کروں اور یہ اس لئے کہ میں ان باتوں کو حجت اور سند بتاؤں اس علم سے وابستہ ہوجاؤں۔تاکہ اگر ممکن ہو تو اسے اپنے اندر پیدا کرنے کی کوشش کروں گویا صحابہؓ کا سوال بھی اور علم بھی برائے علم نہیں بلکہ علم برائے عمل تھا۔

<u>حضرات حسنینؓ کی مسابقت:</u> حضور اقدسﷺ کے وصال کے وقت حسن اور حسینؓ دونوں بھائی چھوٹے تھے۔حسنؓ کی عمر سات سال کی تھی اور حسینؓ کی اس سے بھی کم تھی۔تو حضورﷺ کی وصال کے بعد اجلہ صحابہؓ کے پاس جا جا کر دونوں بھائی تفصیلات معلوم کیا کرتے تھے۔اس میدان میں دونوں بھائیوں میں مسابقت رہتی تھی جب کہ علم اور دین میں یہ مسابقت اور یہ حرص ورشک محمود ہے تو ہر بھائی یہ چاہتا تھا کہ میرے پاس حضور اقدسﷺ کی کچھ امتیازی معلومات ہوں اور میں فرسٹ آجاؤں۔چنانچہ ایک عرصہ سے ایک نے دوسرے سے حدیث چھپائے رکھی تاکہ اسے دوسرے نمبر پر لے جاؤں۔الغرض حضرت ہند

---

(۱)جمیع بن عمیر بن عبدالرحمٰن العجلی ابوبکر الکوفی ضعیف رافضی من الثامنة(تقریب ۱۶۵/۱) لیکن بعض لوگوں کا خیال ہے کہ اس کے والد کا اصل نام تو عمر تھا چونکہ یہ غالی شیعہ تھا لہٰذا اس نے از خود والد کا نام تبدیل کر کے عمیر کر دیا تاکہ عمر فاروقؓ کا ہمنام نہ ہو۔کما قال المناوی ۳۸/۱،(اصلاح الدین)

(۲)جمع الوسائل ۳۹/۱

نے حضرت حسنؓ کو یہ حدیث سنائی کہ **کان رسول اللہﷺ فخماً مفخماً** وہ اپنی ذات میں بھی عظیم تھے اور لوگوں کی نگاہ میں بھی عظیم تھے۔ ذاتی عظمت بھی تھی اور لوگوں کے اوپر بھی چھاجاتے تھے۔ ایسی عظمت وشوکت اور دبدبہ اللہ تعالیٰ نے دیا تھا۔

یتلألأ وَجھهٗ تلألؤ القمر لیلة البدر جیسے چودھویں کا چاند روشن ہوتا ایسے چہرۂ انور چمکتا تھا۔ اور اس بارے میں علماء کا اتفاق ہے کہ حضورﷺ کے ان محاسن میں کوئی مبالغہ آرائی یا شاعرانہ تخیلات نہیں ہیں۔ جہاں حضورﷺ کی کوئی تشبیہ آتی ہے وہ تشبیہ پوری نہیں بلکہ ادھوری ہے۔ پھر اللہ نے پورے حسن وجمال کو ظاہر بھی نہیں کیا کیونکہ پھر نگاہوں میں دیکھنے کی تاب نہ ہوتی۔ صحابہ کرامؓ صرف انہی جلوؤں میں مدہوش ہوجاتے تو تعلیمات نبوت کو کیسے ملحوظ ومحفوظ رکھتے۔ درحقیقت مذکورہ تشبیہات صرف تمثیلات ہیں اس سے کہیں بڑھ کر حضورﷺ کا حسن وجمال تھا۔ مثلاً چاند کو دیکھنے والے صحابی کی ایک نظر چاند پر دوسری رُخ انور پر ہوتی ہے تو قسم کھا کر کہتے ہیں کہ چہرۂ انور چاند سے بڑھ کر حسین تھا۔ سورج تو گویا آپﷺ کے چہرے کے اندر ہی جاری وساری ہے۔ یہ روایات وضاحت سے اس بات کی دلیل ہیں کہ نبی کریمﷺ کا چہرۂ سورج چاند سے زیادہ حسین تھا۔ **فذکر الحدیث بطوله** وہ تفصیلی حدیث اس کتاب میں بھی متفرق ذکر کیا گیا ہے کچھ حصہ پہلے باب میں اور کچھ دوسرے ابواب میں لائے گئے ہیں۔

قال الحسن فکتمتھاالحسین زمانا میں نے وہ حدیث اپنے بھائی حسینؓ سے ایک عرصہ تک چھپائے رکھی تاکہ اچانک ظاہر کروں گا تو مجھے فضیلت اور اولیت حاصل ہوگی(۱)۔

ثمّ حدثته فوجدته قدسبقنی الیه مگر مجھ سے صبر نہ ہوسکا کہ صحابہؓ علم کو چھپاتے نہیں تھے

(۱) اس حدیث کو پوشیدہ رکھنے میں شراح نے اور بھی حکمتیں بتائی ہیں۔ مثلاً اول یہ کہ اپنے چھوٹے بھائی حضرت حسینؓ کا امتحان لینا مقصود تھا کہ وہ از خود تحصیل علم کا شوقین بھی ہے یا نہیں۔ دوم یہ کہ حضرت حسینؓ کو یہ موقع فراہم ہوجائے کہ وہ اس حلیہ کو سند عالی سے یعنی خود ماموں سے حاصل کرے۔ سوم یہ کہ حضرت حسینؓ کی طرف سے طلب اور استفسار کا حضرت حسنؓ کو انتظار تھا کہ وہ پوچھے گا تو بتاؤں گا۔ کیونکہ جو چیز طلب کے بعد حاصل ہوجائے وہ زیادہ قابل قدر ہوتی ہے۔(اصلاح الدین)

ایک دن یہ حدیث بیان ہی کردی حسینؓ کو میں نے بتادیا کہ میرے پاس تو نانا جان کی یہ حدیث بھی ہے۔ حسینؓ نے سن کر کہا ارے بھائی تم کس گمان میں ہو مجھے تو تم سے بھی پہلے یہ حدیث مبارک حاصل ہوئی اور اس سے بڑھ کر مجھے اور بھی معلومات ہیں۔ ماموں جان ہندؓ کے علاوہ میں نے تو ابا جان حضرت علیؓ سے بھی اس قسم کی باتیں پوچھی تھیں۔ **فسالہ عماسألتہ فوجدتہ قدسال اباہ عن مدخلہ وعن مخرجہ الخ،** انہوں نے تو اپنے والد سے پوچھ لیا تھا کہ حضور ﷺ کی داخلی زندگی (مدخل) گھریلو زندگی، بیوی بچوں کے ساتھ رہنا، خلوت کی زندگی، نجی زندگی کیسی تھی نیز (مخرج) خارجی زندگی عوامی زندگی سٹیج کی زندگی جلوت کی زندگی کیسی تھی۔

وشکلہ شکل وصورت مراد نہیں بلکہ شاکلہ بمعنی **الطریقۃ المسلوکۃ** سے ہے۔ تمام طور طریقے اس میں آگئے۔ **فلم یدع منہ شیئاً** ضمیر حضرت علیؓ کو راجع ہے یعنی انہوں نے کوئی چیز بیان کرنے میں نہ چھوڑی۔ یا پھر حضرت حسینؓ کو راجع ہے یعنی حضرت حسینؓ نے کوئی بات پوچھنے سے نہیں چھوڑی تھی جو اسے محفوظ نہ ہو۔ خانگی زندگی کے بارے میں بھی پوچھا، باہر کی زندگی تو صحابہ کرامؓ کو معلوم ہی تھی۔

<u>گھر میں ٹائم ٹیبل:</u> **کان اذااوی الی منزلہ جزّء دخولہ،** دخول سے زمانہ دخول مراد ہے جب حضور ﷺ گھر تشریف لاتے تو جتنا وقت گزارنا ہوتا مثلاً چھ گھنٹے وقت ملا تو ان چھ گھنٹوں کو تین حصوں میں بانٹ لیتے۔ گویا ایک نظام الاوقات تھا ہماری طرح بغیر پروگرام اور ڈسپلن کی زندگی نہ تھی۔ ہر چیز کا ٹائم ٹیبل تھا تو حضور ﷺ گھر کے اس وقت کا بھی ٹائم ٹیبل بنالیتے۔ **جزّءً اللہ عزوجل،** ایک حصہ اللہ تعالیٰ کی عبادت کیلئے مخصوص کر لیتے۔ کہ دو گھنٹے نوافل تلاوت ذکر وغیرہ اللہ کی عبادت اور مناجات میں گزارتے۔ اور **جزءً لاھلہ** ایک حصہ اہل وعیال کیلئے یعنی ان کی حالت جاننے اور تسکین وتسلی کی کوشش فرماتے۔ یہ نہیں کہ سارا وقت عبادت میں گزرجائے اور گھر والوں کی حق تلفی ہو۔ **وجزءً لنفسہ،** تیسرا حصہ اپنی ضرورت اور راحت وآرام کیلئے رکھتے تھے یہ نہیں کہ آرام ہی نہ کیا جائے۔ ہر چیز میں اعتدال ملحوظ تھا۔ تبتل اور رہبانیت سے اجتناب فرمایا کرتے۔

<u>وجہ تعارف اور ذوق عبادت:</u> ایک صحابیہ خاتون(۱) حضورﷺ کے گھر میں حاضر تھیں کہ حضور اقدسﷺ تشریف لائے تو حضرت عائشہؓ سے پوچھا کہ یہ کون خاتون ہیں۔حضرت عائشہؓ نے عرض کیا کہ حضورﷺ یہ فلان ہے۔ اور ساری ساری رات عبادت میں گزارتی اور جاگتی ہے۔

گویا صحابہؓ کے ہاں تعارف بھی ان چیزوں (عبادت) سے ہوتا تھا۔یہ نہیں کہ یہ فلان نواب ہے یہ فلان جاگیردار ہے یہ فلان افسر ہے یہ ڈی سی اور اے سی ہے بلکہ اتنی نماز پڑھتا اور اتنے روزے رکھتا ہے اتنا جہاد کیا ہے یہ اعمال یہ عبادات وہ کرتا ہے یہ باتیں صحابہؓ کے لئے قابل اہمیت اور ذریعۂ تعارف تھیں۔تو فرمایا یہ بے چاری صبح تک جاگتی ہے اور پلک تک نہیں جھپکتی۔ بلکہ عبادت میں ہی مصروف رہتی ہے۔حضورﷺ نے فرمایا کہ میں تو سوتا بھی ہوں اور عبادت بھی کرتا ہوں۔بیوی کا بھی تم پر حق ہے،آنکھوں کا بھی تم پر حق ہے۔تمہارے نفس کا بھی تم پر حق ہے۔جسم اور آنکھوں کا بھی تم پر حق ہے اور ان کو آرام کی ضرورت ہے تمہیں ہر چیز اعتدال پر رکھنی ہے۔

<u>رہبانیت کی سیاہ تاریخ:</u> ورنہ رہبانیت ہو جائے گی جس کی بڑی سیاہ تاریخ ہے اور جو بھی فطرت کے خلاف طریقے اختیار کئے جائیں جو فطرت کے ساتھ نہ چل سکیں تو ان کا ردعمل بھی آگے چل کر نہایت شدید ہوتا ہے رہبانیت بھی آگے چل کر فحاشی اور بے حیائی کا عظیم ذریعہ بنا۔

یہ کلیسائی نظام یہ پاپائیت اسی کی ایک بھیانک شکل ہے۔تو حضور اقدسﷺ فرماتے ہیں کہ میں تو سوتا بھی ہوں ، میں تو کھاتا پیتا بھی ہوں، میں تو بوقت ضرورت بازاروں میں جاتا ہوں ، میں تو شادیاں بھی کرتا ہوں یہ تو کوئی کمال کی بات نہ ہوئی کہ انسان زندگی سے فرار اختیار کر لے اور غاروں میں بیٹھ جائے۔اسلام میں تبتل اور رہبانیت کی گنجائش نہیں۔کوئی بھولے بھالے بزرگ ہوں تو آتے ہی گھر میں ایک طرف بیٹھ جاتے۔ بیوی بچوں سے کہتے کہ جاؤ آرام کرو مجھے تو عبادت ہی سے فرصت نہیں۔

---

(۱)ان کا اسم گرامی حولاء بنت تویتؓ ہے جن کا ذکر باب صوم النبیﷺ میں ہو چکا ہے۔لیکن وہاں نبی کریمﷺ کے الفاظ یوں منقول ہیں"فقال رسول اللهﷺ علیکم من الاعمال ماتطیقون فواللّٰه لایملّ اللّٰه حتی تملّوا وکان احبّ ذالک الی رسول اللّٰهﷺ الذی یدوم علیه صاحبه.(اصلاح الدین)

ساری رات میں نے عبادت میں گزارنی ہے ساراوقت تبلیغ ہی کے لئے ہے۔نہیں بلکہ حضوراقدسﷺ نے اوقات بانٹ دیئے تھے۔ایک حصہ اللہ تعالیٰ کا،ایک حصہ اپنے اہل وعیال کیلئے تاکہ بیوی بچوں سے پیار کی باتیں ہوں ان کی دلجوئی ہو۔ان کی ضروریات وحوائج معلوم کی جائیں۔گھر کے مسائل پر بات چیت کی جائے اورانہیں نمٹایا جائے۔''وجزءً لنفسہ''یعنی ایک حصہ اپنے لئے مخصوص فرماتے یعنی آرام، سونااور قیلولہ۔پھراپنے حصہ میں حتی الوسع ایثارفرماتے اورکوشش کرتے کہ کچھ اوقات ولمحات اس سے بھی امت کی صلاح وفلاح کے کاموں میں صرف ہوں۔

<u>اصلاح امت کی فکر:</u> **ثمّ جزّء ہ بینہ وبین النّاس فیردذلک بالخاصۃ علی العامۃ،** اس اپنے حصہ کوبھی دوحصوّں میں تقسیم فرمایا یعنی اس کا آدھاحصہّ بھی باقی لوگوں کے درمیان تقسیم فرمادیتے اس طرح کہ خصوصی صحابہؓ اس وقت داخل ہوتے۔ان خواصِ امت کے ذریعہ سے اس وقت کے علوم ومضامین اورمشوروں کا بھی فائدہ عام امت کو پہنچتا۔حضورﷺ کی تو ساری زندگی امت کیلئے تھی۔زندگی ایک عجیب گھٹن میں گزاردی۔کڑھتے تھے،اندراندرسلگتے تھے،امت کے غم میں،کہ کسی طرح اصلاح ہوجائے امت کی،نہ آرام،نہ راحت،یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ نے ایک جگہ خودذکرکیا کہ **لعلّک باخعٌ نفسک** کیاتم غم سے اپنا گلہ گھونٹنا چاہتے ہو۔امت کی فکر میں ایسے کڑھتے ہو۔ایساغم کرتے ہوکہ تمہیں تو جیسا پھندا لگ گیاہو۔جیسے کسی شدیدغم کی وجہ سے گلے میں پھندا سا لگ جاتا ہے،نہ کچھ نگل سکتا ہے نہ بات چیت کرسکتا ہےاورشدیدغم کی وجہ سے بسااوقات گھٹ کرآدمی مرجاتا ہے۔تواللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ اتنا غم کیوں کرتے ہوتم تو امت کا حق ادا کررہے ہو۔تو اتنی فکر تھی حضورﷺ کوامت کی۔اس لئے اپنے آرام کے اوقات بھی بانٹ لیا کرتے تھے کہ چلئے اس میں سے بھی کچھ وقت بنی نوع انسان کی بھلائی میں خرچ کردوں۔خواص کے ذریعے عوام کو فائدہ پہنچادوں۔صورت یہ ہوتی کہ حضرت ابوبکرؓ آتے ہیں، حضرت عمرؓ آتے ہیں،حضرت خالدؓ ہیں،حضرت علیؓ آتے ہیں کوئی کسی فوجی مہم کے امیر ہیں۔کوئی اہم ذمہ داری والے صاحب ہیں۔ضرورت ہوتی کہ وہ لوگ کسی مخصوص وقت میں مشورہ حاصل کرسکیں تو ان میں سے ایک ایک کو بلاتے اس طرح ان سے بھی جو بات ہوتی وہ کیاہوگی؟اسی امت کی صلاح وفلاح سے

متعلق امور ہی ہوں گے۔تو وہ وقت بھی اس طرح بٹ جاتا اوران کے واسطے سے ساری امت کو پہنچ جاتا جواب قیامت تک مستفید ہورہی ہے۔

و لایدخر عنهم شیئاً ،اورحضور اقدس ﷺ کوئی چیز امت سے اورلوگوں سے چھپا کرنہیں رکھتے تھے یہ ایک باطل تصور ہے بعض لوگوں اور فرقوں کے ہاں مشہور کہ ہمارے پاس مخصوص اسرار وعلوم ہیں ایسا ہرگز نہ تھا حضور ﷺ کسی سے کوئی علم کی بات مخفی نہ رکھتے تھے۔علوم الٰہیہ علوم دینیہ سب عام ہوتے۔ دوسرا مطلب اس جملے کا یہ بھی ہے کہ گھر میں جو کچھ بھی ہوتا کسی نہ کسی چیز سے ملاقاتیوں کی تواضع فرماتے۔ادخاراور ذخیرہ اندوزی نہ فرماتے کہ یہ چیز کل میرے کام آجائے گی بلکہ جو آیا حضور ﷺ نے میزبانی میں تقسیم کردیا خرچ کردیا۔ **وکان من سیرته فی جزء الامة ایثار اهل الفضل باذنه وقسمه علی قدرفضلهم فی الدین،** اس خاص وقت میں یا پھر عام وقت میں جوملاقاتوں کا ہوتا تو سینکڑوں کا ہجوم ہوگا۔ کھلے بندوں ہر شخص بات بھی نہیں کرنا چاہتا تو ملاقاتیوں کی ترتیب ملحوظ رکھنی ہوتی ہے۔اسی حکمت عملی کو آپ ﷺ روبہ عمل لاتے۔

<u>فرق مراتب:</u> توحضور ﷺ فرق مراتب ملحوظ رکھتے۔ایک ایک کو بلاتے تھے یہ نہ تھا کہ جو پہلے آیا وہ پہلے ملا بلکہ ''**ایثار اهل الفضل الخ** ''جو فضیلت والے تھے علم میں تقویٰ میں دین میں اور جو اسلام کی خدمات اور قربانیوں میں بڑھ کر تھے اس کا مقام علمی لحاظ سے اونچا ہے۔فضل کے معنی دنیاوی معیار نہ ہوتا بلکہ اہل فضل ہوتے اللہ والے۔مخلوق کی بھلائی کے لحاظ سے جس کا جتنا اونچا مقام ان چیزوں میں ہوتا تھا ملنے میں ان کو ترجیح دیتے تھے۔پھر ملاقات کا وقت بھی اسی مناسبت اور مرتبہ کے لحاظ سے طے ہوتا۔یہ نہیں کہ ہر ہمہ شما سب کو دودو منٹ بلکہ جس کا مقام اور فضل جتنا اونچا ہے اس کو وقت بھی زیادہ ملتا جو کم ہے تو کم وقت یا اس کے مسائل کم ہیں تو کم اور زیادہ ہوتے تو زیادہ وقت کسی دینی مہم میں کوئی جاتا تو زیادہ وقت کسی ذاتی مسئلہ میں آیا ہے تو منٹوں میں نمٹالیا جاتا۔تو فضیلت **فی الدین** اورضروریات کے لحاظ وہ وقت تقسیم ہوتا۔

فمنهم ذوالحاجة ومنهم ذوالحاجتین ومنهم ذوالحوائج کسی کے پاس ایک فائل ہے کسی کے پاس دو فائل ہیں۔کوئی بہت سی حاجتیں لے کر آیا ہے۔کوئی کم اور امت کے سارے مسائل

ضروریات اور حاجات کی مرجع آپ ﷺ کی ذات تھی تو وہ مسائل کے پلندے لے کرآتے مگر حضور ﷺ کو کوئی ناگواری محسوس نہ ہوتی نہ یہ کہ اس وقت صرف ایک درخواست پیش کرنی ہے بلکہ سارے مسائل اور حاجات پیش کرنے کی اجازت ہوتی۔ **فیتشاغل بهم ویشغلهم فیمایصلحهم والامة**، الامۃ کالفظ عام ہے۔ حاضرین حاجت مندوں کو بھی شامل ہے اور قیامت تک آنے والی انسانیت کو بھی تو یہ عطف العام علی الخاص کے قبیلے سے ہے تاکہ شمول وعموم مستفاد ہو۔ پس حضور ﷺ پوری توجہ سے ان کے ساتھ مشغول ہوجاتے پھران کوایسے کاموں میں مشغول رکھتے کہ جن سے ان کوفائدہ ہو۔ان کی اصلاح ہوتی ہو اوران کے ذریعہ سے آگے چل کر ساری امت کی بھی اصلاح ہوتی ہو۔ دنیاوی دھندوں، سیروتفریح، فضول گپ شپ اورتعیّشات میں صحابہ کو مصروف نہ ہونے دیتے اور سربراہ مملکت ایسا ہی باہر جاکر کرتے ہیں وفد ساتھ ہوتا ہے اگر چند منٹ بھی ہوتے ہیں تو بڑے لوگوں کے ہاں لمٹ (Limit) یعنی محدود وقت ہوتا ہےتو صدرصدر کے ساتھ مذاکرات میں مصروف ہوجاتا ہے۔وزیرخارجہ، وزیرخارجہ کے ساتھ اور ہرشعبہ کا سربراہ اپنے شعبوں سے متعلقہ افراد کے ساتھ مذاکرات میں مصروف ہوجاتا ہے تاکہ اس دورے سے زیادہ سے زیادہ فائدہ اٹھایا جائے۔تو حضور ﷺ کے پاس اتنا وقت تو نہ تھا کہ کوئی آیا تو گپ شپ اور لایعنی باتوں میں لگے رہیں بلکہ یک دم کام کی باتیں شروع ہوجاتیں اوروں کیلئے بھی یہی حکم تھا کہ جن چیزوں میں تمہارا فائدہ ہو۔انہی باتوں میں لگے رہو۔اوروہ باتیں کس قسم کی ہوا کرتی تھیں؟ **من مسئلتهم عنه واخبارهم بالذی ینبغی لهم**، بعض شراح نے من کو بیانیہ قرار دیا ہےتو یہ بیان ہے **مایصلحهم** کیلئے۔ مطلب یہ ہے کہ امت کی بہبود اور دین ودنیا کی سرخروئی کی باتیں سب کا مشغلہ ہوتی تھیں۔ وہی جو صحابہ آپ ﷺ سے دریافت فرماتے تھے اور آپ ﷺ ان سائلین کے احوال واستفسارات کے مطابق جوابات مرحمت فرماتے تھے لیکن علامہ ابن حجرؒ نے اس کورد کرتے ہوئے کہا ہے کہ یہاں من تعلیلیہ ہے۔ مطلب یہ ہے کہ ان امور کی افادیت صحابہ کرامؓ کے سوال اور آپ ﷺ کی طرف سے جوابات کی وجہ سے ہے۔ ظاہر ہے کہ صحابہ کرامؓ دینی امور کے بارے میں حضور ﷺ سے سوالات کرتے اور حضور ﷺ ان کو ان طریقوں سے آگاہ کرتے جو ان کیلئے یعنی امت کیلئے زیادہ مناسب ہوتے تھے اور جن میں ان کی بھلائی ہوتی۔

ویقول لیبلغ الشاهد منکم الغائب ، پھر یہ بھی تاکید فرماتے کہ جو کام کی باتیں تمہیں معلوم ہوئیں۔ مسائل کا جو حل معلوم ہوا، جو علم حاصل کیا۔ یہ چیزیں جن تک نہیں پہنچیں ان تک بھی پہنچاؤ۔ یہ علم اپنے ساتھ مخصوص نہ رکھو۔ شاہد یعنی جو حاضر ہیں عالم ہیں وہ غائب تک پہنچائیں۔ اگر صحابہ کو یہ حکم نہ ہوتا اور اس پر عمل نہ کرتے تو یہ حدیث ہم تک نہ پہنچتی اور یہی درحقیقت "**یشغلهم فی مایصلحهم والامة**" کی اہم ترین صورت ہے کہ پیغمبر کے وارث بن کر اس کی تعلیمات کی اشاعت کریں۔ پھر فرمایا **وابلغونی حاجةً من لایستطیع ابلاغها** ، ملاقاتیوں کو بھی یہ تاکید فرماتے کہ جو بے چارے دور ہیں کسی مجبوری کی وجہ سے اپنی ضروریات مجھ تک نہیں پہنچا سکتے تو جب تم لوگ میرے پاس آیا کرو تو ایسے لوگوں کی ضروریات و مسائل بھی مجھ تک پہنچادیا کرو مثلاً کوئی دور ہے، غلام ہے بیمار ہے یا پردہ نشین ہے، کوئی ہیبت اور رعب یا حیا کے مارے سامنے نہیں آسکتا۔ تو ان کی ضروریات بھی مجھ تک پہنچادیا کرو۔ خواہ وہ دینی ضرورت ہو یا دنیاوی حاجت۔ ہمارے حکام تو ایسے آدمی کو ڈانٹ دیتے ہیں کہ تمہیں اوروں کی کیا پڑی ہے اپنی بات کرو۔ مگر حضور ﷺ ایک ایک کو فرماتے کہ جہاں جہاں کوئی محتاج ہو، مستحق ہو، مصیبت زدہ ہو مسائل کا شکار ہو، تو ان کے مسائل مجھ تک پہنچادیا کرو۔ اس لئے کہ **فانه من ابلغ سلطاناً حاجة من لایستطیع ابلاغها ثبّت الله قدمیه یوم القیامة** ، سلطان صرف بادشاہ کو نہیں کہتے ہر بااختیار سلطان ہے۔ اگر ڈی سی ہے، اے سی ہے، گورنر ہے اس کو اپنے دائرے میں سلطان کہیں گے یعنی تسلط اور اختیار والا۔ اگر اس کو کسی نے کسی محتاج وغریب اور ضعیف کا مسئلہ پہنچادیا تو اللہ تعالیٰ قیامت کے دن اسے ثابت قدم رکھے گا اسکے بدلے کہ اس نے ڈگمگانے والوں کو دنیا میں سہارا دیا۔ مشکلات کی دلدل سے نکال دیا۔ تو اللہ تعالیٰ قیامت کے دن پل صراط پر اسے ثابت قدم رکھے گا۔

<u>جائز ناجائز سفارش کی نوعیت:</u> یہ سفارش ہے مگر وہ سفارش نہیں جو ہم کرتے ہیں کہ فلاں کا حق ہے لیکن اس کا حق مار کر اس کو دے دیں۔ باقی اگر ایک شخص مستحق ہے اور وہاں پہنچ نہیں سکتا۔ اپنا مسئلہ گورنر کے پاس، ڈی سی کے پاس، صدر کے پاس اور آپ کسی کی حق تلفی اس سے نہیں کرنا چاہتے اور اس کی سفارش کرلیں آپ کے چند جملوں سے اس کا کام ہوجائے تو اس کا اللہ تعالیٰ آپ کو اجر دے گا۔ ہم تو سفارش

کا معنیٰ یہ لیتے ہیں کہ فلاں دیانتدار اور مستحق ہے اس عہدے کیلئے اس کو ہٹا کر دوسرے کو یہ منصب دے دو حالانکہ مستحق کا حق اس کو دینا چاہئے اگر دیانت دار کوئی اور آدمی ہے۔ اس کے پاس اہلیت اور سب کچھ ہے لیکن تم کہتے ہو کہ یہ حق فلاں کو دے دو۔ یہ سفارش جو ہے مذموم ہے۔ باقی یہ سفارش جو حضور ﷺ نے بیان فرمائی اس کی تو بڑی فضیلت حضور ﷺ نے خود فرمائی **و لایذکر عنده إلاّ ذلک**، حضور ﷺ کی مجلس میں باتیں بھی صرف یہی دین ودنیا کی ضرورت کی باتیں ہوتی تھیں۔ دنیوی فضول باتیں نہیں بلکہ دین ودنیا کی ضروری اور مفید باتیں ہوتی تھی۔

و لایقبل من احدٍ غیره، اور میل جول رکھنے والوں میں سے اس کے علاوہ اور باتیں پسند بھی نہ کرتے تھے۔ یہ ماقبل کیلئے تاکیدی جملہ ہے۔ خلاصہ یہ ہے کہ دنیوی باتیں، جہاد کے امور، مملکت کے متعلق امور، ڈسپلن کے انتظامی امور سے متعلق یہ باتیں بھی گناہ نہیں یہ بھی عبادت ہیں لیکن بے ہودہ فضول باتیں اور بے مقصد نہ کرنے دیتے۔ **یدخلون رُوّاداً**، ہر ایک طالب بن کر آتا۔ کسی نہ کسی چیز کا طلب گار۔ کوئی مسائل لے کر آتا، کوئی دین سیکھنے کے لئے آتا، روّاد جمع ہے رائد کی رائد کہتے ہیں اس شخص کو جو قافلہ کے آگے آگے چل کر قافلے والوں کیلئے پانی اور جانوروں کیلئے چارے کی تلاش کرتا ہے۔ یہاں پر ان صحابہؓ کو جو خود اپنے لئے اور امت کیلئے مہبط وحی اور منبع ہدایت سے آب حیات اور زاد آخرت حاصل کرنے آتے روّاد کہا گیا کیونکہ وہ بھی منافع اور حکمتوں کے طالب ہوتے تھے۔

و لایفترقون الاّعن ذواق، حضور ﷺ سے الگ نہ ہوتے ان سے واپس نہ جاتے مگر کچھ چکھا ہوتا۔ ذواق مذوق (چکھی ہوئی چیز) یا مصدر یعنی چکھنے کو کہتے ہیں جبکہ ''عن'' بعد کے معنیٰ میں آیا ہے یعنی بعد ذواق۔ اس کے دو مطلب ہیں۔ ایک یہ کہ حضور ﷺ کے گھر میں ہر وقت فقر تھا لیکن پھر بھی کسی نہ کسی چیز سے مہمان کی تواضع فرماتے۔ حضور ﷺ کی اتنی غیرت اور حمیّت تھی اور مہمان نوازی کا یہ عالم کہ ٹھنڈا پانی اگر ہے اور ایک کھجور ہے کم از کم وہ چکھ لو، کوئی ملنے والا ان سے بغیر کچھ چکھے نہیں جا سکتا تھا۔ معلوم ہوا کہ گھر پر آیا ہوا کوئی بھی مہمان ہو۔ اسے اس طرح نہیں واپس کرنا چاہئے۔ اور دوسرا مطلب یہ ہے کہ کچھ نہ کچھ رشد و ہدایت اپنے دامن میں لے کر جاتے تو ذواق علم و ہدایت سے کنایۃ ہے وہ خالی دامن آتے اور

دامن بھر کے لے جاتے اپنے اپنے ظرف اور اپنے اپنے دامن کی وسعت کی بات تھی۔تو جو کوئی آتا بالکل محروم نہ جاتا کچھ نہ کچھ حصہ علم کا اور کچھ دین کے فائدے لے کر جاتا۔ویخرجون ادلّۃ،اور پھر جب وہ واپس جاتے تو ہر ایک ایک عظیم رہنما ہوتا۔دلّیل کا معنی ہے دلالت علی الخیر کرنے والا، ہر ایک روشنی کا مینار بن کر چلا جاتا۔خیر اور بھلائی، رہنمائی کی باتیں بیان کرنے والا۔چنانچہ آپﷺ فرماتے ہیں اصحابی کالنجوم بایّھم اقتدیتم اھتدیتم۔جبکہ بعض نسخوں میں اذلّۃ یعنی ذال کے ساتھ بھی آیا ہے کہ وہ جو ہدایت سن لیتے تھے۔اس کے لئے سرنگوں اور قبول کرنے والے ہوتے تھے۔اس کے لئے گردن نہاد ہو جاتے تھے۔قال سالتہ عن مخرجہ،فرمایا پھر میں نے ان سے پوچھا۔حضور اقدسﷺ کی عوامی زندگی کیسی تھی جب باہر تشریف لاتے تھے،سٹیج پر جلسے میں،اجتماع میں۔ کیف کان یصنع فیہ،تو اس وقت حضورﷺ کے کیا معمولات تھے گھر کے باہر آپﷺ کی معاشرتی اور سیاسی زندگی اور مدبرانہ طرز عمل کی حسین تصویر ملاحظہ فرمائیں۔

لایعنی باتوں سے احتراز: کان رسول اللّٰہ یخزن لسانہ الاّفی مایعنیہ ،حضورﷺ باہر بھی اپنی زبان محفوظ رکھتے تھے سوائے ضروری باتوں کے۔''مایعنی'' ان باتوں کو کہتے ہیں جن سے کوئی دینی فائدہ ہو یا دنیوی فائدہ ہو۔با مقصد باتوں میں تو قوت گویائی صرف کرتے تھے اور لایعنی (بے مقصد بے کار) باتوں سے اجتناب کرتے تھے۔زبان کو قیمتی خزانہ کی طرح رکھتے تھے۔زبان تو ایک قیمتی خزانہ ہے۔اس کو بے مقصد ضائع نہیں کرنا چاہئے اس کو اگر ہم نے صحیح مصرف پر لگایا تو بہت عظیم چیز ہے اور غلط جگہ پر خرچ کیا تو حضور ﷺ فرماتے ہیں کہ بعض اوقات انسان گپ شپ میں ایسی بات کہہ جاتا ہے کہ اسے احساس تک نہیں ہوتا اور جہنم کے آخری اور نچلے درجے میں پہنچ جاتا ہے۔اکثر لوگ زبان قینچی کی طرح چلاتے ہیں کسی کی آبروریزی کی، کسی کی غیبت کی، کسی پر تہمت لگائی، کسی پر الزام تراشی کی، اس کو پرواہ بھی نہیں ہوتی لیکن تباہی کے کنارے پہنچ جاتا ہے۔ایک اور حدیث میں آپﷺ نے اس قسم کی باتوں کو حصائدالالسنۃ کہا ہے۔حصد کہتے ہیں کھیت کاٹنے کو، اب گندم جس سے ہم کاٹتے ہیں اسے ہم پشتو میں لور کہتے ہیں یعنی درانتی،تو یہ زبان درانتی ہے اور کیا کاٹتی ہے جتنی عبادات اس نے کی ہیں۔نمازیں، روزے، حج جو اخلاق،

جو اعمال جو نیکیاں تھیں وہ کاٹ دیں اسی درانتی نے اس وجہ سے ہم کامیاب نہیں ہوتے کیونکہ جس طرح درانتی چلاتے ہیں اس طرح زبان بھی استعمال کرتے ہیں اور سارے کئے کرائے پر پانی پھیر لیتے ہیں تو یہاں حضور اقدس ﷺ کے بارے میں ارشاد ہے کہ وہ کسی جگہ بلامقصد ایک جملہ بھی نہیں استعمال کرتے تھے۔

مجسمۂ حیاو پیکر عفت: ویؤلفهم حضور ﷺ ملنے والوں کو اپنی رعایا کو اور اپنے زیر اثر لوگوں کو مانوس فرماتے تھے و لاینفرھم، ان کو اپنے سے متنفر اور متوحش نہیں کرتے تھے۔ ان کی تالیفِ قلب کا انتظام کرتے تھے۔ ان کو اپنے قریب لاتے تھے۔ ایسا نہیں کہ کوئی آیا، ذرا نا مناسب بات دیکھی تو اسے ڈانٹا اور دھمکایا کہ تو نے یہ جرم کیا ہے میرے قریب مت آ، تیرے اندر فلاں عیب کیوں ہے۔ جیسے بعض حضرات کسی کو دیکھتے ہی شور مچاتے ہیں کہ داڑھی کیوں مونڈھی ہے یا سر کے بال ایسے کیوں رکھے ہیں اور تم نے فلاں جرم کل کیا تھا کل تم نے چوری کی تھی اور پھر بھرے مجلس میں اسے رسوا کرتے ہیں۔ تو حضور اقدس ﷺ مجلس میں کسی پر تنقید نہیں کرتے تھے مجسم حیا تھے اور عفت و مروت کے پیکر تھے۔ آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بات نہیں کرتے تھے۔ حدیث میں آتا ہے کہ جیسے ڈولی میں دُولہن ہوتی ہے۔ جس حالت میں گھونگھٹ میں ہوتی ہے۔ اس سے زیادہ حضور ﷺ کا حیا تھا روبرو کسی کو سنانا بڑی بات تھی اتنا شرمیلاپن تھا کہ آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر مخاطب نہیں ہوتے تھے عموماً نیچے دیکھتے مجسم حیا تھے۔

ایک صحابیؓ آئے ان کے کپڑوں پر حضور ﷺ نے کچھ رنگ و روغن دیکھا جو مردانہ لباس کے ساتھ مردانگی کے ساتھ مناسب نہیں تھا۔ جب وہ مجلس سے اٹھ کر چلے گئے تو حضور ﷺ نے دوسروں سے کہا تم لوگ اسے سمجھاتے کیوں نہیں۔ تم اسے سمجھا دو تو بہتر ہوگا یعنی خود روبرو تنقید بھی گوارا نہ کرتے (۱)۔

آج کے مولوی صاحب ممبر پر بیٹھے ہوتے ہیں اور وعظ میں سب کو ایک ہی ڈنڈے سے ہانک رہے ہیں اور گالی گلوچ دے رہے ہیں اس سے کیا فائدہ؟ ہر شخص میں خامیاں تو ہوتی ہیں۔ مجلس میں بیٹھتے

---

(۱) آپ ﷺ کی اس خوبی کا بیان قرآن میں بھی موجود ہے قال تعالیٰ: ولو كنت فظاً غليظ القلب لانفضّوا من حولك.(اصلاح الدين)

ہی اسے ملحد اور زندیق بنادیا تو وہ دوسرے دن کیا آئے گا؟ ہرگز نہیں، جب کوئی ملاقاتی آپ کے پاس آیا اور آپ نے درشت لہجہ میں اور سختی سے اس سے بات چیت کی تو آئندہ وہ آپ کے پاس کیسے آئے گا؟ آپ کیسے اپنے فرائض سے سبکدوش ہوں گے۔ دوسری جگہ حضورﷺ نے ارشادفرمایا۔

تلقین، تبشیر اور تنفر: ''بشــرًا وَلاتــنــفّـرا ''لوگوں پرآسانی پیدا کرولوگوں پرتنگی نہ لاؤ۔ جوکامیاب مصلحین ہیں وہ تو جو بھی آتا ہے ان کو پتہ بھی ہے کہ بدترین گنہگار اور مجرم ہے مگر وہ ان کو سینے سے لگاتے ہیں ان پر شفقت کا ہاتھ پھیرتے ہیں وہ ان کے ساتھ محبت کرتے ہیں اور وہ کہتا ہے کہ بھئی تم تو بہت بڑے ولی ہو۔ پاک ہو تو وہ خود اپنے دل میں سوچنے لگتا ہے نادم ہوتا ہے اور کھچ کر چلا آتا ہے۔ تو حضوراقدسﷺ کے پاس جو بھی آتا بڑے سے بڑا ملحد اور فاسق وفاجر وہ ایسا کھچ کرآتا کہ پھر وہیں کا ہوجاتا یہ صرف تالیف قلب کا ثمرہ تھا''یولّفهم'' کا ایک معنی یہ بھی بیان کیا گیا ہے کہ آپﷺ لوگوں کے درمیان الفت ومحبت پیدا کرتے تھے اور ان کو باہمی انتشار اور نفرت سے بچاتے تھے تاکہ قومی وحدت کا شیرازہ بکھرنے نہ پائے۔ یعنی''یـولّف اصـحـابـه فيمابينهم ''خود آپس میں صحابہ کو شیروشکر فرماتے تھے۔ ویـکرم کریم کل قوم ویولّیه علیهم، عوامی زندگی کا ایک پہلو سیاسی ہوتا ہے۔ آپﷺ اس کو بھی بڑے تدبر سے نبھاتے تھے۔

قومی رہنما کا احترام: جس قوم کا جو معزز ہوتا تھا حضورﷺ اسے بھی عزت کی نگاہ سے دیکھتے ہمارا نظامِ سیاسی اسی وجہ سے ابتر ہے ہنگامے اس وجہ سے ہوتے ہیں کسی قوم نے ایک شخص کو اپنا ملک بنایا، خان بنایا، سردار بنایا اسے منتخب کیا اور سارا قبیلہ اس پر راضی ہے کہ یہ ہمارا رہنما ہے، ممبر ہے، ہمارا نواب ہے یہ ہمارا افسر ہے ادھر ملکی انتظامیہ اسے گھاس نہیں ڈالتی، اس کے برعکس حضورﷺ ڈنڈا لیکر قومی معززین کو پس منظر میں جانے پر مجبور نہیں کرتے تھے کہ میں نے جب مکہ فتح کرلیا ہے اور اسلام آگیا تو تم کون ہو ہٹ جاؤ، اس منصب سے معزول ہوجاؤ۔ میں اپنے افراد کو تم پر حاکم بناؤں گا۔ عرب کا نظام قبائلی نظام تھا۔ اگر ذرا بھی ان کے رہنما اور سردار کی طرف ٹیڑھی نظر سے دیکھتے تو وہ حضورﷺ کے دشمن ہوجاتے اور نہ اسلام پھیلتا تو کسی قوم کا جو معزز ہے اس کی عزت فرماتے تھے کیونکہ وہ قوم دیکھتی ہے کہ فلاں افسر ہے۔

فلاں حاکم ہے۔وہ ہمارے اس سردار کے ساتھ نمائندگی کا کیا معاملہ کرتا ہے۔ویولیہ علیھم ، پھر جب وہ علاقہ مقبوضہ ہو جاتا تھا اور وہ شخص شرعاً نا اہل نہ ہوتا قوم نے اسے نمائندہ بنایا ہوا ہوتا تو حضور ﷺ بھی اعلان فرما دیتے کہ ہماری طرف سے بھی یہی والی ہے کیونکہ کسی دوسرے کو قومی نمائندے پر ترجیح دینے سے بڑے فسادات کا خطرہ ہوتا ہے۔مثال کے طور پر عرض کرتا ہوں۔بنگلہ دیش(۱) والوں نے منتخب کیا شیخ مجیب الرحمٰن کو، اب انہوں نے اسے معزز سمجھا تو انہوں نے کہا کہ ہمارا حاکم اور والی یہی ہوگا اور ادھر سے شور مچ گیا کہ نہیں ادھر تم ادھر ہم۔پھر وہ جب کہتا ہے کہ میں پاکستانی ہوں اور پارلیمنٹ ایک ہوگا مجھے اپنی قوم نے چنا ہے تو تم کون ہو مجھے ہٹانے والے۔اس سے سارا بحران آیا کتنا عظیم بحران کہ پاکستان دو ٹکڑے ہو گیا۔پھر یہاں صوبہ سرحد میں لوگوں نے ایک پارٹی کو منتخب کیا اور بلوچستان میں دوسری کو منتخب کیا اور ادھر بھٹو صاحب نے اعلان کیا کہ ان کے گورنروں کو میں نہیں رہنے دیتا۔ان کے گورنر ہٹا دیئے۔آپ کو پتہ ہے کہ دوسرا عظیم بحران اسی سے شروع ہوا۔اور یہ ساری رسہ کشی اب تک جاری ہے ورنہ جمعیت علماء اسلام، عوامی نیشنل پارٹی اور پیپلز پارٹی کا اتحاد ہوتا اور آگے یہ بحران نہ پیدا ہوا ہوتا تو سات سال کتنے استحکام اور ترقی سے گزرے ہوتے ملک کا نقشہ ہی اور ہوتا۔راتوں رات آرڈر آ گیا کہ فلاں قوم کا حاکم ہٹا دیا گیا۔بزنجو ہٹ گیا اور ادھر وہ ناراض ہو گئے کہ یہ کون ہوتا ہے ہم نے جسے چنا ہے۔خراب ہے یا صحیح ہے۔برا ہے یا اچھا ہے۔اب تم بھی اس کو عزت کی نگاہ سے دیکھو۔یہی صورت اگر حضور ﷺ کے فیصلوں میں ہوتی تو مسلمانوں کا شیرازہ تہس نہس ہو جاتا۔تو یہ بڑے قیمتی الفاظ ہیں ''ویکرم کریم کل قوم '' حضور ﷺ ہر قوم کے معزز اور سردار، خان اور ملک جوان کا بڑا ہوتا اس کا احترام کرتے ویولیہ علیھم اور اسی کو پھر ان کا نگران اور نمائندہ اور والی بناتے کہ چلو یہی گورنر ہے یہی نمائندہ ہے ہمیں بھی منظور ہے۔جمہوریت، خود اختیاری اور شخصی ووٹ کا کتنا احترام کیا۔آپ ﷺ کا یہ رویہ ایک ادنیٰ سی جھلک ہے اور سبق ہے کہ ایک قوم نے ایک شخص کو منتخب کیا تو آپ ان کو عزت کی نگاہ سے دیکھیں۔جب تک وہ بنیادی مقاصد کے خلاف نہ ہو تو اور اس کے ساتھ چلتے رہیں تب تو آپ کامیاب ہوں گے۔اگر آپ نے لاٹھی لی کہ نہیں ایسا نہیں

---

(۱) سقوط بنگلہ دیش کے المناک واقعات کو اشارہ ہے۔(اصلاح الدین)

ہوسکتا۔تو پھر وہ سیاست کامیاب نہیں ہوسکتی۔

اللہ کے عذاب سے ڈرانے والا: ویحذّر الناس اورلوگوں کوڈراتے بھی تھے۔اللہ کے عذاب سے برائیوں سے اور ظلم سے کہ اس کے نتائج خراب ہیں۔ بداعمالی کے نتائج خراب ہیں۔محتاط رہو چوراچکوں سے محتاط رہو، تمام مضر چیزوں سے بھی محتاط رہا کرو۔ایسے سادہ لوح مت بنو کہ کوئی بکس اٹھا کرلے جائے کوئی کپڑے اٹھا کرلے جائے کوئی زمین پر قبضہ کرے، ہروقت محتاط اور بیداررہو، ویحترس منھم،خودبھی حضورﷺ بہت محتاط رہتے خودکولوگوں کے تکلیف یانقصان سے محفوظ رکھتے تھے۔ ملاقاتی ہزاروں قسم کے آتے تو آپ دیکھتے کہ بُرے ارادہ سے تو نہیں آیا، یا کوئی ایسی بات میں کہوں کہ رازظاہر ہوجائے اور کل یہ دوسری جگہ ساری بات پہنچادے تو آپ کے ساتھ تو ساری زندگی میں عوامی زندگی میں ایسے لوگ آئیں گے تو صحیح حکمران اورایڈمنسٹریٹر وہ ہے جولوگوں کے بارے میں محتاط رہے۔اپنے آپ کی بھی حفاظت کرے بعض آدمی ہرقسم کی بات کہہ جاتا ہے ہر شخص کو یکدم دوست بنالیتا ہے ہر شخص کواپناراز دان بنالیتا ہے آگے جاکراس کوٹھوکرلگتی ہے حالانکہ المومن لایخدع و لایُخدع کہ مومن نہ دھوکہ دیتا ہےاور نہ دھوکہ کھاسکتا ہے۔تو حضورﷺ خودبھی محتاط رہتے تھے اگرکسی کے بارے میں معلوم ہے کہ دشمن ہےاور خطرناک ہے پھراس کے سامنے میں کیوں ادھرادھر کی باتیں کروں لیکن آگے مکارم اخلاق کی ایک عجیب بات بھی ہے کہ جب ایک شخص آیا مشتبہ قسم کا ان کو پتہ بھی ہے کہ یہ گڑبڑ قسم کا آدمی ہے ملاقات میں محتاط تو ہوگئے لیکن بشاشت میں اور ظاہری خلق میں اور چہرے کی بشاشت میں کوئی فرق نہ آتا۔ اسی طرح تپاک سے ملتے،اسی طرح محبت سے ملتے،اسی کو بیان فرمایا کہ ''من غیر ان یطوی عن احدٍ الخ'' کریمانہ رویئے میں بخل نہیں کرتے تھے۔

خوش خلقی اور بداخلاقی: حضورﷺ حضرت عائشہؓ کے ساتھ بیٹھے ہوئے تھے کسی نے کہا کہ فلاں شیخ آیا ہے ملاقات کیلئے تو حضورﷺ نے کہا کہ یہ بدترین آدمی ہے اپنی قوم کا شریرترین آدمی ہے۔تھا وہ خطرناک قسم کا،مطلب یہ بھی تھا کہ حضرت عائشہؓ بھی محتاط ہوجائیں کوئی ایسی ویسی بات نہ کریں حکومت تھی، نظام تھا۔غیبت کی نیت سے نہیں کہا بلکہ یہ کہا کہ یہ کس قسم کا آدمی ہے؟ پھر حضرت عائشہؓ پردے میں چلی

گئیں اور اس شخص کو بلایا جب وہ آیا تو حضور ﷺ بڑے تپاک سے ملے اور بڑے اخلاق عالیہ سے ملے جب وہ باہر چلا گیا حضرت عائشہؓ نے یہ منظر دیکھ لیا تھا تو حضور ﷺ سے کہا کہ آپ ﷺ نے تو فرمایا تھا کہ بڑا خطرناک آدمی ہے مگر آپ ﷺ تو اس سے بڑی محبت سے ملے تو حضور ﷺ نے فرمایا کہ بدترین آدمی وہ ہے جسے لوگ اس وجہ سے چھوڑ دیں کہ اس کا میل جول ٹھیک نہیں اس کی پیشانی پر بل آجاتے ہیں اور بدخلقی سے پیش آتا ہے۔

تو آپ ﷺ یہ نہیں کرتے تھے کہ ملتے وقت پیشانی پر بل آجائے چہرہ متغیر ہوجائے اور اخلاق میں فرق محسوس ہوجائے بلکہ کھلی پیشانی سے اور ہنسی سے محبت سے ملتے۔ ویتفقد اصحابه، اور غیر حاضر صحابہ کرامؓ کے حالات بھی دریافت فرماتے تھے جو صحابی نہیں آیا تو پوچھا کہ فلاں صحابی نظر نہیں آیا ان کی طبیعت کیسی ہے، ان کے گھر میں مریض تھا ان کا کیا حال ہے؟ ان کا فلاں مقدمہ تھا۔ ان کا فلاں مسئلہ تھا تو سارے ملک اور رعایا اور صحابہؓ ایک ایک کو کرید کرید کر حالات معلوم کرتے پھر کسی کی بیماری یا کسی تکلیف کا علم ہوتا تو حتی المقدور مدد فرمایا کرتے تھے اس تحقیق وتفتیش کو تفقد کہتے ہیں۔ جو مکارم اخلاق سے ہے۔

بھلائی کی تحسین اور حالات حاضرہ سے اپنے آپ کو باخبر رکھنا: **ویسئل النّاس عمافی الناس**، لوگوں سے یہ بھی پوچھتے کہ باہر حالات کیا ہیں جیسے آج کی اصطلاح میں کہیں کہ اخبار بھی پڑھتے، انٹیلی جنس کی رپورٹیں بھی اور یہ ساری معلومات تو ایک حکمران کیلئے ضروری ہیں تو حضور ﷺ کی مجلس میں جو بھی آتا اس سے پوچھتے کہ بھئی فلاں علاقہ میں اور فلاں قبائل میں گندم کا نرخ کیا ہے، خشک سالی تو نہیں ہے، بارش ہوئی ہے یا کوئی نئی صورت حال تو نہیں ہے اور بازار کے نرخ کیسے ہیں؟ اخلاقی حالت کیسی ہے، دینی حالت کیسی ہے، ملک کیسے حالات میں ہے، کہاں تک ترقی ہوئی ہے۔ "**یسئل الناس عمافی الناس**" یہ نہیں کہ ایک مولوی جو مسجد کے ایک گوشے میں بیٹھ جائے اور باہر سے آنکھیں بند کرلے بلکہ ایک صحیح بیدار اور منظم نظام تھا۔

حزب اختلاف اور اختلاف میں اعتدال: **ویحسن الحسن ویقویه**، اچھی بات کی تحسین فرماتے اور اس کو تقویت پہنچاتے، یہ انسان کی ایک بڑی خوبی ہے ہم لوگ تو حزب اختلاف میں ہوجاتے

ہیں تو پھر لاٹھی لے لیتے ہیں کہ کوئی فرشتہ بھی ہے بس مارو کہ یہ خبیث سے بڑھ کر خبیث ہے اگر اس نے اچھا کام بھی کیا تو اچھا نہ کہیں کہ کوئی اچھائی نہیں مانتے اور اگر حزب اقتدار میں ہیں یا اس کے دوست ہیں تو اس کی ہر برائی اچھی اور قابل داد سمجھتے ہیں۔ تو حضورﷺ یہ نہیں کرتے تھے۔ بھلائیوں کی تائید کرتے اور تحسین کرتے تھے۔ اچھائیوں پر شاباش دیتے، انعامات سے نوازتے اور حوصلہ افزائی کرتے۔ **ویقبح القبیح** ، اگر برائی دیکھتے، قبیح دیکھتے، غلط کام دیکھتے تو اس کی تقبیح کرتے اس پر آنکھیں بند نہ کرتے، اچھے کو اچھا کہنا اور برے کو برا کہنا، اگر یہ دونوں پہلو ہیں تو پھر آپ اعتدال میں ہیں اور آپ کی بات کا اثر بھی ہوگا ورنہ لوگ کہیں گے یہ تو تعصب کی وجہ سے ہر وقت لاٹھی اٹھائے ہوئے ہے اور اس کے پیچھے پڑا ہوا ہے۔

ویقبح القبیح ، اور برائیوں اور قباحتوں کی تقبیح فرماتے، **ویوھیہ**، اور اسے کمزور کرنے کی کوشش کرتے کہ برائی کمزور ہوجائے اگر مٹ نہ سکے تو کچھ اس پر ضرب لگادو کسی حد تک تو اس کو کنٹرول کردو کچھ بریک تو اس کو لگادو۔ **معتدل الامر غیر مختلف** ، دونوں لفظوں کا معنی قریب قریب ہے۔ خلاصہ یہ ہے کہ حضورﷺ سارے معاملات میں اعتدال میں ہوتے تھے میانہ روی ہوتی تھی اور بے اعتدال زندگی نہیں تھی۔ غیر مختلف اور متوازن شخصیت کے مالک تھے۔ اس کا معنی یہ ہے کہ ہر معاملہ توازن تھا نہ کہ تلون کہ آج کچھ کہا اور کل دوسری بات کہہ دی۔ اور بات کے بھی پکے تھے۔ بعض آدمی ہوتے ہیں صبح کو ایک فیصلہ کرتا ہے شام کو پھر دوسرا، دوپہر کو تیسرا لوگ کہتے ہیں کہ فلاں صاحب کان کے کچے ہیں اس کی یہی صورت ہے کہ رائے پر قائم نہیں رہ سکتا۔ ایک بات کرلیتا ہے بیچارہ دوسرا ملاقاتی آیا اس نے اس کا دماغ ادھر بدل دیا، تیسرا آیا ادھر یہ عموماً عقل کی کمی اور اخلاقی کمزوری کا اثر ہوتا ہے جو مداہنت اور عدم استقامت پر منتج ہوتا ہے۔ حضورﷺ میں ایسی بات نہیں تھی مختلف نہ تھے اور پھر جب عزم کرلیا، ایک معاملے کو طے کرلیا پھر تردد نہیں ہوتا تھا، متلون مزاجی نہیں تھی۔ حضورﷺ میں توازن اور تصلّب واستقامت تھی۔

<u>حاکم کی ذمہ داری:</u> **ولا یغفل مخافة ان یغفلوا** ، حضورﷺ کسی وقت بھی امت کی خیر خواہی تذکرو ارشاد اور دینی ودنیوی مصالح سے غافل نہیں ہوتے تھے ورنہ خطرہ تھا کہ امت بھی غفلت کا شکار ہوجائے کیونکہ چھوٹا بڑے کی متابعت کرتا ہے اسی سے سیکھتا ہے اگر حکمران اور حاکم اور اصلاح کرنے

والا لمبی تان کر سو جائے تو امت خود بخود غافل ہو جائے گی وہ کب بیدار ہوگی اور اگر حکمران بے غم اور بے فکر ہے اور ادھر روس اور امریکہ کیا کیا منصوبے بنا رہا ہے سرحدات کے اندر کیا اور سرحدات کے باہر کیا کیا سازشیں ہو رہی ہیں۔اس سے بے خبر ہو جائے تو قوم اور رعایا کب بیدار رہ سکے گی۔

<u>امیر شریعت سید عطاء اللہ شاہ بخاریؒ کا لطیفہ:</u> ہمارے سید عطاء اللہ شاہ بخاریؒ صاحب کا ایک لطیفہ ہے عجیب شخصیت تھی بڑے انقلابی انسان تھے عظیم کام کیا۔امیر شریعت ان کو کہتے تھے تو یہ عوام دیہاتی کسان ''امیر شریعت'' وغیرہ الفاظ کو تو جانتے نہیں۔عمر بھر حضرت شاہ صاحبؒ بیچارے دین کے فکر میں لگے رہے جیلوں اور ریلوں میں زندگی گزاری۔شاہ صاحبؒ کی زندگی آزادی کی جدو جہد، دین کی تبلیغ اور ختم نبوت کی اشاعت میں گزری۔تو شاہ صاحبؒ نے فرمایا میں نے ان سے خود یہ لطیفہ سنا تھا کہ ایک دفعہ ایک جگہ میں سویا ہوا تھا تو ایک دو دیہاتی کاشتکار قسم کے لوگ آئے ملنے کیلئے۔انہوں نے جھانک کر دیکھا تو کہا کہ ''شریعت ستی پئی اے'' کہ شریعت تو سوئی پڑی ہے اب شاہ صاحبؒ نے کہا کہ میں نے سن لیا تو اس جملے سے مجھ پر ایسی چوٹ لگی کہ گویا کسی نے چھرا گھونپ دیا ہو۔میں نے اللہ کی طرف سے یہ بات سمجھ لی کہ اچھا اگر ہم اسی طرح لمبی تان کر سو جائیں اور غافل ہو جائیں اور عیش وعشرت میں لگ جائیں تو پھر تو ساری شریعت سو جائے گی۔اگر مولوی صاحب معاشرے سے بالکل بے فکر ہو گیا تو شریعت کا کیا ہوگا؟ اسی طرح ایک حکمران نے اگر اپنے علاقے میں غفلت برتی یا کوئی افسر بے فکر سو گیا، دروازہ بند کر دیا کہ چلو یار جانے دو تو کیا حالت ہو جائے گی۔

تو حضورﷺ کے بارے میں فرمایا کہ **و لایغفل مخافة ان یغفلوا**،حضورﷺ کسی لمحہ بھی غافل نہیں ہوتے تھے کہ مبادا سارے لوگ بھی غافل ہو جائیں گے۔

اویملّوا، ایک نسخہ میں ویملّوا ہے۔یعنی امت کی غفلت کے خوف سے اور امت کی سُستی اور تھک جانے کے خوف سے خود بھی غفلت سے بچتے تھے۔مطلب یہ ہے کہ اگر آپﷺ مسلسل امت کی ڈھارس نہ باندھیں تو وہ بھی حوصلہ ہار بیٹھیں گے اور تکلیفات شرعیہ سے درماندگی کا مظاہرہ کرلیں گے جبکہ بعض نسخوں میں اویملّوا ہے ''اَوْ'' یہاں تنویع کیلئے ہے کہ کچھ لوگ غفلت اور کچھ درماندگی کا شکار ہو جائینگے

بعض نسخوں میں اویمیلوا ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ آپ ﷺ غفلت برت کر مسلسل دستگیری نہ فرمائیں تو امت جادۂ حق سے باطل کی طرف اور دیگر ادیان کی طرف مائل ہو جائے۔اس لئے آپ ﷺ کبھی بھی ان کو مہمل چھوڑنے پر آمادہ نہ ہوئے۔

جبکہ بعض نسخوں میں ہے کہ ''**ولا یَفعَل مخافة ان یَفعلوا فیملوا** ''یعنی''**ولایفعل العبادہ مخافة الخ** ''پھر مطلب یہ ہوگا کہ آپ ﷺ عبادات میں اعتدال سے کام لیتے اور غلو سے اس لئے پرہیز کرتے کہ صحابہؓ بھی آپ ﷺ کی اتباع میں غلو سے کام لیتے اور پھر بالآخر عاجز آکر اسے چھوڑ دیتے۔جس طرح ایک حدیث میں آتا ہے کہ **خذوا من الاعمال ما تطیقون فان اللّٰہ لایملّ حتی تملّوا.**

لکل حال عندہ عتاد، عتاد عین کے فتح کے ساتھ اور عدۃ عین مضموم کے ساتھ ہم معنی الفاظ ہیں۔اس کے معنی تیاری کے بھی آتے ہیں کسی کام کو سرانجام دینے کے اسباب ووسائل پر بھی اس کا اطلاق ہوتا ہے مثلاً جنگ کیلئے سامان جنگ عُدہ اور عتاد ہے۔

اب معنی یہ ہے کہ زندگی کے مدارج طے کرنے میں آپ ﷺ کے پاس ایک لائحہ عمل اور منظم تیاری تھی۔یہ نہیں کہ جیسے گزرے گزارا کرنا ہے۔بعض لوگوں نے یہ ترجمہ کیا ہے کہ احکام اسلام میں سے ہر حکم کیلئے آپ ﷺ کے پاس ایک دلیل موجود تھی۔بعض نے یہ ترجمہ کیا ہے کہ عبادات ومعاملات میں سے ہر چیز کیلئے آپ ﷺ تیار رہتے اور ایک منظم زندگی گزارتے تھے یعنی ہر کام کیلئے آپ ﷺ کے ہاں ایک خاص انتظام تھا۔ہر چیز کیلئے حضور ﷺ کا ایک ٹائم ٹیبل تھا لوگوں کو معلوم ہوتا کہ اس منٹ پر جاگتے ہیں اس منٹ پر سوتے ہیں اس منٹ پر باہر تشریف لاتے ہیں یعنی ہر چیز ڈسپلن کے مطابق ہوم خواہ سفر ہو یا حضر، جنگ ہو یا امن **لایقصر عن الحق ولایجاوزہ** ،حق کہنے اور اسے قائم کرنے میں کوتاہی نہیں کرتے تھے اور نہ حق سے تجاوز کرتے۔حق کے حدود متعین تھے لیکن ایک لحہ اس سے متجاوز نہیں ہوتے تھے اور نہ کسی اور کو حق سے تجاوز کرنے دیتے تھے۔تو امر حق میں کسی طرح کوتاہی تھی نہ حد سے تجاوز فرماتے۔یا پھر حق سے استحقاق مراد ہو تو معنی یہ ہے کہ صاحب حق اگر حق طلب کرتے تو اس میں کوتاہی نہیں کرتے تھے لیکن استحقاق سے زیادہ بھی نہیں دلواتے تھے۔

افضلیت ہم نشینی کا معیار: **الذین یلونه من النّاس خیارهم** ،جوحضور ﷺ کے زیادہ قریب تھے بیٹھنے میں اور تعلقات اور دوستی میں وہ لوگ ہوتے تھے۔جونیک ترین ہوتے تھے جولوگ بہترین اور خیر اور دینی لحاظ سے،علمی لحاظ سے،اخلاقی لحاظ سے اونچا مقام رکھتے تھے وہ قریب ترین ہوتے تھے۔حضور ﷺ نے درس میں بھی یہ حکم دیا تھا''**لیلنی منکم اولوا الاحلام والنهی**'' جوذہین ہیں جوعقل وفکر والے ہیں جو مدبر ہیں وہ مجھ سے قریب ترین بیٹھا کریں کیونکہ ذہین اور عقلمند طلبہ علوم زیادہ حاصل کر سکتے ہیں۔

افضلهم عنده اعمهم نصیحة،حضور ﷺ کی نگاہ میں لوگوں میں اچھا اور افضل اور پسندیدہ کون ہوتا؟ کیا یہ معیار تھا کہ جس کی موٹریں بہت ہوں یا کارخانہ دار ہو،یا بہت بڑا افسر ہو یا کوئی سرکش غنڈہ ہے طاقت والا ہو بدمعاش ہو؟ نہیں ہرگز نہیں۔ہم تو انہی لوگوں کو دوست بناتے ہیں حضور ﷺ کی نگاہ میں افضلیت کا یہ معیار تھا کہ جس کی خیرخواہی عام ہو جس کا فیض لوگوں کو زیادہ پہنچتا۔جس کا خیر عام ہوتا وہ حضور ﷺ کے قریب ترین ہوتا۔نصیحت کہتے ہیں خیرخواہی کو تو مخلوق کی خیرخواہی اور بھلائی کیلئے جوزیادہ دوڑ دھوپ کرتا تھا،جوزیادہ محنت کرتا تھا جس کا فیض زیادہ پہنچتا تھا وہ حضور ﷺ کی نگاہ میں سب سے زیادہ افضل ہوتا

واعظمهم عنده منزلةً احسنهم مواساةً وموازرةً اور حضور ﷺ کی نگاہ میں افضل انسان، اونچا انسان وہ ہوتا تھا قدر و منزلت کے لحاظ سے جو ان سب لوگوں میں اچھا ہوتا تھا غم خوارگی اور معاونت کے لحاظ سے۔

مواساۃ دراصل مہموز ہے ہمزہ واو سے بدل دیا جاتا ہے آسیٰ **یؤاسی مواساة تسویةً** کے معنی میں بھی مستعمل ہے کسی کو اپنے ساتھ برابر کرنا مؤاسات ہے آسیٰ بمالہ کا معنی مالی امداد سے کسی کو اپنا ہمسر بنانا نیز آسیٰ **فلاناً بمصیبةٍ** کا معنی کسی کی مصیبت میں اس کو تسلی دینا بھی ہے چونکہ یہاں مطلقاً مستعمل ہے۔اس لئے مراد یہ ہوسکتا ہے کہ کسی کی پریشانی کو اپنی پریشانی سمجھ کر اس کی مدد کرنا۔

جبکہ موازرۃ اَزَرَ سے ہے جس کے معنی قوت کے ہیں یہ بھی مہموز ہے۔قرآن میں ہے''**اشدد به ازری**'' یعنی ہارونؑ کی نبوت سے میری قوت میں اضافہ کیجئے۔حدیث میں ورقہ بن نوفل کا قول ہے''**انصرک نصراً مؤزرًا**'' یعنی نصراً شدیداً قویاً یہاں تقویت اور معاونت مراد ہے۔

خلاصہ یہ ہوا کہ جو شخص مخلوق خدا کی ہمدردی، غمگساری اور لوگوں کی معاونت میں پیش پیش ہوتا جو تکلیف و پریشانی میں غریبوں اور غمزدہ لوگوں کی مدد کرتا وہ ہی نبی کریم ﷺ کی نظر میں سب سے عظیم المرتبہ انسان ہوتا تھا۔ ظاہر ہے کہ جب دوسروں میں یہی خوبیاں آپ ﷺ کو پسند تھیں تو خود ان اوصاف کو بدرجۂ اتم اپنائے ہوئے ہونگے۔

قال فسألته عن مجلسه، پھر حضرت حسینؓ نے فرمایا کہ میں نے اپنے ابا سے پوچھا کہ حضور ﷺ مجلس میں تشریف فرما ہوتے تو کیا طور طریقے اختیار فرماتے۔ ظاہر ہے کہ نبی کریم ﷺ میں بے انتہا عاجزی تھی وہ اپنے لئے شان و شوکت پسند نہیں کرتے تھے اور باوجود اس کے کہ آپ ﷺ سربراہ مملکت ہو گئے تھے۔ آپ ﷺ تکبر و رعونت سے پاک تھے۔

<u>مصنوعی پروٹوکول:</u> سارے پروٹوکول ہم نے جو اپنے لئے مصنوعی بنا رکھے ہیں۔ اپنے اور اپنی رعایا کے درمیان اتنے بڑے بڑے حجاب اور دیواریں کھڑی کردی ہیں اور جو بیوروکریسی کا نظام ہم نے بنایا ہے یہ سب چیزیں اپنے لئے حضور ﷺ پسند نہیں فرماتے تھے بلکہ جب صحابہؓ ان کیلئے اٹھتے تھے تو حضور ﷺ فرماتے ''**لاتقوموا کما تقوم الاعاجم**'' وہ اس پر خوش نہیں ہوتے تھے کہ لوگ میرے آنے پر اٹھیں جیسا عجمی لوگ اٹھتے ہیں۔ اسی طرح سلامیں اور سلوٹیں مزاج مبارک کے خلاف تھیں غالب شان شان عبدیت تھی۔ حضور ﷺ کی عظمتیں آسمانوں تک، عرش تک پہنچتی تھیں لیکن شان و شوکت کسی چیز میں پسند نہیں۔ راستہ میں حضور ﷺ صحابہ کے ساتھ چلتے۔ صحابہ کہتے ہیں کہ ضروری نہیں تھا کہ وہ آگے چلیں اور ہم پیچھے پیچھے بلکہ کبھی ہمارے ساتھ ساتھ چلتے کبھی اتفاقاً آگے چلتے کبھی پیچھے پیچھے چلتے۔ کسی سفر میں جب قافلہ کسی منزل پر ٹھہر جاتا جب صحابہؓ کام کاج میں لگ جاتے تو صحابہؓ کہتے ہیں کہ ہم منع کرتے لیکن حضور ﷺ بھی ہمارے ساتھ کام میں لگ جاتے تھے۔ لکڑی جمع کر رہے ہیں، لکڑی جلا رہے ہیں، پانی بھر کر لا رہے ہیں سب کاموں میں صحابہؓ کے ساتھ شریک ہیں۔ یہ بتانے کیلئے کہ میں بھی تمہاری طرح ایک انسان ہوں تو اب جب منزل یعنی کسی مجلس میں اور نشست گاہ میں تشریف لاتے اور اٹھنا بیٹھنا ہوتا تو وہ کیسے ہوتا؟ **فقال کان رسول اللّٰہ لایقوم و لایجلس الاّ علیٰ ذکر،** حضور ﷺ کا اٹھنا بیٹھنا سب کچھ اللہ کے کاموں

کیلئے دین کیلئے تھا۔ مسلمانوں کی بھلائی کیلئے تھا۔ یہ بھی ذکراللہ ہے لیکن شراح نے یہاں لسانی ذکر مراد لی ہے یعنی اٹھتے بیٹھتے آپ ﷺ اللہ تعالیٰ کو یاد فرماتے جو کہ بڑی عبادت ہے۔

مجلس میں بیٹھنے کے آداب: واذاانتھٰی الی قوم، جب کسی مجلس میں تشریف لے آتے اور پہلے سے اور لوگ بیٹھے ہوتے جلس حیث ینتھی بہِ المجلس ، جہاں مجلس کا آخری سرا ہوتا وہیں بیٹھ جاتے۔ یہ نہیں کہ لوگوں کے کاندھوں پر پھلانگ کر آگے جاتے اور خصوصی نشست تک لازماً پہنچتے بلکہ کسی مجلس میں حضور ﷺ تشریف لاتے تو جہاں جگہ خالی ہوتی وہیں بیٹھ گئے۔ یہ الگ بات ہے کہ جہاں وہ بیٹھ گئے تو وہی میر مجلس ہوتے تھے اور وہی جگہ صدارت کی مسند بن جاتی۔ ویامرُ بذٰلک، باقی لوگوں کو بھی منع کرتے کہ جب تم کسی مجلس میں آؤ تو یہ نہ کرو کہ تم لوگوں کے کاندھوں پر پھلانگ جاؤ اور جا کر اپنی مخصوص نشست پر، اسٹیج پر اور کرسی پر بیٹھ جاؤ بلکہ جہاں جگہ ملے وہیں بیٹھ جاؤ۔ سب انسان برابر ہیں اس کو تخطی رقاب کہا گیا ہے جو ناجائز ہے تو خود بھی اسی پر عمل تھا اور دوسروں کو بھی یہی امر تھا(۱)۔

وفود کے ساتھ انداز تخاطب: یعطی کل جلسائه بنصیبه ''یعطی'' کا مفعول ثانی خود بنصیبہ ہے اور اس کا باء زائد ہے۔ تحسین کلام کیلئے آیا ہے جبکہ بعض شراح نے مفعول ثانی پر باء کے زیادت کو مستبعد قرار دیا ہے۔

لایحسب جلیسه ان احداا کرم علیه منه ، یہ خاص بات ہے کہ اخلاق عالیہ کی وجہ سے ہر شخص یہ سمجھتا تھا کہ میں حضور ﷺ کے سب سے زیادہ قریب ہوں۔ ہر شخص یہ کہتا تھا کہ میرے ساتھ خصوصی دوستی ہے اور مجھ سے بڑھ کر کوئی ان کو عزیز نہیں۔ اس رویے کا سب سے بڑا فائدہ یہ ہوا کہ صحابہ کرام میں تحاسد و بغض پیدا نہیں ہوا۔ جیسا کہ عموماً بادشاہوں کے مصاحبوں میں پیدا ہوتا ہے۔ جب ہر کسی کو یہ خیال ہو کہ میں ہی نبی کریم ﷺ کا چہیتا ہوں، عزیز ہوں، تو حسد کس کیساتھ ہوگی۔ یہ معمولی چیز نہیں ہے مکارم

---

(۱) احادیث میں آپ ﷺ نے اس کا صراحۃً امر دیا ہے مثلاً طبرانی اور بیہقی نے شیبہ بن عثمان سے روایت کیا ہے کہ ''اذاانتھیٰ احدکم الی المجلس فان وسع لکم فلیجلس والاّ فلینظر الی اوسع مکان یراہ فلیجلس فیه'' (جمع ۲/۱۸۰)(اصلاح الدین)

اخلاق کی انتہا ہے کہ ہر ایک کے ساتھ ایسا سلوک اور ایسا برتاؤ ہو کہ وہ انسان یہ سمجھے کہ بس میں ہی سب سے زیادہ محبوب اور مقرب ہوں۔

<u>صبر کا عمدہ نمونہ:</u> من جالسه او فاوضه في حاجةٍ صابرة حتى يكون هو المنصرف ، مفاوضہ کا معنی یہاں مراجعت کے ہیں یعنی اگر کوئی شخص حضور ﷺ کے پاس آ کر بیٹھ گیا مہمان بن کر یا کسی معاملہ میں کوئی ضرورت لیکر حضور ﷺ کے پاس چلا آیا اب حضور ﷺ کی تو عظیم مصروفیات تھیں۔ایک طرف امور مملکت ہیں، جہاد کے امور ہیں، مسلمانوں کے حالات تجاویز ومشورے عبادت گھریلو مسائل، وفود کا آنا جانا ایسے شخص کا تو ایک ایک منٹ قیمتی ہوتا ہے۔لیکن ادھر صبر کا یہ عالم ہے اور اخلاق اتنے اونچے ہیں کہ ایک شخص بھی اگر آ کر بیٹھ گیا جیسے بعض آدمی آ کر دھرنا مار کر بیٹھ جاتے ہیں۔اب اس کو یہ احساس نہیں ہوتا کہ میں کتنے عظیم شخص کے پاس بیٹھا ہوں وہ تو اپنے گپ شپ میں لگا رہتا ہے اور پھر سمجھتا ہے کہ چلئے آج ہی موقعہ ملا ہے تو عموماً مصروف لوگ تو جلدی سے کہہ دیتے ہیں کہ دو منٹ ہیں ملاقات کے ادھر گھنٹی بجاتے ہیں کہ بس اٹھو مگر حضور گو ہم سے زیادہ ہزاروں ذمہ داریاں تھیں اور ضروریات اور مسائل تھے باوجود اس کے وہ یہ نہیں کہتے تھے کہ چلئے مجلس برخاست ہے۔پریشانی بھی ہوتی تھی لیکن مروت وحیا کی وجہ سے جب تک وہ بیٹھا رہتا تھا حضور ﷺ بھی اپنے نفس پر قابو رکھتے۔صابرہ(۱) کے لفظ میں یہ سب کچھ موجود ہے کہ مشکل کام ہے لیکن صبر کرتے تھے سخت حالات پر بھی صبر جب تک ملاقاتی نہ کہتا کہ میں جاتا ہوں تو حضور ﷺ نہیں کہتے تھے کہ چلئے جناب میرے اور بھی تو کام ہیں۔کسی نے اگر ہاتھ ملایا حضور ﷺ کے ساتھ تو حدیث میں آتا ہے کہ حضور ﷺ نے خود ہاتھ نہیں کھینچے جب تک اس نے ہاتھ نہیں کھینچا تاکہ وہ محسوس نہ کرے کہ ان کے ہاں میری اہمیت نہیں۔

تو آپ ﷺ اپنے نفس کو روکے رکھتے تھے کہ جب تک وہ خود اٹھ کر نہ جاتے حضور ﷺ کے چہرہ مبارک اور پیشانی پر کوئی بل بھی نہ آتا نہ یہ کہتے کہ بس آپ کا کام ہو گیا اب جائیں۔

---

(۱) صابرہ مصابرۃ سے ہے اکثر شراح نے مفاعلہ کو مغالبہ کیلئے لیا ہے یعنی آپ ﷺ ایسے وقت میں دوسروں پر صبر میں غالب آجاتے تھے۔لیکن شاید حضرت الاستاذ کو ملا علی قاری کی رائے پسند ہو جنہوں نے یہاں پر مفاعلہ کو مغالبہ کی بجائے مبالغہ کیلئے لیا ہے۔واللہ اعلم (اصلاح الدین)

ایک بڑھیا نے آواز دی کہ میرا ایک کام ہے۔آپ کے ساتھ بوڑھی عورت تھی۔حضورﷺ نے کہا اے ماں مکے کی جس گلی میں تو مجھے پکارے گی میں خود پہنچ کر آجاؤں گا۔رات کو بلائے گی دن کو بلائے گی جس جگہ تمہارا گھر ہے بس مجھے اطلاع دینے کی ضرورت ہے۔آنے کی تکلیف مت کیا کرو، میں خود پہنچ جاؤنگا۔

<u>سائل کی حاجت برآری:</u> **من ساله حاجة لم يردّه الابها**،اگر کسی شخص نے کوئی چیز مانگی کوئی حاجت لے کر آیا کوئی مسئلہ لے کر آیا۔حضورﷺ کوشش کرتے کہ وہ اس کی حاجت پوری کر کے اسے واپس کردے۔بغیر مقصد برآری کے اس کو نہیں چھوڑتے تھے۔کسی نے کپڑے مانگے، کسی نے کھانا مانگا۔تو جو بس میں ہوتا تھا وہ دے دیتے۔اور کبھی کبھی انسان کے بس میں کچھ بھی نہیں ہوتا یا طالبِ حاجت کی ضرورت صحیح نہیں ہوتی۔مطالبہ غلط ہوتا ہے یا پورا نہیں کر سکتے ہیں تو پھر ڈانٹ ڈپٹ کے ساتھ رخصت کرتے ہیں۔ مگر آپﷺ ہرگز ایسا نہیں کرتے تھے بلکہ **او بميسور من القول** (۱)، جب کچھ نہ ہوتا تو پیار اور محبت کی باتوں کے ساتھ اس کو رخصت کرتے تھے۔نرمی اور یسر کے ساتھ ان کو سمجھا دیتے کہ یہ چیز ہمارے بس کی نہیں نہ ہم پوری کر سکتے ہیں اور اس کو اچھے طریقے سے واپس کردیتے تھے۔

قد وسع الناس بسطه و خلقه، خلاصہ یہ ہے کہ حضورﷺ کی بشاشت اور رحمت اور کھلی پیشانی تمام عالم پر محیط ہوگئی تھی۔اس نے گویا سارے بنی نوع انسانیت کو اپنی لپیٹ میں لیا تھا۔ان کے اخلاق اور ان کی بشاشت ساری مخلوق کو سمو چکی تھی کوئی اس سے محروم نہیں رہا۔

<u>حضورﷺ نوع انسانیت کیلئے بمنزلہ باپ:</u> **فصار لهم ابا**، حضورﷺ تمام بنی نوع انسان کیلئے شفقت ورحمت میں باپ کی طرح بن گئے۔

---

(۱) **الميسور مصدر على وزن المفعول ضدالمعسور** یسر کے معنی میں ہے یہاں صفت واقع ہوا ہے یعنی قول میسور کے ساتھ واپس کرتے مطلب یہ ہے کہ "**قل لهم قولا ميسوراً**" پر عمل کرتے ہوئے آسان اور خوبصورت انداز سے واپس کردیتے۔مثلاً اگر مطلوب چیز موجود نہ ہو تو وعدہ کردیتے کہ جب میرے پاس کوئی چیز موجود ہوگی تو بخش دوں گا۔اسی وجہ سے حضرت ابوبکر صدیقؓ کو خلافت کے پہلے ایام ہی میں حضورﷺ کے ڈھیر سارے وعدوں کو پورا کرنے کا شرف حاصل ہوا۔(اصلاح الدین)

وصاروا عنده فی الحق سواء ،اور سارے انسان حضور ﷺ کی نگاہ میں حقوق کے لحاظ سے برابر تھے۔ یہ نہیں کہ ایک کا حق تو پورا ہو جائے اور دوسرا محروم رہے۔ وہ میرا قریب ہے یا عزیز ہے اس کے تعلقات ہیں اس کی دوستی ہے۔ اگر کسی کا کوئی حق ہے تو اس کو ضرور ملتا۔ تو سارے انسان ان کے نگاہ میں بالکل برابر ہیں یعنی کوئی ترجیح اور کسی کو محروم کرنا اور کسی کو نوازنا نہیں تھا۔

مجلسه مجلس علم وحیاء وامانة وصبر ،مجلس کیا تھی مجلس علم تھی، لوگوں کی حجروں میں اور بیٹھکوں میں جو یہ گپ شپ یہ ہنگامے اور یہ خرافات ہوتے ہیں تو یہ باتیں نہ تھیں بلکہ حضور ﷺ کی مجلس اور صحابہ کی مجلس علم کی مجلس تھی حیا اور امانت کی مجلس تھی اور صبر کی مجلس تھی یہ نہیں کہ ایک بات کرتا ہے ابھی اس نے بات ختم نہیں کی دوسرا شور مچاتا ہے۔ ایک کہتا ہے میں پوچھتا ہوں دوسرا کہتا ہے میرا پہلا حق ہے اور ایک کہتا ہے میں تنگ ہو گیا ہوں بابا، باہر جاتا ہوں تو یہ صورت نہیں تھی بلکہ پورے وقار، ادب اور سکون کا ماحول ہوتا تھا۔

اقوام عالم کی تاریخی اسمبلی: ایک روایت میں آتا ہے حضور ﷺ کے ہاں قطع کلامی نہیں تھی جب ایک صحابی بات کرتا تھا تو سارے خاموشی سے سنتے تھے ایسی پارلیمنٹ اور ایسی اسمبلی اقوام عالم کی تاریخ میں نہیں ملتی وہاں قطع کلامی نہیں ہوتی تھی وہاں غصے میں آپے سے باہر ہو کر ایک آدمی دوسرے پر حملہ نہیں کرتا تھا۔ گالی گلوچ نہیں کرسیاں نہیں چلتیں۔ جو کچھ یورپ کی بنائی گئی اسمبلیوں میں ہم دیکھتے ہیں کہ ممبر لوگ تشنیع وتنقید بڑی بے صبری سے کرتے رہتے ہیں۔ یہاں ہر شخص پرسکون اور پروقار ہے۔ حقیقت میں یہ مثالی پارلیمنٹ ہے۔ بڑے بڑے مسائل ہیں مگر اس پارلیمنٹ کی یہ حالت ہے نیز فرمایا کہ وہ امانت کی مجلس ہوتی تھی ایک اور روایت میں حضور ﷺ نے فرمایا کہ یہ مجالس بھی امانت ہیں (۱)۔

مال ودولت سونا چاندی یہ امانت ہیں تو ہر مجلس ایک امانت ہے۔ امانت میں خیانت کرنا عظیم ظلم ہے۔ مجلس میں بھی ہزاروں باتیں پیش آتی ہیں۔ کسی کی خامیاں سامنے آجاتی ہے۔ آپ مجھے مجلس میں کسی

---

(۱) المجالس بالامانة مرفوع حدیث ہے۔ اخرجه الخطیب فی تاریخه عن علّی وروی ابو ذر عن جابرؓ مرفوعاً المجالس بالامانة الاّ ثلاثة مجالس سفک دم حرام اوفرج حرام او اقطاع مال بغیر حق نیز امام ترمذیؒ نے ابواب الادب میں ترجمۃ الباب میں اس کا ذکر کیا ہے۔ (اصلاح الدین)

کاراز اور کسی کی خامی اور کمزوری بتادیتے ہیں اور میں اسے آؤٹ کردوں یہ میں نے گویا امانت میں خیانت کردی۔ مجلس کی باتیں باہرنہیں پھیلائی جاتیں۔ خلاصہ یہ کہ آپ ﷺ کی مجلس میں علم حیاء امانت اور صبر کا کامل نمونہ دیکھنے کوملتا۔ بعض نسخوں میں علم کی جگہ حلم کا لفظ پایا جاتا ہے جس کا معنیٰ برداشت اور عقلمندی سے کیا گیا ہے۔

لاترفع فیه الاصوات ،اس مجلس میں اس پارلیمنٹ میں ایک وسرے پر آوازیں اونچی نہیں ہوتی تھیں یہ نہیں کہ ایک باتیں کررہا ہے دوسرا اس کی بنسبت زور زور سے اور چیخ چیخ کر بولتا ہے کہ پہلے مجھے باری دوتا کہ میری تقریر یہ لوگ سن لیں اور دوسرے کی آواز دب جائے۔ موجودہ دور کی اسمبلیوں والی صورت نہ تھی۔ صحابہ کرامؓ کی کیفیت مجلس میں کیسی ہوتی تھی ایک حدیث میں آتا ہے **کانّما علی رؤوسهم الطیر** . اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے **یایها الذین امنوا لاترفعوا اصواتکم فوق صوت النبیّ** **(الایة)** کہ نبی کی آواز سے تیری آواز اونچی نہ ہونے پائے۔

و لاتؤبن فیه الحرم، عزت اور آبرو ایک دوسرے کی داغدار نہیں کی جاتی تھی۔ **أبن یأبن أبناً** کے معنی ہیں عیب بتلانا اور حُرم حُرَم کی جمع ہے جس کا معنی ہے ہر قابل احترام اور قابل حفاظت چیز عموماً اس کا اطلاق گھر والی اور دیگر اہل وعیال پر ہوتا ہے۔ چنانچہ دست درازی اور زبان درازی سے کسی کی عزتوں، عصمتوں، آبروؤں کو داغدار بنانے کو تابین کہتے ہیں گویا اس مجلس میں عیب جوئی اور نکتہ چینی نہیں کی جاتی تھی۔ آپس میں ایک دوسرے کی عزت اور حرمت پر۔

و لاتنثیٰ فلتاته، نثاینثو پھیلانے، اشاعت وتشہیر کو کہتے ہیں۔ اور فلتات فلتۃ کی جمع ہے جس کے معنی ہفوات اور خلاف ادب باتوں کے ہیں۔ ظاہر ہے کہ لغزشیں ہر مجلس میں ہوتی ہیں۔ کوتاہی ہر انسان سے ظاہر ہوتی ہے تو مجلس کی لغزشیں وہیں دبادی جاتی تھیں یہ نہیں کہ ہم نے ایک خامی یہاں ایک مجلس میں دیکھی اور پھر باہر اس کو پھیلاتے رہے دہراتے رہے۔ اس کے پھیلانے کو بحو کہتے ہیں۔ مثلاً کسی کی سبقت لسانی کی وجہ سے غلط لفظ نکل گیا یا کسی ساتھی سے مجلس میں کوئی شرمناک قسم کا کام ہوگیا تو یہ نہیں کہ اب سارے جا کر باہر ڈھول پیٹ رہے ہیں کہ فلاں نے اس مجلس میں ایسی حرکت کی بلکہ کوئی لغزش کوتاہی تقریر

میں عمل میں کسی سے ہوتی تو وہ وہیں دب جاتی تھی۔اس کمرے سے باہر وہ بات نہیں پھیلائی جاتی تھی لیکن بعض شراح نے یہ لکھا ہے کہ یہاں پر خود فلتات کی نفی مقصود ہے تو گویا مطلب یہ ہے کہ آپ کی مجلس میں سرے سے فلتات یعنی ہفوات اور نامناسب بات ہوتی ہی نہ تھی۔اسی لئے اس مجلس کی کوئی بیہودہ قسم کی بات پھیلانے کا کسی کو بھی موقع نہیں ملتا تھا۔

متعادلین بل کانوا یتفاضلون فیہ بالتقویٰ متواضعین، ''متعادلین'' کانوا مقدر کا خبر واقع ہوا ہے یعنی کانوا متعادلین ،تعادل سے اسم فاعل ہے جس کا معنی ہے ایک دوسرے کو برابر سمجھنا،مطلب یہ ہے کہ صحابہ مجلس میں ایک دوسرے کو برابر جانتے تھے۔ان میں نسبی تعلق اور خاندانی برتری کا گھمنڈ نہیں تھا بلکہ تقویٰ ہی سبقت کی بنیاد تھا۔''متواضعین''منصوب ہے ترکیب میں حال واقع ہوا ہے۔ یتفاضلون کی ضمیر سے یعنی اس حال میں کہ ایک دوسرے کیلئے تواضع اور عاجزی اختیار کرتے تھے۔اس کلام کا خلاصہ یہ ہوا کہ آپس میں بالکل عدل وانصاف کرنے والے تھے۔ ایک کو دوسرے پر برتر سمجھنے والے نہ تھے کہ کوئی دوسرے کو نیچا سمجھے حسب اور نسب کے لحاظ سے کسی کو اونچا سمجھنا کسی کو نیچا سمجھنا یا مال و دولت کی وجہ سے درجہ بندی کرنا کہ یہ فسٹ کلاس ہے اور یہ سیکنڈ کلاس ہے یہ تھرڈ کلاس ہے تو یہ چیزیں نہیں تھیں۔سب متعاولین تھے دولت اور مادی چیزوں کے لحاظ سے یہ امتیازات قائم نہیں کرتے تھے سب صحابہ برابر تھے ہاں یتفاضلون فیہ بالتقویٰ ایک کو دوسرے پر اگر فضیلت تھی، احترام کیا جاتا تھا،اور اہمیت تھی تو تقویٰ کے لحاظ سے جو اللہ سے زیادہ ڈرتا تھا اور اس میں خوف خداوندی ہوتا تھا اس کو فضیلت والا اور اس کو کلاس ون سمجھا جاتا تھا اور کوئی دوسری حیثیت درجہ بندی نہیں کرتی تھی۔

یوقّرون فیہ الکبیر ،اس پارلیمنٹ اور مجلس میں احترام کیا جاتا تھا۔بڑوں کا کوئی بوڑھا آتا ہے،کوئی معمر آتا ہے، بزرگ آتا ہے،تو صحابہ کرامؓ احترام کے ساتھ پیش آتے۔حضور ﷺ نے خاص اہتمام سے بڑوں کے ادب کا حکم دیا ہے کہ ان کی عزت کرو اور فرمایا **من لم یوقر کبیرنا فلیس منا** ، دوسری جگہ فرمایا کہ جس نے ہمارے چھوٹوں پر شفقت نہ کی اور بڑوں کی عزت نہ کی تو ہم میں سے نہیں۔تو یہاں صحابہؓ سب ایک دوسرے کی عزت کرتے تھے اور بڑوں کا احترام تھا۔**ویرحمون فیہ الصغیر** ،

اور جو چھوٹے ہوتے تھے ان پر رحم اور شفقت فرماتے تھے۔**ویوثرون ذا الحاجة**،اور اگر کوئی محتاج ہو ضرورت مند ہو تو اس کو ترجیح دیتے تھے۔مثلاً ایک شخص آیا ہے وہ ایمرجنسی میں مبتلا ہے اور پریشانی میں ہے تو وہ کہتے تھے کہ بھائی پہلے اس کا نمبر ہے اس کی ضرورت مقدم ہے۔صحابہ دیکھ لیتے تھے کہ اس کی حاجت زیادہ ہے تو فیصلہ کرتے تھے کہ یہ اپنا معاملہ پہلے پیش کردے کیوں کہ اس کی ضرورت زیادہ اہم ہے۔ہم بعد میں ملاقات کرلیں گے۔

ویحفظون الغریب،اور جو پردیسی اس مجلس میں آجاتا تھا اور اجنبی اور مسافر اور نئے لوگ تو ان کی پوری نگہداشت اور حفاظت کرتے تھے یعنی ان کے آرام وراحت اور کھانے کا انتظام کرنا گھروں میں لے جانا ان مسافروں کا حق سمجھا جاتا تھا اور اس کا خاص اہتمام ہوتا تھا۔یا یہ مقصد ہے کہ صحابہ تلاش میں ہوتے تھے کہ کسی پردیسی مسافر اور اعرابی کو لے آئیں تاکہ وہ کچھ بات پوچھے۔صحابہ کرامؓ حضورﷺ کے ساتھ بہت سی باتیں کرنا چاہتے تھے لیکن ادب اور عظمت اور حرمت ایسی تھی کہ حضرت ابوبکرؓ،حضرت عمرؓ جیسے صحابہ کو بھی ہمت نہیں ہوتی تھی دیہاتی اور گنوار قسم کے لوگ سب کچھ پوچھ لیتے تھے۔وہ تو آداب سے بے خبر سیدھے سادے تھے۔صحابہ انتظار میں ہوتے کہ آج نئی باتیں معلوم ہوں گی۔پردیسی تو اس ڈھنگ و آداب کو نہیں سمجھتے۔باہر سے کھڑے ہوکر زور زور سے پکارتے یا محمد (صلی اللہ علیہ وسلم)''**اخرج الینا**'' اے محمد(ﷺ) باہر نکلو ہمیں بتلادو کہ فلاں مسئلہ کیسا ہے۔کوئی آکر پوچھتا اور کہتا کہ سیدھی سادی باتیں بتادو لمبی چوڑی نہیں بس دو جملے۔دور دراز سے آیا ہوں ایسی باتیں کہ میں اس کو حفاظت سے یاد رکھ سکوں اور اس پر عمل کرسکوں۔تو دیہاتی لوگ اس انداز میں ایسے ایسے سوال کرجاتے تھے تو صحابہؓ خوش ہوجاتے تھے کہ ہم سے تو یہ نہیں ہوسکتا تھا لیکن آج انہوں نے ہماری معلومات اور علم میں نئی باتوں کا اضافہ کردیا تو یہ بھی حفاظت غریب ہے پردیسی مسافر مہمان کو غریب کہا جاتا ہے یعنی صحابہؓ پردیسی لوگوں کی آمد کا انتظار کرتے تھے۔اللہ تعالیٰ حضورﷺ کے اخلاق عالیہ پر چلنے کی توفیق عطا فرمائے۔اس حدیث کے کچھ اور حصے بھی ہیں۔وہ بڑے عجیب ہیں۔یہ روایت کئی ٹکڑوں میں ہے۔ایک ٹکڑا ابتداء میں گزر چکا ہے۔حضورﷺ کا عجیب انداز وہاں بھی مفصل مذکور ہے۔

وہ بھی حضرت حسینؓ کی یہی روایت ہے۔حضرت علیؓ سے آگے بھی کچھ حصہ آئے گا۔اگلے باب میں کچھ تفصیل ذکر ہے۔

(۸) حدّثنا محمّد بن عبداللّٰہ بن بزیع ثنابشربن المفضّل ثنا سعید عن قتادۃ عن أنس بن مالک قال قال رسول اللّٰہﷺ لوأھدی إلیّ کراع لقبلت ولودعیت علیہ لاجبت(۱).

ترجمہ: حضرت انس بن مالکؓ سے روایت ہے کہ نبی کریمﷺ نے فرمایا کہ اگر مجھے بکری کا ایک پایہ بھی ہدیہ کیا جائے تو میں قبول کروں اور اگر اس کی دعوت پر مجھے بلایا جائے تو میں ضرور جاؤں۔

لواھدی الیّ کراع،کراع جانور کی پچھلی ٹانگ کے ٹخنوں سے بھی نیچے کے حصے کو کہتے ہیں۔اور بعض شراح نے پنڈلی کے گوشت سے خالی حصے کو کراع کہا ہے۔بہرحال یہ کھانے کے لحاظ سے بیکار قسم کا حصہ ہوتا ہے۔لیکن رسول اللہﷺ فرماتے ہیں کہ اگر چہ یہ حصہ بہت ادنیٰ درجے کا ہے لیکن میں اس کو بطور ہدیہ اور بطور دعوت قبول کروں گا کیونکہ قبول نہ کرنے کا مطلب تعلّی وتکبر ہے۔اور اس طرح ہدیہ دینے والے اور دعوت پر بلانے والے کی دل آزاری ہوگی۔

(۹) حدّثنا محمّد بن بشّار ثنا عبدالرحمٰن ثنا سفیان عن محمّد بن المنکدر عن جابر قال جاء نی رسول اللّٰہﷺ لیس براکب بغل ولابرذون(۲).

---

(۱)جامع ترمذی ۱/۲۴۸کتاب الاحکام فی قبول الھدایۃ، السنن الکبریٰ ۱/۱۶۰، مصنف ابن ابی شیبۃ۶/۵۵۶(مختار)

(۲)صحیح بخاری ۲/۸۴۶کتاب المرضیٰ باب عیادۃ المریض راکباً الخ، سنن ابی داؤد ۲/۸۵ کتاب الجنائز، باب المشی فی العیادۃ، جامع ترمذی ۲/۲۲۴کتاب المناقب باب فی مناقب جابر بن عبداللّٰہ، (مختار)

ترجمہ: حضرت جابرؓ کہتے ہیں کہ رسول اکرمﷺ (میری عیادت کرنے) تشریف لائے نہ خچر پرسوار تھے اور نہ تُرکی گھوڑے پر۔ (بلکہ پیادہ تھے)

لیس براکب بغل ولا برذون، بغل خچر کو اور برذون تُرکی یا فارسی گھوڑے کو کہتے ہیں۔ آپﷺ امراء وسلاطین کے برعکس بلاضرورت سواری پرسوار نہیں ہوتے تھے۔ بلکہ پیادہ چلنے کے عادی تھے اور یہی اس حدیث کو باب تواضع میں ذکر کرنے کی وجہ ہے۔ یہ حدیث بخاری شریف میں ذرا تفصیل کیساتھ ذکر ہے۔ جس میں حضرت ابوبکر صدیقؓ کی معیت کا ذکر بھی ہے۔ نیز حضرت جابرؓ کی بے ہوشی، نبی کریمﷺ کا وضوء کے پانی کو ان پر چھڑکنا اور حضرت جابرؓ کا میراث کے بارے میں سوال کا بھی ذکر ہے۔

(۱۰) حدثنا عبداللّٰہ بن عبدالرحمٰن انا ابونعیم ثنایحی بن ابی الھیثم العطّار قال سمعت یوسف بن عبداللّٰہ بن سلام قال سمّانی رسول اللّٰہﷺ یوسف واقعدنی فی حجرہ ومسح علی راسی(۱).

ترجمہ: یوسف بن عبداللہ بن سلامؓ کہتے ہیں کہ نبی کریمﷺ نے میرا نام یوسف رکھا مجھے اپنی گود میں بٹھایا اور میرے سر پر ہاتھ پھیرا۔

یوسف بن عبداللّٰہ، باب نمبر ۲۶ کی حدیث نمبر ۳۲ کے ضمن میں یوسف اور ان کے والد کے احوال کا تذکرہ ہو چکا ہے۔ امام بخاریؒ کے نزدیک یوسفؓ صحابی ہیں جبکہ بعض نے اسے تابعی کہا ہے۔ زیرنظر حدیث امام بخاریؒ کی تائید کرتی ہے۔

فی حجرہ، حجر گود کو کہتے ہیں جبکہ بعض لوگوں نے حجر کا ترجمہ جولی کیا ہے۔ اس حدیث میں تبرک کے طور پر بچوں کو بزرگوں کے ہاں پیش کرنے اور ان سے نام رکھوانے کا عمل ثابت ہوتا ہے۔ صحابہ کرامؓ بھی اس بات کی کوشش کرتے تھے جیسا کہ احادیث میں آیا ہے اور نبی کریمﷺ ان کی فرمائش کو پورا کرتے تھے۔ یہ استنکاف نہ تھا کہ پیغمبر ہوکر کیسے دوسروں کے بچوں کو اہمیت دوں۔

(۱۱) حدثنا إسحاق بن منصور ثناأبوداؤد أنباناالربیع وھوابن صبیح ثنا یزید الرقاشیّ عن أنس بن مالک أنّ النبیّﷺ حجّ علی

---

(۱)مسنداحمد ۴/۲۰ ۶ حدیث نمبر ۱۵۹۶۹ (مختار)

رحل رث و قطیفة کنّانری ثمنها اربعة دراھم فلمّا استوت به راحلته قال لبیک بحجّة لاسمعة فیھا و لاریاء(۱).

ترجمہ: حضرت انسؓ کہتے ہیں کہ نبی کریمﷺ نے ایک بوسیدہ کجاوے اور جھالروں والے ایک ایسے کپڑے پرحج کیا جس کی قیمت ہمارے خیال میں (صرف) چاردرہم تھی۔پھر جب آپﷺ کو اٹھا کر آپ کی اونٹنی سیدھی کھڑی ہوگئی تو آپﷺ نے دعافرمائی ''اے میرے رب میں تیرے لئے حاضرہوں ایک ایسے حج کے ساتھ جس میں نام ونمود نہیں ہے۔''

کنانُری ثمنھاالخ،یہ حدیث اسی باب کی پانچویں حدیث ہے جوامام ترمذیؒ نے محمود بن غیلان کے واسطے سے روایت کی ہے لیکن اس میں ایک اشکال ہے کہ وہاں تو یہ آیا تھا کہ اس قطیفہ کی قیمت چاردرہم بھی نہیں تھی اور یہاں چاردرہم قیمت بتارہے ہیں۔اس کا جواب اکثر شارحین نے یہ دیا ہے کہ دراصل اس کمبل کی قیمت چاردرہم سے کم ہی تھی لیکن یہاں پرتقریبی قیمت بتائی گئی ہے(۲)۔

لاسمعة فیھا و لاریاء،علامہ بیجوریؒ نے اس جملے سے بھی تواضع کا اثبات کیا ہے۔کہ باوجود معصوم ہونے کے آپﷺ نام ونمود کی نفی کی دعا کرتے ہیں یہ سب تواضعاً ہے۔حدیث کی مزید تشریح پہلے گزرچکی ہے۔

---

(۱)سنن ابن ماجة ۲۰۷ کتاب المناسک باب الحج علی الرحل، مصنف ابن ابی شیبة ۱۰۶/۴ الحلیة الاولیاء لابی نعیم ۵۳/۳(مختار)

(۲)اقول یمکن ان یکون عندالنبیّﷺ فی ھذا الحج قطیفتان احدھما علی الرحل تحت النبیﷺ و کانت قیمتھا اربعة دراھم. وثانیتھما ارخص منھا و کانت علی النبی ﷺ کماینبیٔ علیه لفظ الروایة السابقة. وحینئذٍ الضمیر فی قوله"وعلیه قطیفة" راجعاً علی النبیﷺ (فی الروایة السابقة) کمارجحه الحنفیؒ والمناویؒ خلافاً للقاریؒ، اما فی ھذه الروایة فلفظ القطیفة عطف علی الرحل لاغیر. فکانت تحت النبیﷺ واقول إنّ التواضع علی ھذا التوجیه لمعنی آخرایضاوھوأنّه علیه السلام جلس علی الغالیة والقی علیه القطیفة الرخیصة وذلک تواضع منه ونفی الریاء والسمعة خلافاً لماھو داب المترفین المتکبرین.

ثم اعلم ان ھذ التوجیه من مقترحات قریحتی لم اره عند احدفان وافقنی احدفالحمدللّٰه علی ذلک وان ردّه اھل العلم فلایسؤنی ان یرمی به علی وجھی.(اصلاح الدین الحقانی)

(۱۲) حدثنا إسحٰق ثنا عبدالرزاق ثنا معمر عن ثابت البنانیّ وعاصم الأحول عن أنس بن مالک أنّ رجلا خیّاطا دعا رسول اللّٰہﷺ فقرّب له ثریدا علیه دبّاء وکان رسول اللّٰہﷺ یاخذ الدباء وکان یحبّ الدباء قال ثابت فسمعت أنسا یقول فما صنع لی طعام اقدر علی ان یصنع فیه دباء إلاّ صنع(۱).

ترجمہ: حضرت انس بن مالکؓ فرماتے ہیں کہ ایک درزی نے نبی کریمﷺ کی دعوت کی۔اس نے آپ کو ثرید پیش کیا جس پر کدو رکھا ہوا تھا۔نبی کریمﷺ کدو کے ٹکڑے اٹھاتے رہے کیوں کہ آپﷺ کو کدو پسند تھا۔حضرت ثابتؒ کہتے ہیں کہ میں نے حضرت انسؓ کو یہ کہتے ہوئے سنا کہ اس کے بعد میرے لئے کوئی ایسا کھانا تیار نہیں کیا گیا۔جس میں مجھے کدو ڈلوانے کی قدرت ہو مگر اس میں کدو ضرور ڈالا گیا۔

ان رجلاً خیّاطاً، یہ شخص نبی کریمﷺ کا آزاد شدہ غلام تھا۔جیسا کہ باب ادام النبیﷺ کی گیارہویں حدیث میں گزر چکا ہے۔

فقرب له ثریدا، یہاں پر یہ بات آئی ہے کہ اس درزی نے ثرید آپﷺ کی خدمت میں پیش کی جبکہ باب ادام میں آیا ہے کہ "**فقرب الی الرسولﷺ خبزاً من شعیر ومرقا**" بظاہر یہ تعارض معلوم ہوتا تھا لیکن تطبیق ممکن ہے۔کہ دونوں چیزیں ہوں یا ثرید کو پہلی حدیث میں روٹی شوربا کہا گیا ہو۔کیونکہ ثرید اسی سے مرکب ہوتا ہے۔البتہ وہاں پر کدو کے ساتھ قدید یعنی گوشت کے ٹکڑوں کا بھی ذکر ہے۔یہاں پر ثرید کے ضمن میں ان کا ذکر ہو رہا ہے۔کیونکہ ثرید میں گوشت کے ٹکڑے ہوتے ہیں۔اس حدیث میں نبی کریمﷺ کے ایک غلام کی دعوت پر اور وہ بھی جو کی روٹی اور کدو کے سالن پر جانے کا ذکر ہے۔جو آپﷺ کی تواضع کی بیّن دلیل ہے۔

---

(۱)صحیح بخاری ۸۱۷/۲، صحیح مسلم ۱۸۰/۲ کتاب الاشربة باب جواز اکل المرق الخ جامع ترمذی ۶/۲ کتاب الاطعمة باب ماجاء فی اکل الدباء ،سنن ابن ماجة جلد باب الدباء ص۲۳۷، مؤطا امام مالک، السنن الکبریٰ ۲۷۳/۷، دارمی ۱۰۱/۲ (مختار)

(۱۳) حدّثنامحمّدبن اسمٰعیل ثناعبداللّٰہ بن صالح حدّثنی معاویۃ بن صالح عن یحیی بن سعید عن عمرۃ قالت قیل لعائشۃ ماذاکان یعمل رسول اللّٰہﷺ فی بیتہ قالت کان بشراً من البشر یفلی ثوبہ ویحلب شاتہ ویخدم نفسہ(۱).

ترجمہ: حضرت عائشہؓ سے پوچھا گیا کہ نبی کریمﷺ گھر میں کیا کام کیا کرتے تھے۔انہوں نے جواب دیا کہ نبی کریمﷺ انسانوں میں سے ایک انسان تھے۔ (گھر میں ضرورت ہوتی تو وہ) اپنے کپڑوں میں جوئیں تلاش کرتے تھے۔بکری کا دودھ دوہتے تھے۔اوراپنے کاموں میں خود لگے رہتے تھے۔

کان بشراً من البشر، یعنی آپﷺ بنیادی طور پرانسان ہی تھےاورانسانیت نبوت کے منافی نہیں ہے۔مشرکین کوآپﷺ کی انسانیت پراعتراض تھا۔لہٰذاوہ کہتے تھے **مالھٰذا الرسول یاکل الطعام ویمشی فی الاسواق**، یعنی ایسابھی کوئی رسول ہوتا ہے۔جوکھانا کھائےاور بازاروں میں پھرے۔لیکن حضرت عائشہؓکہتی ہیں کہ آپﷺ بشری تقاضوں سے مبرانہیں تھے۔بلکہ گھر میں بھی انسانی ضروریات کوخود پورافرماتے تھے۔

یفلی ثوبہ، بعض روایات میں آیا ہے کہ جویں نبی کریمﷺ کواذیت نہیں دیتی تھیں توپھر جویں تلاش کرنے کا کیا مطلب؟ علامہ مناویؒ لکھتے ہیں۔کہ نبی کریمﷺ کا پسینہ خوشبودارتھا۔جبکہ جویں تو تعفن کی وجہ سے پیدا ہوتی ہیں۔اس لئے آپﷺ میں جوؤں کا ہونا مستبعد لگتا ہے لیکن اس کے متعدد جواب دیئے گئے ہیں۔کہ نبی اکرمﷺ میں جویں نہیں تھیں یہاں توصرف تلاش کرنے کا ذکر ہے جوامت کی تعلیم کیلئے بھی ہوسکتا ہے۔اور یہ بھی احتمال ہے کہ نظافت اورخوشبو کی وجہ سے خود آپﷺ کے بالوں میں جویں پیدا نہیں ہوتی تھیں لیکن کبھی دوسرےلوگوں کی جویں آپﷺ کے سرمبارک میں گھس جاتی تھیں۔پھربھی یہ جویں آپﷺ کواذیت نہیں دیتی تھیں لیکن آپ ان کوگندہ سمجھ کرخودنکال دیتے تھے۔

---

(۱)مصنف عبدالرزاق رقم حدیث ۲۰۴۹۲،شرح السنۃ ۱۳/۲۴۳ کتاب المناقب باب فی شیبہ وخضابہ ﷺرقم الحدیث ۳۶۷۶، مسنداحمد ۶/۱۰۶ (مختار)

ویخدم نفسه ،مثلاًبعض روایات میں آیا ہے کہ آپﷺ اپنے کپڑوں کی سلائی کرلیا کرتے تھے۔ پھٹے کپڑوں کو پیوند لگانا، جوتوں کی مرمت کرنا،خود ہی وضوء کا پانی اپنے لئے مہیا کرنا،اورخود ہی پانی ڈالنا آپﷺ کا معمول تھا۔ایک روایت میں یہ بھی آیا ہے کہ ''ویعمل عمل البیت'' یعنی آپﷺ گھر کے کام کاج خود کیا کرتے تھے۔

الغرض درون خانہ اور گھر کے باہر ہر جگہ آپﷺ تواضع کا مظاہرہ فرماتے تھے۔اور دوسروں کی نسبت خود کو اعلیٰ وبرتر سمجھ کر امتیازات کی طلب اور جستجو سے اجتناب فرماتے تھے۔

خلاصۂ باب

اس باب میں نبی کریمﷺ کی فروتنی اور تواضع کا بیان ہے۔ضابطہ یہ ہے کہ آدمی جتنا عظیم المرتبہ ہوتا ہے۔اتنا ہی اس میں احساس عبدیت اور فروتنی زیادہ ہوتی ہے اور جتنی عاجزی زیادہ ہوتی ہے۔بندہ اتنا ہی بلندی اور مقام عروج کے قریب تر ہوتا ہے۔تکبر صرف اور صرف واجب الوجود اور رب العالمین کا خاصہ ہے۔اور یہی وجہ ہے کہ نبی کریمﷺ میں تواضع حد درجہ کی تھی۔جتنا مقام بلند تھا اتنی ہی فروتنی تھی۔

بدیں وجہ آپﷺ صحابہ کرام کو مبالغہ آمیز ستائش سے منع فرماتے تھے۔اگر وہ محبت کی وجہ سے بھی کھڑے ہونے کی کوشش فرماتے تو آپﷺ پر گراں گزرتا۔غلاموں، باندیوں بلکہ فاتر العقل عورتوں کے ساتھ ملنے اور ان کے تقاضے پورے کرنے سے استنکاف نہیں فرماتے تھے۔نشست وبرخاست، ملاقات، سلام وکلام، کھانے ،لباس، بستر ے،سواری اور مکان وغیرہ میں سادگی برتنا آپﷺ کا وطیرہ تھا۔

بیماروں کی عیادت کرنا، جنازوں میں شرکت، سادہ دعوتوں کو قبول کرنا، گھر کے کام کاج میں شرکت کرنا،اپنی خدمت کسی اور سے نہ کروانا،سرراہ سائلوں کی حاجت براری کرنا وغیرہ ایسے کام اس بات کی غماز ہیں کہ آپﷺ اپنی ذاتی عظمت اور منصب سے پوری طرح صرف نظر فرمایا کرتے تھے۔اور خود کو ایک عام آدمی کی طرح پیش فرماتے تھے۔مسند احمد میں حضرت حسنؓ کی ایک روایت میں آپﷺ کی تواضع کا نقشہ یوں ذکر کیا گیا ہے۔

لاواللّٰہ ماکانت تغلق دونه الابواب ولاتقوم دونه الحجاب ولایغدیٰ علیه بالجفان ولایراح علیه بها، ولکنه کان بارزاً من ارادان یلقیٰ نبی اللّٰہ لقیه. کان یجلس بالارض ویوضع طعامه بالارض ویلبس الغلیظ ویرکب الحمار ویردف ویلعق واللّٰہ یده،

ترجمہ: نہیں خدا کی قسم آپ کے پیچھے دروازے بند نہیں کئے جاتے تھے نہ آپ پر پہرہ بٹھایا جاتا تھا، نہ صبح کے وقت آپ کے پاس کھانے کے برتن لے جائے جاتے تھے نہ شام کو۔ بلکہ آپﷺ کھلم کھلا پھرتے تھے جو بھی چاہتا کہ پیغمبر خدا کے ساتھ ملے مل لیتا تھا۔ زمین پر بیٹھ جاتے تھے ان کا کھانا بھی زمین پر رکھ دیا جاتا تھا۔ موٹا کپڑا پہنتے تھے۔ گدھے پر سواری کر لیتے تھے۔ دوسرے کو بھی پیچھے بٹھا لیتے تھے۔ اور خدا کی قسم انگلیاں بھی چاٹ لیتے تھے۔

یہ تھی مینارِ عظمت کی کسرِ نفسی اور فروتنی۔ اللہ تعالیٰ ہمیں بھی اتباع کی توفیق بخشے۔ آمین

۴۸. باب ماجاء فی خُلق رسول اللّٰہ ﷺ

رسول اللہ ﷺ کے اخلاق مبارکہ کا بیان

حقیقت اخلاق: خُلق خاء کے ضمہ اور لام کے سکون نیز دونوں کے ضمہ کے ساتھ طبیعت اور نفس کے باطنی اوصاف ومعانی کا نام ہے۔جس طرح کہ انسان کی ظاہری صورت ہوتی ہے۔اس صورت میں محاسن بھی ہوتے ہیں۔اور قبائح بھی اسی طرح نفس انسانی کیلئے باطنی صورت بھی ہوتی ہے۔اس صورت میں بھی محاسن اور قبائح دونوں ہوسکتے ہیں۔ باطنی صفات اور معانی میں سے وہ صفات جو خدا اور سلیم الفطرت انسانوں کے ہاں مقبول اور محمود ہوں اور جو ظاہری اعمال مستحسنہ کیلئے بنیاد بنتی ہوں اخلاق حسنہ کہلاتی ہیں۔ اور چونکہ اللہ تعالیٰ کے ہاں ظاہری صورت وہیئت کی کوئی قیمت نہیں۔اس لئے ثواب اور مقبولیت کا دارومدار انہی باطنی صفات اور اخلاق حسنہ پر ہوتا ہے اور انسان کے کمال کا بڑا وسیلہ اخلاق ہی ہیں۔

حسن خلق کا مصداق: اخلاق حسنہ کے مصداق میں علماء شرع کے مختلف اقوال منقول ہیں۔حافظ عسقلانیؒ کہتے ہیں کہ فضائل کی تحصیل اور رزائل کے ترک کا نام ہے۔قاضی عیاضؒ کہتے ہیں کہ لوگوں کے ساتھ شائستہ رویہ رکھنا،خندہ پیشانی،نرم مزاجی،برداشت،شفقت،صبر جیسی صفات کو اپنانے نیز تکبر،لوگوں کی بے عزتی،غیظ وغضب اور مؤاخذہ سے تجنب کا نام حسن خلق ہے۔

حضرت حسن بصریؒ فرماتے ہیں حسن خلق کا مصداق احسان کرنا،اذیت دینے سے اجتناب اور خندہ روئی ہے۔امام احمدؒ کہتے ہیں کہ حسن خلق یہ ہے کہ غضب اور حسد تم میں نہ ہو۔امام ترمذیؒ نے ابواب البر میں عبداللہ بن مبارک کا قول نقل کیا ہے کہ حسن خلق کشادہ روئی،احسان کرنا اور اذیت سے اجتناب ہے۔

اخلاق کسبی ہیں یا وہبی: پھر اس میں بھی دو قول ہیں کہ اخلاق کسبی ہیں یا وہبی ہیں۔بعض علماء کا خیال ہے کہ یہ طبعی اور فطری صفات ہوتی ہیں۔کیونکہ بخاری شریف کی روایت میں ہے"**ان اللّٰہ قسّم بینکم اخلاقکم کما قسّم ارزاقکم**"،بعض لوگوں کے خیال میں کچھ کسبی بھی ہیں۔جیسا کہ اشجّ عبدالقیس منذر بن عائذؓ جب حضور ﷺ کے پاس حاضر ہوئے تو آپ ﷺ نے فرمایا کہ"**إنّ فیک خصلتین یحبّهما اللّٰہ الحلم و الانأة**"اشجّ عصریؓ نے کہا کیا یہ مجھ میں پہلے سے تھیں یا بعد میں ملی

ہیں۔تو آپ ﷺ نے فرمایا کہ نہیں بلکہ دونوں خصلتیں قدیم سے ہیں۔ چنانچہ علامہ ابن حجرؒ کہتے ہیں کہ منذرؓ کا سوال کرنا، پھر نبی کریم ﷺ کا سوال کو رد نہ کرنا بلکہ جواب دینا اس بات کی دلیل ہے کہ کچھ اخلاق وہبی اور فطری ہوتی ہیں۔مگر کچھ ''حدیث''یعنی کسبی بھی ہوتی ہیں۔اور اسی وجہ سے اخلاق حسنہ کے اکتساب کا حکم بھی دیا جاتا ہے کیونکہ یہ اختیاری ہیں۔

لیکن ملاعلی قاریؒ کہتے ہیں کہ اخلاق تمام تر دراصل تو جبلّی صفات ہوتی ہیں۔البتہ یہ زیادت اور نقصان کو قبول کرتی ہیں۔اسی لئے علمی اور عملی امور پر مبنی ریاضات اور جدوجہد سے ان کو کم وکیف کے اعتبار سے بڑھایا جاتا ہے اور کبھی غفلت کی وجہ سے ان میں نقص آنے لگتا ہے(۱)۔

<u>اخلاق نبوی ﷺ کا کمال:</u> نبی کریم ﷺ انسانیت کے عروج پر بلکہ تمام مخلوقات میں اکمل وافضل ہیں۔اور اس کی سب سے بڑی وجہ بھی آپ ﷺ کے اخلاق کا کمال ہے۔خود اللہ تعالیٰ نے آپ ﷺ کو اخلاق کے معراج پر قرار دیا ہے۔''إنّک لعلیٰ خلق عظیم''،انّ، جملہ اسمیہ، لام تاکید اور عظیم سے توصیف کر کے اللہ تعالیٰ نے آپ ﷺ کے اخلاق عظمت کا خوب نقشہ کھینچا ہے۔

حضرت عائشہؓ جو حضور ﷺ کے ظاہر و باطن کو شاید تمام لوگوں کی نسبت سب سے زیادہ جاننے والی تھیں۔خود کو اخلاق نبوی ﷺ کے بیان سے عاجز جیسی تصور کر کے فرماتی ہیں''کان خلقه القرآن''یعنی جس طرح قرآن مجید کے معانی، محاسن اور خوبیوں کا استقصاء ممکن نہیں اسی طرح آپ ﷺ کے اخلاق جمیلہ کے احاطہ سے کلام عاجز ہے۔اور یہی وجہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے آپ ﷺ کو انسانوں کے ہر طبقے، جنات کے تمام انواع بلکہ بقول ملاعلی قاریؒ ملائکہ، نباتات و جمادات کیلئے نبی بنا کر بھیجا۔

خلاصہ یہ کہ اخلاق جمیلہ باطنی فضائل سے اتصاف اور رزائل سے اجتناب کا نام ہے۔ نبی کریم ﷺ کو اللہ تعالیٰ نے اس صفت میں بھی اکمل بنا کر بھیجا۔اور اگر چہ کسی شخص کیلئے اخلاق نبوی ﷺ کی صحیح تصویر کشی ممکن نہیں ہے لیکن امام ترمذیؒ نے مشت نمونہ خروار کے طور پر ان کا ذکر فرمایا ہے کیونکہ

---

(۱)امام غزالیؒ نے فرمایا کہ اخلاق گو جبلی ہیں البتہ ان پر جو آثار مرتب ہوتے ہیں وہ اختیاری ہیں اس لئے امر و نہی ان آثار پر ہوا ہے مثلاً کسی کی جبلّت میں غصہ رکھا ہوا ہے، یہ غیر اختیاری ہے۔اس پر جو گالی دے بیٹھا یہ امر اختیاری ہے اور اسی پر مؤاخذہ ہوگا۔(تقریر ترمذی حضرت مدنیؒ وشمائل ترمذی ص۸۹۴)(مختار)

"مالایدرک کلہ لایترک کلہ" یعنی سب کچھ نہ ملے تو کچھ کچھ ہی کافی ہے۔ چنانچہ اس سلسلے میں پندرہ احادیث ذکر کر کے انہوں نے اپنی ذمہ داری کو نبھایا ہے۔

(۱) حدّثنا عبّاس بن محمّد الدوریّ ثنا عبداللّٰہ بن یزید المقریٔ ثنا لیث بن سعد حدثنی أبوعثمان الولید بن أبی الولید عن سلیمان ابن خارجة عن خارجة بن زید بن ثابت قال دخل نفر علیٰ زید بن ثابتٍ فقالوا له حدثنا أحادیث رسول اللّٰه ﷺ قال ماذا احدّثکم کنت جاره فکان اذا نزل علیه الوحی بعث الیّ فکتبته له فکنّا اذا ذکرنا الدنیا ذکرها معنا واذا ذکرنا الأخرة ذکرها معنا واذا ذکرنا الطعام ذکره معنا فکل هذا احدّثکم عن النبیّ ﷺ(۱).

ترجمہ: حضرت زید بن ثابتؓ کے پاس کچھ لوگ آئے اور درخواست کی کہ نبی کریم ﷺ کی کچھ باتیں سنائیں۔ انہوں نے کہا کہ کچھ سناؤں؟ میں ان کا پڑوسی تھا جب آپ ﷺ پر وحی نازل ہوتی تو مجھے بلوا لیتے تھے۔ میں (حاضر ہو کر) وہ وحی لکھ لیتا تھا(۲)۔ پھر جب ہم (صحابہ) دنیا کی باتیں کرتے تو آپ ﷺ بھی ہمارے ساتھ (ہماری دلداری کی خاطر) دنیا کی باتیں کرتے تھے اور جب ہم آخرت کو یاد کرتے تو آپ ﷺ بھی ہمارے ساتھ آخرت کو یاد فرماتے۔ اور اگر ہم کھانے پینے کی

---

(۱) شرح السنة للبغوی ۲۴۵/۳ کتاب المناقب باب فی تواضعه ﷺ رقم الحدیث ۳۶۷۹، الدلائل النبوة للبیهقی ۳۲۴/۱ مجمع الزوائد ۵۷۸/۸ کتاب علامات النبوة باب فی حسن خلقه وحیائه الخ (مختار)

(۲) کاتبین وحی کی تعداد میں علماء کا اختلاف نو پر تو سب متفق ہیں البتہ بعض نے ۱۹ بتائی ہے۔ علامہ عبدالجواد الدومیؒ نے لکھا ہے متفقہ افراد کے اسماء ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے و کتاب الوحی هم زید و عثمان و علی و أبی و معاویة و خالد بن سعید و حنظلة بن الربیع و العلاء بن الحضرمی و ابان بن سعید (الاتحافات ۳۲۹) اگرچہ بعض حضرات نے امیر معاویہؓ کے بارے کہا ہے کہ آپ صرف مراسلات لکھتے تھے مگر حقیقت یہ ہے کہ آپ کاتبین وحی میں شمار ہیں (مختار)

بات کرتے تو آپ ﷺ بھی اس کا ذکر فرماتے تھے۔ یہ سب کچھ میں نبی کریم ﷺ
کے حالات بیان کرر ہا ہوں۔

زید بن ثابتؓ: حضرت زید بن ثابت بن لوذان بنوالنجار کے انصاری صحابی ہیں۔کنیت ابوسعید اور ابوخارجہ تھی۔ہجرت کے دن آپؓ کی عمر گیارہ برس تھی نبی کریم ﷺ کیلئے خطوط نویسی کے ساتھ ساتھ وحی کی کتابت بھی کیا کرتے تھے۔ نبی اکرم ﷺ کی زندگی میں جن چار صحابہ کو پورا قرآن حفظ تھا ان میں آپؓ کا نام اس لحاظ سے اہم ہے کہ حضرت ابوبکر صدیقؓ نے جمع قرآن کی خدمت کیلئے انہی کو منتخب فرمایا تھا۔ پھر حضرت عثمانؓ نے اشاعت قرآن کی غرض سے مصحف صدیقی سے قرآن مجید جس کمیٹی سے نقل کروایا، اس میں بھی آپؓ کو منتخب فرمایا۔ اللہ تعالیٰ نے امتیازی علم بخشا تھا بالخصوص علم فرائض میں آپؓ سب سے آگے تھے۔وفات کے روز حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا''**دفن الیوم علم کثیر** '' آج بڑا علم دفن کیا گیا۔۴۵ھ یا ۴۸ھ میں وفات پائی۔

احاطہ اخلاق نبوی ﷺ ناممکن: **فقال ماذا احدّثکم** ،جب ساتھیوں نے نبی کریم ﷺ کے حالات سنانے کی فرمائش کی تو حضرت زید بن ثابتؓ نے بطور تعجب فرمایا کہ کیا کیا سناؤں، گویا تم تو نبی کریم ﷺ کے احوال، افعال واقوال کا احاطہ چاہتے ہو حالانکہ یہ ناممکن امر ہے۔آپ ﷺ کے اخلاق وشمائل کا بیان تو کجا اس کے عشر عشیر کا ادراک بھی محال ہے۔

آپ ﷺ کے حق میں مدح جتنی بھی کی جائے کم ہے بلکہ ایک شاعر کے بقول ؎

تجاوز حق المدح حتّٰی کانّہ **باحسن مایثنیٰ علیہ یعاب**

یعنی آپ ﷺ مدائح اور تعریفوں کے حدود سے آگے جا چکے ہیں کہ یہاں تک کہ اگر کچھ سے بہتر تعریف وتوصیف سے آپ ﷺ کی مدح کی جائے وہ بھی آپ ﷺ کیلئے عیب جیسی ہے۔

؎ دفتر تمام گشت وبپایاں رسید عمر ما ہمچناں دراول وصف تو ماندہ ایم

بہر حال حضرت زیدؓ کا مقصد یہ ہے کہ سب کچھ بیان کرنا مشکل ہے البتہ محبوب کا ذکر آئے اور کچھ بھی نہ کہا جائے یہ بھی عشق کی ناقدری ہے۔اس لئے آپؓ نے رسول کریم ﷺ کے اخلاق کا ایک پہلو اجاگر کردیا کہ کس طرح آپ ﷺ اپنے صحابہ کی دلداری کیا کرتے تھے ایسے موضوع اور باتوں میں بھی

شرکت فرماتے تھے جو صحابہ کرامؓ کی نظر میں دنیاداری کے امور تھے۔

ذکرھا معنا، ہمارے ساتھ دنیا کا بھی ذکر کر لیتے تھے۔ دنیا کے ذکر سے مراد یہ نہیں کہ دنیا کی محبت وتنافس میں مبتلا ہوکر بولتے تھے بلکہ مراد یہ ہے کہ ہمیں دنیا کی باتوں سے منع کرنے کی بجائے اس میں بھی شریک ہوجاتے تھے۔ البتہ ایسے رخ کی طرف اسے موڑ دیتے جس سے صحابہ کی توجہ دین کی جانب مبذول ہوجاتی تھی۔ مثلاً تجارت کے اصول اس کی برکتیں، دولت کے فوائد ونقصانات، اسے اللہ کے راستے میں خرچ کرنے کی ترغیب دنیا ہی کی باتیں ہیں۔ مضمون وموضوع سے خروج بھی نہیں اور رخ بھی دین کی جانب ہے۔ اس طرح کھانے پینے کی بات ہوتی تو بھی آپ ﷺ کھانے کے فوائد نقصانات اس کے آداب، بعض کھانوں کی حلت وحرمت دوسروں کو کھلانے کی فضیلت وغیرہ امور کا تذکرہ کر لیتے تھے۔

جیسا کہ احادیث کی کتابیں اس قسم کی مثالوں سے بھری پڑی ہیں یوں صحابہ کو وحشت بھی نہ ہوتی تھی نہ کسی بات کو کرنے کیلئے مجلس نبوی ﷺ سے نکلنے کی ضرورت پڑتی۔ ساتھ ساتھ منصب نبوت کا حق بھی ادا ہوتا تھا اور اگر یہاں ذکر سے مراد احکام ومعارف نہ بھی لیں تو بھی یہ فائدہ کیا کم ہے کہ صحابہ کو انس حاصل ہو۔ نیز یہ پہلو بھی سامنے آیا کہ امیر عوام کے ساتھ مجالس میں شریک ہوسکتا ہے۔

فکل هذا احدّثکم عن رسول اللّٰه، کل مرفوع مبتداء ہے اور احدثکم خبرہ ہے۔ "**ایاہ**"، ضمیر اس میں مقدر ہے جو مبتداء کو راجع ہے اور یہ بھی ممکن ہے کہ منصوب ہو، اور مفعول بہ مقدم ہو۔ اس جملے کا مطلب یہ ہے کہ پڑوسی اور مقرب ہونے کی وجہ سے آپ ﷺ کے ہر قسم کے حالات مجھے یاد ہیں۔ اس لئے ان کے بارے میں جو بھی سناؤں وہ دیدہ وشنیدہ باتیں ہیں اور تم جو کچھ پوچھو گے وہی سناؤں گا۔

(۲) حدّثنا إسحاق بن موسیٰ ثنا یونس بن بکیر عن محمّد ابن إسحاق عن زیاد بن أبی زیاد عن محمّد بن کعب القرظیّ عن عمرو بن العاص قال کان رسول اللّٰه ﷺ یقبل بوجهه وحدیثه علی اشرّ القوم یتألّفهم بذلک فکان یقبل بوجهه وحدیثه علیّ حتیّ ظننت أنّی خیر القوم فقلت یارسول اللّٰه انا خیر او ابوبکر فقال ابوبکر فقلت یارسول اللّٰه انا خیر ام عمر فقال عمر فقلت یارسول اللّٰه اناخیر ام

عثمان فقال عثمان فلما سألت رسول اللّٰہ ﷺ فصدّقنی فلو ددت أنّی لم اکن سألته(۱).

ترجمہ: حضرت عمرو بن العاصؓ کہتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ لوگوں میں بدترین شخص کی طرف بھی اپنی توجہ مبذول فرماتے تھے۔ آپ ﷺ (اس رویئے سے) ان کو مانوس فرماتے تھے۔ چنانچہ اپنی توجہ اور باتوں سے مجھے بھی نوازتے تھے۔ حتیٰ کہ میں سمجھنے لگا کہ میں (ان کے نزدیک) تمام لوگوں میں سے بہتر ہوں۔ اس لئے میں نے ایک دن پوچھا کہ یارسول اللہ ﷺ میں بہتر ہوں یا ابوبکر۔ آپ ﷺ نے فرمایا ابوبکر بہتر ہیں۔ پھر میں نے پوچھا کہ میں بہتر ہوں یا عمر۔ تو آپ ﷺ نے فرمایا عمر، پھر میں نے پوچھا کہ میں بہتر ہوں یا عثمان۔ آپ ﷺ نے فرمایا عثمان، تو جب میں نے آپ ﷺ سے بے تکلّف یہ سب کچھ دریافت کیا تو آپ ﷺ نے بھی لگی لپٹی بغیر سچ سچ بتایا (کہ میں فضیلت میں بہت سے صحابہ کے بعد ہوں) تو اب مجھے افسوس ہے کہ کاش میں یہ نہ پوچھتا (تاکہ حضور ﷺ سے قریبی تعلق کا احساس برقرار رہتا)

عمرو بن العاص: عمرو بن العاصؓ، بن وائل سہمی صحابی ہیں ۵ھ میں اسلام لائے۔ علامہ ابن حجرؒ نے لکھا ہے کہ صلح حدیبیہ کے سال یعنی ۶ھ میں اسلام لائے جبکہ بعض حضرات نے لکھا ہے کہ آپؓ اور حضرت خالد بن ولیدؓ دونوں صفر ۸ھ کو فتح مکہ سے پہلے اسلام لائے تھے۔ آپؓ انتہائی زیرک سیاستدان اور مدبر تھے۔ اس لئے آپؓ کو داهية العرب بھی کہا جاتا ہے۔ غزوہ ذات السلاسل میں نبی کریم ﷺ نے آپؓ کو امیر مقرر کیا۔ بعد میں آپؓ کو عمان کا والی مقرر کیا۔ اور حضور ﷺ کی وفات تک یہ خدمت انجام دیتے رہے۔ حضرت عمرؓ کے زمانہ میں مصر کو فتح کیا۔ اور انہوں نے مصر پر آپؓ کو والی مقرر کیا۔ پھر حضرت عثمانؓ نے آپ کو معزول کر دیا لیکن حضرت معاویہؓ کے عہد میں آپؓ دوبارہ مصر کے والی مقرر ہوئے اور وفات تک مصر میں رہے۔ آپؓ کی وفات ۴۳ھ میں عیدالفطر کی رات کو ہوئی۔ جبکہ بعض لوگوں نے ۵۰ھ کے بعد وفات ہونے کا لکھا ہے۔ اس وقت آپؓ کی عمر نوے سال تھی۔ مصر میں آپؓ کے نام سے مشہور جامع عمرو بن

(۱) مجمع الزوائد للهيثمی ۵۷۵/۸ کتاب علامات النبوة باب فی حسن خلقه وحيائه الخ (مختار)

العاص آج بھی موجود ہے۔

تالیف قلب کی حکمت: یتألفھم بذلک ، چونکہ اشرّ القوم معنیٰ کے لحاظ سے جمع ہے۔اس لئے یتالفھم کی ضمیر اشرالقوم کو بھی راجع ہوسکتی ہے اور یہ بھی ممکن ہے کہ یہ ضمیر قوم کو راجع ہو۔پہلی صورت میں معنیٰ یہ ہوگا کہ قوم کے بدترین افراد پر بھی ان کی تالیف قلب کے لئے توجہ فرماتے تھے۔دوسری صورت میں مطلب یہ ہوگا کہ قوم کے صلحاء اور اخیا تو ویسے بھی نبی کریم ﷺ سے مانوس تھے۔ان پر اتنی توجہ کی ضرورت ہی نہیں تھی۔

البتہ اشرار پر خصوصی توجہ کر لیتے تھے۔تو اس طرح ساری قوم بلا استثناء تابع ہوجاتی تھی یا یہ مطلب بھی ہوسکتا ہے کہ جب نیک لوگ اشرار کے ساتھ آپ ﷺ کا رویہ اور حسن خلق دیکھ لیتے تھے تو نبی کریم ﷺ کی عظمت اور محبت اور بھی دل میں بڑھ جاتی تھی۔ساتھ ساتھ اشرار کو بھی انس ہوجاتا تھا۔لہٰذا یتالفھم کی ضمیر قوم کو راجع کرنا درست ہوجائے گا۔

خندہ پیشانی نہ کہ مدح سرائی: لیکن یہ بات یاد رہے کہ نبی کریم ﷺ صرف باتوں کا رخ ایسے لوگوں کی طرف موڑتے یا خندہ پیشانی کے ساتھ توجہ فرماتے تھے جہاں تک ان لوگوں کی مدح سرائی اور ثنا وتوصیف ہے وہ کہیں بھی ثابت نہیں ہے کیونکہ ان کی تعریفیں کرنا، اور ایسے لوگوں کے غلط افعال کی تقریر کرنا پیغمبر کے شان کے منافی ہے بلکہ مداہنت متصور ہوگی جو شرعاً مفاسد پر مشتمل ہے۔

اور یہی وجہ ہے کہ جب حضرت عمرو بن العاصؓ نے پوچھ لیا تو آپ ﷺ نے دوسرے صحابہؓ کو ان پر ترجیح دے دی۔

فقلت یارسول اللّٰہ أناخیر او أبوبکر، یہ سوال حضرت عمرو بن العاصؓ نے اپنے ظن کے مطابق اور نبی کریم ﷺ کی کثرت توجہ سے متاثر ہوکر کیا۔**فصدقنی**،یعنی آپ ﷺ نے جواب میں کسی لچک کا مظاہرہ نہیں کیا بلکہ ٹھیک ٹھیک بتادیا کہ دیگر صحابہ تم سے افضل ہیں اور کسی قسم کی تردد اور مداہنت سے کام نہیں لیا۔

فلوددت أنّی لم اکن سألتہ، اپنے سوال پر ندامت کی وجہ دراصل یہ تھی کہ اس سے قبل اپنے بارے میں ایک حسن ظن قائم تھا کہ میں نبی کریم ﷺ کو بڑا پیارا اور تمام صحابہ کی نسبت زیادہ مقرب ہوں لیکن سوال کے بعد وہ حسن ظن جاتا رہا۔اور اصل حقیقت معلوم ہوگئی کہ آپ ﷺ نے مجھے استیناس اور

تالیف قلب کی وجہ سے مرکز توجہ بنایا ہے۔ دراصل میرا نمبر بہت پیچھے ہے۔

(۳) حدّثنا قتیبة بن سعید ثنا جعفر بن سلیمان الضبعیّ عن ثابت عن أنس بن مالک قال خدمت رسول اللهﷺ عشر سنین فما قال لی افٍ قط وماقال لشیٔ صنعته لم صنعته ولالشیٔ ترکته لم ترکته وکان رسول اللّٰهﷺ من احسن الناس خلقا ولامسست خزاو قطُّ لاحریراً ولاشیئا کان ألین من کفّ رسول اللّٰهﷺ ولاشممت مسکاً قط ولاعطرا کان اطیب من عرق رسول اللّٰهﷺ(۱).

ترجمہ: حضرت انسؓ کہتے ہیں کہ میں نے دس سال تک نبی کریمﷺ کی خدمت کی۔ اس دوران انہوں نے کبھی بھی مجھے (ناراضگی اور بیزاری کا لفظ) اف تک نہیں کہا۔ نہ کسی کام کے کرنے پر یہ فرمایا کہ کیوں ایسا کیا نہ کسی کام کے چھوڑ جانے پر یہ کہا کہ کیوں نہیں کیا۔ اور نبی کریمﷺ کے اخلاق تمام لوگوں سے بہتر تھے۔ میں نے کبھی کسی ریشمی کپڑا، ریشم اور نہ کسی اور ملائم چیز کو ہاتھ لگایا جو نبی کریمﷺ کے ہاتھ سے زیادہ نرم ہو۔ اور نہ میں نے کبھی کوئی ایسا مشک یا عطر سونگھا ہے جو نبی کریمﷺ کے پسینہ سے زیادہ خوشبودار ہو۔

فماقال لی اف قط ،أُف، ہمزہ کے تینوں حرکات کے ساتھ منوّن اور غیر منوّن بولا جاتا ہے۔ بلکہ بعض ائمہ نے اس میں دس لغات اور بعض نے اس سے بھی زیادہ کا ذکر کیا ہے۔ یہ اسم فعل ہے جو تـزجر اور کراہت کے دوران بولا جاتا ہے۔ اس کا اصل لغوی معنی ناخنوں اور کانوں کی گندگی ہے جس سے کراہت ہوتی ہے۔ پھر یہ ایسے موقعوں پر بولا جاتا ہے جہاں مخاطب کی کوئی چیز ناپسند اور طبیعت پر بھاری ہو۔ اور شکایت کا اظہار کرنا ہو۔

---

(۱) صحیح بخاری باب صفة النبیﷺ کتاب المناقب ۱/۵۰۳، صحیح مسلم کتاب الفضائل، باب حسن خلقهﷺ ۲/۲۵۳، سنن ابی داؤد کتاب الادب باب فی الحلم واخلاق النبیّﷺ ۲/۳۱۰، جامع ترمذی کتاب البروالصلة باب ماجاء فی خلق النبیﷺ ۲/۲۱ (مختار)

عنایت نبوی ﷺ خدام پر: حدیث کا مطلب یہ ہوا کہ اس دس سالہ(۱) خدمت کے دوران ناممکن ہے کہ مجھ سے کوئی قصور نہ ہوا ہو۔ بایں ہمہ آپ ﷺ کی طرف سے کوئی شکایت یا ڈانٹ ڈپٹ دیکھنے میں نہیں آئی۔ ظاہر ہے کہ یہ آپ ﷺ کے اخلاق عالیہ کی وجہ سے ہے۔ لیکن یاد رہے کہ آپ ﷺ کی یہ خاموشی اور درگزر خدمت کے سلسلے میں تھی ورنہ اگر حضرت انسؓ سے کوئی کوتاہی امور شرعیہ میں ہوتی تو آپ ﷺ ضرور مؤاخذہ فرماتے جیسا کہ دیگر روایات میں تصریحات ہیں کہ حق کے لئے آپ ﷺ غصہ بھی فرماتے تھے۔ البتہ حضرت انسؓ کی منقبت کی طرف بھی اس حدیث میں اشارہ موجود ہے کہ باوجود صغر سنی کے آپؓ نے خدمت کے دوران کوئی شرعی قصور نہیں کیا۔ حضرت انسؓ سے مروی بعض روایات میں آیا ہے کہ اگر کسی قصور پر کوئی اور شخص بھی کسی کو عتاب کرتا تو بھی آپ ﷺ منع فرما کر کہتے کہ چھوڑو بس یہی اللہ تعالیٰ کو منظور تھا اگر اللہ تعالیٰ چاہتے تو کوتاہی نہ ہوتی گویا ایسے موقع پر آپ ﷺ رضاء بقضائے الٰہی کی تعلیم دیتے تھے۔

وكان النبيّ من أحسن النّاس خُلقا، شاید مطلب یہ ہے کہ میرے ساتھ جو حسن اخلاق کا رویہ تھا وہ میری خصوصیت نہیں تھی بلکہ آپ ﷺ فطری طور پر اخلاق حسنہ کے حامل تھے اور ہر کسی سے یہی معاملہ تھا۔

ولامســت خــزًّا الــخ، حسن اخلاق کے بعد آپ ﷺ کی خلقی حسن کا بیان ہے کہ آپ ﷺ ظاہری طور پر بھی بہت خوبیوں کے مالک تھے "خز" بعض لوگوں کے ہاں ایک جانور(۲) کا نام ہے جس کا اون بہت ملائم ہوتا ہے اس کے اون سے بنے ہوئے کپڑے کو بھی خز کہا جاتا ہے۔ علامہ ابن اثیرؒ نے نہایہ میں لکھا ہے کہ خز اون اور ریشم سے مرکب کپڑے کو کہتے ہیں۔

مســكــاًأو لاعــطــراً، عطر کا ذکر مشک کے بعد ذکر العام بعد الخاص کے قبیلے سے ہے۔

(۱) اس روایت میں دس سال کی خدمت کا ذکر ہے لیکن بعض روایات میں آتا ہے کہ حضرت انسؓ کو نبی کریم ﷺ کی خدمت میں پیش کرنے والے حضرت ابوطلحہؓ تھے جو حضرت انسؓ کی والدہ ام سلیمؓ کے شوہر ہیں اور ابوطلحہؓ کا ام سلیمؓ سے نکاح اور اسلام دونوں ہجرت نبوی ﷺ کے کچھ ماہ بعد واقع ہوئے ہیں۔ اس لئے یہ مدت دس سال سے قدرے کم ہوگی اور اسی وجہ سے بعض روایات میں کسر کے الغاء کر کے "تسع سنین" یعنی نو سال ذکر ہے۔ (اصلاح الدین)

(۲) بعض شراح کے خیال میں یہ ایک دریائی جانور ہے جسے قندس بھی کہا جاتا ہے اس پر ریشم کی طرح ملائم اون ہوتا ہے۔ (اصلاح الدین)

کان أطیب من عرق رسول اللّٰہ ﷺ، یعنی نبی کریم ﷺ کے پسینے سے زیادہ خوشبودار کوئی بھی چیز نہیں دیکھی۔ اس میں کوئی مبالغہ آمیزی نہیں بلکہ روایات اس پر شاہد ہیں کہ بعض صحابیات آپ ﷺ کے پسینے کو جمع کرتی تھیں اور اس کو دوسری خوشبوؤں میں ملاتیں تو وہ خوشبو بھی بے مثال بن جاتی تھی(۱) اس کے باوجود آپ ﷺ مصنوعی خوشبو بھی زیادہ استعمال فرماتے تھے تاکہ ملائکہ سے ملاقات اور مجامع المسلمین میں حاضری کے وقت فرشتے اور لوگ زیادہ محظوظ ہوں۔ اسی وجہ سے آپ ﷺ فرمایا کرتے تھے، **حبّب الیّ من دنیا کم ثلاث النساء والطیب وقرة عینی فی الصلوٰة**، یعنی بیویاں اور خوشبو سے مجھے محبت دی گئی ہے اور نماز تو میری آنکھوں کی ٹھنڈک ہے۔

(۲) حدّثنا قتیبة بن سعید واحمد بن عبدة ھو الضبیّ والمعنی واحد قالا حدّثنا حمّاد بن زید عن سلم العلوی عن أنس بن مالک عن رسول اللّٰہ ﷺ أنّه کان عندہ رجل به اثر صفرة قال وکان رسول اللّٰہ ﷺ لایکادیواجه احداً بشیٔ یکرھه فلمّا قام قال للقوم لوقلتم له یدع ھذہ الصفرة(۲).

ترجمہ: حضرت انسؓ کہتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ کے پاس ایک شخص بیٹھا تھا جس کے کپڑے پر زعفران کا رنگ لگا ہوا تھا نبی کریم ﷺ کی عادت تھی کہ آپ ﷺ کسی کی منہ پر ایسی بات نہیں کہتے تھے جو اسے ناگوار ہو جب وہ شخص مجلس سے اٹھ کر چلا گیا

---

(۱) بلکہ ایک روایت میں ہے حضرت انسؓ کی والدہ نے رسول اللہ ﷺ سے آپ ﷺ کے پسینے کے بارے میں عرض کیا **یارسول اللّٰہ ﷺ نرجو برکته لصبیانناقال اصبتِ(الحدیث)** ملاعلی قاریؒ اس روایت سے استدلال کرتے ہوئے لکھا ہے **وفیه استحباب التبرک والتقرب بآثار الصالحین قیل لما حضر أنس بن مالک الوفاة اوصی ان یجعل فی جنوبه من ذالک الطیب(مرقات ..مشکوٰة)(مختار)**

(۲)سنن ابی داؤد ۲/۲۲۳ ایضا کتاب الادب باب حسن المعاشرة ۲/۲۱۳ کتاب الترجل باب فی الخلوق للرجل، السنن الکبریٰ للنسائی ۶/۶۷ کتاب عمل الیوم واللیل باب ترک مواجھة الانسان بمایکرہ الادب المفرد للبخاری ۱۱۷ رقم الحدیث ۴۳۷(مختار)

تو آپ ﷺ نے حاضر لوگوں سے فرمایا کہ اگر تم لوگ اس شخص سے کہہ دو کہ وہ یہ رنگ استعمال کرنا چھوڑ دے تو بہتر ہوگا۔

لایکادیواجه احداً بشیٔ یکرهه، یعنی کسی پر رو برو اعتراض کرنے سے غالباً کتراتے تھے کہ مبادا حضور ﷺ کا اعتراض اسے ناگوار گزرے یا اعتراض پر اعتراض کردے اور انکار صادر ہو تو پھر کفر کا خدشہ ہے لہذا آپ ﷺ اس اعتراض کو کسی دوسرے موقعہ کیلئے مؤخر کردیتے تھے یا بالواسطہ اس کو تنبیہ فرماتے تھے۔اور مزاج پر حیا کا اتنا غلبہ تھا کہ کسی سے سخت بات نہیں کرسکتے تھے۔

__اعتراض نہ کرنے کے حدود:__ لیکن آمنے سامنے اعتراض نہ کرنا، آپ ﷺ کی غالب عادت تھی اور وہ بھی مذکورہ خدشات کی وجہ سے تھی اگر مخاطب کی طرف سے اطمینان ہوتا کہ بات بری نہیں لگے گی تو آمنے سامنے بھی منع فرماتے تھے جیسے کہ سرخ رنگ کپڑا پہننے کی وجہ سے حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاص ؓ پر گرفت فرمائی۔ بلکہ پہنے ہوئے کپڑے کو جلانے کا حکم بھی مروی ہے۔

لیکن آپ ﷺ کا یہ وقتی اغماض ایسے امور میں ہوتا تھا جو شرعاً حرام اور ناجائز نہ ہوں بلکہ ایسے موقع پر تنزیہی کراہت کے حامل اور خلاف اولیٰ باتوں کو برداشت کرتے تھے۔محرمات کے بارے میں تو آگے حدیث میں آرہا ہے کہ۔۔۔۔''**فاذاانتهک من محارم اللّٰه تعالیٰ شیٔ کان من أشدّهم فی ذالک غضباً**'' ایک اور روایت میں ہے''**فاذاتعدّی الحق لم یقم لغضبه شیٔ**'' اب ایک اعتراض یہ ہوسکتا ہے کہ زعفران کی خوشبو لگانا مردوں کیلئے اس کے رنگ کی وجہ سے ممنوع اور ناجائز ہے۔ تو آپ ﷺ نے اسے کیونکر برداشت کیا ضابطے کے مطابق تو اس شخص کو منع کرنا چاہئے تھے کیونکہ وہ شرعاً ناجائز کام کا مرتکب تھا۔اس کا جواب یہ ہے کہ ممکن ہے کہ ابھی تک ''صفرۃ'' کے استعمال سے نہی نازل نہ ہوئی ہو۔آپ ﷺ نے صرف نسوانی عادت سمجھ کر اس کو طبعی طور پر ناپسند فرمایا اور صرف مکروہ تنزیہی کے درجے میں سمجھ کر اس پر انکار نہیں فرمایا ہو، یا یہ کہ یہ صفرۃ اس درجے کی نہ ہو جہاں حرمت کا حکم لگایا جاسکے۔ بلکہ زعفران کے رنگ کا پھیکا سا اثر باقی ہو جیسے کہ حدیث کے لفظ میں ''اثر صفرۃ'' کا ذکر ہے ''صفرۃ'' مذکور نہیں ہے ورنہ آپ ﷺ مجلس ہی میں اس پر انکار فرماتے۔

(۵) حدّثنا محمّد بن بشّار ثنا محمّد بن جعفر ثنا شعبة عن أبی إسحاق عن أبی عبداللّٰہ الجدلیّ و اسمه عبدبن عبدعن عائشة أنّها قالت لم یکن رسول اللّٰہ ﷺ فاحشا و لامتفحّشاً و لاصخّاباً فی الأسواق و لایجزی بالسّیّئة السّیّئة ولکن یعفوویصفح(۱).

ترجمہ: حضرت عائشہؓ کہتی ہیں کہ نبی کریم ﷺ نہ طبعی طور پر فحش گو تھے نہ بتکلف فحش گوئی فرماتے تھے نہ بازاروں میں چلّا چلّا کر بات کرنے والے تھے برائی کا بدلہ برائی سے نہیں دیتے تھے بلکہ معاف فرماتے اوراعراض فرماتے تھے۔

وَلامَتفحشاً، تفَحّش الرّجلِ کا معنی ہے کہ فحش گوئی اور بدکلامی کی عادت تو نہ ہو لیکن عوارض کی وجہ سے تکلفاً برا بھلا کہا جائے تو گویا نبی کریم ﷺ بدکلامی کے دونوں قسموں سے مبرّا تھے۔ نہ عادت تھی اور نہ کبھی تکلفاً بیہودہ بات کرتے تھے۔ **و لاصخّا بافی الاسواق**، علامہ زمخشری کہتے ہیں کہ یہ اصل میں سخاب سین کے ساتھ ہے۔ سین صاد سے بدلا گیا ہے۔ یہاں بھی سین اور صاد دونوں کے ساتھ مروی ہے۔ **صخب** چیخنے چلانے کو کہتے ہیں چونکہ بازار میں شوروغل ہوتا ہے اس لئے وہاں چیخنے چلانے کا موقع زیادہ ہوتا ہے مگر نبی کریم ﷺ وہاں بھی نرم اور میٹھی آواز سے بولتے تھے۔ دوسری جگہ تو بطریق اولیٰ آواز پست ہوتی تھی۔ صخاب اس مقام پر صفت مشبہ کا صیغہ ہے۔ مطلب یہ ہے کہ آپ ﷺ شور کرنے والے نہ تھے۔ اس میں مبالغہ کی نفی نہیں۔ بلکہ نفس صخب یعنی شور کی نفی مقصود ہے۔ بعض علماء کہتے ہیں کہ فعال کے صیغے کی نفی سے نفی المبالغہ نہیں بلکہ مبالغہ فی النفی مقصود ہے مطلب یہ ہے کہ شور کرنا آپ ﷺ سے شدومد سے منفی تھا۔ نہ یہ کہ زیادہ شور نہیں کرتے تھے اور کم شور کیا کرتے تھے۔ **ولکن یعفوویصفح**، یعنی برائی کو معاف فرماتے تھے اور صفح فرماتے تھے صفح کا معنی ہے "**اعراض بصفحة الوجه**" جس کا لفظی معنی منہ پھیرنا ہے۔ یہاں مراد یہ ہے کہ آپ ﷺ کسی کی برائی کا ذکر اس کے روبرو

---

(۱)جامع ترمذی۲/۲۱ وصحیح البخاری کتاب المناقب باب صفة النّبیّ ﷺ، کتاب البر والصلة باب ماجاء فی خلق النبی ﷺ، مصنف ابن ابی شیبة ۸/۳۳۰ سنن ابی داؤد الطیالسی رقم الحدیث ۱۵۲۰، صحیح ابن حبان۸/۱۲۰ (مختار)

نہیں فرماتے تھے نہ اس کا اثر آپ ﷺ کے چہرہ انور پر ظاہر ہوتا تھا یعنی برائی کے بدلہ پر قادر ہوتے ہوئے بھی اس کا بدلہ نہیں لیتے تھے۔ یہ محض دعویٰ نہیں بلکہ ہزاروں واقعات اس کے شاہد ہیں۔ کفار نے آپ ﷺ کو کتنی اذیتیں پہنچائیں۔ مگر آپ ﷺ نے ذاتی تکلیف کے مقابلے میں ان کیلئے بددعا تک گوارہ نہیں کی البتہ جہاں دین حق کو نقصان پہنچا تو ان لوگوں کیلئے آپ ﷺ بددعا بھی دیتے تھے بلکہ عملاً ان کے ساتھ قتل وقتال روا رکھتے تھے۔

بے مثال حلم اور دریا دلی کی مثالیں: ملا علی قاریؒ نے یہاں پر دو واقعے آپ ﷺ کی کشادہ دلی اور اعراض کے بیان کئے ہیں۔ ایک واقعہ یہودیوں کے ایک عالم کا لکھا ہے جو کہتے ہیں کہ میں نے نبوت کی تمام علامات نبی کریم ﷺ کے چہرۂ انور میں دیکھتے ہی محسوس کر لئے تھے سوائے دو علامتوں کے۔ ان دو علامتوں کا امتحان لینے کیلئے میں موقع کی تلاش میں تھا ایک یہ کہ ''**یسبق حلمه جهله** '' یعنی آپ ﷺ کی برداشت آپ ﷺ کے غصے پر غالب ہوگی، دوم یہ کہ ''**لایزید شدة الجهل علیه الاحلما** '' یعنی ان کے ساتھ جتنا بھی زیادہ جہالت کا رویہ اختیار کیا جائے اس سے ان کی برداشت اور زیادہ ہوگی۔ چنانچہ ایک موقع پر میں نے آپ ﷺ سے کھجور کا سودا طے کیا میں نے رقم دے کر کچھ کھجور ان سے خریدے۔ کھجور کی ادائیگی میں ابھی دو تین دن باقی تھے کہ میں آپ ﷺ کے پاس آیا اور ان کے قمیص اور چادر کو ہاتھ سے کھینچ کر ترشروئی اور سختی سے کہا کہ اے محمدؐ کیا تم میرا حق ادا نہیں کرتے۔ خدا کی قسم تم سب بنی عبدالمطلب قرضخواہوں کو ٹالنے والے ہو۔ حضرت عمرؓ نے میری بات سن کر کہا کہ اے خدا کے دشمن تم رسول اللہ ﷺ سے ایسی باتیں کرتے ہو۔ خدا کی قسم اگر نبی کریم ﷺ کی (موجودگی کی وجہ سے ان کی تکلیف) کا خوف نہ ہوتا تو میں تیرا سر تلوار سے اڑا دیتا۔ اس دوران نبی کریم ﷺ حضرت عمرؓ کی طرف بہت سکون اور اطمینان کے ساتھ ہنستے ہوئے دیکھتے رہے۔ پھر فرمایا، کہ اے عمر! میں اور یہ یہودی (تیرے اس رویے کے بجائے) ایک اور بات کے زیادہ محتاج ہیں وہ یہ کہ تم مجھے حسن ادائیگی اور اس کو حسن طلب کی تلقین کرتے۔ اب جاؤ تم اس کا قرضہ ادا کرو۔ اور بیس صاع تم اس کو اپنے حق سے زیادہ دے دو کیونکہ تم نے اس کے ساتھ جھگڑا کیا ہے۔ چنانچہ جب حضرت عمرؓ نے میرا قرضہ ادا کر دیا اور زائد بھی دے دیا تو میں نے ان سے کہا کہ اے عمرؓ میں نے نبی اکرم ﷺ میں نبوت کی تمام علامات دیکھ لی تھیں سوائے دو علامتوں کے وہ یہ کہ ''**یسبق**

حلمه جهله و لایزید شدة الجهل علیه الاحلما'' اب میں نے ان دونوں کا مشاہدہ بھی کرلیا۔لہٰذا تم گواہ رہو کہ میں ایمان لاتا ہوں اور خدا کی ربوبیت اسلام کی حقانیت اور محمد ﷺ کی نبوت پر راضی ہوں۔

دوسرا واقعہ یہ لکھا ہے کہ ایک اعرابی آپ ﷺ کے پاس آیا اور آپ ﷺ کی چادر کو اس زور سے کھینچا کہ آپ ﷺ کی گردن مبارک میں اس کا اثر ظاہر ہوگیا۔اس کے ساتھ ساتھ یہ بھی کہا کہ میرے دو اونٹوں پر غلہ لادکر مجھے دیدو کیونکہ تم مجھے اپنے اور اپنے باپ کے مال سے تو نہیں دیتے۔آپ نے از راہ ملاطفت فرمایا کہ جب تک میری گردن میں چادر کھینچنے کا بدلہ مجھے نہیں دوگے میں غلہ نہیں دونگا۔اس نے کہا کہ خدا کی قسم میں بدلہ نہیں دونگا۔آپ ﷺ نے تبسم فرمایا اور درگزر فرماتے ہوئے ایک آدمی کو حکم دیا کہ ایک اونٹ پر کھجور اور دوسرے پر جَو لادکر اس کے حوالے کردو۔

بہرحال آپ ﷺ کو ذاتی تکلیف پہنچانے کا آپ ﷺ انتقام نہیں لیتے تھے بلکہ کشادہ دلی سے معاف فرماتے تھے اور مجرم کے سامنے اس کا کوئی تذکرہ تک نہیں فرماتے تھے۔

(٦) حدثنا هارون بن اسحاق الهمدانیّ ثنا عبدة عن هشام ابن عروة عن أبیه عن عائشة قالت ماضرب رسول اللّٰه ﷺ بیده شیئاً قطّ إلاّ ان یجاهد فی سبیل اللّٰه و لاضرب خادماً و لاامرأةً(١).

ترجمہ: حضرت عائشہؓ سے روایت ہے کہ نبی اکرم ﷺ نے اپنے ہاتھ سے جہاد کے علاوہ کسی موقع پر کسی بھی چیز کو نہیں مارا نہ خادم کو نہ کسی عورت کو۔

إلاّ ان یجاهد الخ، یعنی میدان جہاد میں جو مار ہوتی ہے وہ تو نبی اکرم ﷺ سے صادر ہوئی ہے جیسا کہ احد میں آپ ﷺ نے ابی بن خلف لعین کو نیزہ مارا تھا۔اس کے علاوہ کسی اور موقع پر آپ ﷺ نے کسی چیز کو نہیں مارا۔بعض لوگوں نے حدود و تعزیرات میں مارنے کو بھی جہاد کے ساتھ ملحق کیا ہے کہ وہ بھی

---

(١)صحیح مسلم ٢/٢٥٦ باب مباعدته ﷺ للآثام و اختیاره من المباح اسهله الخ، کتاب الفضائل، السنن الکبریٰ للنسائی کتاب عشرة النساء باب ضرب الرجل زوجته، مصنف ابن ابی شیبة ٣٦٨/٨، سنن ابن ماجةابواب النکاح باب ضرب النساء ص ١٤٢ واخرجه ابوداؤد فی سننه ٣١٢/٢کتاب الادب باب فی التجاوز،(مختار)

اللہ تعالیٰ کی رضا کی خاطر ضرب ہے لیکن یہ نہیں لکھا کہ حدود وقصاص میں بھی خود آپ ﷺ سے مار صادر ہو چکی ہے یا نہیں۔

و لاضرب خادماًو لاامرأة، شئ کا لفظ عموم کی وجہ سے خادم اور عورت کو بھی شامل ہے۔تو گویا یہ دونوں ضمناً مذکور ہیں لیکن عموماً ان دونوں کی مار بکثرت ہوتی ہے۔لہٰذا ان کا ذکر خصوصی طور پر کیا گیا نیز ان کا مارنا تادیب کے طور پر اگر چہ جائز ہے لیکن آپ ﷺ کے اخلاق عالیہ نے یہ بھی گوارا نہیں فرمایا کہ تادیب کیلئے بھی ان پر ہاتھ اٹھائے۔البتہ اولاد کی اخلاقی ودینی تربیت کیلئے آپ ﷺ نے مارنے کا حکم دیا ہے۔یہاں اگر اشکال ہوجائے کہ بعض روایات میں نبی کریم ﷺ کا کچھ صحابہ کو مارنے کا ذکر ہے کسی کو سینہ پر مارا۔کسی کو پاؤں سے مارا۔اسی طرح حضرت جابرؓ کے بیمار اونٹ کو بھی مارا تھا۔اس کا جواب یہ ہے کہ یہاں مارنے سے مراد یہ ہے کہ اپنے غصہ کو ٹھنڈا کرنے کیلئے آپ ﷺ نے کسی کو تکلیف پہنچائی ہو اور مذکورہ واقعات میں ایسا نہیں ہوا۔بلکہ آپ ﷺ نے کسی بیمار کے استشفاء کیلئے یا پھر کسی کو ایصال برکت کیلئے مارا ہے تو اسے مار نہیں کہتے بلکہ یہ تو عین ترحّم ہے۔

(۷) حدّثنااحمد بن عبدة الضبّيّ ثنا فضيل بن عيّاض عن منصور عن الزهريّ عن عروة عن عائشة قالت مارأيت رسول اللّٰهﷺ منتصراًمن مظلمة ظلمها قطّ مالم ينتهک من محارم اللّٰه تعالیٰ شئ فاذا انتهک من محارم اللّٰه تعالیٰ شئ كان من أشدّهم فی ذلک غضباً وماخيّر بين امرين إلاّاختار ايسرهما مالم يكن مائما(۱).

ترجمہ: حضرت عائشہؓ کہتی ہیں کہ میں نے کبھی بھی نبی کریم ﷺ کو کسی ایسے ظلم کا بدلہ لیتے ہوئے نہیں دیکھا جو (ذاتی طور پر) آپ ﷺ پر کیا گیا ہو۔لاّ یہ کہ اللہ تعالیٰ کی حرمتوں میں سے کسی حرمت کا ہتک ہوا۔پھر جب حرمات الٰہی میں سے کسی حرمت

(۱)صحيح بخاری ۵۰۳/۱ كتاب المناقب باب صفة النبیﷺ، صحيح مسلم ۲۵۶/۲ كتاب الفضائل باب مباعدة النبیﷺ،سنن ابی داؤد ۳۱۲/۲ باب فی التجاوز كتاب الادب باب فی التجاوز فی الامر،مسنداحمد ۸۵/۶ (مختار)

کی اہانت ہوتی تو آپ ﷺ اس کی وجہ سے سب سے زیادہ غضبناک ہوتے تھے۔ نیز
نبی کریم ﷺ کو کبھی بھی دو باتوں کے درمیان اختیار نہیں دیا گیا مگر آپ ﷺ نے ان
میں سے آسان تر کا انتخاب فرمایا جب تک کہ وہ (آسان تر) گناہ نہ ہوتا۔

منتصراً، انتصار سے اسم فاعل ہے جس کا معنیٰ انتقام اور بدلہ لینے کے ہیں۔ **مظلمۃ** لام کے کسرہ کے ساتھ اس چیز کو کہتے ہیں جو ظالمانہ طور پر لوٹی گئی ہو اور لام کے فتحہ کے ساتھ ظلم کے معنی میں مصدر ہے۔ **ظلمھا** مجہول کا صیغہ ہے نائب فاعل کی ضمیر نبی کریم ﷺ کو اور منصوب ضمیر مظلمۃ کو راجع ہے۔ مفعول کی طرف تعدیہ پر اعتراض ہوسکتا ہے جس کا جواب شرّاح نے یہ دیا ہے کہ یہاں حرف جر مقدر ہے یعنی "ظلم بہا"۔

<u>انتقام لغت نبوی میں نہیں ہے:</u> اب کلام کا معنی یہ ہوا کہ نبی کریم ﷺ ایسے ظلم کا انتقام نہیں لیتے تھے جو آپ ﷺ پر کیا گیا ہو خواہ وہ بدنی ظلم ہو، مالی ہو یا آپ ﷺ کی بے حرمتی کا ارتکاب ہوا ہو مثلاً **بسید بن الاعصم** یہودی نے آپ ﷺ کو زہر دیا جس کا اثر آپ ﷺ کی وفات تک باقی رہا۔ احد میں عتبہ نے آپ ﷺ کو پتھر مارے۔ طائف والوں نے آپ ﷺ کو لہولہان کر دیا۔ کئی بد بخت شعراء نے آپ ﷺ کی ہجو کی آپ ﷺ کے حرم مبارک پر بھی انگلیاں اٹھائی گئیں مگر آپ ﷺ نے رواداری سے بڑھ کر فیاضی کے ساتھ سب کچھ معاف کر دیا۔

مالم ینتھک، مجہول کا صیغہ ہے نھک سے افتعال مجرد کے معنیٰ میں بھی آتا ہے۔ "**نھک الامر فلاناً**" کا معنیٰ ہے کہ یہ چیز اس شخص پر غالب آئی اور اس کو تھکا دیا۔ **انتھاک الحرمات** کا معنی ارتکاب حرمات ہے ناجائز کام میں ہاتھ ڈالنے کو کہتے ہیں۔ **من محارم اللّٰہ ،محارم محرم** کی جمع ہے دراصل مصدر میمی ہے جو مفعول کے معنی میں آیا ہے۔ یہاں مراد وہ امور ہیں جو اللہ تعالیٰ نے حرام کر دی ہوں۔ **کان من اشدّھم فی ذلک غضباً،** ارتکاب محرم کی وجہ سے آپ ﷺ سب سے زیادہ غضبناک ہوتے۔ اور انتقام بھی لیتے تھے اور یہی دراصل اعتدال ہے۔ اخلاق عالیہ کا کہ ذاتی اذیت میں کمال حلم وصبر اور اللہ تعالیٰ کی نافرمانی میں کمال بے صبری تھی نہ ہر جگہ غیظ وغضب اور نہ ہر جگہ درگزر اور نظر اندازی تھی۔

نبی کی بے حرمتی سے صرف نظر کیوں: یہاں یہ اعتراض ہوتا ہے کہ نبی ﷺ پر ظلم بھی تو انتہاک حرمت ہے یعنی یہ بھی تو ایک بڑے حرام کام کا ارتکاب اور عظیم جرم ہے تو آپ ﷺ نے اس نظر سے اس جرم کو کیوں نہیں دیکھا۔اور اس کا انتقام کیوں نہیں لیا اس کا جواب شرّاح یوں دیتے ہیں کہ ٹھیک ہے کہ یہ بھی ایک دینی جرم اور حق الٰہی کا ضیاع ہے لیکن پیغمبر کی اذیت کبھی کبھی نادانستہ طور پر یا سادگی یا دیہاتی گنوار پن کی وجہ سے کسی سے صادر ہو۔تو اس صورت میں اغماض اور عفو کا معاملہ برتنا زیادہ مناسب ہے جیسا کہ بعض اعراب مخلص ہو کر بھی گستاخی کر جاتے تھے رہے منافقین اور کفار تو ان کے حق میں آپ ﷺ کی چشم پوشی دراصل تالیف قلب اور دیگر لوگوں کو اسلام کی طرف راغب کرنے کیلئے بھی ہوتی تھی ورنہ نبی کی بے حرمتی کی نسبت زیادہ بڑا جرم تو وہ کفر صریح کی صورت میں کر رہے تھے۔خلاصہ یہ کہ جہاں مصلحت ہوتی وہاں آپ اغماض سے کام لیتے خواہ وہ کفار کے ساتھ ہو یا مسلمانوں کے ساتھ اور اگر حقوق الٰہی کے ضیاع کا مسئلہ ہوتا اور سزا ہی مناسب ہوتی تو آپ ﷺ غصہ بھی ہوتے تھے اور انتقام بھی لیتے تھے مگر ذاتی تکلیف کی وجہ سے نہیں بلکہ حقوق الٰہیہ کے ضیاع کی وجہ سے۔

اولین ترجیح امت پر سہولت: مـالـم یکن ماثما، مأثم اثم کے معنی میں مصدر میمی ہے بخاری شریف روایت میں ہے۔فـان کـان اثـمـاً کـان ابـعدالناس منه ،مطلب یہ ہے کہ جن دو امور میں آپ ﷺ کو اختیار دیا جاتا تھا اگر ان میں سے ایک سہل اور دوسرا مشکل ہوتا تھا۔تو آپ ﷺ امت کی سہولت کو ترجیح دیتے تھے تاکہ امت کو تکلیف سے بچا سکیں۔مثلاً کسی جنایت کی وجہ سے دو سزاؤں میں اختیار دیا گیا تو آسان تر کو ترجیح دیتے۔کفار کے قتل اور جزیہ یا فدیہ میں قتل کا انتخاب نہیں فرماتے تھے۔ عبادت میں مجاہدہ اور اقتصاد دونوں کی اجازت ہوتی تو آپ ﷺ اقتصاد کو ترجیح دیتے۔اس لئے کہ امت پر آسانی اور ان کو مشقت سے بچانے کی آپ ﷺ ہمیشہ فکر کرتے تھے اور اسی وجہ سے لوگوں کی دلوں میں آپ ﷺ کی عزت و محبت بھی بڑھ جاتی تھی۔

ہمارے بعض فضلاء اور بالخصوص نئے نئے فارغ ہونے والے عوام میں جا کر تشدد کی انتہا کر جاتے ہیں۔ہر ہر بات پر گرفت ہوتی ہے چھوٹے بڑے گناہ پر جنت کو حرام کر دیتے ہیں۔عوامی

رواجوں اور علاقائی روایات پر بدعتوں کے فتوے لگا لگا کر اور مستحبات کے ترک پر وعیدات سنا کر لوگوں کا ناک میں دم کر لیتے ہیں اس طرح لوگ ان سے دور دور رہتے ہیں۔ بلکہ کبھی کبھی اس کیلئے ماحول اتنا تلخ ہوجاتا ہے کہ گزارہ مشکل ہوجاتا ہے۔ نبی کریم ﷺ کا رویہ عوام کے ساتھ خیر خواہانہ ہوتا تھا اور ان کو ہر پریشانی سے بچانے کی فکر میں رہتے تھے۔ اس لئے آسانی کو ترجیح دیتے تھے۔ البتہ اگر وہ جہت جو آسان ہو، شرعاً گناہ اور ناجائز ہوتی تو آپ ﷺ اس کے قریب بھی نہ جاتے تھے۔ ایسی صورت میں مشکل جہت کا انتخاب ناگزیر ہوتا تھا۔

(۸) حدّثنا ابن أبی عمر ثنا سفیان عن محمّد بن المنکدر عن عروۃ عن عائشۃ قالت استاذن رجل علی رسول اللّٰہ ﷺ وأنا عندہ فقال بئس ابن العشیرۃ او اخ العشیرۃ ثمّ اذن لہ فألان لہ القول فلمّا خرج قلت یارسول اللّٰہ ﷺ قلت ماقلت ثم النت لہ القول فقال یا عائشۃ إنّ من شرّ الناس من ترکہ الناس اوودعہ الناس اتّقاء فحشہ(۱).

ترجمہ: حضرت عائشہؓ کہتی ہیں کہ ایک شخص نے نبی کریم ﷺ کے پاس آنے کی اجازت چاہی آپ ﷺ نے فرمایا کہ یہ شخص بہت برا آدمی ہے اپنے قبیلے کا۔ اس کے بعد آپ ﷺ نے اس شخص کو آنے کی اجازت دیدی۔ پھر اس کے ساتھ نرم کلامی سے بات کرنے لگے جب وہ آدمی باہر چلا گیا تو میں نے آنحضرت ﷺ سے پوچھا کہ یارسول اللہ ﷺ آپ ﷺ نے اس شخص کے بارے میں وہ بات کہی جو کہی (یعنی اس کی مذمت کی) پھر (کیوں) بات کرنے میں نرمی فرمائی؟ تو آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ اے عائشہؓ وہ شخص بدترین لوگوں میں سے ہے جسے دیگر لوگ اس کی بدکلامی کے ڈر کی وجہ سے چھوڑ دیں۔

---

(۱) صحیح بخاری ۸۹۱/۲ کتاب الادب باب لم یکن النبی ﷺ فاحشا ولامتفاحشاً، صحیح مسلم ۳۲۲/۲ کتاب البر والصلۃ والادب باب مدارۃ من یتقی فتحشہ، سنن ابی داؤد ۳۱۲/۲ کتاب الادب باب فی حسن العشیرۃ، جامع ترمذی کتاب البر والصلۃ باب ماجاء فی المداراۃ (مختار)

استأذن رجل، اس شخص کی تعیین میں تین ناموں کا ذکر کیا گیا ہے۔

۱) عیینہ بن حصن الفزاری، جس کو الاحمق المطاع بھی کہا جاتا تھا نبی کریم ﷺ کے زمانے میں اس کی بدمعاشی اور اذیتوں سے لوگ تنگ تھے۔

۲) حضرت مخرمہ بن نوفل الزہریؓ (مسورؓ کے والد) جو ابتداء میں مؤلفۃ القلوب میں سے تھے اور انتہائی زبان دراز تھے لیکن ان کے صحیح الاسلام ہونے میں کوئی شک نہیں ہے۔

۳) خزیمہ

مؤخرالذکر کا نام ایک انتہائی ضعیف روایت میں وارد ہے اس لئے یہ احتمال بھی ضعیف ہے۔ حضرت مخرمہ قریش کے معزز صحابی ہیں اس لئے بعض شراح نے تو اس کا انکار کیا ہے البتہ بعض حضرات کا خیال ہے کہ ہوسکتا ہے کہ اسلام لانے سے قبل جب وہ مؤلفہ القلوب میں سے تھے اس دور میں یہ واقعہ ہوا ہو۔

جبکہ اکثر شراح کا خیال یہ ہے کہ یہ عیینہ بن حصن فزاری ہے یہ منہ پھٹ قسم کا آدمی تھا فتح مکہ سے پہلے مسلمانوں میں شامل ہوا تھا اور فتح مکہ کے دوران مولفہ القلوب میں ان کا شمار ہوتا تھا۔ ابوبکر صدیقؓ کے زمانہ میں مرتد ہوا پھر گرفتار ہوکر ابوبکرؓ کے سامنے پیش ہوا اور توبہ سے جان بخشی ہوئی لیکن حضرت عمر فاروقؓ کے زمانہ میں بھی اس کے ناجائز حرکات کا سلسلہ جاری رہا۔ بلکہ ابن حجرؒ نے کتاب الام للشافعیؒ کے حوالے سے لکھا ہے کہ حضرت عمرؓ نے اس کو حالت ارتداد میں قتل کردیا تھا۔ اس صورت میں تو اس کی صحابیت ہی ختم ہوجاتی ہے لیکن بعض حضرات نے اسے صحابی کہا ہے۔ اور یہ کہ اس کی موت حضرت عثمانؓ کے زمانے میں واقع ہوئی۔

کیا نبی کریم ﷺ نے غیبت کی؟ بئس ابن العشیرة اوقال اخو العشیرة، عشیرہ سے خود اس آنے والے شخص کا قبیلہ اور خاندان مراد ہے اور عربی زبان میں خاندان کی طرف نسبت "ابن" اور "اخ" دونوں طریقوں سے ہوتی ہے۔ اس جملے پر بعض ظاہر پرستوں نے یہ اشکال کیا ہے کہ نبی کریم ﷺ کا یہ کلام غیبت کے زمرے میں آتا ہے کیونکہ اس شخص کی غیر حاضری میں آپ ﷺ نے اس کی تنقیص کی ہے اس کا

ایک جواب تو یہ دیا گیا ہے کہ آپ ﷺ نے حاضرین اور خصوصی طور پر حضرت عائشہؓ کو خبردار کرنے کیلئے آنے والے کی برائی بیان کی تا کہ وہ محتاط رہیں اور آنے والے کی ضرر سے محفوظ رہ سکیں۔اس کے سامنے راز کی بات نہ کہدیں بلکہ احتیاط سے کام لیں نیز اس کی بدزبانی سے پریشان نہ ہوں اور کسی شریر کی شر سے بچانے کیلئے لوگوں کو خبردار کرنا غیبت محرمہ نہیں ہے۔چنانچہ علامہ ابن حجرؒ نے اس عیینہ بن حصن کا واقعہ لکھا ہے کہ وہ جب نبی کریم ﷺ کے پاس آیا پردے کا حکم ابھی نازل نہیں ہوا تھا حضرت عائشہؓ ساتھ بیٹھی تھیں اس نے پوچھا کہ یہ کون بیٹھی ہیں تو آپ ﷺ نے فرمایا یہ عائشہ بنت ابی بکرؓ ہیں وہ بولا کہ کیا میں تیرے لئے اپنے بیٹوں کی ماں (بیوی) نہ چھوڑوں جو اس (عائشہ) سے بہتر ہے جس پر حضرت عائشہؓ کو بہت غصہ آیا۔ نبی کریم ﷺ نے عیینہ کو باہر نکل جانے کا حکم دیا اور جب حضرت عائشہؓ نے پوچھا کہ یہ کون ہے؟ تو آپ ﷺ نے فرمایا"**هذا الاحمق المطاع**" یہ اپنی قوم کا بیوقوف سربراہ ہے۔

دوسرا جواب یہ دیا گیا ہے کہ کسی فاسق معلن کے فسق کو بیان کرنا غیبت نہیں ہے۔اور عیینہ کم از کم ان دنوں جہراً بدمعاشی کا ارتکاب کرتا رہتا تھا چنانچہ ۶ھ میں نبی کریم ﷺ کے بیس اونٹوں کو چرا کر لے جانے والوں میں عیینہ اور اس کے بیٹے ملوث تھے جن کے تعاقب میں نبی کریم ﷺ نے لشکر بھیجا اور غزوہ ذات قرد واقع ہوا۔

فالان له القول، نبی کریم ﷺ نے رواداری اور مدارات کے طور پر اس کے ساتھ کلام میں نرمی اور ملاطفت فرمائی تا کہ اسے اور اس کی قوم کو اسلام کی طرف راغب کر سکیں اور اس کے شر سے لوگوں کو بچا سکیں۔ **قلت ماقلت ثم النت الخ**، حضرت عائشہؓ نبی کریم ﷺ کے عمل میں حکمت جاننا چاہتی ہیں کہ جب ایک بار اس شخص کو قوم کا برا آدمی قرار دیا تو پھر برے آدمی کی طرح رویہ بھی ہونا چاہئے تھا۔باتوں میں لچک اور نرمی تو کم از کم نہیں ہونی چاہئے حالانکہ آپ ﷺ نے تو اس کے ساتھ بڑی نرمی سے باتیں کیں اس میں کونسی حکمت ہے؟

<u>حکمتوں پر مبنی مدارات:</u> **ان من شر الناس من ترکه الناس او ودعه الناس اتقاء فحشه**، **ودع یدع** کے معنیٰ ہیں ترک کرنا لیکن عرب کے اکثر لغات میں اس کا ماضی استعمال نہیں ہوتا۔

مضارع اورامر کے صیغے مستعمل ہیں کہتے ہیں کہ "امات الناس ماضی یدع ویذر" کہ لوگوں نے ودع یدع اور وذر یذر میں ماضی کومروادیا ہے۔یعنی متروک الاستعمال ہے۔اس لئے بعض لوگوں نے تو یہ کہا ہے کہ نبی کریم ﷺ کا اس مقام پر ودعہ کہنا شاذ ہے لیکن ملا عصامؒ کہتے ہیں کہ یہ کلام ان لغات عرب پر مبنی ہے جن میں اماتۃ اور ترک نہیں ہے جملے کا معنی یہ ہے کہ جس شخص کولوگ اس کی بدزبانی کی وجہ سے چھوڑ دیں وہ بدترین لوگوں میں سے ہےاس جملے کا مطلب کیا ہے؟ اس سلسلے میں دوقول منقول ہیں۔

کلام نبوی ﷺ کا مقصد: اول یہ کہ نبی کریم ﷺ اس حکمت کو بیان کرتے ہیں جس کے بارے میں سوال ہوا ہےاوراپنے رویے کیلئے توجیہہ اورعلت بیان کررہے ہیں حاصل کلام یہ ہے کہ میں تو اس شخص کے ساتھ نرم رویہ صرف بطور مدارات اور سیاست دینیہ کے اختیار کررہاہوں اگرچہ یہ شرالناس ہی ہے لیکن اس کی بدزبانی اوراس کے قوم کی شر سے بچنے کیلئے اورقوم کے تالیف قلب کیلئے اس کے ساتھ اچھارویہ اپنایا ہے اور یہ بلا ریب جائز بلکہ مستحسن اور مندوب ہے۔اس سے بڑھ کرآپ ﷺ ایسے لوگوں کو بڑے بڑے اموال بھی دیتے تھے یہ مداہنت اور منافقت نہیں تھی نہ دینی اقدارکودنیا کی خاطر داؤ پرلگانا تھا نہ اس میں آنے والے شخص کی کوئی صفائی اورتائید تھی بلکہ "بئس ابن العشیرہ" بھی اپنی جگہ سچی بات تھی۔

دوسری توجیہ بعض شراح نے یہ کی ہے کہ نبی کریم ﷺ حضرت عائشہؓ سے یہ کہتے ہیں کہ تیرے کلام سے تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ دوسرے لوگوں کی طرح میں بھی برے لوگوں کے ساتھ بدزبانی اورگالی گلوچ کارویہ اپناؤں گا حالانکہ مجھ سے یہ توقع بے جاہے۔کیونکہ بدزبان آدمی توشـر الناس ہوتا ہےاور میں شـرّ الناس نہیں بنناچاہتا۔اوراگرچہ یہ شخص تلخ کلامی کا مستحق بھی ہے لیکن مجھ سے یہ نہیں ہوسکتا کیونکہ پھر لوگ مجھے اس فحش گوئی کی بناء پرچھوڑ دیں گےاس لئے اس قسم کارویہ اپنایا ہےاور یہ مستحسن امر ہے۔اسے کچھ لوگ مدارات، کچھ مصانعت، کچھ عقل وحکمت اور کچھ تقیہّ کانام دیتے ہیں۔

واضح رہے کہ ملاعلی قاریؒ نے دوسری توجیہہ کواس مقام کی تشریح کے طور پرنامناسب بلکہ خطا کہا ہےاور پہلی توجیہ کوترجیح دی ہے۔

(۹) حدثنا سفیان بن وکیع ثنا جمیع بن عمر بن عبدالرحمٰن

العجلیّ حدّثنی رجل من بنی تمیم من ولدابی هالة زوج خدیجة یکنّیٰ أباعبداللّٰه عن ابن لأبی هالة عن الحسن بن علی رضی اللّٰه عنهما قال قال الحسین بن علیّ سألت أبی عن سیرة رسول اللّٰهﷺ فی جلسائه فقال کان رسول اللّٰهﷺ دائم البشر سهل الخلق لیّن الجانب لیس بفظٍّ ولاغلیظٍ ولاصخّابٍ ولافحّاشٍ ولاعیّابٍ ولامشّاحٍ یتغافل عمّالایشتهی ولایؤئس منه ولایجیب فیه قد ترک نفسه من ثلاث المراء والاکبار ومالایعنیه وترک الناس من ثلاث کان لایذّم احداً ولایعیبه ولایطلب عورته ولایتکلّم إلاّفیما رجا ثوابه واذا تکلّم اطرق جلسائه کانّما علی رؤسهم الطیرفاذاسکت تکلّموا لایتنازعون عنده الحدیث ومن تکلّم عنده انصتواله حتّی یفرغ، حدیثهم عنده حدیث اوّلهم یضحک ممّا یضحکون منه ویتعجّب ممّا یتعجّبون ویصبر للغریب علی الجفوة فی منطقه ومسألته حتّی ان کان اصحابه لیستجلبونهم ویقول اذا رأیتم طالب حاجة یطلبها فارفدوه ولایقبل الثناء إلاّمن مکافئ ولایقطع علی احدحدیثه حتّی یجوز، فیقطعه بنهی اوقیام.

ترجمہ: حضرت حسنؓ کہتے ہیں کہ مجھے (میرے بھائی) حسینؓ نے بتایا کہ میں نے اپنے والدمحترم (حضرت علیؓ) سے نبی اکرمﷺ کے اہل مجلس کے ساتھ رویے کے بارے میں پوچھا تو انہوں نے بتایا کہ نبی کریمﷺ ہمیشہ خندہ پیشانی اورنرم اخلاق والے رہتے تھے۔نرم اخلاق والے اورجلدی مہربان ہونے والے تھے۔نہ آپﷺ سخت گو تھے نہ سنگ دل، نہ چیخنے چلانے والے تھے نہ بدزبان تھے، نہ عیب چین تھے نہ بخیل تھے، غیرمرغوب چیزوں سے غفلت برتتے تھے اوراس سے دوسروں کو مایوس بھی

نہیں کرتے تھے اور خود اس کو آپ ﷺ نے تین باتوں کے بارہ میں خود کو روک رکھا
تھا۔ جھگڑے سے، تکبر اور لایعنی کاموں سے اور تین چیزوں سے لوگوں کو بچا رکھا تھا۔
آپ ﷺ کسی کی مذمت نہیں کرتے تھے اور نہ کسی کی برائی بیان کرتے تھے نہ عیب
جوئی کرتے تھے۔ کسی سے بات کرتے تو وہی بات کرتے جو باعث اجروثواب ہو۔
اور جب آپ ﷺ بولتے تو ہم نشین سر جھکا کر (بغور) سنتے تھے جیسے ان کے سروں پر
پرندے بیٹھے ہوں۔ جب آپ ﷺ چُپ ہو جاتے تھے تو تب وہ بات کرتے۔

آپ ﷺ کے سامنے وہ کسی بات میں نزاع نہیں کرتے تھے۔ آپ ﷺ کے ہاں کوئی بات کرتا تو سب حاضرین خاموش ہو کر سنتے۔ حتیٰ کہ وہ اپنی بات سے فارغ ہو جاتا۔ آپ ﷺ کی مجلس میں ہر ایک کی باتیں قابل قدر سمجھی جاتی تھیں جیسا کہ وہ پہلا بولنے والا اور پہلا مقرر ہو۔ جس بات پر صحابہ ہنستے آپ ﷺ بھی ہنستے اور جس بات پر وہ تعجب کرتے آپ ﷺ بھی تعجب فرماتے تھے۔ مسافر لوگوں کی باتوں میں اور مانگنے والوں کے درشت لہجہ کو برداشت کرتے تھے۔ یہاں تک کہ صحابہ کرامؓ ایسے پردیسی لوگوں کو آپ ﷺ کی مجلس میں کھینچ کرلاتے تھے آپ ﷺ صحابہ کو حکم دیتے کہ جب کسی حاجت مند کو حاجت طلب کرتے ہوئے دیکھو تو اس کی مدد کیا کرو صرف ان لوگوں سے تعریف قبول کرتے تھے جو آپ ﷺ کی شان کے لائق تعریف کرتے تھے کسی کی قطع کلامی اس وقت تک نہ کرتے تھے جب تک وہ حدّ اعتدال سے تجاوز نہ کرتا اور اگر کرتا تو اسے روک کر اس کی بات کاٹ لیتے تھے یا خود اٹھ کر چلے جاتے تھے۔

<u>بشاشت نبوی ﷺ:</u> **کان رسول اللّٰہ ﷺ دائم البشر الخ،** بشر چہرے کے اس حصے کو کہتے ہیں جو ظاہر ہو اور عام حالات میں اس پر نظر پڑے۔ اسی حصہ پر غم اور خوشی کے آثار نمایاں ہو جاتے ہیں بشریٰ بمعنی خوشخبری بھی اسی سے نکلا ہے کیونکہ اس کی وجہ سے جو تغیّر آتا ہے وہ بھی سب سے پہلے چہرے پر ظاہر ہوتا ہے اور محسوس کیا جا سکتا ہے تو مطلب یہ ہوا کہ آپ ﷺ کے رخ انور پر ہمیشہ بشاشت ہوتی تھی اور آپ ﷺ ہمیشہ ہنس مکھ رہتے تھے اور آپ ﷺ کی یہ بشاشت ہر ایک کیلئے ہوتی تھی اس پر یہ اعتراض ہو سکتا ہے کہ اس سے پہلے شمائل میں گزر چکا ہے کہ آپ ﷺ متواصل الاحزان تھے یعنی ہمیشہ غم اور فکر میں

رہتے تھے۔شرّاح نے اس کا جواب یہ دیا ہے کہ آپ ﷺ کی پریشانی اور فکرمندی تو امورِ آخرت کے سلسلے میں ہوتی تھی اور امت کو قیامت کی ہولناکیوں سے اور جہنم کے عذابوں سے نجات کی فکر ہمیشہ دامن گیر رہتی تھی لیکن دنیوی امور میں کمال توکل اور زہد کی بناء پر آپ ﷺ کو کوئی فکر نہیں ہوتی تھی اور ظاہری طور پر ہشاش بشاش نظر آتے تھے کہ ہمنشین آپ ﷺ سے تنگ نہیں ہوتے تھے اور یہ اخلاقِ نبوی ﷺ کا کمال ہے۔

سهل الخلق لين الجانب الخ، نرم اخلاق، نرم خوئی کی وجہ سے ہر ایک پر جلدی سے مہربان ہوجاتے تھے اور لوگوں کے دلوں کو موہ لیتے تھے۔**لیس بفظٍّ و لا غلیظ**، فظ سخت طبیعت کے آدمی کو کہتے ہیں اور تقریباً یہی معنیٰ غلیظ کے بھی ہیں۔لیکن اول کو زبان کی سختی اور دوسرے کو دل کی سختی پر محمول کیا گیا ہے۔ قرآن میں بھی غلیظ کی اضافت قلب کو ہوئی ہے۔اللہ تعالیٰ نے آپ ﷺ سے دونوں صفات کی نفی کی ہے اور اسے آپ ﷺ کی مقبولیت کا راز بتایا ہے۔فرماتے ہیں **ولو کنت فظاً غلیظ القلب لانفضّوا من حولک**، اگر آپ ﷺ سخت اور سنگدل ہوتے تو صحابہؓ آپ ﷺ سے منتشر ہوجاتے لیکن یہ صفت مومنین کے حق میں مطلوب تھی جبکہ کفار کے حق میں آپ ﷺ کو حکم تھا کہ "**واغلظ علیهم**" ان کے ساتھ شدت سے پیش آؤ۔**لا صخّاب و لا فحّاش و لا عیّاب**، عیاب کے معنیٰ عیب بیان کرنے والے۔بخاری و مسلم میں روایت ہے کہ "**ماعاب طعاماً قط**" کہ آپ ﷺ کبھی کسی کھانے میں عیب نہیں نکالتے تھے کیونکہ اس طرح کھانا بنانے والے کی دل شکنی ہوتی ہے اور یہ مکارمِ اخلاق سے بعید ہے۔البتہ اگر کسی کی تربیت اور تادیب مقصود ہو تو پھر تنقید کی جاسکتی ہے۔یہاں جن صفات کی نفی کی گئی ہے بظاہر مبالغہ کے صیغوں کی نفی ہے لیکن یہ صرف مبالغہ کی نفی نہیں مبالغہ **فی النفی** کیلئے ہے یعنی یہ صفات آپ ﷺ میں بالکل نہیں پائی جاتی تھیں یہ معنیٰ نہیں کہ کم کم تو موجود ہوں اور بکثرت واقع نہ ہوں۔

بہرحال آپ ﷺ نکتہ چینی اور عیب جوئی بھی نہیں کیا کرتے تھے۔بعض لوگ ہر وقت دوسروں کے عیوب کی تلاش میں رہتے ہیں۔محاسن کی طرف ان کی نظر اٹھتی ہی نہیں۔دوسروں کے پیچھے پڑے رہتے ہیں۔ان سے دوست، استاد، پڑوسی، والدین اور اہلِ محلہ میں سے کسی کی عزت محفوظ نہیں رہتی۔دراصل اس بدباطن شخص کا اپنا آئینہ خراب ہوتا ہے جس میں عکس صحیح نہیں پڑتا۔صحیح انسان تو وہی ہے جو دوسروں کے

محاسن کی تلاش میں ہو۔حسن ظن کے حامل ایسے بزرگ بھی ہیں جنہیں کوئی بھی شخص برا نہیں لگتا۔مثلاً ہمارے والد ماجد حضرت شیخ الحدیث نوراللہ مرقدہ کو اگر ساری دنیا کہے کہ فلاں ایسا برا آدمی ہے فلاں اتنا گناہوں میں ڈوبا ہوا ہے مگر حضرت کو گویا یہ بات سرے سے سمجھ میں نہیں آتی۔انہیں ہر شخص پاکیزہ نظر آتا ہے زاہد ومتقی اور عادل نظر آتا ہے۔بہرحال عیب گیری بجائے خود بڑا عیب ہے۔لوگ ایسے شخص کی مجلس سے دور بھاگتے ہیں۔

ولا مشّاح،شح سے باب مفاعلہ کے اسم فاعل کا صیغہ ہے شح بخل کی نسبت عام معنیٰ پر بولا جاتا ہے جس میں مال،عہدے وغیرہ پر بخل آجاتا ہے۔مطلب یہ ہے کہ آپ ﷺ سے ہر قسم کا بخل منفی تھا کیونکہ بخیل آدمی کے پاس دو سال کے بعد جائیں تو بھی چیں بجبیں ہوجاتا ہے۔اس لئے لوگوں سے اس کا رابطہ کٹ جاتا ہے۔بعض نسخوں میں مدّاح کا لفظ آیا ہے۔شراح نے اسے بھی صحیح کہا ہے یعنی آپ ﷺ زیادہ مدح کرنے والے نہ تھے مثلاً کھانے،مکان،لباس وغیرہ کی مدح میں مبالغہ سے گریز کرتے تھے کیونکہ ان اشیاء کی زیادہ مدح ان چیزوں سے محبت پر مبنی ہوتی ہے جس سے آپ ﷺ بری تھے۔البتہ کبھی کبھی آپ ﷺ تھوڑی سی مدح کرلیا کرتے تھے۔

یتغافل عما لایشتھی الخ، اکثر لوگ اپنی مرضی کے مطابق قسم قسم کے پروگرام بناتے ہیں جو مباح ہونے کے باوصف بعض حضرات کو پسند نہیں ہوتے ایسے موقع پر حکمت کا تقاضا یہ ہوتا ہے کہ دوسروں کو منع کرنے کی بجائے خود لاتعلق ہوجاؤ۔اور اس پروگرام سے اپنی بے تعلقی نبھاؤ۔اگر ساتھی مشترک طور پر کوئی پروگرام بنائیں۔تو ان کی خواہش کا احترام کرتے ہوئے انہیں مت ٹوکیں۔اور اگر ان کے ساتھ شریک نہ ہونا چاہیں تو بتکلف انجان بن جاؤ۔آپ ﷺ ایسے موقعوں پر خود تو انہاک سے حصہ نہیں لیتے تھے لیکن وسعت ظرفی کا مظاہرہ کرکے دوسروں کو مایوس نہ کرتے۔

اور اس جملے کا یہ معنیٰ بھی ہوسکتا ہے کہ اگر کوئی شخص کسی غیر مناسب بات کی فرمائش کرتا جو آپ ﷺ کا ناپسند ہوتا تو اول تو خود کو انجان بنادیتے۔لیکن اس کو اپنے کرم وسخاوت سے بالکل مایوس بھی نہیں ہونے دیتے تھے بلکہ خاموشی کے ساتھ اس کی بات کو ٹال دیتے تھے۔

تو یتغافل عما لایشتھی ،کا معنی ہے کہ جو بات یا جو کام آپ نہیں چاہتے تھے اس کے کرنے سے بتکلف غفلت برتتے تھے۔و لایؤیس منه، یاء کے ضمہ کے ساتھ ایاس سے ہے یعنی کسی اور کو ایسے غیر مرغوب فعل سے مایوس نہیں کرواتے تھے یعنی اگر کوئی ایسا کام کرتا جو مباح ہو لیکن آپ ﷺ کے نزدیک قابل رغبت نہ ہو تو اس کو کرنے دیتے اور کرنے والے کی رغبت کو ملحوظ رکھتے لیکن اپنی عدم رغبت کا مظاہرہ زبان سے کرنے کی بجائے بصورت تغافل اور عدم توجہ فرماتے۔

بعض شراح نے ''منہ'' کا ضمیر عما لایشتھی کی بجائے نبی کریم ﷺ کو راجع کیا ہے پھر مطلب یہ ہوگا کہ آپ ﷺ لوگوں کو اپنی طرف سے مایوس نہیں کرتے تھے اگر کوئی آپ ﷺ سے کسی کام کی توقع رکھتا تو آپ ﷺ اس کو کورا جواب دے کر مایوس نہیں کرتے تھے بلکہ اگر وہ کام آپ ﷺ نہ کرتے تو بھی ان کو کرنے دیتے اور نفرت کا اظہار نہ کرتے البتہ،و لایجیب فیه ،اگر کوئی دعوت دیتا تو ایسے غیر مرغوب کام میں شامل نہ ہوتے بلکہ خوش اخلاقی اور نرم گفتار سے اس کو واپس کر دیتے تھے۔بعض علماء حضرات بھی لوگوں کے جائز کھیل کود اور مشاغل کو ایسے انداز میں لے لیتے ہیں جیسے وہ گناہ کبیرہ کر رہے ہوں۔جس کی وجہ سے وہ لوگوں سے دور ہو جاتے ہیں ایسا کرنے کی بجائے مباح کاموں میں لوگوں کی خواہشات کا کشادہ دلی سے لحاظ کرنا چاہئے یہ ٹھیک ہے کہ بعض اس طرح کے کام علماء کی حیثیت سے قابل ترک اور وقار کے منافی ہوتے ہیں اس کا تقاضا ہوتا ہے کہ ان کو ترک کیا جائے مگر اس کے کرنے والوں کو جہنم کی وعیدیں سنانا بھی مصلحت کے خلاف ہوتا ہے نہ شرعاً اس کی کوئی راہ نکلتی ہے۔

قد ترک نفسه من ثلاث، ترک منع کے معنیٰ کو متضمن ہے یعنی تین باتوں کو اپنی ڈائری سے نکال دیا تھا اور ان باتوں کے قریب بھی نہیں جاتے تھے۔المراء، بعض شراح نے اس کا ترجمہ الجدال بالباطل کیا ہے لیکن ملا علی قاریؒ کہتے ہیں کہ مطلق جدال مراد ہے۔یعنی بحث ومباحثہ اور کٹ حجتی پسند نہ تھی۔جیسے کہ ہمارے بعض طالب علم وقت اور استعداد کو سیاسی بحثوں میں ضائع کر دیتے ہیں یہ کوئی نتیجہ خیز بحث نہیں ہوتی بلکہ محض دماغی تھکان اور وقت کا ضیاع ہوتا ہے ساتھ ساتھ محبتوں کو نفرتوں میں تبدیل کرنے کا موجب بنتا ہے۔

والاکبـــــار، باء کے ساتھ یہ تکبّر یعنی خودکو بڑا ظاہر کرنے کو کہتے ہیں یعنی آپ ﷺ نشست وبرخاست اور آمدورفت میں خودکو امتیازی مقام دینے سے کتراتے تھے۔ جہاں تک "اناسید ولد آدم" اور اس جیسے کلمات ہیں۔تو وہ تحدیث نعمت کے طور پر آپ ﷺ نے ذکر فرمائے ہیں۔فخر ومباہات کیلئے نہیں۔بعض نسخوں میں **اکبـــار** کی جگہ **اکثـــار** ثاء کے ساتھ منقول ہے اس کا معنیٰ ہے کثرت کلام یعنی آپ ﷺ زیادہ بولنے سے بچتے تھے۔**ومالایعنیه**، یعنی جو چیزیں دین ودنیا میں بے فائدہ ہوتی تھیں اس سے بھی آپ ﷺ دور رہتے ہیں۔

وتــرک النـــاس من ثلاث، پہلے تین امور کو تو نبی کریم ﷺ نے اپنی رعایت کرتے ہوئے چھوڑا تھا لیکن ان تین امور کو دیگر لوگوں کی رعایت کرتے ہوئے چھوڑ دیا تھا، **کـــان لایــذم احــداً ولایـعیبه**، یعنی دوست ہو یا دشمن کسی کی مذمت اس کے روبرو نہیں کرتے تھے نہ اس کی غیر حاضری میں اس کے عیوب بیان کرتے تھے یا معنی یہ کہ کسی شخص کے اختیاری افعال پر اس کی مذمت نہیں کرتے تھے اور نہ کسی کے فطری اور طبعی عیوب پر انگشت نمائی فرماتے تھے جبکہ بعض شراح نے کہا ہے کہ یہاں پر ذم اور عیب دونوں ہم معنیٰ ہیں اور ولایعیبہ صرف تاکید کے طور پر کہا گیا ہے مگر یہ بات یاد رہے کہ آپ ﷺ کی یہ رعایت ان لوگوں کیلئے تھی جو معصیت کے مرتکب نہ ہوں نہ حدود شرعیہ سے تجاوز کر گئے ہوں۔**ولایطلب عورته**، نہ کسی شخص کے مستور امور اور پردوں کے پیچھے پڑتے تھے عورت سے مراد وہ امور ہیں جن کا اظہار موجب رنج وخفت ہو۔تو گویا کسی کے عیوب کا اظہار کرنے سے کتراتے تھے ہم لوگ ہر وقت دوسروں کے حالات کریدنے کی کوشش کرتے ہیں یہ بری عادت ہے ہمارے حکمران تو ہر اہم شخصیت کی فائل بناتے ہیں ڈکٹیٹروں میں یہی بڑا عیب ہوتا ہے کہ وہ دوسرے کے عیوب کا ریکارڈ رکھتے ہیں تاکہ انہیں بلیک میل کرکے ان کی سرگرمیاں قابو میں رکھیں آپ ﷺ اس سے احتراز کرتے اور دوسروں کو اس سے احتراز کی ترغیب بھی دیتے تھے۔

ایک حدیث میں آیا ہے کہ **من تتبع عورة اخیه المسلم تتبع اللّٰه عورته ومن یتّبع اللّٰه عورته یفضحه ولوفی جوف رحله**(۱)،

---

(۱)جامع ترمذی ۲/۴٦۷ باب ماجاء فی تعظیم المؤمن(ابواب البر والصلة) ۱۲ (مختار)

جو شخص اپنے مسلمان بھائی کے پردے کے پیچھے پڑا اللہ تعالیٰ اس کے پردے کے پیچھے پڑ جائے گا۔اور جس کے پردے کے پیچھے اللہ تعالیٰ پڑ جائے اس کو اللہ تعالیٰ رسوا کردے گا اگر چہ وہ اپنے کجاوے کے اندر ہو یا وہ اپنے گھر کے بیچوں بیچ رہے۔

ولایتکلم الاّفیمار جاثوابہ، یہ تیسری بات ہے اس کا مطلب یہ ہے کہ کسی سے بات کرتے تو ایسے امور کے بارے میں کرتے جن میں متکلم اور مخاطب کے ثواب کی توقع ہو۔بے مقصد بات نہیں کرتے تھے نہ دنیوی مقاصد میں منہمک رہتے بلکہ لوگوں کے اخروی منافع ملحوظ ہوتے تھے۔اس صورت میں ثوابہ کا ضمیر احد من الناس کو راجع ہے اور اسی کو ملا علی قاریؒ نے ترجیح دی ہے۔

<u>شوق استماع:</u> **اطرق جلساءہ،** اطراق کا معنی ہے سر جھکانا یعنی آپ ﷺ بولتے تو صحابہ کرامؓ سر جھکا کر غور سے سنتے تھے۔اور یوں ساکت وصامت اور ہمہ تن متوجہ رہتے "**کانّ علیٰ رؤسھم الطّیر**" گویا سروں پر پرندے بیٹھے ہیں اور ان کے اڑنے کے خوف سے وہ حرکت نہیں کرتے ہوں۔اس طرح یہ کمال استماع سے کنایہ ہے جو کہ آپ ﷺ کی ہیبت رعب اور صحابہؓ کے کمال ادب کی وجہ سے تھا۔

بعض شراح نے اس جملے کو استلذاذ سے کنایہ ٹھہرایا ہے یعنی صحابہؓ آپ ﷺ کے کلام سے لذت حاصل کرتے تھے اور اس کی تفصیل یوں کی ہے کہ کوے اور مینا وغیرہ بعض پرندے اونٹ کے سر پر بیٹھ کر اس کے سر سے جوئیں اور دیگر تکلیف دہ کیڑے چن چن کر کھاتے ہیں اس صورت میں اونٹ سر کو بالکل ساکن کر کے رکھ دیتا ہے تا کہ پرندے یہ موذی کیڑے چن لیں اور اس کو راحت ملے یونہی صحابہ کرامؓ کو آپ ﷺ کی باتوں میں لذت اور روحانی سکون ملتا تھا۔لہٰذا وہ سرنگوں ہو کر سنتے تھے۔اس سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ دوران تعلیم درس کو خاموشی سے سننا چاہئے کوئی اشکال ہو تو اختتام درس کے بعد استاد سے پوچھنا چاہئے۔

لایتنازعون عندہ الحدیث، آپ ﷺ کی مجلس میں ایک دوسرے کی بات مداخلت اور قطع کلامی نہیں کرتے تھے یا مطلب یہ ہے کہ باتوں میں ایک دوسرے کے ساتھ جھگڑتے نہیں تھے۔**ومن تکلّم عندہ الخ،** یہ "**لایتنازعون**" کی تفسیر ہے۔

حدیثھم عندہ حدیث اوّلھم، "اوّلھم" کا معنی ہے سب سے پہلا۔اس کے مصداق تین قول ہیں۔ پہلا یہ کہ یہاں مراد پہلے بولنے والا ہے یعنی آپ ﷺ کی مجلس میں ہر بولنے والے کو اس طرح سنا جاتا تھا جس طرح کہ سب سے پہلے بولنے والے کو توجہ، ہمہ تنی اور التفات سے سنا جاتا تھا۔

ہر بولنے والے کی قدر: عموماً جلسوں میں آپ کو یہ تجربہ ہو چکا ہو گا کہ ابتداء میں تو سامعین میں جوش ہوتا ہے اور بات جیسے بھی ہو سن لیتے ہیں لیکن جوں جوں وقت گزرتا ہے وہ تھک کر کھسکتے رہتے ہیں۔ آخر میں لوگ تنگ آجاتے ہیں خصوصاً جب ایک ہی موضوع پر بولا جاتا ہے۔ تو لوگ اٹھ اٹھ کر مجلس چھوڑتے ہیں لیکن حضور ﷺ کی مجلس میں ایسا نہیں ہوتا تھا بلکہ تمام حاضرین کی بات پہلے بولنے والے کی بات جیسے قابل قدر سمجھی جاتی تھی، سنی جاتی تھی اور تنگ دلی کا مظاہرہ نہیں ہوتا تھا تا کہ اس کی دل شکنی نہ ہو۔ دوسرا یہ کہ اول سے مراد پہلے آنے والا ہو پھر مطلب یہ ہوگا کہ آپ ﷺ کی مجلس میں پہلے آنے والے کو پہلے بولنے کا حق ملتا تھا۔ بعد میں آنے والے بعد میں بولتے تھے گویا کسی کا استحقاق مجروح نہیں ہوتا تھا۔ تیسرا یہ کہ اول سے مراد اشرف و افضل ہو پھر مطلب یہ ہوگا کہ آپ ﷺ کی مجلس میں افضل و اشرف لوگوں کو پہلے بولنے کا موقعہ دیا جاتا تھا اور لوگ ان کے بات کو اصل بات سمجھ کر توجہ سے سنتے تھے گویا عام صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم اجمعین اکابر صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم اجمعین کی رعایت کرتے تھے۔

یضحک ممایضحکمون ویتعجب ممایتعجبون، جس بات پر صحابہؓ ہنستے آپ ﷺ بھی اس پر تبسم فرماتے اور جس بات سے وہ لوگ تعجب کرتے آپ ﷺ بھی تعجب فرماتے تھے گویا یہ آپ ﷺ کے حسن اخلاق کی تصویر کشی ہے کہ آپ ﷺ ایسے امور میں صحابہؓ کی دلجوئی کی خاطر ان کے ساتھ حتی المقدور گھل مل کر شرکت کی کوشش فرماتے تھے۔

تحمل کا نمونہ: **ویصبر للغریب علی الجفوۃ،** عرب کے بعض صحرائی لوگ آداب معاشرت سے لابلد ہونے کے سبب ناقابل برداشت حد تک نامناسب رویہ اپناتے تھے ان کی باتوں میں درشتی، نشست و برخاست میں بے ادبی اور کھانے پینے میں گنوار پن ہوتا تھا۔ مانگنے کا انداز تحکمانہ تھا بلکہ مسائل پوچھتے ہوئے سوء ادب کا ارتکاب کر لیتے تھے مگر بایں ہمہ آپ ﷺ ان کے ان عیوب کو ان کی فطرت پر محمول

کر کے ان کو برداشت کر لیتے تھے اوران کی اکھڑپن کے باوصف ان کی فرمائشیں بھی پوری فرماتے تھے۔

دیہاتیوں کے برعکس مہذب، متمدن اور تعلیم یافتہ لوگوں کے طرز طریقے اور قسم کے ہوتے ہیں۔ اسی طرح صحابہ کرامؓ کو تو آداب مجلس اور اطوار مصاحبت معلوم تھے لیکن صحراؤں اور پہاڑوں سے آنے والے نو وارد حضرات عموماً آپ ﷺ کے ساتھ انداز تخاطب نیز دیگر تکلفات وآداب سے ناواقف ہوتے تھے وہ نام لے کر دور سے چیخ کر پکارتے تھے اس طرز تخاطب میں باوجود اخلاص کے بات کرنے کا ڈھنگ آداب سے خالی ہوتا تھا۔ بایں ہمہ آپ ﷺ ان لوگوں کی سخت اور بے ڈھنگ باتوں کا برا نہیں مانتے تھے۔ ان کے درشت انداز کو برداشت کرتے۔

<u>شوق علم:</u> حتیّ ان کان اصحابه یستجلبونهم، إنّ مخففہ من المثقل ہے اور استجلاب کا معنی ہے کھینچ کرلانا اس کے متعدد معانی بیان کئے گئے ہیں۔

اول یہ کہ صحابہ کرامؓ بدوی صحرائی لوگوں کی آمد کی تمنا کرتے تھے کہ کاش وہ آکر الٹی سیدھی باتیں پوچھیں تاکہ نبی کریم ﷺ سے ان باتوں کے بارے میں علم حاصل ہو جن کے بارے میں صحابہ کرام ادب اور رعب کی وجہ سے نہ پوچھ سکے کیونکہ بدوی اور اجڑ قسم کے لوگ ادب واحترام کو مسائل کیلئے حجاب نہیں بناتے تھے۔

دوم یہ کہ صحابہ کرامؓ بدوی لوگوں کو باہر سے نبی اکرم ﷺ کی مجلس میں کھینچ کرلاتے تاکہ وہ کچھ پوچھیں اور صحابہ استفادہ کرسکیں۔

سوم یہ کہ بدوی لوگ نبی کریم ﷺ کی مجلس سے کتراتے تو صحابہ کرامؓ صحرائی لوگوں کیلئے نبی کریم ﷺ کی خصوصی رعایت اور صبر بیان کر کے ان کو مجلس میں آنے کی ترغیب دیتے تھے تاکہ وہ حاضر ہو کر کچھ حاصل کرسکیں۔

چہارم یہ کہ صحابہ کرامؓ بدوی لوگوں کی بے ادبی کو دیکھ کر ان کو مجلس نبوی ﷺ سے کھینچ کر باہر نکالتے تاکہ مزید بے ادبی نہ کریں اور نبی کریم ﷺ کے عتاب کا نشانہ نہ بنیں لیکن موخر الذکر توجیہہ کو شراح نے نامناسب توجیہہ قرار دیا ہے۔

فـارفدوہ، ارفـاد کے معنی ہیں معاونت کرنا، صحابہ کرامؓ کو ہدایت تھی کہ ضرورتمندوں کی حاجت برآری میں ان کے ساتھ تعاون کریں خواہ وہ مالی ہو بدنی ہو یا بصورت سفارش ہو۔

و لایقبل الثناء إلاّمن مکافیٍ، مکافی مکافات کا اسم فاعل ہے مکافات کفو، بمعنی ہمسر سے مفاعلہ ہے جس کے معنیٰ مماثلث ہیں تو معنی یہ ہوگا کہ آپ ﷺ مکافات ومماثلث کرنے والے سے تو اپنی تعریف قبول کر لیتے تھے کسی اور سے نہیں پھر اس کلام کے مطلب میں ملاعلی قاریؒ کہتے ہیں کہ مماثل سے مراد **"مقارب فی مدحه غیر مجاوزبه عن حدمثله و لامقصّر به عمّا رفعه اللّٰه الیه"** ہے یعنی وہ شخص جو آپ ﷺ کی مدح میں اعتدال برتتا ہو مطلب یہ ہے کہ آپ ﷺ قصیدے اور مدائح نہیں سنتے تھے روبرو مدح سرائی سے ناراض ہو جاتے تھے۔ سپاسنامے اور القابات قبول نہیں کرتے تھے ہاں حقیقت حال بیان کرنے والے کی تعریف بھی سن لیتے تھے مکافی کفو سے ہے جو برابری اور ہمسری کے معنیٰ میں آتا ہے یعنی اس شخص کی مدح پر کان دھرتے جو کہ برابر برابر مدح کرتا تھا۔ حد سے تجاوز کرنے کی بجائے عین حقیقت حال کہتا اور مبالغہ آمیزی سے اجتناب کرتا مثلاً اگر کوئی آپ ﷺ کو خدا، مشکل کشا یا عالم الغیب کہتا اس قسم کی توصیفات سے آپ ﷺ خفا ہوتے تھے اور اگر آپ ﷺ کو عبداللہ یا رسول اللہ ﷺ کے ناموں سے پکارا جاتا تو آپ ﷺ خوش ہوتے تھے۔ اطراء وتنقیص دونوں کو ناپسند فرماتے تھے۔

جیسا کہ ایک اور حدیث میں آپ ﷺ نے فرمایا کہ میری مدح میں مبالغہ آرائی نہ کرو جیسے عیسائیوں نے عیسیٰؑ کی مدح میں کی ہے۔ مجھے اللہ کا بندہ اور رسول ہی کہو۔ یہی معنیٰ علامہ مناویؒ نے بھی لیا ہے اور علامہ میرکؒ نے تعبیریوں کی ہے کہ نفس الامر اور واقع سے مطابقت رکھنے والی مدح قابل قبول ہوتی باقی نہیں۔ جبکہ بعض حضرات نے ترجمہ یہ کیا ہے کہ مکافی کا معنیٰ ہے بدلہ دینے والا۔ تو مطلب یہ ہوا کہ اگر کوئی آپ ﷺ کے احسان کے بدلے میں بطور شکریہ کے مدح کرتا تب تو آپ ﷺ کے ہاں مدح قبول ہوتی ورنہ نہیں لیکن علامہ میرکؒ نے اسے رد کیا ہے اور ابن حجرؒ نے وجہ یہ بیان کی ہے کہ آپ ﷺ کے احسانات تو تمام عالم پر ہیں پھر کسی سے مدح قبول نہ کرنے کی صورت نہیں بنتی۔

بعض حضراتؒ نے مکافی کا معنی برابر اور ہمسر سے کیا ہے اور مطلب یہ نکالا ہے کہ آپ ﷺ

ایمان میں اپنے ساتھ برابر شخص کی مدح سنتے اور کافروں اور منافقوں کی مدح قبول نہ فرماتے۔بہرحال جو مدح آپ ﷺ کو ناگوار ہوتی تھی اس سے مدح کرنے والے کو منع فرماتے تھے۔

ولایقطع علی احدحدیثه، کسی کی قطع کلامی نہ فرماتے،حتی یجوز،بعض نسخوں میں حتیٰ یجور راء کے ساتھ ہے جو جور سے ہے یعنی جب وہ ظلم اور کج روی نہ کرتا تب تک بولنے دیتے تھے لیکن راجح حتیٰ یجوز ہے یعنی جب تک کوئی حد اعتدال سے تجاوز نہ کرتا اور اگر کرتا تو آپ ﷺ اس کو ٹوک کر اس کی بات کو قطع کر لیتے یا پھر اٹھ جاتے تاکہ وہ خود بات چھوڑ دے آج کل تو سپیکروں کی وجہ سے اسمبلیوں کا براحال ہے ہر ایوان میں بدنظمی ہوتی ہے ٹھیک اور جائز بات بھی نہیں کرنے دیتے اور اگر بدتہذیبی اور خلاف شرع بات ہو تو اس کو موقع دیدیا جاتا ہے۔**فإلیٰ اللّٰه المشتکیٰ.**

(۱۰) حدّثنا محمّدبن بشّار ثنا عبدالرحمٰن بن مهدی ثنا سفیان عن محمّد بن المنکدر قال سمعت جابر بن عبداللّٰه یقول ماسئل رسول اللّٰه ﷺ شیئاً قطّ فقال لا(۱).

ترجمہ: حضرت جابر بن عبداللہؓ کہتے ہیں کہ نبی اکرم ﷺ سے کسی بھی چیز کا تقاضا نہیں کیا گیا جس پر آپ ﷺ نے ''نہ'' کہا ہو۔

فقال لا،مراد یہ ہے کہ آپ ﷺ نے کبھی بھی کسی سائل کو نہ کہہ کر واپس نہیں کیا بلکہ یا تو اس کا مطالبہ پورا فرماتے یا آئندہ کیلئے وعدہ کر کے رخصت فرماتے یا اس کو مستغنی کرنے کیلئے اس کے حق میں دعا فرماتے اور بقول فرزدق ؎

ماقال لاقطّ الافی تشهُّدهٖ لولاالتشهُّد کانت لاء ه نعم

یعنی صرف تشہد میں تو لا کہہ دیتے اگر تشہد نہ ہوتا تو ان کی ہر''لا'' کی جگہ ''نعم'' یعنی ہاں ہی ہوتا۔

---

(۱)صحیح بخاری ۸۹۱/۲ کتاب الادب باب حسن الخلق اوالسخاء، صحیح مسلم کتاب الفضائل باب فی سخائه ؐ، مصنف ابن ابی شیبة ۵۱۵/۱۱ کتاب الفضائل، مسنداحمد ۳۰۷/۳(مختار)

اس پر ایک اعتراض ہوتا ہے کہ غزوۂ تبوک کے دوران جب ابوموسیٰ اشعریؓ اور ان کے قبیلے والوں نے سواریوں کا تقاضا کیا تو آپ ﷺ نے فرمایا "واللّٰہ لااحملکم" اس کا جواب یہ دیا گیا ہے کہ آپ ﷺ نے یہاں پر جو "نہیں" کا لفظ بولا ہے وہ بطور تادیب یا بطور اعتذار ہے منع اور انکار کے طور پر نہیں ہے یعنی آپ ﷺ نے یا تو اشعریوں کو عذر کے طور پر کہا کہ میرے پاس چونکہ اس وقت سواری نہیں ہے۔اس لئے میں دینے سے معذرت کررہا ہوں جیسا کہ قرآن مجید میں صراحۃً عذر ہی کے الفاظ سے بیان ہے "قلت لاأجدمااحملکم "یعنی آپ نے عذر کیا کہ میرے پاس سواری نہیں ہے یا پھر مطلب یہ ہے کہ جب بار بار عذر پیش کرنے کے باوجود اشعری لوگ اصرار کرنے لگے تو آپ ﷺ نے ان کی توقع ہی کو ختم کرنا چاہا۔اور "واللہ لا احملکم" کہہ دیا جس پر وہ تقاضا چھوڑ گئے مگر جب آپ ﷺ کو اونٹ میسر ہو گئے تو انکار اور قسم کے باوجود آپ ﷺ نے پانچ اونٹ عطا فرمائے(۱)۔

(۱۱) حدّثنا عبداللّٰہ بن عمران ابوالقاسم القرشیّ المکیّ ثناإبراھیم بن سعدٍ عن ابن شھاب عن عبیداللّٰہ عن ابن عبّاسؓ قال کان رسول اللّٰہ ﷺ أجود الناس بالخیر وکان أجود مایکون فی شھررمضان حتیّ ینسلخ فیاتیہ جبریل فیعرض علیہ القرآن فاذالقیہ جبریل کان رسول اللّٰہ ﷺ أجودبالخیر من الریح المرسلۃ(۲).

ترجمہ: حضرت عبداللہ بن عباسؓ کہتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ تمام لوگوں کی نسبت ایصال خیر میں زیادہ سخی تھے پھر آپ ﷺ رمضان شریف میں تو اختتام مہینہ تک اور بھی زیادہ فیاض ہوجاتے تھے پس (رمضان میں) آپ ﷺ کے پاس جبرئیل آتے

(۱)بخاری شریف ج۲ ص ۶۳۰

(۲)صحیح بخاری باب کیف کان بدء الوحی ۱/۳کتاب البدء الوحی باب مکااجودماکان النبی ﷺیکون فی رمضان، صحیح مسلم ۲/۲۶۱کتاب الفضائل باب کان النبی ﷺاجودالناس بالخیر،السنن الکبریٰ للنسائی کتاب فضائل القرآن باب عرض جبرئیل القرآن، مصنف ابن ابی شیبۃ، السنن الکبریٰ للبیھقی ۴/۳۰۵کتاب الصیام باب الجودو الافضال فی شھررمضان(مختار)

اور آپ ﷺ کوقرآن مجید سناتے جب بھی آپ ﷺ کی ملاقات جبرئیل سے ہوجاتی
تو آپ ﷺ نفع رسانی میں بارش لانے والی ہوا سے بھی زیادہ فیاضی فرماتے۔

عن عبیداللّٰہ، اسی تابعی کی تعیین میں تین قول ہیں۔(۱)عبیداللہ بن عیاضؒ (مناوی) (۲)عبیداللہ بن ابی رافعؒ حضرت علیؓ کے کاتب (مناوی)(۳)عبیداللہ بن عتبہ بن مسعودؒ، ملاعلی قاریؒ، ابن حجرؒ اور علامہ عینی وغیرہ نے موخرالذکر کو ترجیح دی ہے۔بعض لوگوں نے عبیداللہ بن ابی ملیکہ کا ذکر کیا ہے لیکن شراح نے اس کی تردید کی ہے۔

أجود الناس بالخير ،خیر سے مراد دنیوی اور اخروی منافع ہے۔اس لئے یہ آپ ﷺ کی طرف مالی، حالی، اخلاقی، علمی اور عملی نفع رسانی کو شامل ہے اور یہ نفع رسانی صرف انسانوں تک محدود نہیں بلکہ حیوانات، نباتات اور جمادات تک متعدی ہے۔

وکان اجود مايكون في شهر رمضان، ا جود میں اگر چہ نصب بھی جائز ہے لیکن رفع راجح ہے اور ابن حاجبؒ نے اس کے لئے پانچ وجوہ ذکر کی ہیں۔سب سے بہتر توجیہہ یہ ہے کہ یہ کان کا اسم ہے اور ما مصدر یہ ہے یہ اجود کا مضاف الیہ بنتا ہے جبکہ فی شہر رمضان حال کے مرتبے میں ہے اور خبر کا قائم مقام ہے جو محذوف ہے تقدیر عبارت یوں ہوگی ''**وكان اجودا كوانه حال كونه في شهر رمضان حاصلاً**'' **حتى ينسلخ**، یعنی اختتام ماہ تک تو بے تحاشا جود ہوتی تھی لیکن اس کے بعد اپنی اصلی فطری سخاوت عود کر آتی جو دیگر لوگوں کی سخاوت سے پھر بھی بڑھ کر تھی۔

<u>رمضان اور سخاوت میں اضافے کا سبب:</u> رمضان شریف میں سخاوت میں اضافے کے متعدد اسباب ہیں اول تو یہ کہ رمضان شریف خود بھلائیوں کا موسم ہے۔دوم یہ کہ اللہ تعالیٰ کی رحمت اور فضل وعنایتیں بھی اس مہینے میں بارشوں کی طرح برستی رہتی ہیں اور حضور ﷺ تو تخلق باخلاق الرب کا نمونہ ہیں۔ سوم یہ کہ دین وتقویٰ میں صحبت صالحین کا خصوصی اثر ہوتا ہے اکابر کہتے ہیں ''**لقاء اهل الخير عمارة القلوب**'' یعنی صلحاء کی ملاقات سے ہی دلوں کی تعمیر ہوتی ہے تو جب جبرئیل علیہ السلام سے آپ ﷺ کی ملاقات ہوتی تو آپ ﷺ کی فیاضی کا اضافہ بھی قرین قیاس ہے۔چہارم یہ کہ رمضان شریف قرآن کے

نزول کا زمانہ ہے"شهر رمضان الذی انزل فیه القرآن" اس لئے آپ ﷺ تحدیث نعمت کے طور پر بھی زیادہ سخاوت فرماتے تھے۔فیعرض علیه القرآن، یعرض فاعل کا ضمیر نبی کریم ﷺ کو اور علیہ کا ضمیر جبرئیلؑ کو راجع کرنا اور اس کے برعکس دونوں جائز ہیں کیونکہ بخاری شریف کی روایت میں فیدارسه القرآن آیا ہے بعض دیگر روایات میں "یعارضنی بالقرآن" آیا ہے۔اس کا مطلب یہ ہے کہ جبرئیلؑ نبی کریم ﷺ کو سناتے اور نبی اکرم ﷺ جبرئیل علیہ السلام کو سناتے تھے۔

لیکن اکثر روایات میں نبی اکرم ﷺ کا جبرئیلؑ کو سنانے کا ذکر ہے۔اس لئے یہاں شراح نے یعرض کا فاعل کا ضمیر نبی اکرم ﷺ کو راجع کرنے کو ترجیح دی ہے۔

لقاء جبریل کے اثرات: فاذالقیه جبریل کان رسول اللّٰه أجود بالخیر من الریح المرسلة، یعنی عمومی سخاوت کے علاوہ رمضان شریف میں خصوصی سخاوت ہوتی تھی لیکن جبرئیل علیہ السلام کے ساتھ ملاقات کے بعد تو اور بھی سخاوت میں اضافہ ہوجاتا تھا۔اور آپ ﷺ بارش لانے والی ہوا سے بھی زیادہ سخی ہوجاتے تھے۔ یہاں ہوا کے ساتھ تشبیہ دو وجوہ سے ہے۔اول اس لئے کہ عموماً ایسی ہوا تیز چلتی ہے ہر جگہ تک جلدی رسائی کرلیتی ہے یونہی آپ ﷺ بھی انتہائی سرعت سے ایصال خیر فرماتے تھے۔دوم یہ کہ ایسی ہوا کی نفع رسانی عام ہوتی ہے اور ہر کس و ناکس تک بارش اور اس کے منافع پہنچادیتی ہے۔اسی طرح نبی کریم ﷺ کی نفع رسانی بھی عام ہوجاتی تھی۔

ہواؤں سے تشبیہ ناقص ہے: ملاعلی قاریؒ نے علامہ کرمانیؒ کے حوالے سے نقل کیا ہے کہ ہوا اور بارش کی منفعت ظاہری اور محدود ہے صرف مادی حیات کا سبب بنتے ہیں جبکہ نبی اکرم ﷺ ویران دلوں کی آبیاری کرکے حیات جاودان بخشتے ہیں اور فانی رونق کے مقابلے میں دائمی اور حقیقی نعمتوں سے مالامال کرتے ہیں۔اس لئے یہ تشبیہ ناقص اور صرف تفہیم کیلئے ہے ورنہ آپ ﷺ کی سخاوت کے مقابلے میں ہوا، بارش، سورج، چاند وغیرہ کی نفع بخشی ہیچ ہے(۱)۔

حضور اقدس ﷺ کی مادی سخاوت اور فیاضی کی مثالیں: خلاصہ یہ ہے کہ آپ ﷺ خداوند عالم کے بعد عالم میں سب سے زیادہ سخی تھے۔حتیٰ کہ آپ ﷺ کی صرف مادی سخاوت دیکھ کر انسان دنگ رہ جاتا ہے

---

(۱)فانّ من جودک الدنیا وضرّتها ومن علومک علم اللّوح والقلم (بردہ)

مثلاً ایک عورت نے ایک چادر ہدیہ کردی ضرورت کی وجہ سے پہن لی، صحابہؓ میں سے کسی نے مانگ لی اور اتار کر دیدی۔ ایک آدمی کو بھیڑ، بکریوں کا ایک بڑا ریوڑ جو دو پہاڑوں کے درمیان چر رہا تھا سارے کا سارا بخش دیا۔ جعرانہ کے مقام پر ایک ایک آدمی کو سوسو اونٹ دیتے رہے۔ حکیم بن حزامؓ کو سو درہم دیئے، انہوں نے اور مانگے تو فوراً سو اور دیدیئے۔ ایک مرتبہ نوے ہزار درہم آئے۔ فوراً ہی چٹائی پھیلا کر تقسیم شروع کردی اور سب کے سب تقسیم کردیئے۔ بحرین سے علاء بن الحضرمیؓ نے ایک لاکھ درہم (۱) بھیج دیئے۔ مسجد میں پھیلا دیئے اور تقسیم کرتے رہے۔ بخاری شریف کی روایت میں ہے کہ **فما قام رسول اللّٰہ ﷺ وثمّہ منھا درھم** (۲) یعنی آپ ﷺ وہاں سے اٹھے تو ایک درہم بھی باقی نہیں تھا۔

حنین کے روز ایک عورت کو اتنا مال دیا جس کی قیمت پچاس کروڑ درہم کے برابر تھی (۳)، دوسری طرف خوف فقر وفاقے کی حالت ہوتی تھی۔ مہینے بھر گھر میں آگ نہیں جلتی تھی۔ پیٹ پر بھوک سے پتھر باندھ لیتے تھے جَو کی روٹی معمول کا کھانا ہوتا تھا لیکن جب کوئی مانگ لیتا تھا تو قرض لے کر بھی دے دیتے تھے۔

(۱۲) حدّثنا قتیبہ بن سعیدثنا جعفر بن سلیمان عن ثابت عن أنس ابن مالک قال کان النبیّ ﷺ لایدّخر شیئا لغد (۴)۔

ترجمہ: حضرت انسؓ کہتے ہیں کہ نبی اکرم ﷺ کوئی بھی چیز دوسرے دن کیلئے (اپنی خاطر) ذخیرہ نہیں کرتے تھے۔

<u>کمال توکل کے وجہ سے عدم ادخار:</u> **لایدّخر شیئاً لغد**، یعنی اپنے لئے کوئی چیز نہیں رکھتے تھے جو آپ ﷺ کی سخاوت اور رب العالمین پر اعتماد وتوکل کا بیّن ثبوت ہے۔ البتہ یہاں ایک اعتراض ہوتا ہے کہ بخاری ومسلم میں ہے کہ آپ ﷺ اپنے اہل خانہ کیلئے ایک برس کا نفقہ ذخیرہ کیا کرتے تھے۔ اس کے

(۱) فتح الباری ج ۱ ص ۶۸۰

(۲) بخاری ج ۱ ص ۶۰

(۳) مناوی ج ۳ ص ۲۱۰

(۴) جامع ترمذی ۲/۶۰ ۵ کتاب الزھد باب ماجاء فی معیشۃ النبی ﷺ س ۱۱ ۵، صحیح ابن حبان، شرح السنۃ للبغوی (مختار)

جواب میں کئی اقوال ہیں۔اول یہ کہ یہ ادخار اپنے لئے نہیں بلکہ اہل خانہ کے حقوق کی ادائیگی کیلئے تھا۔ ان کیلئے ذخیرہ کر لیتے تھے اور وہ بھی بسا اوقات اس نفقہ کو جلد ہی تقسیم کر لیتی تھیں۔دوم یہ کہ آپ ﷺ تعلیماً للامۃ اور بیان جواز کیلئے یہ ادخار فرمایا کرتے تھے۔سوم یہ کہ غالب اوقات میں ادخار کی عادت نہ تھی کبھی کبھی کرتے بھی تھے۔چہارم یہ کہ غزوۂ خیبر سے قبل تو آپ ﷺ ایک سال کیلئے ادخار کیا کرتے تھے لیکن فتح خیبر کے بعد ادخار نہیں کی اور حضرت انسؓ کی یہ حدیث فتح خیبر کے بعد کے زمانہ پر محمول ہے۔

(۱۳) حدّثنا هارون بن موسىٰ بن أبی علقمة الفرویّ المدنیّ حدّثنی أبی عن هشام بن سعد عن زید بن أسلم عن أبیه عن عمر ابن الخطاب أنّ رجلاً جاء إلیٰ رسول اللّٰه ﷺ فسأله ان یعطیه فقال النبیّ ﷺ ماعندی شیٔ ولکن ابتع علیّ فاذاجاء نی شیٔ قضیته فقال عمر یارسول اللّٰه قداعطیته فما کلّف اللّٰه مالاتقدرعلیه فکره النبیّ ﷺ قول عمر فقال رجل من الأنصار یارسول اللّٰه انفق ولاتخف من ذی العرش إقلالافتبسّم رسول اللّٰه ﷺ وعرّف البشر فی وجهه لقول الأنصاری ثمّ قال بهذا امرت(۱).

ترجمہ: حضرت عمرؓ کہتے ہیں کہ ایک شخص نبی اکرم ﷺ کے پاس آیا اور کچھ دینے کا سوال کیا۔آپ ﷺ نے فرمایا کہ میرے پاس کوئی چیز موجود نہیں ہے لیکن تم میرے نام سے قرضہ لے کر خریدلو جب میرے پاس کچھ آجائے گا میں قرضہ اتاردوں گا۔ حضرت عمرؓ نے عرض کیا کہ یارسول اللہ ﷺ آپ اس سائل کو (مقدور بھر) دے چکے ہیں اور جو آپ کے طاقت سے باہر ہے اس کے دینے پر اللہ تعالیٰ نے آپ ﷺ کو مکلّف نہیں فرمایا۔ نبی کریم ﷺ نے حضرت عمرؓ کی بات کو ناپسند فرمایا۔تب ایک انصاری صحابی نے عرض کیا، یارسول اللہ مال (اللہ کی رضا کی خاطر) خرچ کیجئے اور

(۱)تفردالامام الترمذی بهذاالحدیث

عرش والے سے کسی کمی کا خوف نہ کیجئے (یہ سن کر) نبی اکرم ﷺ نے تبسم فرمایا اور انصاری کی بات کی وجہ سے آپ ﷺ کے رخ انور پر بشاشت ظاہر ہونے لگی پھر ارشاد فرمایا کہ اسی (انفاق) کا مجھے حکم دیا گیا ہے۔

ولکن ابتع الخ، ابتیاع سے امر کا صیغہ ہے لیکن اشتراء کے معنی میں مستعمل ہے یعنی خرید لو علیّ عبارت مقدر ہے یعنی ''ابتع المطلوب بثمن یکون دیناً علیّ'' اپنے مطلوب کو خرید لو اور قیمت کی ذمہ داری مجھ پر ڈال دو۔

قداعطیته، تم اس آدمی کو دے چکے ہو مفعول ثانی محذوف ہے۔اس کی تعیین میں اقوال ہیں۔ بعض لوگ کہتے ہیں کہ مراد یہ ہے کہ **قداعطیته ماعلیک من القول المیسور** ،یعنی تم اس شخص کو اچھی بات کہہ چکے ہو۔اب مزید اسے ٹال دو اور قرض لے کر دینے کی ضرورت نہیں کیونکہ یہ تکلیف بمالایطاق ہے یہی احتمال محققین شراح پسند کر چکے ہیں۔

بعض لوگوں کا خیال ہے کہ ''**قداعطیته، مرة بعداخری**'' ہونا چاہئے یعنی سائل کو اس سے قبل ہی آپ بار بار کافی مال دے چکے ہیں۔اب قرض لے کر دینا مناسب نہیں بعض لوگوں کا خیال ہے ایک مرتبہ آپ ﷺ نے نوے ہزار درہم تقسیم کر دیئے اس کے بعد ایک شخص آیا اور مدد مانگی تو آپ ﷺ نے فرمایا کہ میرے نام خرید کر مطلوب چیز لے لو تو گویا اس شخص کو پہلے بھی مال سے حصہ مل چکا تھا مزید مانگنے پر آپ ﷺ نے یہ پیشکش کر دی۔

بعض شراح نے لکھا ہے کہ تقدیر یوں ہوگی کہ ''**قداعطیته سواله وجعلته دیناً فی ذمتک فلاتفعل غیر ذلک**'' یعنی اس شخص کے مطلوب کی قیمت اپنے ذمے لے کر آپ ﷺ نے اس شخص کا مطلوب تو اس کو دے دیا۔اب اس سے آگے بڑھ کر مزید سخاوت نہ کرنا کہ یہ آپ ﷺ کی وسعت سے باہر ہے۔لیکن اس موخر الذکر توجیہ کو اکثر شراح نے رد کیا ہے۔

<u>انفاق میں احتیاط کی ناپسندیدگی:</u> **فکره النبیّ ﷺ قول عمرؓ**،حضرت عمرؓ کی بات بری لگنے کا سبب یہی تھا کہ یہ کمال سخاوت کا تقاضا نہیں تھا اگرچہ شریعت سے مخالف نہ تھا مگر آپ ﷺ کی فطرت میں جو سخاوت کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی اس کا مقتضیٰ کچھ اور تھا جو کہ انصاری صحابی نے بیان کیا۔**ولاتخف من**

ذی العرش اقلالاً، اقلال قلت سے افعال ہے کم ہونے کو کہتے ہیں۔ جملے کا مطلب یہ ہے کہ جو بے انتہا سخاوت آپ ﷺ کو عطا کی گئی ہے اس کے تقاضے کے مطابق بے خطر مال صرف کرتے رہتے اور اسی صفت پر ثابت قدم رہتے۔ حضرت عمرؓ نے اگر چہ بطور خیر خواہی کے مشورہ شریعت کے مطابق دیا ہے مگر اس کی بنیاد بظاہر عرش کے مالک کی طرف سے کم ملنے کے خطرہ پر ہے جو متوکلین اور بالخصوص انبیاء اور پھر سیدالانبیاء ﷺ کے شایان شان نہیں ہے۔ بھٰذا امرت، ہٰذا میں اشارہ انفاق وتوکل کو ہے یا پھر قول میسور عند فقدان المال کو ہے۔

(۱۴) حدّثنا علیّ بن حجر ثنا شریک عن عبداللّٰہ بن محمّد ابن عقیل عن الربیع بنت معوّذ بن عفراء قالت اتیت النبیّ ﷺ بقناع من رطب و اجروزغب فاعطانی ملأکفّه حلیًا و ذهباً(۱).

ترجمہ: ربیّع بنت معوذؓ کہتی ہیں کہ میں نبی کریم ﷺ کے پاس ایک چھنگیر میں کھجور اور پتلی پتلی ککڑی لائی تو آپ ﷺ نے مجھے مٹھی مبارک بھر کر زیور اور سونا عطا فرمایا۔

یہ حدیث باب نمبر ۲۹ باب فاکھة رسول اللہ ﷺ میں چوتھی اور پانچویں حدیث ہے وہاں تفصیل کے ساتھ ذکر ہے کہ معاذ بن عفراءؓ نے یہ ہدیہ آپ کے پاس بھیجا تھا اور آپ ﷺ نے بحرین سے آئے ہوئے مال سے حضرت ربیعؓ کو زیور بخشا تھا۔

(۱۵) حدّثنا علیّ بن خشرم وغیرواحد قالوا انا عیسیٰ بن یونس عن هشام بن عروة عن أبیه عن عائشة أنّ النبیّ ﷺ کان یقبل الهدیّة ویثیب علیها(۲).

---

(۱) مسند احمد ۶/ ۳۵۹

(۲) صحیح بخاری باب المکافأة الخ ۱/ ۳۵۶ کتاب الهبة باب مکافاة فی الهبة، سنن ابی داؤد ۲/ ۱۴۲ کتاب الاجارة باب فی قبول الهدایا، جامع ترمذی ۲/ ۱۴۲ کتاب البر والصلة باب ما جاء فی قبول الهدیة ص ۴۵۹، مصنف ابن ابی شیبة ۶/ ۵۵۱ (مختار)

ترجمہ: حضرت عائشہؓ کہتی ہیں کہ نبی کریم ﷺ ہدیہ قبول فرماتے تھے اور اس کا بدلہ بھی دیتے تھے۔

ویثیب علیھا ، جہاں تک ہدیہ کے قبول کرنے کا مسئلہ ہے تو وہ تو مکارم اخلاق میں سے ہے کیونکہ اس سے ہدیہ دینے والے کی دلداری ہوتی ہے۔اور اس کا بدلہ مطلقاً واجب تو نہیں لیکن آپ ﷺ اس کا بدلہ دیتے تھے جو کم از کم ہدیہ کے برابر ہوتا تھا بلکہ کبھی کبھی تو دس گنا تک بدلہ بڑھ جاتا تھا۔

کیاہدیہ کابدلہ واجب ہے؟ یہاں پر یہ مسئلہ قابل تحقیق ہے کہ کیا ہدیہ کا بدلہ واجب ہے یا نہیں۔ملاعلی قاریؒ نے یہ تحقیق کی ہے کہ اگر کوئی شخص طیب خاطر کے ساتھ ہدیہ دے تب تو قبول کرنا چاہیے اور بدلہ بھی واجب نہیں ہے اور اگر کوئی شخص ہدیہ دیکر کوئی کام نکالنا چاہے یا شرم ورواج کی وجہ سے ہدیہ دے مثلاً کبھی حاجی لوگ مبارکباد کیلئے آنے والوں میں بادل ناخواستہ ہدایا تقسیم کرتے رہتے ہیں یا کسی اور مجبوری سے ہدیہ دینا چاہے تو اس صورت میں ہدیہ لینا جائز نہیں اور اگر وہ بھی شرم کی وجہ سے قبول کرے تو اس کا بدلہ اس پر واجب ہے کم از کم ہدیہ کے قیمت کے مساوی بدلہ دے۔

صورت اول میں اگر چہ بدلہ واجب نہیں لیکن اگر ہدیہ قبول کرنے والا ایسے انداز سے ہدیہ دینے والے کا بدلہ چکائے کہ اسے بدلہ کا احساس نہ ہو بلکہ اسے محبت پر حمل کردے تو یہ بہتر ہے کیونکہ اس سے محبت میں مزید اضافہ ہوجاتا ہے۔

خلاصۂ باب

اخلاق نبوی ﷺ کے بارے میں ابتدائے باب میں ہم تحریر کرچکے ہیں کہ ان کا احاطہ ناممکن ہے۔خود جمال نبوی ﷺ کا مشاہدہ کرنے والے صحابہ اس کے بیان سے عاجزی کا اظہار کرتے ہیں۔البتہ اس باب میں جو چیدہ چیدہ باتیں بظاہر نظر آتی ہیں ان کا خلاصہ یہ ہے کہ آپ ﷺ کا اپنے صحابہ کرامؓ سے

رویہ انتہائی شفیقانہ تھا خدام کے ساتھ حد درجہ کی نرمی اور خدمت میں سستی اور کوتاہی کے باوجود آپ ﷺ ان کی ڈانٹ ڈپٹ نہیں فرماتے تھے۔ عمر بھر کسی خادم یا بیوی کو مارا نہیں۔ فحش گوئی گالم گلوچ تو کجا بے وقار بات سے بھی اجتناب فرماتے تھے۔ بازار کے اندر آپ ﷺ زور سے بولتے نہ تھے۔ عفوودرگزر کی یہ حالت تھی کہ کبھی کسی سے ذات کیلئے انتقام نہیں لیا۔ غزوات کے سوا کسی کو تھپڑ تک نہیں مارا۔ البتہ خداوند کریم یا انسانوں کی حق تلفی پر غصہ فرماتے تھے۔ بدزبان اور بداخلاق لوگوں کے ساتھ بھی مدارات کے طور پر حسن اخلاق سے پیش آتے تھے تاکہ ان کو اپنی کمی کا احساس ہو حتیٰ کہ بدترین شخص کے ساتھ ایسا رویہ ہوتا تھا کہ وہ خودکو بہترین سمجھنے لگتا تھا۔ صحابہ کی دلداری کی خاطر آپ ﷺ ان کی گپ شپ میں شریک رہتے تھے۔ ان کے ساتھ ہنستے، تعجب فرماتے، ساتھ ساتھ ان کی تربیت فرماتے، ان کے جائز مرغوبات سے نفرت کا اظہار نہیں کرتے تھے۔ نہ اپنی پسند کو کسی پر مسلط فرماتے تھے۔

کلام میں شیرینی تھی حتیٰ کہ صحابہ کرام بے چینی اور شوق سے سنتے تھے۔ شرکائے مجلس کی پسند کا لحاظ فرماتے۔ ان کی توقعات کے مطابق بولتے۔ بدوی لوگوں کے سخت رویئے کے مقابلے میں تحمل وبرداشت سے کام لیتے تھے۔ خندہ پیشانی اور نرمی عموماً غالب رہتی تھی۔ تکبّر، لایعنی باتوں، عیب جوئی، عیب چینی اور مذمت سے کوسوں دور تھے۔ سخاوت کوٹ کوٹ کر بھری تھی کسی بھی سائل کیلئے آپ ﷺ کے پاس ''نہیں'' کا لفظ نہیں تھا۔ سخاوت پسند کرنے والوں کو پسند فرماتے اور اس سلسلے میں احتیاط کی تلقین ناقابل قبول سمجھتے تھے۔ عمومی طور پر نفع رسانی میں پیش پیش اور ضرورتمندوں کی حاجت روائی میں خصوصی طور پر انتہائی حساس تھے۔ حتیٰ کہ دوسروں کو بھی اس کا حکم فرماتے تھے۔ کمال توکل کی پاسداری فرماتے تھے اور فقر کو ترجیح دیتے ہوئے آئندہ کیلئے نفقہ تک ذخیرہ کرنے سے کتراتے تھے۔ جو ہدایا پیش ہوتے دینے والوں کی دلداری کیلئے قبول فرمالیتے مگر اس سے کئی گنا زیادہ بخش دیتے تھے۔ اور بایں ہمہ اپنی تعریف ناپسند تھی بلکہ اس میں مبالغہ آرائی کرنے والوں کو منع فرماتے تھے۔

۴۹. باب ماجاء فی حیاء رسول اللہ ﷺ

رسول اللہ ﷺ کے حیاء کے بیان میں

حیاء کا لغوی اور اصطلاحی معنی: حیاء الف ممدودہ کے ساتھ ہے۔اس کا لغوی معنی ہے "تغیر وانکسار یعتری الانسان من خوف مایعاب بہ "یعنی حیاء وہ تغیر اور دلشکنی ہے جو ملامت اور عیب چینی کے خوف سے لاحق ہو۔یہ انسانی فطرت کا حصہ ہے اور عموماً غیر اختیاری ہوتا ہے لیکن یہاں پر یہ معنی مراد نہیں ہے کیونکہ نبی اکرم ﷺ کی تعلیمات کے مطابق حیاء اخلاق حسنہ کے قبیلے سے ایک اختیاری فعل ہے۔شریعت میں اس کی تعریف یوں کرتے ہیں "الحیاء ھو خلق یبعث علیٰ اجتناب القبیح ویمنع من التقصیر فی حق ذوی الحق (۱) "یعنی حیاء وہ خلق ہے جو قبیح کام کے ارتکاب سے اور صاحب حق کے حق کی ادائیگی میں کوتاہی سے بچائے اخلاق میں اس کا مرتبہ بہت اہم ہے۔نبی اکرم ﷺ فرماتے ہیں الحیاء من الایمان (۲)،ایک حدیث میں ہے الحیاء خیر کلّہ (۳)،ایک اور روایت میں ہے الحیاء لایاتی إلاّبخیر (۴)،اسی اہمیت کی وجہ سے اس کیلئے مستقل باب کا انعقاد کیا گیا ہے۔اس باب میں دو حدیثوں کا ذکر ہے۔

(۱) حدّثنا محمود بن غیلان ثنا أبو داؤد ثنا شعبة عن قتادة قال سمعت عبداللّٰہ ابن أبی عتبة یحدّث عن أبی سعید الخدریّ قال کان رسول اللّٰہ ﷺ أشدّ حیاء من العذراء فی خدرھا وکان اذاکرہ شیئاعرفناہ فی وجھہ(۵).

ترجمہ: حضرت ابوسعید خدریؓ سے روایت ہے کہ نبی اکرم ﷺ پردہ میں بیٹھی ہوئی

---

(۱)علامہ بیجوریؒ حیاء کی شرعی تعریف کرتے ہوئے لکھتے ہیں ھو خلق یبعث علی تجنب القبیح ویحض علی ارتکاب الحسن ومجانبة التقصیر فی حق ذی الحق(المواھب الدنیة ص)(مختار)

(۲)صحیح بخاری

(۳)صحیح مسلم

(۴)صحیح بخاری (۵)صحیح بخاری ۱/۵۰۳ کتاب المناقب باب صفة النبی ﷺ،سنن ابن ماجة ص۳۰۸ کتاب الزھدباب الحیاء، مصنف ابن ابی شیبة۸/۳۳۵،مسنداحمد۳/۷۱(مختار)

کنواری لڑکی سے بھی بڑھ کر حیاء کرنے والے تھے۔آپ ﷺ کسی بات کو ناپسند فرماتے تو ہم آپ ﷺ کے چہرۂ انور سے آپ ﷺ کی ناگواری محسوس کر لیتے تھے۔

حیاءاور پردہ فطری عمل ہے: من العذراء فی خدرها، خدر اس پردے کو کہتے ہیں جو کنواری لڑکیوں کو اجنبیوں کے ساتھ اختلاط سے بچانے کیلئے بنایا جاتا تھا۔عرب کے معاشرے میں مردوزن کا اختلاط عام تھا لیکن بعض معزز کنواری لڑکیوں کو پھر بھی ایک پردہ لگا کر اجنبی مردوں بلکہ بعض اوقات اجنبی عورتوں سے بھی پردہ کرایا جاتا تھا۔ظاہر ہے کہ عورت جو طبعی طور پر باحیا ہوتی ہے جب اختلاط سے بھی محفوظ ہو تو اور بھی زیادہ حیادار ہوتی ہے مگر نبی اکرم ﷺ کی حیا اس سے بھی بڑھ کر تھی حتیٰ کہ بعض روایات میں ہے کہ آپ ﷺ شدت حیاء کی وجہ سے کسی کے چہرہ پر نظر ثبت نہیں فرماتے تھے۔

بعض شراح نے ''العذراء فی خدرها'' کا ترجمہ نئی نئی بیاہی ہوئی عورت سے کیا ہے جو شب زفاف کو پردے میں تنہا کر دی گئی ہو لیکن ملاعلی قاریؒ نے اس احتمال کو ضعیف قرار دیا ہے۔

عرفناه فی وجهه ،یعنی آپ ﷺ کسی ناپسندیدہ بات پر ناپسندیدگی بوجہ شدت حیاء کے زبان سے ظاہر نہیں فرماتے تھے بلکہ رخ انور پر تغیر سے ہمیں پتہ چل جاتا تھا کہ یہ چیز ناگوار خاطر ہے۔جس طرح شمس وقمر کے سامنے غبار آجاتا ہے اور روشنی مدھم پڑجاتی ہے یونہی چہرے کے نور میں تغیر آجاتا تھا۔اسی طرح کنواری لڑکی بھی اپنی پسند ناپسند کا اظہار نہیں کرتی۔زیادہ سے زیادہ قرائن سے کام لیا جاتا ہے۔ شریعت نے بھی اس کے سکوت کو رضا ٹھہرایا ہے کیونکہ وہ بعض امور میں بصراحت بولنے سے شرماتی ہے۔

(۲) حدثنا محمود بن غیلان ثنا وکیع انا سفیان عن منصور عن موسیٰ بن عبداللّٰہ بن یزید الخطمیّ عن مولیً لعائشة قال قالت عائشة مانظرت إلٰی فرج رسول اللّٰہ ﷺ اوقالت مارأیت فرج رسول اللّٰہ ﷺ قطّ(۱).

---

(۱)سنن ابن ماجة ص۴۸ کتاب الطهارة ابواب التیمم باب نهی ان یریٰ عورت اخیه، مصنف ابن ابی شیبة ۱/۱۰۶ کتاب الطهارة، مسند احمد ۶/۶۳،السنن الکبریٰ ۷/۹۴ کتاب النکاح باب ماتبدی المرأة من زینتها للمذکورین فی الایة(مختار)

ترجمہ: حضرت عائشہؓ کہتی ہیں کہ نبی اکرم ﷺ (کی حیاء کی وجہ سے) میں نے کبھی بھی ان کی شرمگاہ نہیں دیکھی۔

<u>نبی کریم ﷺ حیاء کے پیکر تھے:</u> **ماانظرت إلیٰ فرج الخ** (۱)، حضرت عائشہؓ کا مقصد یہ ہے کہ نبی اکرم ﷺ **کامل الحیاء** تھے اور تستّر میں اتنا مبالغہ فرماتے تھے کہ ہمیں کبھی بھی آپ ﷺ کے شرمگاہ کی طرف نظر اٹھانے کی ہمت نہیں ہوئی۔ ظاہر ہے کہ باحیاء آدمی کے سامنے دوسرے بھی حیاء سے رہتے ہیں اور دوسروں کی بے حیائی سے مصاحبین کو بھی بے حیائی کی جرأت ہوتی ہے۔

یہ بھی واضح بات ہے کہ جب حضرت عائشہؓ کمال محبوبیت اور بے تکلفی کے باوجود آپ ﷺ کی شرمگاہ نہ دیکھ سکیں تو دوسری ازواج مطہرات تو بطریق اولیٰ یہ کام نہ کرسکیں۔ دنیا کا کوئی بھی شخص شاید یہ دعویٰ نہ کرسکے کہ اس کی بیوی اور اس کے درمیان ایسا پردہ رہا ہے۔

اللہ تعالیٰ خود فرماتے ہیں **هنّ لباس لكم و انتم لباس لهنّ**، اور ظاہر ہے کہ لباس میں شدید اتصال ہوتا ہے نہ لباس سے پردہ ممکن ہے اگرچہ وہ ساتر ہے اس کی وجہ سے دوسرے عیوب چھپ

---

(۱) اولیٰ اور بہتر یہ ہے کہ شوہر اپنی بیوی اور بیوی اپنے شوہر کی شرمگاہ کو نہ دیکھے لیکن اگر دیکھنا چاہے تو دیکھ سکتے ہیں اس میں کراہت نہیں۔ **کماقال ابن نجیم وینظر الرجل إلیٰ فرج امته وزوجته یعنی عن شهوة وغیر شهوة قال علیه الصلوٰة والسلام غضّ بصرک إلاّ عن زوجتک وأمتک وماروی عن عائشة قالت کنت اغتسل أنا ورسول الله ﷺ فی إناء واحد ولأنّه یجوزله المس والغشیان فالنظر أولیٰ إلاّ أنّ الاولیٰ أن لاینظر کل منهما إلی عورة صاحبه. لقوله علیه الصلوٰة والسلام إذاأتی احدکم فلیستترمااستطاع ولایتجردان تجرد البعیر لأن النظر إلی العورة یورث النسیان**(البحر الرائق ۸/۳۵۸) صاحب ہدایہ نے حضرت عبداللہ بن عمرؓ کی طرف اس قول کی نسبت کی ہے کہ آپؓ کے ہاں میاں بیوی کا ایک دوسرے کی شرمگاہ دیکھنا بہتر ہے۔ مگر علامہ شامیؒ نے علامہ بدرالدین عینیؒ کے حوالہ سے اس نسبت کی تردید فرمائی ہے۔ **وکان ابن عمرؓ یقول الأولیٰ أن ینظر لیکون أبلغ فی تحصیل معنی اللذة لکن فی شرح الهدایة للعینی أنّ هذالم یثبت عن ابن عمر لابسند صحیح ولابسند ضعیف**(ردالمحتار ۶/۳۶۷) البتہ امام ابویوسفؒ سے مروی ہے کہ **سألت أباحنیفة عن الرجل یمسّ فرج أمرأته وهی تمسّ فرجه لیتحرک علیهاهل تریٰ بأساً قال لاوأرجوان یعظم الأجر**(ردالمحتار ۶/۳۶۷) خلاصہ یہ ہے کہ نہ دیکھنا بہتر ہے۔ (مختار)

جاتے ہیں بالکل اسی طرح شادی سے بھی عیوب چھپ جاتے ہیں لیکن بیوی سے پردہ نہیں رہتا بایں ہمہ نبی کریم ﷺ کا حیاء میں وہ مقام ہے کہ حضرت عائشہؓ اس قسم کا دعویٰ کرتی ہیں۔

آج کل کی طرح اس زمانہ میں روشنیاں اور بجلی نہیں تھی اندھیرا بھی ہوتا تھا آج تو برسرعام بلکہ سینماؤں اور ٹیلی وژن پر بہت فحش قسم کے کام کئے جاتے ہیں اور نبی کریم ﷺ کا وہ قول صادق ہوتا جاتا ہے جس میں آپ ﷺ نے فرمایا کہ تم یہود ونصاریٰ کا اتباع کروگے حتیٰ کہ ان کی طرح سڑکوں کے کنارے پر ایک دوسرے سے ملوگے پھر جب بیویوں میں یہ حالت ہے تو دوسرے لوگوں سے اپنی پردہ پوشی کا اندازہ بخوبی لگایا جاسکتا ہے۔ بخاری شریف میں اس کی تصریح ہے کہ سوائے ایک موقع کے آپ ﷺ کا پردہ کبھی نہیں دیکھا گیا۔ ہوا یوں کہ جب آپ ﷺ کی نوجوانی میں خانہ کعبہ کی تعمیر ہورہی تھی تو آپ ﷺ بھی دوسرے لوگوں کی طرح پتھر اٹھا کرلایا کرتے تھے۔ ایک ہی دھوتی بندھے ہوئے تھے اور کوئی کپڑا بدن پر نہ تھا۔ حضرت عباسؓ ساتھ تھے انہوں نے کہا کہ آپ ﷺ دھوتی کھول کر کندھوں پر ڈالیں تاکہ بھاری پتھر اٹھانے سے اذیت نہ ہو چونکہ عرفاً عرب میں مردوں کیلئے برہنگی کوئی معیوب بات نہ تھی۔ لہٰذا آپ ﷺ نے بھی دھوتی کھول دی۔ معاً آپ ﷺ بے ہوش ہوکر گر پڑے۔ چچا نے پردہ چھپایا۔ راوی کہتے ہیں کہ "**فما رأی بعد ذلک عریاناً** (۱)" اس کے بعد آپ ﷺ کبھی بھی برہنہ نہیں دیکھے گئے۔ اسی طرح دوسروں کے پردوں پر نظر سے بھی مکمل اجتناب کرتے تھے۔ حضرت عائشہؓ ہی کی روایت ہے کہ "**ما رایت منہ ولا رأی منی**" نہ میں نے آپ ﷺ کا پردہ دیکھا نہ انہوں نے میرا پردہ دیکھا اور ظاہر ہے کہ دوسروں کا پردہ تو بطریق اولیٰ آپ ﷺ نے نہیں دیکھا۔

---

(۱) بخاری ج ۱ ص ۵۲

(۲) مناوی ج ۲ ص ۲۱۸

خلاصہ باب

اس باب میں نبی اکرم ﷺ کی حیاء کا ذکر ہے کہ آپ ﷺ میں یہ صفت بدرجہ اتم موجود تھی۔اس سلسلے میں آپ ﷺ سے قولی احادیث بھی مروی ہیں اور فعلی بھی یہاں امام ترمذی بطور نمونہ دوحدیث لائے ہیں۔

نوجوانی میں صرف ایک مرتبہ آپ ﷺ برہنہ ہوکر بے ہوش ہوئے تھے اس کے بعد کبھی بھی برہنہ نہیں ہوئے بلکہ حضرت ابن عباسؓ کہتے ہیں کہ **فکان اوّل شیئ رأیٰ من النبوۃ ان قیل لہ "استتر" فما رأیت عورتہ من یومئذ**، یعنی احکام سماویہ میں سب سے پہلا حکم (قبل نبوت) آپ ﷺ کو یہی ملا تھا کہ "پردہ چھپاؤ" اور اسی روز سے آپ ﷺ کا پردہ کبھی نہیں دیکھا گیا۔

بہرحال اس بات میں نبی اکرم ﷺ کے اخلاق عالیہ کا ایک گوشۂ زریں نمایاں کیا گیا ہے۔

۵۰. باب ماجاء فی حجامة رسول اللہ ﷺ

حضور اقدس ﷺ کے پچھنے لگوانے کا بیان

<u>علاج توکل کے خلاف نہیں:</u> حجم اور احتجام پچھنے اور سینگ لگوانے کو کہتے ہیں اس کا اصل معنی مص یعنی چوسنا ہے۔حجامۃ اسی حجم سے اسم ہے یہ نبی کریم ﷺ کے علاج کے طریقوں میں ایک طریقہ تھا۔شمائل میں اس باب کے لانے کیلئے علامہ مناویؒ نے یہ لکھا ہے کہ چونکہ کمال توکل نبی اکرم ﷺ کے اخلاق عالیہ کا حصہ تھا جبکہ توکل کا تقاضا ہے کہ اللہ تعالیٰ پر اعتماد کرتے ہوئے علاج اور دم تعویذ وغیرہ سے پرہیز کیا جائے تو امام ترمذیؒ نے اس توہم کو دفع کرتے ہوئے یہ باب منعقد کیا تاکہ تنبیہ کردیں کہ حجامت بلکہ کوئی بھی علاج خلاف توکل نہیں اور نہ کمال توکل کے منافی ہے۔اس باب میں مصنفؒ نے چھ حدیثیں بیان کی ہیں جن میں نبی اکرم ﷺ کے معمول کا بیان ہے۔

<u>حجامت مجرب طریقہ علاج:</u> خون کی صفائی کیلئے اور اس کے جوش اور دباؤ کو کم کرنے کیلئے زمانہ قدیم سے خون کا کوئی حصہ نکالنا بطور علاج رائج تھا۔اس نوعیت کا علاج کئی مقامات پر جھونکیں لگوانے سے بھی زمانہ قریب تک رائج رہا اس پر یہ شبہ نہ کیا جائے کہ خون نکالنے سے علاج کیسے ہوسکتا ہے؟ اس لئے کہ آج کل طب جدید میں بھی خون کی بیماریوں میں ڈاکٹر اور حکیم حضرات اسی نوعیت کے علاج تجویز کرتے ہیں۔

لہٰذا خون کی کمزوری، بلڈ پریشر اور جوش کو اگر حجامت کے ذریعے ختم کیا جائے تو کیا حرج ہے خون اگر سخت اور گاڑھا ہو یا اس میں چربی کے ذرات شامل ہوں اور یہ شریانوں میں بسہولت جاری نہ ہو تو آج کل بھی ڈاکٹر لوگ دواؤں اور اخراج خون کے ذریعے خون کو نرم کرواتے ہیں جس سے خون شریانوں میں تیزی کے ساتھ دوڑنے لگتا ہے غیر ترقی یافتہ دور میں اسی وجہ سے احتجام کو مقبول طریقہ علاج تصور کیا جاتا تھا۔ابن سینا اور دوسرے مسلم وغیر مسلم اطباء نے اس طریقہ کی تحسین وتائید کی ہے اور ثابت کیا ہے کہ یہ بھی علاج کے طریقوں میں سے بہترین طریقہ ہے۔آج بھی سعودی عرب مدینہ منورہ وغیرہ میں یہ طریقہ علاج بہت اہتمام سے جاری ہے اور اس کے بڑے ماہرین سے عرب پچھنے لگواتے ہیں۔

(۱) حدّثنا علیّ بن حجر ثنا إسماعیل بن جعفر عن حمید قال سئل أنس بن مالک عن کسب الحجام فقال أنس احتجم رسول اللّٰہﷺ حجمه ابوطیبة فامر له بصاعین من طعام و کلّم اهله فوضعوا عنه من خراجه وقال إنّ افضل ما تداویتم به الحجامة و إنّ من أمثل دوائکم الحجامة(۱).

ترجمہ: حضرت انسؓ سے حجام کی کمائی کے جواز اور عدم جواز کے متعلق پوچھا گیا تو انہوں نے کہا کہ نبی کریمﷺ نے خود پچھنے لگوائے تھے ابوطیبہ نامی ایک غلام نے آپﷺ کو پچھنے لگائے تھے آپﷺ نے اس غلام کو دو صاع کھانا (کھجور) بخشنے کا حکم دیا اور اس کے آقاؤں سے بات کر کے اس کے اوپر خراج (ٹیکس) میں کمی کرادی۔ نیز فرمایا کہ تمہارے علاجوں میں سے بہترین علاج حجامت ہی ہے یا یہ فرمایا کہ حجامت تمہارے بہترین دواؤں میں سے ہے۔

حجامت پر اجرت: کسب الحجام الخ ،حجام یعنی پچھنے لگانے والے کی کمائی کے بارے میں حضرت انسؓ سے دریافت کیا گیا حجام سے ہمارے ہاں کا متعارف حجام یعنی نائی مراد نہیں یہ شاید اس لئے مشہور ہوا ہو کہ اکثر اوقات نائی ہی پچھنے لگایا کرتے تھے نیز پچھنے لگانے سے قبل حجام سر مونڈتے تھے یا پچھنے لگانے کے جگہ سے بال مونڈتے تھے۔اس لئے سر مونڈنے والوں کو بھی حجام کہا جانے لگا ویسے عربی زبان میں آج کل نائی کو حلاّق کہتے ہیں۔

یہاں سائل نے حجام کی کمائی کے بارے میں پوچھا کہ کیسی ہے اس سوال کا منشاء یہ ہے کہ حجام کا کام چونکہ بظاہر گندہ ہے لہذا سائل کو شبہ ہو گیا ہو گا کہ اس کی کمائی بھی درست نہ ہو گی یا پھر یہ سوال اس لئے

---

(۱)صحیح بخاری ۲۸۳/۱ باب ذکر الحجامة کتاب البیوع، جامع ترمذی ۱۵۳/۱ ابواب البیوع باب ماجاء فی الرخصه فی کسب الحجام سنن ابی داؤد ۱۲۸/۲ کتاب الاجارات باب فی کسب الحجام، مسنداحمد۱۰۰/۳، مصنف ابن ابی شیبة۲۶۵/۶،السنن الکبریٰ للبیهقی ۳۳۷/۹، مؤطاامام مالک(مختار)

کیا کہ نبی کریمﷺ نے ایک حدیث میں فرمایا ہے کہ "کسب الحجام خبیث" یعنی حجام کی کمائی خبیث ہے۔

احتجم رسول اللهﷺ الخ ،حضرت انسؓ نے جواب دیا کہ یہ کمائی حلال ہے کیونکہ ابوطیبہ نامی حجام نے نبی کریمﷺ کو پچھنے لگائے تھے اور خود آپﷺ نے اسے اجرت میں دوصاع طعام کے دیئے تھے۔ چنانچہ یہ جائز ہے۔ اب بظاہر جو دونوں حدیثوں میں تعارض معلوم ہورہا ہے تو اس کی تطبیق یوں ہوگی کہ محل جواز وہ ہے جہاں اجرت اور عمل دونوں معلوم ہوں اور محلّ زجر وہ ہے جہاں اجرت مجہول ہو کہ حجام کو کتنا ملے گا یا عمل مجہول ہو یعنی یہ پتہ نہ ہو کہ کتنے پچھنے لگیں گے۔ امام طحاویؒ نے یہ بھی لکھا ہے کہ ابتداء میں حجام کی اجرت ناجائز تھی بعد میں اباحت کا حکم نازل ہوا تھا جبکہ امام احمدؒ تطبیق میں فرماتے ہیں کہ یہ فرق حر اور عبد میں ہے یعنی حر کیلئے تو یہ پیشہ اختیار کرنا جائز نہیں اور نہ اسے کمائی لینا جائز ہے الا یہ کہ وہ اس کمائی کو غلاموں اور چوپایوں پر خرچ کرے تو درست ہے جبکہ غلاموں کیلئے یہ عمل اور کمائی مطلقاً جائز ہے اور اس کی کمائی سے کھانا بھی درست ہے لیکن اکثر روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ نہی تنزیہی ہے اور یہ عمل اور اس کی اجرت لینا ہر کسی کیلئے جائز ہے کسی کیلئے مضائقہ نہیں اور یہی باقی ائمہ کا مسلک بھی ہے کیونکہ اگر حرام ہوتو پھر حر وعبد میں فرق نہیں ہونا چاہیئے اور حلال ہوتو بھی دونوں کیلئے حلال ہوگا۔ اسلام نے عبد کو انسانیت اور تکلیف کے دائرے سے کب نکالا ہے حتیٰ کہ اسے حیوانات سے ملا کر اس کے اور آزاد آدمی کے درمیان احکام میں فرق کیا ہو۔ اسلام حتی الوسع اسے انسانیت کے تمام تقاضوں میں آزاد کے برابر شمار کرتا ہے بلکہ اسلام انسان کی غلامی کا روادار ہی نہ تھا لیکن دوسری طرف دوسرے انسان کے حقوق مالیہ کا لحاظ کرکے مجبوراً باقی رکھنا پڑا۔ یہی وجہ ہے کہ اسلام نے غلامی کو محدود کردیا غلام کو پستی سے نکال کر معاشرے میں قابل لحاظ رعایتیں دینے کے ساتھ ساتھ اس کی آزادی کے مختلف راستوں کی ترغیب دلائی۔ بہرحال غلام اور آزاد میں فرق کی بات غیر معقول نظر آتی ہے۔ لہٰذا اصل جواب یہی ہونا چاہیئے کہ نہی تنزیہی ہو اور ایک نجس چیز (خون) کے ساتھ تلبس کی وجہ سے محض احتیاطاً نبی کریمﷺ نے **کسب الحجام خبیث** کا حکم لگایا ہو اور اس میں راز کی بات یہ ہے کہ بعض اوقات حجام خون کو منہ سے چوستا ہے جس سے خون کے نگلنے کی نوبت آسکتی ہے۔ آج کل بھی خون ٹیسٹ کرنے کی لیبارٹری میں سرنج پر منہ لگا کر خون کھینچتے ہیں۔ اسی طرح

اس کے جسم اور لباس کو ویسے بھی خون عموماً لگ جاتا ہے جو شرعاً اور طبعاً ایک قبیح امر ہے لیکن کثرت ملابست کی وجہ سے حجام کی طبعی نفرت جاتی رہتی ہے اس لئے شرعاً قباحت کی بقاء اور اظہار کیلئے آپﷺ نے اس فعل کی تقبیح کی۔ رہی جواز کی بات تو اس سلسلے میں خود آپﷺ سے عملاً حجامت کروانا بھی ثابت ہے اور اجرت دینا بھی۔ مذکورہ حدیث بھی اسی کی شہادت دیتی ہے بعض حضرات نے یہ تطبیق بھی کی ہے کہ حجامت کا عمل اور اس کی اجرت لینا تو جائز امر ہے لیکن اسے بطور کاروبار اپنانا اور پیشہ بنانا مکروہ ہے اور نہی کی حدیث کا محمل بھی وہی ہے جبکہ بعض حضرات نے نہی کی وجہ یہ بتائی ہے کہ چونکہ بیمار شخص کی حجامت کرنے پر مجبور ہو جاتا ہے اس کی مجبوری سے فائدہ اٹھانے کے بجائے اس سے ہمدردی کر کے مفت میں علاج کرنا چاہئے نہ یہ کہ ایسی حالت میں اس سے پیسے کمائے جائیں۔

و کلّم اھلہ، ابوطیبہ یا تو ماذون غلام تھا اس کا مالک حضرت محیصہ بن مسعود انصاریؓ تھا۔ یا بنی حارثہ میں سے کسی اور کا غلام تھا جو اس سے تین صاع ٹیکس لیتا تھا۔ آپﷺ نے اس کی سفارش کی اور اس کیلئے مالکوں سے ایک صاع کی رعایت حاصل کی۔ اس کے نام میں متعدد اقوال منقول ہیں۔ بعض نے نافع بعض نے میسرہ اور بعض نے دینار لکھا ہے لیکن ملا علی قاریؒ نے موخر الذکر دو ناموں کو درست قرار نہیں دیا الغرض اس کے اہل یعنی مالکوں سے بنی حارثہ اور بالخصوص محیصہ بن مسعود انصاریؓ مراد ہیں۔

او ان من امثل دوائکم الحجامة، او، یہاں شک کیلئے ہے راوی کو الفاظ کی تعیین میں شک ہے نبی اکرمﷺ نے حجامت کی تحسین فرمائی ہے جو ایک مفید طریقہ علاج ہے بالخصوص عرب کے گرم علاقے میں اس کی افادیت مسلم ہے کیونکہ وہاں حرارت کی شدت کی وجہ سے خون کی کثافتیں بدن کی ظاہری حصہ میں جمع ہو جاتی ہیں جس کی وجہ سے مختلف قسم کی بیماریاں پیدا ہوتی ہیں۔ حجامت سے یہ کثافتیں خارج ہو جاتی ہیں۔ ابن سینا حکیم کا قول ہے

ومن تکن عادته الفصادة فلایکن قطع تلک العادة

ترجمہ: جس کو رگ مارنے کی عادت ہو اس کیلئے یہ عادت چھوڑنا نہیں چاہئے۔

ایک اور جگہ کہتے ہیں

ووفّر علی الجسم الدمأ فانّه لصحة جسم من احل الدعائم

ترجمہ: جسم سے خون کثرت سے بہاؤ کہ یہ جسمانی صحت کیلئے بڑا ستون ہے۔

البتہ بڑے بوڑھوں کو اس عمل سے پرہیز کرنا چاہئے کیونکہ ان کے جسم میں تولید خون کا نظام کمزور پڑ جاتا ہے جس کی وجہ سے وہ حجامت کو برداشت نہیں کر سکتے اسی طرح روزہ دار کو بھی اگر کمزوری یا نقصان کا خوف ہو تو پچھنے لگوانے سے پرہیز کرنا چاہئے۔

(۲) حدّثنا عمرو بن علیٌّ ثنا ابو داؤد ثنا ورقاء بن عمر عن عبد الأعلیٰ عن أبی جمیلة عن علیّ أنّ النبیّﷺ احتجم و أمرنی فاعطیت الحجام اجره(۱).

ترجمہ: حضرت علیؓ کہتے ہیں کہ نبی اکرمﷺ نے پچھنے لگوائے اور مجھے اجرت دینے کا حکم دیا پس میں نے حجام کو اس کی اجرت ادا کی۔

و أمرنی اس حدیث سے بھی حجامت کا جواز اور حجام کو اجرت دینے کا جواز ثابت ہو رہا ہے۔

(۳) حدّثنا هارون بن إسحاق الهمدانیّ ثنا عبدة عن سفیان الثوریّ عن جابر عن الشعبیّ عن ابن عبّاس أظنّه قال أنّ النبیّﷺ احتجم فی الاخدعین وبین الکتفین واعطیٰ الحجّام اجره ولو کان حراما لم یعطه(۲).

ترجمہ: حضرت عبداللہ بن عباسؓ کہتے ہیں کہ نبی اکرمﷺ نے گردن کے دونوں جانب اور دونوں کندھوں کے درمیان پچھنے لگوائے اور حجام کو اس کی مزدوری دے دی۔ اگر کسب حجام حرام ہوتا تو آپﷺ اس کو مزدوری نہ دیتے۔

---

(۱) سنن ابن ماجة ص۱۵۶ کتاب التجارات باب کسب الحجام، مسنداحمد ۱/ ۹۰،مصنف ابن ابی شیبة۶/ ۲۶۴ کتاب الاجارات. (مختار)

(۲) صحیح بخاری ۱/ ۳۰۴ کتاب الاجارات باب خراج الحجام، صحیح مسلم ۲/ ۳۰ کتاب البیوع باب حل اجرة الحجامة ، مصنف ابن ابی شیبة۶/ ۲۶۶،سنن ابی داؤد۲/ ۱۳۹ کتاب الاجارات باب کسب الحجام، مسنداحمد ۱/ ۲۱۵(مختار)

علی الاخدَ عین و الکاھل، اخدَعین گردن کے دونوں جانب موجود دو رگوں کا نام ہے جبکہ کاہل کندھوں کے درمیان پیٹھ کے بالائی حصہ کو کہتے ہیں جو ریڑھ کے ہڈی کے اوپر کے چھ مہروں پر مشتمل ہے اور پیٹھ کا تقریباً ایک تہائی حصہ ہے۔

حجامت کئی بیماریوں کا علاج ہے: اہل طب کہتے ہیں کہ اخدَعین یعنی گردن کے دونوں جانب پچھنے لگوانے سے سر، منہ، کان، آنکھ اور دانت کے امراض ختم ہو جاتے ہیں جبکہ کندھوں کے درمیان پیٹھ کے بالائی حصے میں پچھنے لگوانا کندھوں اور حلق کے درد میں مفید ہے۔ اسی طرح بعض دوسرے مخصوص اعضاء پر پچھنے کچھ مخصوص امراض میں فائدہ مند ثابت ہوتے ہیں۔

نبی اکرم ﷺ کو بھی سر درد کا عارضہ بکثرت ہوتا تھا بلکہ مرض وفات میں بھی زیادہ تکلیف سر درد کی ہوتی رہی اور اس کا سبب محققین کے ہاں وہ زہریلا گوشت چکھنا ہے جو سلام بن مشکم یہودی کی بیوی اور مشہور یہودی پہلوان مرحب کی بہن زینب بنت الحارث نے آپ ﷺ کو پیش کر کے کھلایا تھا۔ اس کا اثر تمام سر یا آدھے سر کے درد کی صورت میں اخیر زندگی تک باقی رہا اور ہر سال یہ دورہ آپ ﷺ پر لوٹ کر آتا آپ ﷺ اس کا علاج پیٹھ پر حجامت کے ذریعے کرواتے تھے۔

ولو کان حراماًلم یعطه، یعنی جب کام جائز ہوگا تب اس کی اجرت بھی جائز ہوگی اور کام کے بارے میں تو نبی کریم ﷺ نے امثل وافضل کہا۔ لہٰذا اجرت کیوں حرام ہو۔ علاوہ ازیں نبی کریم ﷺ نے خود اجرت دی ہے تو حرام کیسے ہوگی اس لئے نہی کی احادیث میں تاویل واجب ہوگی۔

یہاں کوئی یہ نہ کہے کہ اس حدیث کی رو سے حجامت ہر بیماری کیلئے علاج ہونا چاہئے اس لئے کہ حجامت ایک علاج ہے اور ہر علاج اور دوا ایک خاص مرض کیلئے ہوتی ہے جو کہ خاص حالات بلکہ خاص موسموں میں خصوصی پرہیزوں کے ساتھ کیا جاتا ہے ورنہ پھر وہی علاج مضر بھی ہوسکتا ہے۔ حجامت بھی ہر مرض کیلئے اور ہر حال میں نہیں کیا جاتا مثلاً اگر کوئی شخص خون کی قلت کا مریض ہے اور اس حدیث کے پیش نظر اس سے مزید خون بھی نکال لیا جائے تو اسے تو موت کے منہ میں پہونچا دیا جائے گا۔ اسی طرح اگر سرد علاقوں میں جہاں بدن میں خون کی کثرت اور گرمی کی ضرورت ہوتی ہے تم احتجام سے کسی مریض کا

علاج کروگے تو اس مریض کی موت کا خطرہ ہے۔اس صورت میں یہ نہیں کہا جائے گا کہ نبی کریم ﷺ کا علاج غلط تھا بلکہ دراصل علاج بے موقعہ و بے محل ہونے کے سبب نقصان دہ ہوگا۔ کیونکہ یہ علاج گرم علاقوں کی گرمی میں خون کی حدت کے دوران کیا جائے تو مفید ہوگا ہر جگہ اور ہر موسم میں نہیں۔جس طرح کہ اکثر علاجوں میں علاقہ، موسم، مرض اور مریض کی حالت کو مدنظر رکھنا لازم ہے۔اسی وجہ سے اطباء جماع کرنے، غسل، زیادہ کھانا کھانے، اور زیادہ بھوک کی حالت میں حجامت کو مضر کہتے ہیں۔

(۴) حدّثنا هارون بن إسحاق ثنا عبدة عن ابن أبی لیلیٰ عن نافع عن ابن عمر أنّ النبیّ ﷺ دعا حجّاما فحجمه وسأله کم خراجک فقال ثلاثة آصعّ فوضع عنه صاعا واعطاه اجره(۱)۔

ترجمہ: حضرت ابن عمرؓ سے روایت ہے کہ نبی اکرم ﷺ نے ایک حجام کو بلایا اس نے آپ ﷺ کو پچھنے لگائے۔آپ ﷺ نے اس سے پوچھا کہ تجھ پر کتنا خراج (ٹیکس) مقرر ہے۔اس نے عرض کیا کہ تین صاع آپ ﷺ نے اس کے مالک سے اس پر ایک صاع ٹیکس کم کروایا اور اسے اجرت بھی دے دی۔

دعا حجاما، یہ غالبًا ابوطیبہ ہی ہیں جن کا ذکر پہلے ہو چکا ہے کہ آپ ﷺ کی سفارش پر اس کے مالکوں نے ٹیکس کم کر دیا تھا۔

فقال ثلاثة آصع، ماذون له، غلاموں کو خدمت سے چھوٹ دیکر کاروبار کی اجازت دے دی جاتی تھی اور عموماً ان پر یومیہ یا ماہوار محصول لگایا جاتا تھا وہ معین محصول آقاؤں کو ادا کرتے تھے اور وہ آزاد لوگوں کی طرح کاروبار کرتے تھے۔یہ غلام بھی اپنے آقاؤں سے تین صاع پر اس قسم کا عقد کر چکا تھا جس میں نبی کریم ﷺ کی سفارش پر ایک صاع کی تخفیف کر دی گئی۔

بعض شراح نے یہاں یہ اشکال کیا ہے کہ صاع کی جمع صیعان یا اصوع تو لغت کی کتابوں میں مذکور ہے لیکن آصع خلاف قیاس ہے پھر اس کا جواب یہ دیا ہے کہ آصع دراصل اصوٗع تھا۔صاد کے بعد کا

(۱)مصنف ابن ابی شیبة ۶/۲۶۶، مسنداحمد ۳/۳۵۳(مختار)

ہمزہ قلب کے قاعدے سے صاد سے پہلے منتقل ہوگیا اور پھر الف سے بدل دیا گیا اس طرح آصع بن گیا۔

(۵) حدّثنا عبدالقدوس بن محمّد العطّار البصریّ ثنا عمرو ابن عاصم ثنا همّام و جرير بن حازم قالا ثنا قتادة عن أنس بن مالک قال کان رسول اللّٰہ ﷺ یحتجم فی الاخدعین و الکاهل و کان یحتجم لسبع عشرة وتسع عشرة واحدی وعشرین(۱).

ترجمہ: حضرت انسؓ سے روایت ہے کہ نبی اکرم ﷺ گردن کے دونوں جانب اور کندھوں کے درمیان پچھنے لگواتے تھے اور(اکثر) سترھویں،انیسویں یا اکیسویں تاریخ کو پچھنے لگواتے تھے۔

<u>علاج کیلئے مناسب وقت ہونا چاہئے:</u> **کان یحتجم لسبع عشرة الخ** ، علاج اور خصوصاً جراحی اور آپریشن کے معاملے میں اب بھی ڈاکٹر موسم کو خاص اہمیت دیتے ہیں۔گرمی اور سردی نیز مریض کی حالت کا لحاظ رکھتے ہیں۔اسی طرح آپ ﷺ بھی حجامت کیلئے وقت کا خیال رکھتے تھے۔ مہینے کی ۱۷،۱۹ اور ۲۱ تاریخوں میں کرتے تھے یہ دراصل چاند کے ایام اور اس کی تاریخوں کا اعتبار تھا چاند بھی مدوجذر اور موسم کی کیفیت پر اثر انداز ہوتا ہے۔اس لئے آپ ﷺ نے بھی ان ایام میں جو اعتدال کے ایام ہیں علاج کروایا۔ابن سینا نے بھی قانون میں اس کی تصریح کی ہے کہ علاج کیلئے صحیح وقت کا انتخاب کرنا چاہئے تو آپ ﷺ کا یہ اہتمام گویا محض ایک رسم اور بدعت کے طور پر نہ تھا بلکہ حِکَم اور مصالح پر مبنی تھا۔اور وہ یہ کہ چاند طلوع ہونے کے بعد دوران خون میں عموماً ہیجان آجاتا ہے ایسی حالت میں حجامة میں ضرورت سے زائد خون بہنے کا خطرہ ہوتا ہے جبکہ مہینے کے آخر میں خون کا دوران مدھم پڑ جاتا ہے۔اس لئے حجامت کے باوجود فاسد مواد کا اخراج نہیں ہوتا۔لہٰذا حجامت کا سب سے بہتر وقت مہینے کا ربع ثالث بتایا گیا ہے پھر ان ایام میں طاق ایام کا انتخاب شاید اس وجہ سے ہو کہ آپ ﷺ جفت کی نسبت طاق اعداد کو ترجیح دیتے

---

(۱)سنن ابی داؤد ۲/۱۳۰ کتاب الاجارات باب کسب الحجام، جامع ترمذی ۲/۲۶۸ کتاب الطب باب ماجاء فی الحجامة،مسنداحمد ۳/۱۱۹ (مختار)

تھےاور فرماتے تھے کہ ''انّ اللّٰہ وترٌ ویحبّ الوتر '' یعنی اللہ تعالیٰ خود بھی وتر ہیں اور وتر اعداد کو پسند کرتا ہے۔

(۲) حدّثنا إسحاق بن منصور انا عبدالرزاق عن معمر عن قتادة عن أنس ابن مالک أنّ رسول اللّٰہ ﷺ احتجم وھو محرم بملَلٍ علی ظھر القدم(۱).

ترجمہ: حضرت انسؓ سے روایت ہے کہ نبی اکرم ﷺ نے ملل کے مقام پر پچھنے لگوائے جبکہ آپ ﷺ محرم تھے۔

بملل، ملل مدینہ سے تقریباً سترہ میل دور مکہ کے راستے میں ایک مقام کا نام ہے جہاں احرام کی حالت میں آپ ﷺ نے پچھنے لگوائے تھے۔

علماء کہتے ہیں کہ حالت احرام میں احتجام جائز ہے لیکن اس کیفیت سے ہو کہ بال نہ کاٹنے پڑیں۔ کیونکہ بال کاٹنے سے احرام ٹوٹنے کا خطرہ ہوتا ہے۔ ویسے علاج تو حالت احرام میں بھی ممکن اور جائز ہے۔ لیکن بالوں کے ساتھ احتیاط ضروری ہے۔ ہاں اگر بال دور کرنا ضروری ہو پھر اسے بھی دور کرنا اضطراراً جائز ہوگا۔ لیکن بال کاٹنے کی جنایت ادا کرنی ہوگی۔ بہر حال بال کاٹنے سے حتی المقدور احتراز کیا جائے تو احتجام جائز ہے۔ یہ احناف کا مسلک ہے۔ جبکہ امام مالکؒ کہتے ہیں کہ مکروہ ہے نبی کریم ﷺ نے ضرورت کی بنیاد پر شاید کیا ہو۔ لیکن احناف کے ہاں یہ پچھنے پاؤں کے ظاہری حصہ پر لگائے گئے تھے۔ جس میں بالوں کو کاٹنے کی نوبت نہیں آئی۔ نہ فدیہ واجب ہوا۔

---

(۱) سنن ابی داؤد ۱/ ۲۶۲ کتاب المناسک باب المحرم یحتجم، السنن الکبریٰ للنسائی کتاب الطب، مسند احمد ۳/ ۱۶۴ (مختار)

۵۱. باب ماجاء فی اسماء رسول اللہ ﷺ

حضور اقدس ﷺ کے ناموں کا بیان

اس باب میں نبی کریم ﷺ کے بعض اسماء مبارکہ کا بطور نمونہ مختصراً بیان کیاجاتا ہے کہ نبی کریم ﷺ پر کن الفاظ کا اطلاق ہوا ہے۔اسماء سے عرفی معنی یعنی اعلام مرادنہیں بلکہ مراد یہ ہے کہ بطور اعزاز اور بصورت القاب آپ ﷺ کوکن وصفی ناموں سے پکارا گیا ہے۔آپ کا علم اور اسم ذاتی تو محمد ﷺ اور احمد ﷺ ہے۔

<u>نبی کریم ﷺ کے اسماء پر مستقل کتابیں:</u> جبکہ آپ کیلئے توصیف کی خاطر جواسماء بولے جاتے ہیں بعض حضرات نے ان کا استقراء اور تتبع بھی کیا ہے۔اوراس سلسلے میں مستقل کتابیں بھی لکھی گئی ہیں۔ بعض کتابوں میں یہ القاب وخطابات ہزاروں کی تعداد میں بتائی گئی ہیں۔امام سیوطیؒ نے اس سلسلے میں **البھجة السنیه فی الاسماء النبوية** کے نام سے ایک رسالہ تحریر کیا ہے جس میں آپ ﷺ کے تقریباً پانچ سونام جمع کئے گئے ہیں۔ملاعلی قاریؒ نے ننانوے نام ذکر کئے ہیں۔اللہ تعالیٰ کے اسماء حسنیٰ کی طرح نبی کریم ﷺ کے بھی عجیب خطابات والقاب ہیں۔قرآن مجید میں بھی آپ ﷺ کے متعدد اسماء گرامی کا بار بار ذکر ہوا ہے۔مثلاً محمد،عبداللہ،احمد، نبی،رسول،مزمل اور مدثر وغیرہ۔

اس کے علاوہ احادیث وآثار میں بھی متعدد اسماء وارد ہوئے ہیں نیز کتب سماویہ میں بھی مختلف ناموں سے حضور ﷺ کے بارے میں بشارتیں نازل ہوئی ہیں۔ان اسماء کے معانی بھی اللہ تعالیٰ نے قرن اول میں آپ ﷺ کے لئے ایک طرح سے ثابت کرکے اس بات کی نشاندہی کی کہ یہی شخصیت ہی ان مذکورہ ناموں کا حقیقی مصداق ہے۔اس باب میں بھی جونام ذکر ہیں ہرنام کی مخصوص تشریحات اور برکات شروح میں موجود ہیں۔ملاعلی قاریؒ کہتے ہیں کہ ناموں کی کثرت مسمّیٰ کی عظمت وشرف کی غماض ہے۔

(۱) حدثنا سعیدبن عبدالرحمٰن المخزومیّ وغیرواحدقالوا ثنا سفیان عن الزهریّ عن محمّدبن جُبیربن مطعم عن أبیه قال قال

---

(۱)علامہ بیجوریؒ نے لکھا ہے و القاعدة أنّ کثرة الأسماء تدلّ علی شرف المسمّیٰ(المواهب الدنية)(مختار)

رسول اللّٰہ ﷺ إنّ لی اسماءً انا محمّد وأنا احمد واناالماحیّ الذی یمحو اللّٰہ بی الکفر واناالحاشر الذی یحشر الناس علی قدمی واناالعاقب والعاقب الذی لیس بعدہ نبیّ(۱).

ترجمہ: جبیر بن مطعمؓ سے روایت ہے کہ نبی اکرم ﷺ نے فرمایا کہ میرے کئی نام ہیں۔ میں محمد ہوں، میں احمد ہوں، میں ماحی (مٹانے والا) ہوں میرے ذریعے اللہ تعالیٰ کفر کو مٹاتا ہے میں حاشر ہوں کیونکہ (قیامت کے دن) تمام لوگوں کو میرے قدموں میں جمع کیا جائے گا اور میں عاقب (آخری) ہوں جس کے بعد کوئی نبی نہیں ہے۔

حضرت جُبیر بن مطعمؓ: جبیر بن مطعم بن عدی بن نوفل ہیں جبیر کے والد کا دادا نوفل اور نبی اکرم ﷺ کے والد کے دادا ہاشم بن عبد مناف آپس میں بھائی ہیں۔قریش کے بڑے لوگوں میں ان کا شمار ہوتا تھا انساب کا بھی ماہر تھا جو انہوں نے ابوبکر صدیقؓ سے سیکھی تھیں ابوبکر صدیقؓ کو انسب العرب کہا کرتے تھے۔ بدر کے قیدیوں کو چھڑانے کیلئے جبیرؓ مکہ سے مدینہ آئے تھے تو نبی اکرم ﷺ کو سورہ طور پڑھتے ہوئے سنا۔آپؓ کہتے ہیں کہ اسی وقت اسلام نے میرے دل کے اندر گھر کر لیا تھا۔ نبی اکرم ﷺ نے بھی آپؓ کی عزت افزائی فرمائی اور کہا کہ اگر مطعم بن عدی (جبیر کے والد) زندہ ہوتے اور ان قیدیوں کی سفارش کرتے تو میں ان قیدیوں کو چھوڑ دیتا۔ پھر صلح حدیبیہ کے بعد فتح مکہ سے پہلے جبیر اسلام لائے۔آپؓ نے ۵۷ھ،۵۸ھ یا ۵۹ھ میں وفات پائی۔

إنّ لی أسماء،یعنی میرے لئے کچھ مخصوص نام ہیں یہاں ظرف کی تقدیم اس بات پر دلالت کرتی ہے کہ یہ نام آپ ﷺ سے پہلے کسی اور کو نہیں دیئے گئے اور شاید اسی وجہ سے ان پانچ ناموں کو خصوصی طور پر ذکر کیا گیا ہے۔علاوہ ازیں یہ نام آپ ﷺ کے اسماء گرامی میں سب سے زیادہ معظم ہیں نیز دیگر امتوں کے درمیان بھی سب سے زیادہ مشہور ہیں۔

---

(۱)صحیح بخاری کتاب المناقب باب ماجاء فی اسماء رسول اللّٰہ ﷺ، صحیح مسلم ۲/۲۶۱ کتاب الفضائل باب فی الاسماء، جامع ترمذی ۲/۱۱۱ کتاب الادب باب ماجاء فی اسماء النبی ﷺ، مسنداحمد ۴/۸۰(مختار)

امت پر خصوصی رنگ احمد کا حاوی ہے: أنا محمّد الخ، میں محمد ہوں اس نام کا لغوی معنیٰ بھی یہ ہے کہ بہت زیادہ حمد وستائش کیا ہوا۔اور چونکہ حمد کمالات اوراخلاق کریمہ کے مقابلے میں ہوتا ہے۔اس لئے اس میں آپﷺ کے بہت سے خصال حمیدہ کا حامل ہونے کی طرف اشارہ ہے یا پھر آپﷺ کو محمد اس لئے کہا گیا کہ خود اللہ تعالیٰ نے اور پھر انبیاء کرام،فرشتوں اوراولیاء نے آپﷺ کی مدح وتوصیف کی ہے بلکہ ہر کسی سے زیادہ آپﷺ کی تعریف کی جاچکی ہے اور یہ بھی ممکن ہے کہ گھر والوں نے تفاؤلاً آپﷺ کا یہ نام رکھا ہوتا کہ مستقبل میں آپﷺ کی صفت کی جائے اوران کی توقعات سو فیصد پوری بھی ہوئیں۔

بعض روایات میں یہ بھی آیا ہے کہ مخلوقات کی پیدائش سے بھی دوہزار برس قبل آپﷺ کو محمد کے نام سے موسوم کیا گیا تھا یہی نام عرش کے ستون، ساتوں آسمانوں، جنت کے محلات،حوروں کے سینوں، جنت کے پودوں اورطوبیٰ اور سدرۃ المنتہیٰ کے پتوں پر لکھا گیا ہے۔علماء نے اس کے بہت سے فضائل اور برکات کا تذکرہ کیا ہے۔

أنا أحمد ،احمد کا لغوی معنیٰ ہے سب سے زیادہ حمد کرنے والا،اور نبی کریمﷺ اللہ تعالیٰ کا سب سے زیادہ حمد کرنے والے تھے۔اس امت پر اللہ تعالیٰ نے ایک عمومی رنگ کو حاوی کردیا ہے اور وہ حمد سے تعلق ہے یہی ''صبغۃ اللہ'' کا مطلب ومقصود ہے۔چنانچہ حمد کے ساتھ اسی مناسبت کی وجہ سے نبی کریمﷺ کا نام محمد اوراحمد ہے نیز اس امت کا نام حمادون ہے۔اس امت کے پیغمبر فرماتے ہیں بیدی لواء الحمد. کہ قیامت کے دن میرے ہاتھ میں حمد کا جھنڈا ہوگا۔علاوہ ازیں اس امت کو جو کتاب ہدایت دی گئی ہے۔اس کی ابتداء بھی حمد سے کی گئی ہے اور نبی کریمﷺ کے مقامات عالیہ کی انتہاء بھی مقام محمود پر ہوگی۔اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے عسیٰ ان یبعثک ربّک مقاماًمحموداً.قریب ہے کہ آپ کا رب آپ کو مقام محمود میں جگہ دے گا(بنی اسرائیل ۷۹پارہ نمبر۱۵)

شفاعت کبریٰ کے بارے میں آیا ہے کہ نبی اکرمﷺ اس وقت جب سجدے میں جائینگے تو اللہ تعالیٰ ایسے مخصوص محامد کا القاء سجدے میں فرمائینگے جو آپﷺ سے پہلے کسی کو معلوم بھی نہ ہوں گی۔نیز اہل جنت کے قول آخر کا بیان کرتے ہوئے قرآن مجید کہتا ہے کہ واٰخر دعوٰھم ان الحمدللّٰہ ربّ العالمین(یونس

۱۰پارہ۱۱)''جنت میں''انکی اخیر بات یہ ہوگی کہ''الحمدللّٰہ ربّ العٰلمین ''الغرض اس امت کوابتداء سے انتہاء تک حمد سے جوڑا گیا ہے۔احمد کا نام کتب سابقہ میں بھی مذکور ہے جسکی طرف قرآن مجید نے بھی اشارہ کیا ہے فرمایامبشرًا برسول یأتی من بعدی اسمہ أحمد(الصّف : ٦)

یعنی میں (عیسیٰؑ) میرے بعد آنے والے پیغمبر کی بشارت دینے والا ہوں جن کا نام احمد ہے۔

کتب سابقہ میں اگر چہ اسی مفہوم کودوسرے الفاظ سے ادا کیا گیا ہے یعنی احمد کے لفظ کی بجائے وہاں اس کا ہم معنی لفظ''فارقلیط'' کا ذکر ہے اس لفظ اوراس کے معنی مرادکو بدلنے کیلئے عیسائی پادریوں اور راہبوں نے ہزارہا تحریفات وتاویلات کا سہارالیا لیکن تحقیقات کے مطابق اس کا صحیح صحیح مفہوم''احمد'' ہی کا مفہوم ہےاورانصاف پسند مستشرقین نے اس بات کا اعتراف کیا ہے کہ احمد کے سوافارقلیط کا دوسرا کوئی معنی بنتا ہی نہیں۔بہر حال قرآن مجیداور دیگر کتب سماویہ میں محمداور احمد کے دونام مذکور ہیں۔

<u>مٹانے والا، ماحی:</u> وانا الماحیّ،آپ ﷺ کے وصفی اسماء میں سے ایک نام ماحی (مٹانے والا) ہے۔جو کہ محایمحو سے ہےاس سے قبل کے دونام چونکہ آپ ﷺ کیلئے علم کے مرتبہ میں ہیں اس لئے ان کی وجہ تسمیہ بیان نہیں فرمائی۔لیکن باقی تین وصفی نام ہیں۔اس لئے ان کی وجہ تسمیہ بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں۔یمحو اللّٰہ بی الکفر،یعنی اللہ تعالیٰ میرے ہاتھ سے شرک وکفراورظلم وجہالت کومٹا تا ہے جزیرۃ العرب میں تو آپ ﷺ کے حین حیات میں کفر کا نام نہ رہا جبکہ سارے عالم میں بھی کفر کا اضمحلال اور عیسیٰؑ کے زمانۂ نزول میں اس کا خاتمہ مسلّم بات ہے۔قرآن کاارشاد ہے ھوالذی أرسل رسولہ، بالھدیٰ ودین الحق لیظھرہ علی الدّین کلہ(فتح ۲۸ وصف ۹) (ترجمہ)وہی ہے جس نے اپنے رسول کوبھیجا سیدھی راہ اور سچے دین پرتا کہ غالب کرے اسے ہر دین پر۔

دوسری جگہ ارشاد ہے کہ واللّٰہ متمّ نورہ ولو کرہ الکافرون(صف۸) (ترجمہ)اوراللہ اپنے نورکوکمال تک پہنچا کر ہی رہے گا گوکافرلوگ کیسے ہی ناخوش ہوں۔

بعض روایات میں ایک اوروجہ بھی اس نام کیلئے ذکر کی گئی ہے وہ یہ''فإن اللّٰہ یمحوبہ سیّئات من تبعہ ''یعنی اللہ تعالیٰ آپ ﷺ کے طفیل آپ ﷺ کی امت کی گناہوں کومٹادیں گے۔کافروں کوایمان سے سرفرازفرمائیں گے۔اورمؤمنوں کے حق میں شفاعت قبول فرمائیں گے۔

بنی نوع انسان کوجمع کرنے والا: و أنا الحاشر ،فرماتے ہیں میں جمع کرنے والا ہوں۔حشر جمع کرنے کو کہتے ہیں۔آپ ﷺ اپنی قیادت میں اطراف واکناف کے منتشر لوگوں کوایک صراط مستقیم پر جمع کرنے والے ہیں۔تمام بنی نوع انسان کوآپ ﷺ کے قدموں کی اتباع کا حکم ملا۔اورتمام ادیان کوچھوڑ کردین حق کی اتباع کی دعوت دی گئی جووحدت کی ضمانت ہےآپ ﷺ سےاعلان کروایا گیا کہ **وانّ ھذا صراطی مستقیماً فاتبعوہ ولاتتّبعوا السبّل فتفرّق بکم عن سبیلہٖ** (انعام۱۵۳)(ترجمہ)یہ دین میرا راستہ ہے جوکہ سیدھا ہے پس اس راہ پر چلواور دوسرے راستوں پر مت چلو کہ وہ راہیں تم کواللہ کی راہ سے جدا کردیں گی۔

اورجس طرح اللہ تعالیٰ کی توحید انسانیت کیلئے وحدت کا ذریعہ ہے۔اسی طرح آپ ﷺ کی رسالت بھی بنی نوع انسان کے اتفاق واتحاد کا پیغام ہے۔یورپی ملحدین کومذاہب پراعتراض ہے کہ مذاہب انسانیت میں تفرقہ پیدا کرتے ہیں لیکن جب دیگر مذاہب کوختم کرکےاسلام نے اتفاق واتحاد کی دعوت دی توپھرتفرقہ کا کیاسوال؟ آپ ﷺ کوختم نبوت کا تمغہ دیا گیا تواب دوسرےادیان کوختم کرکےتمام لوگوں کو متحد ہونا ہےاوریہی حشرِ انسانیت کی صورت ہے جودنیامیں ہونا ہے۔

علاوہ ازیں قیامت کے روزبھی نبی کریم ﷺ سب سے پہلے میدان حشر(۱) میں نکلیں گے۔اور پھردوسرےلوگ ان کے پاس جمع ہونگے اس لحاظ سےبھی آپ ﷺ پرحاشر کااطلاق ہوسکتا ہے۔

آخری نبی: **وانا العاقب**،عاقب کے معنی آخر میں آنیوالے ہیں۔اورآپ بھی انبیاءکرام کے سلسلۃ الذہب کی آخری کڑی تھے۔آپ ﷺ کے بعدکوئی نبی نہیں۔اب اگرلفظ خاتم النبین کے ہزاروں تاویلات بھی کی جائیں۔تو یہ لفظ العاقب اوراس قسم کے ہزاروں تصریحات ختم نبوت کے واضح دلائل ہیں۔ختم نبوت کے منکرخاتم کامعنی مہرلگانے والے سے کرتے ہیں لیکن خودآپ ﷺ کی احادیث اس پرناطق ہیں کہ خاتم کا یہ معنی نہیں بلکہ اس کامعنی آخر ہےمثلاً اس جگہ بھی لیس بعدی نبیؐ فرمایا۔اوردوسرے

---

(۱)أناأوّل من تنشق عنہ الارض رواہ الترمذی ۲۰۲/۲عن أبی ھریرۃ فی ابواب المناقب باب فضل النبیّ ﷺ، ورواہ البخاری ۳۲۵/۱عن ابی سعیدؓ فی کتاب الخصومات ولفظہ فاکون اوّل من تنشق عنہ الأرض الخ وکذارواہ أحمد والدرامی وابوداودوغیرھم ۱۲ (اصلاح الدین)

مقام پر فرمایا لانبی بعدی، اگر کوئی تحریف اور دجل و تلبیس کرے تو اس کا تو کوئی علاج نہیں۔ایک متنبی خبیث نے نبوت کا دعویٰ کیا اور دعویٰ سے قبل ہی وہ خود کو ''لا'' کا لقب دے چکا تھا اور اپنی نبوت پر لانبیّ بعدی سے استدلال کرتے ہوئے کہتا تھا کہ ''لانبیّ بعدی'' کا معنی یہ ہے کہ ''لا'' میرے بعد پیغمبر ہوگا۔مرزا غلام احمد لعین بھی کچھ اس قسم کی تحریفات کرتا رہتا تھا۔اب اس قسم کے تعنّت کا تو کوئی علاج نہیں ہے البتہ احادیث میں آپ ﷺ نے ختم نبوت کی ناقابل تاویل تصریحات بھی کی ہیں۔

(۲) حدّثنا محمّدبن ظریف الکوفیّ ثنا أبوبکر بن عیّاش عن عاصم عن أبی وائل عن حذیفة قال لقیت النبیّ ﷺ فی بعض طرق المدینة فقال أنا محمّد وأنا أحمد وأنانبیّ الرحمة ونبیّ التوبة وأناالمقفیّ وأنا الحاشرونبیّ الملاحم(۱).

ترجمہ: حضرت حذیفہ بن الیمانؓ کہتے ہیں کہ میں نبی کریم ﷺ کے ساتھ مدینہ کی ایک گلی(۲) میں ملا۔تو آپ ﷺ نے فرمایا کہ میں محمد ہوں اور میں احمد ہوں میں نبی الرحمۃ ہوں، میں نبی التوبہ ہوں، میں مقفّی ہوں میں حاشر ہوں اور میں نبی الملاحم ہوں

نبی الرحمة، کا معنی رحمت والا نبی، نبی التوبة (۳) توبہ والا نبی، مقفّی پیچھا کرنے والا، مُقفّی پیچھا کیا ہوا، حاشر جمع کرنے والا، نبی الملاحم جنگوں والا نبی۔

رحمۃ کائنات: أنا محمد، آپ ﷺ نے فرمایا کہ میں محمد ہوں احمد ہوں اور نبی الرحمۃ ہوں، رحمت ہونے کی بھی بہت تفصیلات بیان کی جا چکی ہیں۔قرآن مجید میں ہے **وما ارسلنک إلاّ رحمةً للعٰلمین.**

---

(۱)مصنف ابن ابی شیبة ۱۱/۴۵۸،مجمع الزوائد۸/۲۸۴،مسنداحمد۵/۴۰۵،الحلیة الاولیاء لابی نعیم ۵/۹۹(مختار)

(۲)اس حدیث کو ابونعیمؒ نے حضرت حذیفہؓ اور حضرت عبداللہ ابن مسعودؓ سے طرق المدنیہ کی بجائے فی سکّة من سکک المدینة کے لفظ سے روایت کیا ہے اس لئے ترجمۃ میں گلی کا لفظ ذکر کیا ہے۔(اصلاح الدین)

(۳)ملا علی قاریؒ نے توبہ کے لئے تین ارکان لکھے ہیں۔وارکان التوبة علی ماقاله العلماء ثلاثة الندم والقلع والعزم علی ان لایعود ولا اجدجعل الاستغفار اللسانی شرطاً للتوبة نعم للتوبة باعتبار تعلقها بحقوق العبادوببعض حقوق الله شروط(جمع الوسائل ۲/۲۲۷)

آپﷺ تمام عالموں کیلئے رحمت ہیں یعنی مسلمانوں کیلئے، کفار کیلئے یہود ونصاریٰ کیلئے حتیٰ کہ جانوروں اور نباتات، شمس وقمر اور سماوات وارضین کیلئے بھی آپﷺ رحمت ہیں۔ اس سلسلے میں علماء نے مستقل کتابیں لکھی ہیں مثلاً قاضی سلیمان منصور پوری کی تین جلدوں کی کتاب ''رحمۃ للعالمین'' اسی موضوع پر لکھی گئی ہے۔ اسی طرح ''نبی الرحمۃ'' تین جلدوں میں مولانا ابوالحسن علی ندوی صاحبؒ نے لکھی ہے نیز مفسرین نے بھی اس صفت کی عجیب عجیب تفصیلات بیان کی ہیں۔ آپﷺ کافروں کیلئے رشد وہدایت ہونے کے علاوہ اس لحاظ سے بھی رحمت ہیں کہ انکو خسف مسخ اور دیگر عمومی عذابوں سے آپﷺ کے طفیل امن ملا ہے لیکن امۃ مسلمۃ کیلئے تو آپﷺ رحمت کامل ہیں۔ جن کیلئے قرآن مجید نے آپﷺ کا منصب یوں بیان کیا ہے۔ **يتلوعليهم آياته ويزكّيهم ويعلّمهم الكتاب والحكمة** (جمعہ۲) جوانکو اللہ کی آیتیں پڑھ پڑھ کر سناتے ہیں اور انکو پاک کرتے ہیں اور انکو کتاب اور دانشمندی کی باتیں سکھلاتے ہیں۔ نیز فرمایا **وبالمؤمنين رؤف الرحيم** (توبۃ:۱۲۸) اور ایمانداروں کیساتھ بڑے ہی شفیق ومہربان ہیں۔

<u>توبہ کے حقیقی راستے:</u> بہرحال آپﷺ کی صفت رحمت تمام عالم خصوصاً تمام بنی نوع انسان کیلئے ایک مسلّم بات ہے۔ **أنا نبيّ التوبة**، مطلب یہ ہے کہ میں نے توبہ کے دروازے کھول دیئے۔ جو اگرچہ کبھی بند نہ تھے لیکن تحریف وتاویل کرنے والوں نے غلط نظریات اور مذموم مقاصد سے اس کو بند پیش کیا عیسائیوں نے اسے بند سمجھ کر گناہوں کے کفارے کی ضرورت پر زور دیا۔ اور اسی وجہ سے عیسیٰؑ کو بطور کفارہ مصلوب مانا۔ اور بعض مذاہب والوں کے ہاں تو سرے سے گناہگار کیلئے معافی نہیں ہے۔ آپﷺ نے توبہ کے حقیقی راستوں کو پھر سے زندہ کردیا کہ اگر اللہ تعالیٰ سے معافی مانگی جائے اس کے دربار میں رویا جائے تو اللہ تعالیٰ معاف فرمادے گا۔ اللہ تعالیٰ کی ذات سے مایوسی کو کفر بتایا۔ آپﷺ کی بعثت سے قبل لوگوں پر مایوسی کی گھٹائیں چھائی رہیں اور چارونا چار لوگ خود کو اپنے گناہوں کا بڑے ظالمانہ اور راہبانہ طریقوں سے سزا دیتے تھے آپﷺ نے اس کا خاتمہ کیا۔ علاوہ ازیں آپﷺ کو نبی التوبۃ کہنے کی اور بھی وجوہات ہیں مثلاً یہ کہ بعض امتوں کے توبہ کی قبولیت کیلئے قتل نفس وغیرہ سخت شرائط لگائی گئیں لیکن آپﷺ کی امت سے سیدھے سادے توبہ کا مطالبہ کیا گیا یا یہ کہ آپﷺ اپنی امت کو کثرت سے توبہ کی

تعلیم دیتے تھے یا یہ کہ آپ ﷺ خود بکثرت استغفار فرمایا کرتے تھے نیز آپ ﷺ کی امت کو بھی اللہ تعالیٰ نے تائبین کہا ہے۔

تابع ومتبوع: وانا المقفی، مقفّی اسم مفعول ہوتو معنیٰ یہ ہوگا کہ میں متبوع ہوں۔ دوسرے لوگ میرے پیچھے آرہے ہیں گویا بنی نوع انسان کیلئے آپ ﷺ کے نقش قدم پر چلنا ضروری ہے اور قیامت تک کوئی اور ایسا شخص نہیں آئے گا جس کا اتباع مطلقاً لازم ہو اور اگر یہ لفظ اسم فاعل ہو تو پھر معنیٰ یہ ہوگا کہ میں دوسرے انبیاء کا اتباع کرنے والا ہوں کوئی دوسرا راستہ ایجاد نہیں کیا بلکہ ان کی تعلیم میری تعلیم ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے کہ اولٰئک الذین هدی الله فبهداهم اقتده(انعام:۹۰) یہ حضرات ایسے تھے جن کو اللہ تعالیٰ نے ہدایت کی تھی سو آپ بھی انہی کے طریقہ پر چلئے۔

انبیاء کرام کا سلسلہ ہادیین ومہدیین کا سلسلہ تھا اور آپ ﷺ کو اصول دین یعنی توحید اور مکارم اخلاق وغیرہ میں ان کی اقتداء کا حکم مل چکا ہے۔ یہ اور بات ہے کہ بعض فروعی مسائل میں ادیان سابقہ سے اختلاف ضرور ہے۔ لیکن اس سے وہ اقتداء مجروح نہیں ہوتا جس کا نبی کریم ﷺ دعویٰ کررہے ہیں۔ بعض شراح نے مقفّی کا معنی پیچھے اور آخر میں آنے والے سے کیا ہے۔ اس طرح یہ عاقب کا ہم معنی ہوگا جو گزشتہ حدیث میں ذکر ہو چکا ہے۔

جہاد کو زندہ کرنے والے: وأنا نبی الملاحم، ملاحم ملحمہ کی جمع ہے جو کہ شدید جنگ اور قتل وقتال کو کہتے ہیں بلکہ لام حاء اور میم کے مادے میں شدت اور مضبوطی کا معنی ہوتا ہے جیسے لحم یعنی گوشت اور التحام بمعنی ازدحام میں بھی یہ معنی ہوتا ہے چونکہ جنگ میں بھی لوگ ایک دوسرے میں گھس جاتے ہیں اسلئے اسے بھی ملحمہ کہتے ہیں یا اس لئے کہ اس میں لحم یعنی گوشت گرتا رہتا ہے اسے ملحمہ کہتے ہیں۔ اس میں نبی کریم ﷺ اپنی ایک اور صفت یعنی جہاد کی علمبرداری کو اشارہ فرمارہے ہیں اور اس بات پر تنبیہ ہے کہ میرے دین میں جہاد بھی دعوت کے دوش بدوش کارفرما ہے۔ مجرد رحمت ورافت نہیں بلکہ میں مجاہد ہوں اب باطل کے مقابلے میں تلوار سے دین حق کا تحفظ کیا جائے گا۔ آپ ﷺ سے پہلے حضرت عیسیٰ ؑ کے مذہب میں یہ بات نہ تھی۔ بلکہ ان کے ہاں تو حکم یہ تھا کہ کوئی ایک گال پر مارے تو اس ظلم کا بدلہ نہ لو بلکہ دوسرا رخ

بھی اس کے سامنے پھیردو۔ دورجدید میں گاندھی ازم بھی اہنساء کا علمبردار رہا۔ جو ہندی کا لفظ ہے اور اس کا معنی عدم تشدد ہے۔ ہندوؤں میں یہ دراصل بدھ مت کا اثر تھا۔ تو نہ بدھ مت میں جہاد تھا نہ گاندھی ازم میں اور نہ عیسیٰ علیہ السلام کے مذہب میں جہاد تھا۔ جہاد کو آپ ﷺ نے زندہ کیا۔ اور جہاد کا حکم ملنے کے بعد مدنی زندگی کے مختصر دورانیہ میں آپ ﷺ ابن سعد کی روایت کے مطابق ستائیس مرتبہ بنفس نفیس جہاد پر گئے جبکہ جن فوجی مہمات میں آپ ﷺ نے صحابہ کو روانہ فرمایا ان کی تعداد ستر تک بتائی گئی ہے چنانچہ اسی جہاد ہی نے اسلام کو حیات جاودانی بخشی۔ آپ ﷺ نے فرمایا **الجهاد ماض إلى يوم القيامة**(۱)، جہاد قیامت کے دن تک جاری رہنے والا ہے۔

اللہ تعالیٰ کی طرف سے آپ ﷺ کو خطاب ہے **ما كان لنبيٍّ ان يكون له اسرىٰ حتىّ يسخن في الأرض**(انفال ۶۷) نبی کے شان کے یہ لائق نہیں کہ اپنے ہاں قیدی رکھے جب تک وہ زمین میں اچھی طرح خونریزی نہ کرلیں۔

بہرحال اسلام کا یہ ایک عظیم اور قابل فخر پہلو ہے کہ حق کے راستے میں قوۃ کا استعمال ہونا چاہئے یہ کوئی قابل شرم بات نہیں حتیٰ کہ بیکار قسم کی توجیہات کا سہارا لینا پڑے کہ اسلام جارحانہ جنگ نہیں بلکہ دفاعی جنگ کی ترغیب دیتا ہے۔

دراصل جب جسم میں فاسد مادہ زیادہ ہوجائے مریض اس کی وجہ سے مرنے لگے تو اس فاسد مادے کو نکالنا بلکہ بعض اوقات کسی خراب عضو کو کاٹنا بھی ضروری ہوتا ہے اور واضح بات ہے کہ کفر معاشرے میں ناسور کی طرح ہے اس سے بچاؤ اور معاشرے کی تطہیر کیلئے اسلام نشتر چلانے کی تعلیم دیتا ہے۔ یہ تو اس صورت میں ہوا کہ ملحمہ سے شدت کا معنی لیا گیا ہو اور اگر ملحمہ سے التحام مراد ہو تو اس کا معنی اجتماع بھی ہوسکتا ہے اور مطلب یہ ہوگا کہ میں اجتماعیت کا پیغمبر ہوں لوگوں کو منتشر نہیں کرتا بلکہ ان کو جمع کرتا ہوں اور نفرتوں کے اندھیروں میں محبتوں اور وحدت کا پیغام لایا ہوں۔

حدّثنا اسحاق بن منصور الخ، اسی حدیث کیلئے دوسری سند لا رہے ہیں۔

---

(۱)الجهاد ماض منذ بعثنى الله الى ان يقاتل آخر أمتّى الدّجال(ابوداود ۱/۳۵۰کتاب الجهادباب فى الغزو مع ائمة الجور) (اصلاح الدين)

خلاصہ باب

اس باب میں نبی اکرم ﷺ کے اسماء مبارکہ کا ذکر ہے جو ویسے تو بہت زیادہ ہیں جیسا کہ باب کی ابتداء میں ہم ذکر کر چکے ہیں لیکن یہاں صرف چند اہم اور ان مخصوص ناموں کا ذکر ہے جو کتب سابقہ میں بھی آپ ﷺ کیلئے ثابت ہیں جو درج ذیل ہیں:

محمد،احمد،ماحی،حاشر،عاقب،نبی الرحمة،نبی التوبة،مقفیٰ ؐ،اور نبی الملاحم.

فصلیّ اللّٰہ تبارک وتعالیٰ علی مسمّا ھا وسلّم تسلیما کثیرا

۵۲. باب فی عیش النبی ﷺ

حضور اقدس ﷺ کی گزار اوقات کا بیان

<u>اکل وشرب لازمۂ حیات مگر اعتدال اور سادگی:</u> اللہ تعالیٰ کی عبادت اور حق شناسی علم وعمل کا نام ہے لیکن علم وعمل کا فرض نبھانے کے لئے بدن کی سلامتی ضروری ہے اور بدن کی سلامتی کیلئے ضروری ہے کہ اس کی بنیادی ضروریات روٹی، کپڑا اور مکان کا خیال رکھا جائے تا کہ وہ تندرست اور مطمئن رہ کر رب کے ساتھ تعلق جوڑ سکے۔ اسی وجہ سے بعض بزرگوں کا مقولہ ہے کہ "**الاکل من الدین**" یعنی کھانا بھی دین ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ "**کلوا من الطّیبات واعملوا صالحاً**" پاک چیزیں کھاؤ اور نیک عمل کرو۔ لیکن جو شخص عبادت کیلئے تیاری کے تصور سے کھائے وہ اپنے نفس کو جانوروں کی طرح صرف خورونوش کیلئے وقف نہ کرے بلکہ شریعت کی پابندیوں اور آداب کے ساتھ کھائے پیئے۔ ضرورت سے زائد نفس کے خواہشات کو قابو میں رکھے بلکہ کم کھائے پیئے۔ حدیث میں ہے "**من کثر تفکرہ قلّ مطعمہ ومن کثر مطعمہ قلّ تفکرہ وقسا قلبہ**" جو فکر مند رہتا ہے وہ کم کھاتا ہے اور جو زیادہ کھاتا ہے اس کا تفکر کم ہو جاتا ہے اور دل سخت ہو جاتا ہے۔ بالخصوص علم کے حصول کے لئے بھی پیٹ بھر کر کھانا مضر ہے۔ کسی شاعر نے کہا ہے کہ

ے **تہی ز حکمتی بہ علّت آں — کہ پُری از طعام تابینی**

بہر حال اس باب میں نبی کریم ﷺ کی کم خوری، لباس، مسکن میں سادگی اور اختیاری فقر کا بیان ہے۔ آپ ﷺ متاع دنیا میں انہماک سے کوسوں دور اپنے رب سے تعلق میں مگن رہتے تھے۔

اس عنوان سے ایک اور باب "**باب ماجاء فی خف رسول اللّٰہ ﷺ**" سے قبل لایا گیا تھا وہیں لفظ عیش کی تشریح بھی گزر چکی ہے البتہ یہ اعتراض ہوتا ہے کہ اس باب کو مکرر کیوں لایا گیا ہے۔ بعض شراح نے تو اسے ناسخین کا تصرف قرار دیا ہے اور بعض نے یہ عذر کر دیا ہے کہ زیر نظر باب میں متنوع احادیث لانے سے تکرار کا شبہ زائل ہو جاتا ہے جبکہ بعض شراح نے لکھا ہے کہ مصنفؒ نے اس موضوع کی

اہمیت واضح کرنے کیلئے قصداً ایسا کیا ہوگا۔اس سلسلے میں بعض دیگر توجیہات اسی چھوٹے باب کی ابتداء میں ہم پیش کر چکے ہیں۔

(۱) حدثنا قتیبة بن سعید ثنا أبو الأحوص عن سماک بن حرب قال سمعت النعمان بن بشیر یقول الستم فی طعام و شراب ما شئتم لقد رأیت نبیکم ﷺ و ما یجد من الدقل ما یملأ بطنه(۱).

ترجمہ: حضرت نعمان بن بشیرؓ اپنے ساتھیوں سے کہتے تھے کیا تم دل پسند کھانے پینے میں مصروف نہیں ہو؟ میں نے تمہارے نبی ﷺ کو بھی دیکھا تھا یوں کہ ان کو بے کار قسم کی کھجوریں بھی پیٹ بھر کر میسر نہیں تھیں۔

ماشئتم ما موصولہ ہے یعنی "بالقدر الذی شئتم" جتنا کھانا پینا چاہو کر سکتے ہو۔ملا علی قاریؒ کہتے ہیں کہ ما مصدریہ بھی ہو سکتی ہے یعنی مقدار مشیّتکم، دونوں صورتوں میں درحقیقت اپنے ساتھیوں کی تنبیہ مقصود ہے کہ تم دل پسند کھانے پینے میں مشغول ہو۔حالانکہ نبی اکرم ﷺ نے فقر کو ترجیح دی تھی(۲)۔

و مایجد من الدقل ،دقل چھوارے یعنی خشک اور بے ذائقہ کھجور کو کہتے ہیں۔یہ حدیث باب ادام رسول اللہ ﷺ میں گزر چکی ہے۔وہیں مزید تشریح گزر چکی ہے۔

(۲) حدثنا هارون بن اسحاق ثنا عبدة عن هشام بن عروة عن أبیه عن عائشة قالت ان کنا آل محمد نمکث شهرا ما نستوقد بنارٍ ان

---

(۱)صحیح مسلم ۲/۱۰۲۴ کتاب الزهد والرقائق، جامع ترمذی ۲/۱۵ کتاب الزهد باب ماجاء فی معیشة اصحاب النبی ﷺ،سنن ابن ماجة ص ۳۰۶ ابواب الذهد باب معیشة آل محمد ﷺ، مسند احمد ۴/۲۶۸ (مختار)

(۲) بعض اہل اللہ سے مروی ہے جوّعوا انفسکم بولیمة الفردوس(المواهب اللدنیة ص ۲۳۲) مگر یاد رہے کہ بسیار خوری وہ مذموم ہے جو علم و عمل کی تحصیل میں سستی کا باعث بنے ورنہ اگر تقویت کا باعث ہو پھر تو مطلوب ہے۔قال البیجوریؒ والمذموم إنّما هو الشبع المثقل الموجب للکسل المانع من تحصیل العلم والعمل وأما الأکل المعین علی العبادة فهو مطلوب لاسیما اذا کان بقصد التقوی علی الطاعة (المواهب اللدنیة ۲۳۲)(مختار)

هو الا التمرو الماء(۱).

ترجمہ: حضرت عائشہؓ کہتی ہیں کہ بیشک ہم محمدﷺ کے گھر والے پورا مہینہ آگ جلائے بغیر گزار لیتے تھے۔ ہمارا کھانا صرف کھجور اور پانی ہوتا تھا۔

اہل بیت کی تنگدستی: ان کنّا آل محمد، ان مخففہ من المثقلہ ہے اصل میں ''انّا کنّا'' تھا اور آل محمد ''کنّا'' کی ضمیر سے بدل واقع ہوا ہے اگر مرفوع پڑھا جائے۔ اور اگر منصوب ہو تو ''اعنی'' کی تقدیر کے ساتھ مفعول بہ ہوگا یا پھر منصوب علی المدح ہوگا۔ کنّا کی خبر نہیں ہے۔

یہاں یہ اعتراض ہوسکتا ہے کہ اس حدیث میں نبی کریمﷺ کی عیش کا بیان نہیں بلکہ گھر والوں کی تنگدستی کا ذکر ہے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ آل محمد سے مراد بشمول رسول اللہﷺ تمام گھر والے ہیں۔ یا جواب یہ ہے کہ یہ فطری بات ہے کہ مرد کھانے پینے اور لباس کے سلسلے میں گھر والوں کو خود پر مقدم رکھتا ہے۔ لہٰذا واضح بات ہے کہ جب گھر والوں کی یہ حالت ہے تو نبی کریمﷺ کی حالت اس سے بھی ابتر ہوگی۔

نمکث شهرا، یہاں ایک مہینے کا ذکر ہے بعض دیگر روایات میں بھی ایک مہینے تک آگ نہ جلنے کا ذکر ہے جبکہ بعض روایات میں پندرہ دن اور بعض میں تین ماہ کا بھی ذکر ہے کہ آپﷺ کے گھر میں آگ جلنے کی نوبت نہیں آئی۔ شاید یہ مختلف مواقع کا بیان ہے جیسا کہ ملاعلی قاریؒ نے بیان کیا ہے۔

پھر اس دوران اکثر تو آپﷺ اور آپﷺ کے گھر والوں کا کھانا کھجور اور پانی کی صورت میں ہوتا تھا۔ کبھی کبھی پڑوسیوں کی طرف سے دودھ بھی پینے کو مل جاتا مگر وہ پیٹ بھر کر نہیں ہوتا تھا۔

ہم پہلے بیان کر چکے ہیں کہ آپﷺ کا یہ فقر اختیاری ہوتا تھا ورنہ آپﷺ کو دنیا کے خزانوں کی چابیاں پیش کی جا چکی تھیں مگر آپﷺ نے خود یہی پسند فرمایا کہ ''اشبع یوماً و أجوع یوماً'' ایک دن

(۱) صحیح بخاری ۹۵۶/۲ کتاب الرقاق باب کیف کان عیش اصحاب النبیﷺ، صحیح مسلم ۴۱۰/۲ کتاب الزهد والرقاء، سنن ابن ماجة ص ۳۰۶ ابواب الذهد باب معیشة آل محمدﷺ (مختار)

کھانا کھاؤں تو دوسرے روز بھوکا رہوں(۱)۔

فقر اختیاری: علامہ مناویؒ لکھتے ہیں کہ آپﷺ کے بعد لوگ چار طرح کے ہو گئے۔اول وہ لوگ جنہوں نے دنیا کو چاہا نہ دنیا نے ان کو جیسے ابوبکر صدیقؓ،کہ ان کی زندگی بھی نبی اکرمﷺ کی طرح فقر میں گزری۔دوم وہ جنہوں نے دنیا کو نہ چاہا مگر دنیا نے ان کو چاہا جیسے حضرت عمرؓ کہ ان کے زمانہ میں دولت کی فراوانی ہوئی مگر انہوں نے زہد سے کام لیا،سوم وہ لوگ جنہوں نے دنیا کو چاہا اور دنیا نے ان کو چاہا جیسے عمر بن عبدالعزیز کے سوا اموی اور عباسی خلفاء۔چہارم وہ لوگ جنہوں نے دنیا کو چاہا مگر دنیا نے ان کو نہ چاہا جیسے دنیا سے محبت کرنے والے فقیر لوگ(۲)۔

(۳) حدثنا عبداللّٰه بن ابی زیاد ثنا سیار ثنا سهل بن اسلم عن یزید ابن ابی منصور عن أنس عن أبی طلحة قال شکونا الی رسول اللّٰهﷺ الجوع ورفعنا عن بطوننا عن حجرٍ حجرٍ فرفع رسول اللّٰهﷺ عن بطنه عن حجرین قال أبو عیسیٰ هذا حدیث غریب من حدیث أبی طلحة لانعرفه إلاّ من هذا الوجه و معنی قوله ورفعنا عن بطوننا عن حجر حجر کان احدهم یشدُّ فی بطنه الحجر من الجهد و الضعف الذی به من الجوع(۲).

ترجمہ: حضرت ابوطلحہؓ کہتے ہیں کہ ہم نے نبی اکرمﷺ سے بھوک کی شکایت کی اور کپڑا اہٹا کر پیٹ پر بندھا ہوا ایک ایک پتھر دکھایا تو نبی اکرمﷺ نے پیٹ سے کپڑا اہٹا کر دو پتھر دکھائے۔

---

(۱)عن أبی أمامةؓ عن النبیﷺ قال..عرض علیّ ربی لیجعل لی بطحاومکة ذهباً قلت لایارب ولکن أشبع یوماً وأجوع یوماً اوقال ثلاثاً اونحو هذا فاذاجعت تضرّعت الیک وذکرتک فاذاشبعت شکرتک وحمدتک(ترمذی ج۲ابواب الزهد ص ۵۰۹باب ماجاء فی الکفاف والصبرعلیه)(اصلاح الدین) (۲)مناوی ج۲ص ۳۳۳(اصلاح الدین)

(۳)جامع ترمذی ۵۱۲/۲ کتاب الزهد باب ماجاء فی معیشة اصحاب النبیﷺ، شرح السنة ۲۷۶/۱۴ باب یف کان عیش رسول اللهﷺ کتاب الرقاق رقم الحدیث ۴۰۷۹(مختار)

پیٹ پر پتھر: توجیہات: رفعنا عن بطوننا عن حجر حجر، یعنی ہم نے پیٹ پر بندھا ہوا ایک ایک پتھر دکھایا۔ قدیم عرب اور بالخصوص اہل مدینہ کی عادت تھی کہ بھوک کی شدت میں پیٹ پر پتھر باندھتے تھے تاکہ خالی ہونے کی وجہ سے پیٹ لٹکنے نہ پائے۔ نیز پیٹ خالی ہونے کی وجہ سے کمر جھک کر کام کاج میں رکاوٹ پیدا ہونے کا اندیشہ ہوتا تھا اور کبھی کبھی ہوا بھر جانے کا احتمال ہوتا ہے نیز انتڑیوں کے اتر جانے کا خدشہ ہوتا ہے پتھر باندھنے سے یہ خطرہ بھی ٹل جاتا تھا۔

علاوہ ازیں پیٹ خالی ہونے کی وجہ سے پیٹ کی طبعی حرارت اور تندوتیز رطوبات غذا نہ پاکر معدے اور آنتوں کیلئے مضر بن جاتا ہے۔ پتھر باندھنے سے ایک حد تک ٹھنڈک پیدا ہوجاتی ہے جس کی وجہ سے حرارت اور رطوبات کی حدت کم ہوجاتی ہے۔

صاحب ازہار نے لکھا ہے کہ یہ مدینہ کے بعض پتھروں کی خصوصیت تھی جن کو پیٹ کے اوپر باندھنے سے بھوک کی تکلیف ختم ہوجاتی تھی ان کو مُشبعہ کہا کرتے تھے لیکن دیگر شراح نے ایسے خاص پتھروں کے وجود سے انکار کیا ہے جبکہ بعض شراح نے یہ بھی لکھا ہے کہ یہ محض ایک کنایہ ہے پتھروں کا پیٹ پر باندھنے سے صبر کا مظاہرہ مقصود ہے جیسے صبر کی تلقین کے دوران کہا جاتا ہے کہ ''اربط علی قلبک حجراً'' ''دل پر پتھر رکھ لو'' گویا راوی کا مقصد یہ ہے کہ ہماری نسبت نبی اکرم ﷺ کی جفاکشی اور بھوک کی برداشت بڑھ کر تھی۔ لیکن امام ترمذیؒ نے اس عمل کو ظاہر پر محمول کیا ہے جیسا کہ حدیث کے آخر میں وہ خود وضاحت کر رہے ہیں اور یہی راجح بھی ہے۔

حضور اقدس ﷺ کو بھوک کے احساس پر اشکال اور جواب: فرفع...عن حجرین، یعنی آپ ﷺ نے بھوک کی شدّت کی وجہ سے پیٹ پر دو پتھر باندھ رکھتے تھے۔ اس حدیث پر بعض شارحین حدیث نے یہ اشکال کیا ہے کہ نبی اکرم ﷺ کو بھوک کی شدت کا احساس کیسے ہوا۔ حالانکہ جب آپ ﷺ کئی دن تک بغیر افطار کئے مسلسل روزہ رکھ لیتے تھے تو بعض صحابہؓ نے ان کی تقلید میں ان کی طرح صوم الوصال پر عمل کرنا چاہا۔ آپ ﷺ نے ان کو منع کر دیا۔ تو انہوں نے عرض کیا کہ آپ ﷺ خود تو صوم الوصال رکھ رہے ہیں۔ اس پر آپ ﷺ نے فرمایا کہ إنّی لست کاحدکم إنّی لست کھیئتکم إنّ ربی

یطعمنی ویسقینی(۱)

اسی وجہ سے علامہ ابن حبانؒ نے پیٹ کے اوپر پتھر باندھنے والی احادیث کا انکار کیا ہے بلکہ یہ بھی کہا ہے کہ یہ لفظ حَجر نہیں بلکہ حُجز ہے جو تہہ بند باندھنے کی جگہ کو کہتے ہیں۔

لیکن محققین نے ان کی رائے کی تصویب نہیں فرمائی کیونکہ آپ ﷺ کیلئے بھوک کا ثبوت اور بھوک کی وجہ سے تکلیف اور اس تکلیف کا چہرے وغیرہ سے دوسروں کو احساس ایک دو نہیں کئی احادیث سے ثابت ہے۔ جیسا کہ آئندہ حدیث میں اس کی تصریح ہے پھر پتھر باندھنے اور دو پتھروں کا ذکر بھی روایات میں موجود ہے۔ لہٰذا بلا ضرورت ان تمام روایات کی تاویل نامناسب ہے۔

جہاں تک ربّی یطعمنی ویسقینی ،والی بات ہے تو وہ روزے کی مواصلت کی صورت میں ہے یعنی جب نبی کریم ﷺ ایک روزے کے بعد افطار کئے بغیر دوسرا روزہ بھی رکھ لیتے تھے تو ایسی صورت میں مسلسل بھوک آپ ﷺ کیلئے تکلیف دہ نہیں رہتی تھی بلکہ رب کی طرف سے کھانا پینا میسر ہوتا تھا۔

بغیر صوم وصال کے آپ ﷺ سے بھوک کی نفی خلاف عقل ونقل ہے۔ بلکہ بھوک تو خود نبی کریم ﷺ کا مطلوب تھا جیسے کہ ہم روایت ذکر کر چکے ہیں کہ آپ ﷺ نے فرمایا کہ ولٰکنّ أجوع یوماً وأشبع یوماً ظاہر بات ہے کہ شکر بھی دل سے تب ہی نکل سکتا ہے جب بھوک کے بعد کچھ کھایا جائے۔

بعض حضرات نے دیگر جوابات بھی ذکر کئے ہیں مثلاً یہ کہ ابتدائی زمانہ میں آپ ﷺ کو بھوک لاحق ہوتی تھی آخری زمانہ میں اللہ تعالیٰ نے اس تکلیف سے آپ ﷺ کو محفوظ رکھا تھا لیکن اس پر یہ اشکال ہوتا ہے کہ زیر نظر حدیث تو ابو ہریرہؓ کے ایمان کے بعد کی حدیث ہے اور وہ ۷ھ میں ایمان لائے تھے اگرچہ بعض شراح نے یہ لکھا ہے کہ یہ حدیث فتوحات سے قبل کی حدیث ہے کیونکہ فتوحات کے بعد ایسے فاقوں کی نوبت نہیں آئی جیسے کہ حدیث میں ذکر ہے لیکن ملا علی قاریؒ اور دیگر شراح نے اس پر رد کیا ہے کہ حدیث کے راوی ابو ہریرہؓ کا تعلق فتح خیبر کے بعد نبی اکرم ﷺ کے ساتھ قائم ہوا ہے اور یہ قرینہ ہے کہ یہ واقعہ آخری زمانہ کا ہے۔

---

(۱) بخاری ج ا ص ۲۶۳

بعض محققین نے یہ جواب بھی دیا ہے کہ بھوک کا اثر نبی اکرم ﷺ پر نہیں ہوتا تھا لیکن پتھروں کا باندھنا امت کی تسلی وتشفی اور فقراء ومساکین کے ساتھ تشبہ اور شرکت کی بناء پر تھا تا کہ امیر کو دیکھ کر وہ بھی دلجمعی سے کام کریں لیکن یہ توجیہ بھی کچھ بعید معلوم ہوتی ہے کیونکہ پتھروں کا واقعہ غزوہ خندق کا ہے اور اسی غزوۂ خندق کے موقع پر حضرت جابرؓ کہتے ہیں کہ رأیت بالنبی ﷺ خمصاً شدیداً جس کی وجہ سے انہوں نے حضور اقدس ﷺ کی دعوت کا انتظام کیا اور تھوڑے سے کھانے پر آپ ﷺ ایک ہزار صحابہ کو لے کر گئے (۱)۔

(۴) حدّثنا محمّد بن اسمٰعیل ثنا اٰدم بن أبی ایاس ثنا شیبان أبو معاویة ثنا عبد الملک بن عمیر عن أبی سلمة بن عبد الرحمٰن عن أبی هریرة قال خرج النّبیّ ﷺ فی ساعة لایخرج فیها ولایلقاه فیها احدٌ فاتاه أبوبکر فقال ماجاء بک یا ابابکر فقال خرجت القی رسول اللّٰه ﷺ وانظر فی وجهه والتسلیم علیه فلم یلبث ان جاء عمر فقال ماجاء بک یاعمر قال الجوع یارسول اللّٰه فقال النّبیّ ﷺ واناقد وجدت بعض ذلک فانطلقوا الی منزل أبی الهیثم بن التیهان الانصاری وکان رجلا کثیر النخل والشجر والشاء ولم یکن له خدمٌ فلم یجدوه فقالوا لامرأته این صاحبک فقالت انطلق یستعذب لنا الماء فلم یلبثو ان جاء ابو الهیثم بقربة یزعبها فوضعها ثم جاء یلتزم النّبیّ ﷺ یفدیه بابیه واُمه ثمّ انطلق بهم إلیٰ حدیقته فبسط لهم بساطاً ثمّ انطلق الی النخلة فجاء بقنو فوضع فقال النّبیّ ﷺ أفلاتنقّیت لنا من رطبه فقال یا رسول اللّٰه ﷺ إنّی اردت ان تختاروا او تخیّروا من رطبه وبسره فاکلوا وشربوا من ذلک الماء فقال النّبیّ ﷺ هذا والذی نفسی بیده

(۱) بخاری شریف ج۲ ص ۵۸۹

من النعیم الذی تسئلون عنه یوم القیامة ظلٌّ باردٌ ورطبٌ طیّب وماءٌ بارد فانطلق أبالھیثم لیصنع لھم طعاماً فقال النّبیّﷺ لاتذبحنّ لنا ذات درّ فذبح لھم عناقاً اوجدیاً فاتاھم بھا فاکلوافقال النبیﷺ ھل لک خادمٌ قال لاقال فاذااتاناسبیٌ فاتنا فاتی النبیﷺ برأسین لیس معھما ثالث فاتاہ ابوالھیثم فقال النبیﷺ اختر منھما فقال یانبی اللّٰہ اخترلی فقال النبیﷺ إنّ المستشار مؤتمن خذ ھذا فإنّی رأیتہ یصلّی واستوص بہ معروفا فانطلق أبوالھیثم إلیٰ امرأتہ فاخبرھا بقول رسول اللّٰہﷺ فقالت امرأتہ ماانت ببالغ مال فیہ النّبیّﷺ إلاّ ان تعتقہ قال فھو عتیق فقال النّبیّﷺ ان اللّٰہ تعالیٰ لم یبعث نبیًا ولاخلیفة إلاّولہ بطانتان بطانة تأمرہ بالمعروف وتنھاہ عن المنکر وبطانةٌ لاتألوخبالا ومن یوق بطانةَ السُّوء فقدوقی(۱).

ترجمہ: حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ نبی کریمﷺ ایک مرتبہ گھر سے ایسے وقت نکلے جس میں عموماً وہ گھر سے نہیں نکلتے تھے نہ کوئی شخص آپﷺ سے اس وقت ملاقات کرنے آتا تھا ایسے میں ابوبکرصدیقؓ بھی تشریف لائے آپﷺ نے ابوبکرؓ سے پوچھا کہ تیرے آنے کا سبب کیا ہے وہ بولے کہ (بھوک نے ستایاتو) رسول اللہﷺ کی ملاقات، رخ انور پرنظر ڈالنے اور سلام عرض کرنے کیلئے نکل آیا۔ تھوڑی دیر گزری تھی کہ حضرت عمرؓ بھی حاضر ہوئے۔ حضور اقدسﷺ نے پوچھا تم کیوں آئے اے عمر؟ انہوں نے عرض کیا یارسول اللہﷺ بھوک لگی تھی (سوچا کہ دیدار سے مٹاؤں) نبی اکرمﷺ نے فرمایا کہ مجھے بھی کچھ بھوک محسوس ہورہی ہے۔ اس کے بعد

(۱) سنن أبی داؤد ۲/ ۳۵۱ کتاب الادب باب المشورة، جامع ترمذی ۲/ ۶۱۵ کتاب الزھد باب ماجاء فی معیشة اصحاب النبیﷺ، سنن ابن ماجة ص۲۶۷ کتاب الادب باب المستشار مؤتمن(مختار)

تینوں حضرت ابوالھیثم بن التیھان انصاریؓ کے مکان پر تشریف لے گئے۔وہ کھجور کے درختوں اور مویشی کے مالک (دولتمند صحابی) تھے لیکن (چونکہ) خادم ان کا کوئی نہیں تھا اس لئے انہوں ان کو گھر پر نہیں پایا۔ انہوں نے اس کی بیوی سے دریافت کیا کہ تیرا خاوند کہاں ہے؟ وہ بولیں کہ وہ تو میٹھا پانی لانے کیلئے گئے ہیں۔زیادہ وقت نہیں گزرا تھا کہ ابوالہیثمؓ (بھاری) مشک بدقت اٹھائے ہوئے گھر آ گئے۔مشکیزہ رکھا پھر آ کر نبی اکرم ﷺ سے لپٹ گئے اور ان پر ماں باپ نثار کرنے لگے۔اس کے بعد ان سب کو اپنے باغ میں لے چلے۔بچھونا بچھا کر ان کو بٹھایا۔اور کھجور کے ایک درخت کی طرف گئے اس سے ایک خوشہ لا کر (مہمانوں کے سامنے) رکھ دیا۔(یہ دیکھ کر) نبی اکرم ﷺ نے فرمایا کہ تم نے (درخت کے اوپر ہی سے) ہمارے لئے پکی کھجوریں کیوں نہیں چنیں۔ انہوں نے عرض کیا کہ میرا خیال تھا کہ تم لوگ خود ہی پختہ یا نیم پختہ (من پسند) کھجوریں چن لو (تو اچھا ہوگا) انہوں نے کھجوریں کھائیں۔ پانی پیا تو نبی اکریم ﷺ نے فرمایا اس رب کی قسم جس کے قبضے میں میری جان ہے۔ یہ نعمتیں ان نعمتوں میں سے ہیں جن کے بارے میں قیامت کے روز تم سے سوال کیا جائے گا۔ یہ ٹھنڈا سایہ یہ میٹھے کھجور اور یہ ٹھنڈا پانی۔**تسئلن یومئذٍ عن النعیم (الآیة)**

بعد ازاں ابوالھیثمؓ مہمانوں کیلئے کھانا تیار کرنے جانے لگے تو نبی اکرم ﷺ نے فرمایا کہ ہمارے لئے دودھ دینے والا جانور ذبح نہ کرنا (یہ سن کر) انہوں نے بکری کا یک مادہ یا نر بچہ ذبح کیا اور (پکا کر) لے آیا۔تینوں مہمانوں نے اسے تناول فرمایا۔ پھر نبی اکرم ﷺ نے پوچھا کہ کیا تیرا کوئی خادم (غلام یا کنیز) ہے عرض کیا نہیں۔ آپ ﷺ نے فرمایا کہ جب ہمارے پاس جنگی قیدی آ جائیں تو تم میرے پاس (اپنی حاجت یاد دلانے کیلئے) آ جانا اس کے بعد نبی اکرم ﷺ کے پاس دو غلام لائے گئے جن کے ساتھ تیسرا نہیں تھا (صرف دو تھے) تو ابوالھیثمؓ ان کے پاس آئے۔ نبی

اکرم ﷺ نے (حسب وعدہ) فرمایا کہ ان دونوں میں سے ایک چن کر لے جاؤ۔ انہوں نے عرض کیا کہ یارسول اللہ ﷺ آپ ہی میرے لئے ایک کو پسند فرمائیں تو نبی اکرم ﷺ نے فرمایا کہ بیشک جس سے مشورہ طلب کیا گیا ہو اس کو امانت سپرد کی گئی ہے (امین کی طرح درست مشورہ دینا چاہئے) یہ غلام لےلو کیونکہ میں نے اسے نماز پڑھتے دیکھا ہے لیکن اس کے ساتھ بھلائی کا معاملہ برتنے کی وصیت بھی مجھ سے قبول کرلو۔ ابوالھیثمؓ اپنے گھر بیوی کے پاس (غلام لے کر) آئے اور نبی اکرم ﷺ کے فرمان کا ذکر کیا۔ بیوی نے کہا کہ تم اس غلام کے حق میں نبی اکرم ﷺ کے ارشاد کو پورا نہیں کرسکتے سوائے اس صورت کے کہ تم اسے آزاد کردو۔ ابوالھیثمؓ نے فرمایا کہ پھر تو یہ آزاد ہے نبی اکرم ﷺ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے جو بھی نبی یا خلیفہ منتخب کیا اس کیلئے دو رازدار ساتھی ہوتے ہیں۔ ایک رازدار ساتھی اسے نیکیوں کا مشورہ دیتا ہے اور برائی سے روکتا ہے۔ اور دوسرا رازدار ساتھی اس کے فساد اور خسارے میں کوئی کسر نہیں چھوڑتا۔ اور جو بھی شخص برے ساتھی سے بچایا گیا۔ اس کو درحقیقت خسارے سے بچایا گیا۔

و لایلقاہ فیہ احد، یعنی عادتاً اس وقت میں آپ ﷺ سے کسی کی ملاقات نہیں ہوتی تھی یہ نہیں کہ آپ ﷺ نے ملاقات پر پابندی لگائی تھی ورنہ پھر اسی وقت میں شیخین آپ ﷺ کی ملاقات کی جرأت کیونکر کرتے۔ عموماً گرمی کے موسم میں دوپہر کے وقت دوسروں سے ملاقات عادتاً نہیں ہوتی۔ بس اسی کا ذکر ہے۔

شیخینؓ کی تنگدستی: **فقال خرجت القی الخ،** یعنی اُریدان القیٰ یالعلّی القیٰ اور **والتسلیم علیہ** فعل کی تقدیر کے ساتھ القیٰ پر عطف ہے یعنی **و اتشرف بالتّسلیم علیہ** مطلب یہ ہے کہ میں اس وقت گھر سے نکلا ہوں اس بناء پر کہ شاید نبی اکرم ﷺ سے ملاقات ان کی دیدار اور ان پر سلام کا شرف حاصل ہوجائے۔ شراح کہتے ہیں کہ ابوبکر صدیقؓ کو بھی بھوک ہی نے ستایا تھا۔ مگر ان کی بھوک ملاقات محبوب سے

مٹ جاتی تھی اوراسی وجہ سے انہوں نے یہ تعبیر فرمائی۔ادھر دو قالب یک جان کے مصداق نبی اکرم ﷺ کو بھی نورِ نبوت سے یہ علم ہوا کہ صدیقؓ کو بھوک نے ستایا ہے اسے غذا کی ضرورت ہے۔ چنانچہ آپ ﷺ نے گھر سے باہر نکل کر ان کا استقبال کیا پھر حسنِ ادب کا تقاضا تھا کہ صدیقؓ نے بھوک کی شکایت تو نہیں کی البتہ تحدیث بالنعمۃ کے طور پر حضور اقدس ﷺ سے ملاقات پر مسرّت کا اظہار فرمایا۔

فلم یلبث ان جاء عمر ،یلبث کی ضمیر نبی کریم ﷺ کو یا ابوبکر صدیقؓ کو راجع ہے۔یعنی تھوڑی دیر بعد حضرت عمرؓ تشریف لائے۔

قال الجوع یا رسول اللّٰہ، نبی اکرم ﷺ کے استفسار پر انہوں نے کہہ دیا کہ بھوک کی وجہ سے آپ ﷺ کے پاس آیا ہوں۔حضرت عمرؓ کی مراد بھی بالکل وہی تھی جو صدیق اکبرؓ کی تھی یعنی بھوک نے ستایا تو آیا تا کہ رخِ انور کے دیدار سے بھوک مٹ جائے۔البتہ انہوں نے اصل سبب کا ذکر کیا کیونکہ ظاہر ہے کہ حضرت عمرؓ کے پاس جب کچھ کھانے کو نہیں تھا تو نبی اکرم ﷺ کے پاس کھانے کا موجود ہونا عادتاً بعید تھا۔

وأنا قد وجدت بعض ذٰلک ،یعنی مجھے بھی بھوک لگی ہے۔اس سے معلوم ہوتا ہے کہ نبی اکرم ﷺ کو بھوک لگنا اور طبعی طور پر اس کا تکلیف دہ ہونا مستبعد نہیں اور رب کی طرف سے خورونوش ملنے کے باوجود آپ ﷺ کو بعض مواقع پر اس کا شدید احساس بھی ہوتا تھا مگر ہم پہلے عرض کر چکے ہیں کہ یہ سب کچھ اختیاری تھا اور شیخین بھی اسی طرز کو بالاختیار اپنائے ہوئے تھے۔پھر نبی اکرم ﷺ نے شیخین پر ترحم فرماتے ہوئے ان کے کھانے کا انتظام فرمایا۔

<u>ابوالہیثم:</u> **فانطلقوا إلیٰ منزل ابی الهیثم الخ**، ابوالہیثم بن التیہان بن مالک بن عتیک بن عمرو انصاری صحابی ہیں۔ بنو اوس سے ان کا تعلق ہے۔کنیت سے مشہور ہیں۔بقول ابن حجرؒ ان کا نام مصنف عبدالرزاق میں عبداللہ مذکور ہے۔لیکن ملا علی قاریؒ لکھتے ہیں کہ خود ابوالہیثم کا نام مالک بن عمرو بن الحارث یا مالک بن عتیک بن عمرو ہے۔ بیعت عقبہ میں شرکت فرمائی بلکہ اوس کے بنوعبدالاشہل کی طرف سے آپؓ اور اسید بن حضیرؓ کو نقیب شمار کیا جاتا ہے لیکن ابن اسحاقؒ کا خیال ہے کہ ابوالہیثمؓ کا تعلق بنو قضاعہ سے ہے وہ بنوعبدالاشہل کے حلیف تھے۔اسی وجہ سے ان میں سے گنے جاتے ہیں۔ بعثت نبوی سے قبل آپؓ

نے عیسائی مذہب کے مطابق رھبانیت اختیار کی تھی۔اسلام قبول کرنے کے بعد اسے خیر باد کہا۔

نبی اکرم ﷺ نے ان کے اور حضرت عثمان بن مظعونؓ کے درمیان مواخات قائم کی تھی۔غزوۂ بدر اور اس کے بعد تمام غزوات میں شریک رہے۔آپؓ کی روایات کم ہیں بلکہ علامہ ابن حجرؒ نے ان سے مروی صرف دو روایات کی نشاندہی کی ہے اور ان پر بھی سنداً کلام کی طرف اشارہ کیا ہے۔اس کی بڑی وجہ یہ ہے کہ آپ قدیم الوفات صحابہ میں سے ہیں۔اکثر مؤرخین کے ہاں آپؓ ۲۰ھ میں وفات پائے تھے۔بعض نے ۳۷ھ کا بھی ذکر کیا ہے جبکہ بعض نے کہا ہے کہ وہ نبی اکرم ﷺ کی زندگی میں وفات پائے تھے لیکن ۲۰ھ یا ۲۱ھ کا قول راجح معلوم ہوتا ہے۔

نبی اکرم ﷺ کے ساتھ آپؓ کی محبت کا اندازہ زیر نظر حدیث سے تو ہو ہی جاتا ہے لیکن ایک شعر میں آپ نے اپنے دل کی ترجمانی یوں کی ہے

لقدجدعت آذاننا و انوفُنا غداة فُجعنا بالنبیّ محمّد ﷺ

یعنی جس روز ہمیں محمد ﷺ کی فراق کا صدمہ پہنچے اسی روز ہم اپنی کانوں اور ناک سے محروم ہوجائیں۔

فانطلقوا الی منزل أبی الھیثم بن التیھان بعض دیگر روایات میں ابوایوب انصاری(۱) کا ذکر ہے۔علامہ مناویؒ نے لکھا ہے کہ نبی اکرم ﷺ ابتداءً کسی خاص شخص کے پاس جانے کیلئے نہیں نکلے تھے بلکہ توکل کر کے گھر سے نکلے اور اتفاقاً ابوالہیثم کے باغ کا رخ کیا یہ سعادت انہی کیلئے مقدر تھی۔

وکان رجلاً کثیر النخل و الشاہ الخ، شاء شاۃ کی جمع ہے جس کی اصل شاھۃٌ ہے۔اس کی جمع شیاہ بھی آتی ہے یعنی وہ کھجور کے بہت سے درختوں اور بہت سے مویشی کے مالک تھے البتہ ان کے پاس خادم یعنی غلام اور کنیز کوئی نہیں تھا۔کام کاج خود کرنا پڑتا تھا۔

---

(۱)وفی روایة عندالطبرانی و ابن حبان فی صحیحه أبی أیوب أنصاری فالقضیة متعددة. وفی روایة لمسلم رجلاً من الأنصار وھی محتمله لھما وعلی کل ففیه منقبة عظیمة لکل منھما اذأھّله ﷺ لذٰلک ۱۲ جمع الوسائل ج۲ ص۲۳۷ (اصلاح الدین)

فقالوا لامرأته این صاحبک، صاحب سے مراد خاوند ہے(۱)۔**فقالت انطلق یستعذب الماء** یعنی پینے کیلئے میٹھا پانی لانے کیلئے گئے ہیں۔مسلم شریف کی روایت میں ہے کہ **فلما رأته قالت مرحباً واھلاً** یعنی خاتون خانہ نے ان معزز مہمانوں کو دیکھ مرحبا کہاوہ نیک خاتون تھی۔نبی اکرم ﷺ اور شیخین کو بن بلائے گھر میں پایا تو بڑی سعادت سمجھ کران کا استقبال کیا ۔

وہ آئے گھر میں ہمارے خدا کی قدرت ہے ۔ کبھی ہم ان کو کبھی اپنے گھر کو دیکھتے ہیں

پھر شوہر کے بارے میں بتایا۔وہ بھی تھوڑی ہی دیر بعد گھر آ گیا۔

زعب کا مطلب: **جاء بقربة یزعبھا، زعب یزعب باب فتح** سے ہے۔اس کے متعدد معانی منقول ہیں۔اول یہ کہ زعب القربۃ کا معنی ہے ملأالقربۃ یعنی مشک بھرنا۔دوم یہ بھرے ہوئے مشک کو اٹھانے کے معنی میں مستعمل ہے۔سوم بعض حضرات جیسے صاحب نہایہ نے یہ معنی بھی کہا ہے کہ زعب ٹھیک اور مضبوطی سے تھام کر اٹھانے کو کہتے ہیں لیکن صحاح وغیرہ میں اس کا معنی سیلاب کیلئے بولا جاتا ہے جو وادی کے کناروں سے ٹکراتا ہوئے چلے۔عموماً پانی سے بھرا ہوا بڑا برتن کا سنبھالنا مشکل ہوتا ہے اور اٹھاتے ہوئے ادھر ادھر جھٹکے لگتے ہیں۔اسی کو زعب کہتے ہیں گویا بڑا بھاری مشک اٹھائے ہوئے۔

ابوالہیثمؓ کی مہمان نوازی: حضرت ابوالہیثمؓ گھر آئے۔**ویفدیہ الخ،** یعنی حضور اقدس ﷺ کو دیکھ لپیٹ گئے اور فداک ابی وامی (میرے ماں باپ آپ ﷺ پر قربان ہوں) کہنے لگے۔

إلیٰ حدیقته (۲)، حدیقہ اس باغ کو کہتے ہیں جن کی چاردیواری تعمیر کی گئی ہو لیکن توسعاً بغیر چاردیواری والے پر بھی بولا جاتا ہے۔

---

(۱)اس روایت سے معلوم ہوا کہ اگر فتنہ کا خوف نہ ہو تو اجنبی مردوں کا اجنبی عورت سے پردہ کے پیچھے گفتگو یعنی سوال وجواب کرنا جائز ہے کماقال العلامة بیجوریؒ **یؤخذ منه حل تکلم الأجنبیة وسماع کلامھا مع أمن الفتنة وان وقعت فیه مراجعة ثمّ انّا ھذہ المرأة تلقتھم احسن تلقی وانزلتھم اکرم الانزال وفعلت مایلیق بذلک الجناب الافخم والملاذالأعظم یؤخذ منه جوازاذن المرأة فی دخول منزل زوجھا اذاعلمت رضاہ وجوازدخول الضیف منزل الشخص باذن زوجته مع علم رضاہ حیث لاخلوة محرمة(المواھب الدنیة ۲۳۵)(مختار)**

(۲)اس روایت سے یہ بھی معلوم ہوا کہ مہمان کی ضیافت احسن اور بہتر کھانے سے کرنی چاہئے۔**ویؤخذ من الحدیث أنّه ینبغی للمضیف ان یقدم إلیٰ الضیف أحسن ماعندہ(المواھب الدنیة ۲۳۵)(مختار)**

أفلا تنقیت لنامن رطبه، یعنی تم نے سارا خوشہ توڑ کر پیش کر دیا اب ہم کچھ کھالیں گے لیکن باقی ضائع ہو جائے گا۔اس کی بجائے صرف پختہ کھجوریں چُن کر ہمیں لا دیتے تو اچھا ہوتا۔

اردت ان تختاروا او تخیروا، راوی کو شک ہے معنی دونوں کا ایک ہے تخیّر وا اصل میں تتخیّر وا تھا علامۃ مضارع تخفیفاً حذف ہو چکی ہے۔مطلب یہ ہے کہ میں نے سوچا کہ مہمان حضرات اپنی مرضی سے چن چن کر کھائیں تو بہتر ہے ممکن ہے کسی کو پختہ، کسی کو نیم پختہ اور کسی کو خشک کھجور پسند ہوں۔اب جب سارا خوشہ سامنے پڑا ہے تو من پسند لے لیں۔اس عمل میں اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ میزبان کھانا لانے سے قبل کچھ ایسی چیز مہمان کے سامنے پیش کر دے جو بصورت بھوک اس کی بھوک کو کم کر دے جیسا کہ عموماً ہمارے ہاں چائے بسکٹ سے مہمان کی تواضع کی جاتی ہے لیکن میٹھی چیز سے اور خصوصاً پھل سے تواضع سب سے بہتر ہے کیونکہ یہ زود ہضم ہوتا ہے۔

من النعیم الذی تسئلون، یعنی جب کھجور کھا کر ٹھنڈا پانی پیا تو آپ ﷺ نے فرمایا کہ یہ جو کچھ ملا یہ وہ نعمتیں ہیں جن کے بارے میں پوچھا جائیگا جیسا کہ سورۃ التکاثر میں اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں **ثم لتسئلنّ یومئذٍ عن النعیم،** نبی اکرم ﷺ ایک اور حدیث میں فرماتے ہیں **حلالها حساب وحرامها عقاب"** یعنی حلال مال کے حساب اور حرام کے عقاب کا سامنا کرنا ہوگا۔یہاں حلال مال ہے لیکن اس کا بھی حساب ہوگا کہ کہاں سے کمایا اور کہاں صرف کیا۔

ظل بارد ورطب طیب وماء بارد، یہ یا تو ہذا کیلئے خبر ثانی ہے یا مبتدا مقدر کیلئے خبر ہے ابن حجرؒ نے اسے مبتداء یعنی ہذا سے بدل قرار دیا ہے لیکن ملا علی قاریؒ نے اسے درست قرار دینے سے انکار کیا ہے۔

<u>کھجور طعام ہے فاکھۃ:</u> **فانطلق أبو الهیثم لیضع لهم طعاما** اس جملے سے شوافع نے اس بات پر استدلال کیا ہے کہ کھجور طعام نہیں بلکہ فاکھہ ہے کیونکہ یہاں کھجور کھانے کے بعد کہا گیا ہے کہ ابوالہیثم کھانا تیار کرنے کیلئے جانے لگے مگر خود ملا عصامؒ نے اس پر اعتراض کیا ہے کہ دلیل درست نہیں۔اس حدیث سے زیادہ سے زیادہ یہ ثابت ہو سکتا ہے کہ کھجور تیار کیا ہوا طعام نہیں ہے۔مطلق طعام ہونے کی نفی پر حدیث دلالت نہیں کرتی۔امام ابوحنیفہؒ کے ہاں کھجور فاکھہ یعنی پھل نہیں بلکہ غذا ہے دلیل قرآن مجید کی آیت **فیهافاکهة ونخل ورمّان(الآیة)** ہے کیونکہ نخل کھجور کو فاکھہ پر عطف کیا گیا ہے اور یہ مغائرت کا

مقتضی ہے تفصیل فقہ اور اصول فقہ کی کتابوں میں آپ پڑھ چکے ہیں۔

دودھ والے جانور کی ذبح: لاتذبحنّ لنا ذات درّ درّ دودھ کو کہا جاتا ہے دودھ والے جانور کو ذبح کرنے سے نبی اکرم ﷺ نے منع فرمایا اس نہی سے ایسے جانور کے گوشت کو حرام یا مکروہ ثابت نہیں کیا جاسکتا کیونکہ یہ نہی صرف ارشاد اور شفقت پر مبنی ہے یعنی جب ذبح کیلئے اور جانور بھی موجود ہیں کیونکہ میزبان ''کثیر الشاۃ'' ہے تو دودھ والی بکری کا ذبح کرنا تکلف باردہ بلکہ مال کو ضائع کرنے کے مترادف ہوگا۔اب اگر کسی نے مہمان کیلئے دودھ دینے والا جانور ہی ذبح کردیا تو بالاتفاق اس کا کھانا جائز ہوگا۔

فذبح لھم عناقاً او جدیاً بکری کے مادہ بچے کا جو چار ماہ کو ہو عناق اور اسی عمر کے نر بچے کو جدی کہا جاتا ہے۔بعض اہل لغت کے ہاں سال سے کم بکری کے بچے کو عناق اور جدی کہا جاتا ہے۔

ھل لک خادم ، نبی اکرم ﷺ نے غلام کو نہ پا کر بھی یہ سوال اس لئے کیا کہ ممکن ہے کہ غلام یا کنیز تو ہو لیکن اس وقت حاضر نہ ہو۔

فاذااتاناسبیٌ جنگ میں قیدی بننے والوں کا عموماً استرقاق کیا جاتا تھا۔اس لئے یہ فرمایا کہ جب ہمارے پاس قیدی بصورت غلام اور کنیز کے آئیں تو مجھے یاددلانا تا کہ گھر کی خدمت کیلئے کوئی غلام یا کنیز دے دوں۔

مشورہ امانت ہے: المستشار موتمن ،یعنی مشورہ طلب کرنے والے نے مستشار پر اعتماد کر کے اس سے مشورہ طلب کیا اور اس پر عمل کرنے کا ارادہ کیا گویا اس نے اپنے اختیار کو اس کے ہاں امانت رکھ دیا۔ اب وہ ٹھیک اور مصلحت کے موافق مشورہ دے گا تو امانت پوری طرح ادا ہوگی اور اگر قصداً خلاف مصلحت مشورہ دے گا تو اس نے گویا مشورہ طلب کرنے والے کے ساتھ خیانت کا معاملہ کیا۔حدیث کا یہ قطعہ کئی صحابہ سے مروی ہے اور تقریباً تواتر کے درجہ میں ہے۔

معیار افضلیت: خُذھذافانّی رایتہ یصلی (۱) خادم کے انتخاب میں نبی اکرم ﷺ نے نماز

---

(۱)علامہ بیجوریؒ نے اس سے دومسائل کا استنباط کیا ہے(۱)یؤخذ منہ أنّہ یستدل علی خیریۃ الانسان بصلاتہ قال تعالیٰ إنّ الصلوٰۃ تنھیٰ عن الفحشاء والمنکر(۲)یؤخذ ایضاً انّہ ینبغی للمستشار ان یبیّن سبب اشارتہ بأحد الامرین لیکون اعون للمستشیر علی الامتثال (المواھب ۲۳۷)(مختار)

کومعیار ٹھہرایا ہے۔ افسوس ہے کہ آج نماز کو ایک عیب کی نظر سے دیکھا جارہا ہے۔ ہمارے ایوانوں میں نمازیوں کو قدامت پسند، رجعت پسند اور دقیانوسی خیال کیا جاتا ہے جبکہ تارک صلوٰۃ وصوم کو معزز گردانا جاتا ہے لوگ انتخابات میں بھی اس کا خیال نہیں رکھتے۔ غنڈوں، کرپٹ، بدکردار اور چوروں کو ووٹ دے کر آگے لے آتے ہیں اور پھر نتیجہ سامنے ہے کہ ان کم بختوں کے پیٹ کا جہنم بھرتے نہیں بھرتا۔ دفتروں میں یہی حال ہے داڑھی والے ملازموں اور نمازی افسروں کو ٹھکانا نہیں ملتا۔ دفتر سے اس کو بھگا دیا جاتا ہے۔ اس سے دوسرے دفتر کو فارغ کردیا جاتا ہے کیونکہ وہ نماز پڑھتا ہے۔ حالانکہ نبی اکرم ﷺ کے ہاں ملازمت کی معیار نماز ہونا ہے۔

<u>وصیت اور قبول وصیت:</u> **واستوص بہ معروفا** اس جملے کے دو مطلب بیان کئے جاتے ہیں۔ اولؔ یہ کہ استیصاء وصیت کا معنی یہ ہوگا کہ اس غلام کو خیر کی وصیت کرنا، بھلائی کا حکم دینا۔ دومؔ یہ کہ استیصاء کا معنی طلب وصیت اور قبول وصیت ہو۔ پھر مطلب یہ ہوگا کہ اس غلام کے بارے میں میری طرف سے شفقت اور خیر خواہی کی وصیت قبول کرلو موخر الذکر احتمال کو ملا علی قاریؒ نے اظہر کہا ہے۔

ما انت ببالغ فیه الخ نیک دل بیوی نے شوہر کو مشورہ دیا کہ اگر چہ گھر میں انتہائی ضرورت ہے مگر جب رسول اللہ ﷺ نے اس غلام کی تعریف کی ہے اور اس کے ساتھ حسن سلوک کی تاکید کی ہے تو ایسے غلام کو غلام رکھنا ہی مناسب نہیں آزاد کردینا چاہئے۔

<u>اچھی بیوی دنیا کی بڑی نعمت:</u> **إنّ اللّٰہ لم یبعث نبیا ولا خلیفةً الا وله بطانتان** اور جب نبی کیلئے اور اس کے خلیفہ کیلئے **بطانتان** کو لازم ٹہرایا تو اولیاء، علماء، امراء اور عوام کے لئے تو بطریق اولیٰ یہ بطانتان ہونگے۔ بطانہ ظہارہ کی ضد ہے دراصل اس کپڑے کو کہتے ہیں جو اوپری تہہ کے نیچے پہنا جائے اور بدن سے لگا رہے۔ ایسے کپڑے پر بدن کے راز مخفی نہیں رہتے بلکہ جلد کی رنگت اس کے بالوں، عیوب اور محاسن کا علم ہوتا ہے۔ تو جس کے اخلاص پر اعتماد کرکے آدمی اس کے اوپر اپنے راز ظاہر کرتا رہے اسے بطانۃ کہا جاتا ہے۔

یہاں پر ابوالہیثمؓ کی بیوی کی مدح مقصود ہے کہ وہ ایک مخلص راز دان اور خیر میں معاون بیوی ہے اور

اسی کو "خیر متاع الدنیا" بھی کہا گیا ہے یعنی اچھی بیوی دنیا کا بہترین سرمایہ ہے۔

اچھا اور بُرا ساتھی: ایک دوسری حدیث میں ہر انسان کے ساتھ دو ساتھیوں کا ذکر ہے۔ جن میں سے ایک ملہم فرشتہ اور دوسرا وسوسہ ڈالنے والا شیطان ہے۔ فرشتہ اسے خیر کی دعوت دیتا ہے اور شیطان دوسری طرف لے جانے کی کوشش کرتا ہے۔

وبطانة لاتألوه خبالا تو قصور اور کوتاہی کے معنی میں آتا ہے اور خبال فساد کو کہتے ہیں پھر اُلا یأ لو چونکہ منع یا نقص کے معنی کو متضمن ہے اس لئے یہ دو مفعول کو متعدی ہوتا ہے یہاں بھی معنی یہ ہوگا کہ بطانۃ لا تمنعه و لاینقصه من الخبال یعنی ایک رازدار وہ ہوتا ہے جو اپنے ساتھی کو فساد پر آمادہ کرنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑتا۔

(۵) حدّثناعمربن إسماعيل بن وقاص يقول إنّي لأول رجل اهرق دماًفي سبيل اللّٰه وإنّي لاوّل رجل رمى بسهم في سبيل اللّٰه لقد رأيتني اغزوفي العصابة من أصحاب محمّدﷺ مانا كل الإورق الشجر والحبلة حتّى تقرحت اشداقنا حتّى أنّ احدنا ليضع كما تضع الشاة والبعير وأصحبت بنواسدٍ يعزرونني في الدين لقدخبت اذاً ضل عمل(۱).

ترجمہ: حضرت سعد بن ابی وقاصؓ کہتے ہیں کہ میں پہلا مسلمان ہوں جس نے اللہ تعالیٰ کے راستے میں کسی کافر کا خون بہایا ہو۔ اور میں پہلا مسلمان ہوں جس نے اللہ کے راستے میں کافروں کو تیر مارا ہو۔ اور خود نبی اکرمﷺ کے صحابہ کی ایک جماعت کی معیت میں جہاد کرتے ہوئے یہ دیکھا تھا کہ ہمارے کھانے پینے کے لئے سوائے درخت (کے پتوں) اور کیکر کے تخم کے اور کوئی چیز نہیں ہوتا تھا یہاں تک کہ ہماری

---

(۱)صحيح بخاری ۱/۵۲۸ كتاب فضائل الصحابه باب مناقب سعد بن ابی وقاص، صحيح مسلم ۲/۴۰۸ كتاب الزهد والرقائق باب في ذكر مامضى على الصحابة رضى الله عنهم من الزهادة فى الدنيا الخ، جامع ترمذی ۲/۱۱۵ كتاب الزهد باب ماجاء فى معيشة النبیﷺ.(مختار)

باچھیں پھٹ کر زخمی ہوگئیں اور یہاں تک کہ ہم میں سے ایک شخص بکری اور اونٹ کی طرح پاخانہ کرتا تھا پھر بھی بنواسد کے لوگ دین (نماز) کے بارے میں مجھے کوستے ہیں (اگر میں دین سے بے فکر رہا) پھر تو حقیقۃً نامراد رہا اور میری مساعی رائیگاں گئیں۔

<u>حضرت سعد بن ابی وقاصؓ پہلا تیر انداز:</u> إنــیّ لاوّل رجـل الخ حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ متقدمین فی الاسلام صحابہ میں سے ہیں۔ ابتداء میں صحابہ مشرکین کے خوف سے چھپ کر نمازیں پڑھا کرتے تھے۔ ایسے ہی ایک موقع پر جب صحابہ کرامؓ ایک گھاٹی میں نماز ادا کر رہے تھے۔ مشرکین آئے اور صحابہ کو تنگ کرنا شروع کردیا۔ صحابہ کرامؓ اور ان کے درمیان تو تو میں میں نے طول پکڑا اور ہاتھاپائی تک نوبت آئی۔ حضرت سعدؓ نے اونٹ کے جبڑے سے ایک کافر پر وار کردیا جس سے وہ زخمی ہوا اور یہ کسی کافر کا سب سے پہلا خون تھا جو کسی مسلمان کے ہاتھ سے بہا ہو۔ اسی کا ذکر حضرت سعدؓ بیان کر رہے ہیں۔

وإنّی لاوّل رجل رمیٰ بسهم الخ، علامہ مناویؒ لکھتے ہیں کہ ۴؍شوال ۱ھ کو نبی اکرم ﷺ نے اپنے چچازاد بھائی عبیدہ بن الحارثؓ (شہید بدر) کو جھنڈا دے کر ۶۰ مجاہدین کے ساتھ (رابغ کی طرف) مشرکین کے خلاف روانہ کیا۔ مشرکین سے آمنا سامنا ہوا جن کی قیادت ایک قول کے مطابق ابوسفیان کے ہاتھ میں تھی۔ اس میں اگرچہ باقاعدہ جنگ تو نہیں ہوئی لیکن ایک دوسرے پر تیروں سے حملہ کیا گیا۔ مسلمانوں کی طرف سے سب سے پہلا تیر حضرت سعد بن ابی وقاصؓ نے چلایا۔ یہاں حضرت سعدؓ اسی کا تذکرہ کر رہے ہیں۔

لیکن فتح الباری وغیرہ میں آیا ہے کہ ہجرت کے تقریباً ایک سال بعد صفر میں نبی اکرم ﷺ خود قریش کے مقابلے میں نکلے اور ابواء یا ودّان کے مقام تک گئے۔ یہیں سے آپ ﷺ نے عبیدہ بن الحارثؓ کے سریہّ کو بھیجا۔ جس میں حضرت سعدؓ نے سب سے پہلے تیر چلایا(۱)۔

(۱) فتح الباری ج ۷ ص ۳۵۵

غزوۂ خبط وسیف البحر: وقد رایتنی اغزوفی العصابة الخ، عصابہ دس سے چالیس تک کی جماعت کو کہتے ہیں۔ ان حملوں میں حضرت سعدؓ جس غزوہ کا ذکر کرتے ہیں اسے غزوۂ خبط اور غزوۃ سیف البحر کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ علامہ ابن حجرؒ ابن سعدؒ سے نقل کرتے ہیں کہ نبی اکرم ﷺ نے رجب ۸ھ میں بنو جھینہ کی سرکوبی کیلئے حضرت ابوعبیدہ بن الجراحؓ کو تین سو صحابہ کے ساتھ ساحلی شہر قبلیہّ کی طرف بھیجا۔ علامہ ابن حجرؒ کہتے ہیں کہ صحیحین کی روایت میں یہ آتا ہے کہ یہ سریہّ قریش کے قافلے کیلئے بھیجا گیا تھا۔ اسلئے یہ ۶ھ کے اواخر سے پہلے کا واقعہ ہونا چاہئے رجب ۸ھ میں تو قریش کے ساتھ صلح کا زمانہ تھا الاّ یہ کہ قریش کے قافلے کی بنو جھینہ سے حفاظت کیلئے آپ ﷺ نے لشکر بھیجا ہو۔

اس غزوہ میں تین سو مجاہدین کو ایک بوری کھجور بطور زاد دیا گیا تھا۔ راستے میں رفتہ رفتہ یہ زاد ختم ہو گیا اور مجاہدین کیکر کے پتوں اور اس کے تخم کھانے پر مجبور ہو گئے جس کی وجہ سے صحابہ کے ہونٹ پھٹ گئے اور ان کی قضائے حاجت بھی بھیڑ بکریوں کی مینگنیوں کی طرح نکلنے لگی۔ بعد میں انہوں نے ساحل سمندر پر ایک بہت بڑی مچھلی پائی جس کا گوشت وہ تقریباً اٹھارہ دن تک کھاتے رہے بلکہ مدینہ واپسی تک اسی سے گزارا چلتا رہا۔ یہیں سے ترجمۃ الباب کا استنباط بھی ہوتا ہے کیونکہ ظاہر ہے کہ صحابہ کرامؓ کی زندگی جب اتنی تنگ تھی تو اس سے نبی اکرم ﷺ کی تنگدستی کا اندازہ بخوبی لگایا جا سکتا ہے۔

سعدؓ پر نکتہ چینی کا پس منظر: ثم اصبح بنو اسد یعزّروننی فی الدین الخ، یعنی باوجود قدیم الاسلام ہونے انتہائی صعوبتیں برداشت کرنے اور نبی اکرم ﷺ کی قریبی مصاحبت کے بنو اسد مجھے دین (نماز) کے سلسلے میں کوستے ہیں۔

بنو اسد بن خزیمہ بن مدرکہ بنو مضر کی ایک شاخ ہے۔ نبی اکرم ﷺ کی وفات کے بعد یہ قبیلہ مرتد ہو گیا تھا اور طلیحہ بن خویلد الاسدی کی متابعت اختیار کر لی تھی جو نبوت کا دعویٰ کر چکا تھا۔ حضرت ابوبکر صدیقؓ نے حضرت خالد بن ولیدؓ کو ان کے مقابلے کیلئے بھیجا۔ طلحہؓ اور ان کے ساتھیوں نے توبہ کی ان کی اکثریت کوفہ میں آباد تھی۔ طلیحہ جنگ نہاوند میں ۲۱ھ کو شہید ہوئے۔

حضرت عمرؓ کے زمانے میں حضرت سعدؓ کوفہ کے امیر مقرر ہوئے۔ بنو اسد حضرت سعدؓ سے ناراض

ہوئے۔انہوں نے حضرت عمرؓ کے پاس شکایات کیں جن میں سے ایک شکایت یہ بھی تھی کہ حضرت سعدؓ نماز اچھی طریقہ سے نہیں پڑھ سکتے (۱)۔

حضرت عمرؓ نے باز پرس کیلئے حضرت سعدؓ کو مدینہ بلوایا۔ جواب طلبی کی تو آپؓ نے یہ بیان دیا کہ بنواسد کو تو میری نماز پر اعتراض ہے کیا یہ ممکن ہے کہ میرے جیسے شخص کو نماز کا بھی علم نہ ہو۔

حضرت عمرؓ نے مزید تحقیق کیلئے دوآدمی کوفہ بھیجے۔ جنہوں نے ہر محلے کی مسجد میں جا کر حضرت سعدؓ کے بارے میں دریافت کیا کسی کو بھی آپ پر حرف گیری کی جرأت نہیں ہوئی۔صرف ایک شخص نے ان کے بارے میں کہا کہ حضرت سعدؓ میں تین عیب ہیں(۱) جہاد کیلئے نہیں نکلتے (۲) مال کی تقسیم میں برابری نہیں کرتے (۳) فیصلوں میں انصاف نہیں کرتے۔حضرت سعدؓ کو علم ہوا تو انہوں نے کہا کہ اس شخص نے تین شکایات کی ہیں۔اس لئے میں تین بددعائیں کرتا ہوں اے اللہ اگر یہ شخص جھوٹا ہے محض شہرت کیلئے یہ تنقید کی ہے تو اس کی عمر طویل کردے اس کی فقر میں اضافہ کردے اور اسے فتنوں میں مبتلاء کردے۔حدیث کا راوی کہتا ہے کہ میں نے دیکھا کہ اس شخص کی ابروئیں بڑھاپے کی وجہ سے آنکھوں پر جھکی ہوئی تھیں۔فقر کی وجہ سے وہ بھیک مانگتا تھا اور گلیوں میں چھوٹی بچیوں کو چھیڑا کرتا تھا۔کوئی اس حال کے بارے میں پوچھتا تو اقرار کرتا کہ مجھے سعدؓ کی بددعا لگ گئی ہے۔

لقدخبت اذاالخ، یعنی اگر میں باوجود اتنی مشقتیں جھیلنے کے دین بھی نہ سیکھ سکا۔نماز پڑھنا بھی نہ سیکھ سکا تو پھر تو دنیا وآخرت میں میری نامرادی ظاہر ہے۔

(۲) حدّثنامحمّدبن بشّارثنا صفوان بن عیسیٰ ثناعمرو بن عیسیٰ ابونعامة العدی وقال سمعت خالد بن عمیر وشویسااباالرقادقالابعث عمربن الخطاب عتبة بن غزوان وقال انطلق انت ومن معک حتی اذا کنتم فی اقصی ارض العرب وادنی بلاد ارض العجم فاقبلوا حتی اذاکانوا بالمربدوجدواهذاالکذّان فقالوا ماھٰذه قالواھذه البصرة

---

(۱)وکانواوشوابه إلیٰ عمر قالوا لایحسن یصلّی(بخاری ج ۱ ص۵۲۸)۱۲ (اصلاح الدین)

فساروا حتی اذا بلغوا حیال الحسر الصغر فقالوا ههنا امرتم فنزلوا فذکروا الحدیث بطوله قال فقال عتبة بن غزوان لقد رأیتنی وانی لسابع سبعة مع رسول اللّٰه ﷺ مالنا طعام الاورق الشجر حتی تقرحت اشداقنا فالتقطت بردة فقسمتها بینی وبین سعد فمامنا من اولئک السبعة احدا لاوهو امیر مصر من الامصار ویستجربون الامراء بعدنا(۱).

ترجمہ: راوی(خالدؒ اور شویسؒ) کہتے ہیں کہ حضرت عمرؓ نے حضرت عتبہ بن غزوانؓ کو(بصرہ کی طرف) روانہ کیا اور نصیحت کی کہ تم اور تمہارے ساتھی جاؤ۔ جب تم عرب کی زمین کے آخری کنارے اور عجم کی زمین کے قریب پہنچو(تو وہیں ڈیرہ ڈال دو) چنانچہ یہ لوگ آئے۔ جب وہ مربد کے مقام پر پہنچے تو انہوں نے یہ(عجیب) سفید نرم پتھر دیکھے۔ انہوں نے آپس میں پوچھا دوسروں نے جواب دیا کہ یہ بصرہ(سفید نرم پتھر) ہیں پھر وہ کچھ آگے بڑھے۔ جب وہ چھوٹے پل کے برابر آئے تو یہ طے پایا کہ یہی وہ جگہ ہے جس جگہ(حضرت عمرؓ کی طرف سے) ٹھہرنے کا حکم ملا ہے۔ چنانچہ وہیں اس لشکر نے پڑاؤ ڈالا۔ اس کے بعد راویوں(خالد اور شویس) نے تفصیل کے ساتھ قصہ ذکر کر دیا۔ راوی کہتے ہیں کہ پھر عتبہ بن غزوانؓ نے فرمایا کہ میں نے خود کو دیکھا تھا جب میں سات میں سے ساتواں شخص نبی اکرم ﷺ کے ساتھ تھا۔ ہمارے پاس کھانے کی کوئی چیز نہیں ہوتی تھی سوائے درختوں کے پتوں کے حتیٰ کہ(پتے کھانے سے) ہماری باچھیں پھٹ کر زخمی ہوگئیں۔(ایک دفعہ) مجھے ایک چادر ملی میں نے اسے اور سعدؓ کے درمیان دو حصوں میں بانٹ دیا۔ ان سات صحابہؓ میں سے

---

(۱)صحیح مسلم ۴۰۹/۲ کتاب الزهد والرقائق، مصنف بن ابی شیبة ۵۴/۱۳، جامع ترمذی ۵۳۷/۲ کتاب صفة جهنم باب ماجاء فی قعر جهنم، مسنداحمد ۱۷۴/۴ (مختار)

کوئی بھی نہیں رہا وہ کسی علاقہ کا امیر بن چکا ہے اور ہمارے بعد ہی تم (بُرے) امراء کا تجربہ بھی کرلو گے۔

حضرت عمرؓ کا بعثت عتبہ: بعث عمر بن الخطابؓ یہ واقعہ حضرت عمرؓ کے زمانہ خلافت کا ہے۔ کیونکہ اس میں بصرہ کی آبادکاری کا ذکر ہے جو ۱۴ھ میں تعمیر ہوگیا تھا(۱)۔ حضرت عمرؓ نے عتبہ بن غزوان کو جس مہم پر روانہ کیا تھا۔ اس کا پس منظر یہ ہے کہ حضرت عمرؓ کو اطلاع ملی کہ یزدجرد نے ہندوستان کے بادشاہوں سے مدد کا مطالبہ کیا ہے تاکہ وہ مسلمانوں کے خلاف لڑائی لڑیں چونکہ عجم کیلئے عربوں پر حملہ کرنے کا یہی راستہ متعین تھا۔ اس لئے حضرت عمرؓ نے اس کی ناکہ بندی کیلئے حضرت عتبہؓ کو تین سو مجاہد لیکر پہرہ دینے کا حکم دیا۔

عتبہ بن غزوانؓ: عتبہ بن غزوانؓ ابن جابر بن وھب مازنی صحابی ہیں۔ جو بنی عبد شمس یا بنی نوفل کے حلیف تھے۔ ابتدائی زمانہ نبوت میں ہی اسلام سے سرفراز ہوئے۔ حبشہ کی طرف ہجرت فرمائی پھر وہاں سے مدینہ کی طرف ہجرت کی۔ بدر اور بعد کے تمام غزوات میں شریک رہے۔ حضرت عمرؓ نے مشرقی سرحد کی طرف بھیجا تو دریائے دجلہ پہنچنے کے بعد پڑاؤ ڈالا۔ وہاں صاحب فرات سے مڈبھیڑ ہوئی جو چار ہزار کا لشکر لے کر آیا تھا۔ اللہ تعالیٰ کی نصرت سے مسلمانوں کو فتح حاصل ہوئی۔

شہر بصرہ کا قیام: ان سے فراغت کے بعد حضرت عمرؓ کے پاس قاصد بھیجا کہ اس جگہ ایک ایسا شہر ہونا چاہئے جو مسلمانوں کا مرجع ہوتا کہ فراغت کے اوقات میں وہ سکون کے ساتھ وہاں رہ سکیں۔ حضرت عمرؓ نے اجازت دیدی۔ بشرطیکہ وہ جگہ پانی اور چارے کے قریب ہو۔ چنانچہ آپؓ نے بصرہ کی جگہ کا انتخاب کیا اور وہاں فوجی نقشہ کے مطابق شہر کی بنیاد ڈالی۔ ابتداء میں بانس اور لکڑی سے گھروں کی تعمیر کی جو وہاں بکثرت ہوتے تھے۔ مسجد بھی بانسوں سے بنائی گئی اور ۱۴ھ میں یہاں مجاہدین کی ایک چھاونی آباد ہوگئی۔

---

(۱)قال فی الجمع ثم البصره بناها عتبه بن غزدان فی خلافة عمرؓ سنہ ۱۷ھ وقیل سنہ ۱۸ھ قیل ولم یعبد بارضها ضم ویقال لها قبة الاسلام وخزانة العرب(جمع ج ۲ ص ۲۴۵)هذاولکن رایت فی شذرات الذهب ج ۱ ص ۳۴ ان عتبةؓ مصرّها سنہ ۱۴ھ والیه ذهب المؤرخون ولعلّه الراجح فان عتبةؓ مات سنہ ۱۷ھ علی الراجح،(اصلاح الدین حقانی)

حضرت عتبہؓ حسین اور بلند قد وقامت کے مالک تھے، انتہائی جفاکش تھے۔ اخیر عمر میں حضرت عمرؓ کے پاس آئے تاکہ امارت سے معذرت کرلیں مگر حضرت عمرؓ نے استعفیٰ قبول نہیں کیا چنانچہ واپس ہوئے راستے ہی میں ۱۷ھ کو وفات پائی۔ جبکہ بعض روایات کے مطابق ۲۰ھ کو وفات پائی۔

حتی اذا کانوا بالمربد مربد بصرہ میں ایک جگہ کا نام ہے۔ اصل میں مربد اونٹ باندھنے کی جگہ کو بھی کہتے ہیں نیز کھجور سکھانے کے خرمن کو بھی مربد کہا جاتا ہے۔**وجدوا هذا الكذان** کذان اس سفید قسم کے پتھر کو کہتے ہیں جو نرم بھی ہو۔ یہی بصرہ کا لغوی ترجمہ بھی ہے۔

فساروا حتی بلغوا حیال الجسر الصغیر ، حیال، مقابل اور برابر کے معنی میں ہے یعنی یہ مجاہدین بصرہ کے اس مقام سے کچھ آگے بڑھے یہاں تک کہ دریائے دجلہ کے چھوٹے پل کے برابر آئے جسر صغیر کو جسر کبیر کے مقابلے کی وجہ سے صغیر کہا گیا کیونکہ جو پل بغداد کے مقام پر تھا وہ جسر کبیر تھا۔ یہ نسبتاً چھوٹا تھا جو دریا دجلہ پر بنایا گیا تھا۔

فذکروا الحدیث بطوله ،فذکروا کی جمع کا ضمیر خالد اور شویس کو باعتبار مافوق الواحد راجح ہے بعض نسخوں میں فذکرا تثنیہ کے صیغے سے ہے اور وہی راجح اور ظاہر ہے جبکہ بعض نسخوں میں فذکر مفرد کے صیغے سے ہے۔ پھر ضمیر محمد بن بشار کو راجع ہوگی۔ جو امام ترمذیؒ کے شیخ ہیں۔

<u>کافر حاکم صاحب فرات سے جہاد:</u> اس حدیث کو علامہ طبریؒ نے کچھ مزید تفصیل کے ساتھ ذکر کیا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ جب عتبہؓ سرحد پر ٹھہرے تو وہاں کے کافر حاکم ''صاحب فرات'' کو پتہ چلا۔ اس نے چار ہزار کا لشکر لے کر مسلمانوں کا رخ کیا۔ جب پہنچ کر اس نے دیکھا کہ مسلمان صرف تین سو ہیں تو فوج کو حکم دیا کہ ان لوگوں کے گلوں میں رسیاں ڈال کر مجھے پیش کردو۔ چنانچہ وہ آئے۔ حضرت عتبہؓ نے مسلمانوں کو حکم دیا کہ صرف دفاعی جنگ لڑیں۔ دشمن پر حملہ نہ کریں گرمی کا موسم تھا ہوا رکی ہوئی تھی جب زوال ہوگیا تو مسلمانوں کو حکم دیا کہ اب اللہ کے نام سے حملہ کردو چنانچہ ایسا ہی کیا گیا اور بہت سے کفار قتل کئے گئے ''صاحب فرات'' کو قید کرلیا گیا۔ اس کے بعد حضرت عتبہ بن غزوان نے حکم دیا کہ کوئی اچھی جگہ منبر بنادو اور ایک بلیغ خطبہ دیا۔ جبکہ علامہ مناویؒ کہتے ہیں کہ حضرت عتبہ بن غزوان نے خوزستان کے

لوگوں سے جو وہاں کے مقامی باشندے تھے تاوان چاہا وہ آئے تو مسلمانوں کی قلیل تعداد کو دیکھ کر غداری کی اور مسلمانوں پر حملہ کردیا۔ چنانچہ جنگ ہوئی اور میدان مسلمان کے ہاتھ رہا۔

عتبہ کا طویل خطبہ: **فقال عتبه بن غزوان الخ** ، یہ اسی طویل خطبہ کا حصہ ہے جس کا ہم پہلے ذکر کر چکے ہیں واقعہ اور بقیہ خطبہ کو اختصاراً حذف کیا گیا ہے۔ اس خطبہ کا کچھ حصہ یوں ہے۔

''اے لوگوں یہ دنیا ختم ہو رہی ہے اور منہ پھیر کر جا رہی ہے۔ اس کا صرف اتنا تھوڑا حصہ باقی رہ گیا ہے جتنا برتن میں پانی پینے کے بعد رہ جاتا ہے تم لوگ ہمیشہ رہنے والی جگہ کی طرف منتقل ہو رہے ہو۔ اس لئے تمہارے ساتھ جو بہترین سرمایہ (عمل) ہو اس کے ساتھ آخرت کو منتقل ہو جاؤ۔ مجھے یہ بتایا گیا ہے کہ اگر ایک پتھر جہنم کے منڈھیر سے جہنم میں پھینک دیا جائے وہ ستّر سال تک (بغیر رکے) جہنم میں گرتا ہوا جائیگا۔ اور اس جہنم کو تم (کافر) لوگ بھرو گے۔ کیا تم اس سے تعجب کر رہے ہو۔

مجھے یہ بھی بتایا گیا ہے کہ جنت کے دروازہ کے دونوں کناروں میں چالیس برس کا فاصلہ ہے اور ایک دن ایسا آئے گا جب وہ دروازہ رش کی وجہ سے بھر جائیگا اور میں نے خود کو دیکھا۔۔۔۔الخ

مالناطعام الاورق الشجر الخ یہی ترجمۃ الباب ہے یعنی تنگدستی کی وجہ سے درختوں کے پتے کھانا پڑے۔

فقسمتها بيني وبين سعد ، ایک نسخ میں سعد کی جگہ سبعہ آیا ہے لیکن اسے تصحیف بتایا جاتا ہے کیونکہ مسلم شریف کی روایت میں ہے کہ **فقسمتها بيني وبين سعدبن مالك**ؓ **فاتزرت بنصفهاو اتّزر سعدبنصفها۔**

وستجرّبون الامراء بعدنا ، اس کلام کا مطلب یہ ہے کہ ہم لوگوں نے نبی اکرم ﷺ کی مصاحبت اور ریاضات ومجاہدات سے جو کچھ سیکھا اسی کی برکت سے خدا اور بندوں کے حقوق کی ادائیگی کی توفیق ملی ہے۔ ہمارے بعد ایسے امراء آئیں گے جو عیاشیوں میں پلے بڑھے ہونگے ان کو نہ خدا کے حقوق کی ادائیگی کی فکر ہوگی نہ مخلوق کی بدحالی ان کو ستائے گی۔ ان کو اپنی خواہشات اور عیاشیوں سے فراغت ہی نہیں ملے گی۔

(۷) حدثنا عبداللّٰہ بن عبدالرحمٰن ثنا روح بن اسلم ابوحاتم البصری ثنا حماد بن سلمة ثنا ثابت عن أنسٍ قال قال رسول اللّٰہﷺ لقد اخفت فی اللّٰہ ومایخاف احدولقداوذیت فی اللّٰہ ومایوذی احدولقداتت علی ثلثون من بین لیلة ویوم ومالی ولبلال طعام یاکله ذو کبدالاشئ یواریه ابط بلال(۱).

ترجمہ: حضرت انسؓ سے روایت ہے کہ نبی اکرمﷺ نے فرمایا کہ مجھے اللہ کے راستے میں اس زمانہ میں ڈرایا گیا تھا جس میں کسی کواللہ تعالیٰ کے راستے میں نہیں ڈرایا گیا۔اور مجھے اللہ کے راستے میں اذیتیں دی گئی جب کسی کواذیتیں نہیں دی جاتی تھیں اور مجھ پرتیس دن راتیں ایسی گزریں جب میرے اور بلال کے لئے کھانے کی کوئی چیز ایسی نہیں تھی جسے کوئی جاندار کھاسکے۔سوائے اس تھوڑے سے کھانے کے۔ جسے بلال کا بغل چھپالیتا تھا۔

مشرکین کاحضوراقدسﷺ کوڈرانادھمکانا: **لقداُخفت فی اللّٰہ الخ** یعنی مشرکین نے مجھے ڈرایا۔ایسی حالت میں جب کوئی بھی نہیں ڈرتا تھا میں چونکہ اکیلا تھا اوراکیلا آدمی زیادہ ڈرتا ہے بہ نسبۃ جماعت کے۔**ثلاثون من بین لیلة ویوم** یعنی تیس دن راتیں۔

علامہ طیبی نے لکھاہے کہ **من بین لیلة ویوم** ماسبق کی تاکید ہے۔اور معنی یہ ہے کہ تیس دن اور تیس راتیں۔لیکن ملاعلی قاریؒ کاخیال ہے کہ یہ ثلاثون کی تمیز ہے یعنی تیس دن رات اور مطلب یہ ہے کہ پندرہ دن اروپندرہ راتیں جوکل تیس بنتی ہیں۔

مایواریه ابط بلال ،یہ دراصل قلت سے کنایہ ہے یعنی کچھ تھوڑا سا کھانا ہوتا تھا جو بلال کے بغل میں سموجاتا تھا۔اسی پر اس سارے زمانہ میں ہمارا گزارا ہوتا تھا۔

---

(۱)سنن ابن ماجة ۱۴/۱ ابواب المناقب باب فضائل اصحاب رسول اللّٰہﷺ، مسند احمد۳/۱۲۰ ،شرح السنة رقم الحدیث ۴۰۸۰(مختار)

اس حدیث کوامام ترمذیؒ نے جامع ترمذی میں ابواب صفۃ القیامۃ (۱) میں بھی ذکر کیا ہے وہاں آخر میں ان الفاظ کا اضافہ ہے **ومعنی ھذا الحدیث حین خرج النبیّﷺ ھارب من مکۃ ومعہ بلال إنّما کان مع البلال من الطعام مایحمل تحت ابطہ،** صاحب لمعات کہتے ہیں کہ امام ترمذی کا مقصد یہ ہے کہ یہ واقعہ سفر ہجرت کے سوا کوئی دوسرا واقعہ ہے جس میں حضرت بلالؓ آپﷺ کے ساتھ تھے کیونکہ ہجرت میں تو بلالؓ ساتھ نہیں تھے تو شاید یہ طائف کے عبد کلاٗل بن یاٗلیل کے پاس آپﷺ کے آنے کا واقعہ ہو جس کو آپﷺ نے دعوت دی تھی اور اس نے بچوں سے پتھر برسوائے لیکن اس سفر میں بھی آپﷺ کے ساتھ بلالؓ کی بجائے زید بن حارثہؓ تھے اور یہ بھی ممکن ہے کہ یہ کوئی دوسرا موقعہ ہو جس میں حضرت بلالؓ آپﷺ کے ساتھ شریک سفر ہوں۔واللہ اعلم بالصواب۔

(۸) حدثنا عبداللّٰہ بن عبدالرحمان انباناعفان بن مسلم ثنا أبان بن یزید العطار ثناقتادۃ عن أنس بن مالک أنّ النّبیّ ﷺ لم یجتمع عندہ غداء ولاعشاء من خبزولحم الا علی ضفف قال عبداللّٰہ قال بعضھم ھو کثرۃ الایدی(۱).

__ضفف کا مطلب:__

ترجمہ: حضرت انسؓ کہتے ہیں کہ نبی اکرمﷺ کے پاس (دسترخوان پر) صبح وشام کے کھانے میں کبھی بھی روٹی اور گوشت جمع نہیں ہوئے۔سوائے حالت ضفف (یعنی اجتماعی حالت) میں۔

الاّعلی ضفف الخ، ضفف سے اجتماعی کھانا مراد ہے یعنی مہمانوں کے ساتھ یا گھر والوں کی معیت میں۔یادیگر لوگوں کی معیت میں کبھی گوشت اور روٹی اکٹھی مل جاتی۔ورنہ صرف جو کی روٹی معمول کا کھانا ہوتا تھا۔

---

(۱)مسنداحمد ۳/ ۲۷۰ (مختار)

قال عبداللّٰہ یہاں امام ترمذیؒ کے شیخ عبداللہ بن عبدالرحمٰن مراد ہیں وہ کہتے ہیں کہ ضفف کا معنی کثرۃ الایدی ہے یعنی دوسرے لوگوں کے ساتھ شرکت طعام میں آپ ﷺ کو یہ چیزیں میسر ہوجاتی تھیں ضفف کے معنی میں دیگر اقوال بھی ہیں مثلاً بعض لوگوں نے کثرۃ العیال سے بعض نے تناولاً مع الناس اور بعض نے الضیق والشدۃ سے اس کا ترجمہ کیا ہے۔

یہی حدیث مؤلف نے پچھلے چھوٹے ''باب ماجاء فی عیش النبی ﷺ'' میں بھی ذکر کی ہے وہاں اس کی تفصیل بھی ہم عرض کر چکے ہیں۔

(۹) حدّثنا عبدالرحمن بن حمید ثنا محمّد بن اسمٰعیل بن ابی فدیک ثنا ابن أبی ذئب عن مسلم بن جندب عن نوفل بن أیاس الهذلیّ قال کان عبدالرحمٰن بن عوف لنا جلیسا و کان نعم الجلیس وانّه انقلب بنا ذات یوم حتی اذادخلنا بیته و دخل فاغتسل ثمّ خرج واوتینا بصحفة فیها خبز ولحم فلمّا وضعت بکی عبدالرحمٰن فقلت له یا با آبامحمد ما یبکیک قال هلک رسول اللّٰه ﷺ ولم یشبع هو واهل بیته من خبز الشعیر فلا ارانا اخرنا لما هو خیر لنا(۱).

ترجمہ: نوفل بن ایاس کہتے ہیں کہ عبدالرحمٰن بن عوفؓ ہمارے ہمنشین تھے اور وہ بہترین مصاحب تھے ایک دن وہ ہمارے ساتھ (بازار سے گھر) لوٹے۔ یہاں تک کہ ہم ان کے دولت خانہ پرآئے۔ غسل خانے میں جا کر انہوں نے غسل کیا پھر باہر آئے تو ہمارے پاس یک بڑا برتن روٹی اور گوشت کا لایا گیا۔ جسے (دسترخوان پر) رکھ دیا گیا۔ تو عبدالرحمٰنؓ رونے لگے میں نے پوچھا کہ اے ابومحمد! تجھے کس بات نے رلایا۔ فرمایا کہ نبی اکرم ﷺ اس حال میں وفات پائے کہ وہ اوران کے گھر والے جو کی روٹی سے بھی شکم سیر نہیں ہوئے۔ ہمارا نہیں خیال کہ ہمیں کسی بھلائی کیلئے ان کے بعد زندہ رہنے دیا گیا ہے۔

---

(۱)مجمع الزوائد ۱۰/ ۳۱۲،الحلیلة الاولیاء لابی نعیم ۱/ ۹۹(مختار)

حضرت عبدالرحمٰن بن عوفؓ: حضرت عبدالرحمٰن بن عوف بن الحارث بن زہرہ بن کلاب کا جاہلی نام عبدالکعبہ یا عبدعمرو تھا۔ نبی اکرم ﷺ نے تبدیل کر کے نام عبدالرحمٰن رکھا۔ عشرہ مبشرہ میں سے ہیں۔ اور حضور اقدس ﷺ کے ننھیال بنوزہرہ سے تعلق ہے۔ واقعہ اصحاب فیل کے دس سال بعد ولادت ہوئی۔ قدیم الاسلام صحابی ہیں۔ ہجرت حبشہ کے بعد مدینہ منورہ کو بھی ہجرت فرمائی۔ بدر اور اس کے بعد کے تمام غزوات میں شریک رہے۔ غزوۂ احد میں ان کو اکیس زخم آئے۔ پاؤں کے ایک زخم کی وجہ سے لنگڑا پن بھی محسوس کیا جاتا رہا۔ سرخ وسفید رنگ، بڑی آنکھوں، خمدار پلکوں، بڑی گردن، مضبوط ہاتھ کی وجہ سے حسن ووقار آپؓ کی شخصیت میں نمایاں تھے۔

علم میں بھی امتیازی مقام حاصل تھا۔ نبی اکرم ﷺ کی زندگی میں فتویٰ دیا کرتے تھے۔ ایک سفر کے دوران نبی اکرم ﷺ نے ان کی اقتداء میں صبح کی نماز بھی ادا فرمائی تھی۔ انہوں نے جاہلیت میں بھی شراب کو حرام سمجھ کر چھوڑ دیا تھا۔

کامیاب تجارت کی وجہ سے آپؓ کا شمار چند ایک دولتمند صحابہ میں ہوتا تھا۔ مگر اللہ تعالیٰ نے سخاوت کی نعمت سے بھی مالا مال فرمایا تھا۔ نبی اکرم ﷺ کی زندگی میں ایک دفعہ اپنا آدھا مال اللہ کے راستے میں دے دیا۔ پھر چالیس ہزار دینار صدقہ کئے۔ پھر پانچ سو گھوڑے اور پانچ سو اونٹ اللہ تعالیٰ کی راہ میں پیش کئے۔ ازواج مطہرات کو ایک باغ ہدیہ کیا جو چار لاکھ درہم میں فروخت ہوا۔ ازواج مطہرات کے حج اور مصارف سفر کا انتظام بھی آپؓ ہی فرمایا کرتے تھے۔ جعفر بن برقانؒ کہتے ہیں کہ ہمیں معلوم ہوا ہے کہ انہوں نے تیس ہزار غلام اور باندیوں کو آزاد فرمایا تھا۔ وفات کے وقت بھی وصیت کی کہ موجود ہر بدری صحابی کو چار سو دینار دے دیئے جائیں۔ چنانچہ اس وقت ایک سو بدری صحابہ پائے گئے۔

حضرت عمرؓ نے خلیفہ کے انتخاب کیلئے چھ افراد کی کمیٹی بنائی۔ ان میں آپؓ کا نام شامل تھا۔ مگر آپؓ نے خلافت قبول کرنے سے انکار کیا بلکہ ایک دفعہ حضرت عثمانؓ نے ان کو خلیفہ بنانے کا وثیقہ لکھا تھا جس پر آپؓ ناراض ہوئے ان کی وفات ۳۲ھ یا ۳۱ھ میں تقریباً بہتر (۷۲) برس کی عمر میں ہوئی۔ جنت البقیع میں دفن ہوئے۔

حتّٰی اذادخلنا بیته و دخل یعنی ہم بھی ان کے گھر میں داخل ہوئے اوروہ خود بھی گھر کے اندر داخل ہوئے۔لیکن ملاعلی قاریؒ کہتے ہیں کہ دخل کا مفعول ''مغتسلہ'' ہے جو مقدر ہے یعنی وہ گھر میں غسلخانہ میں داخل ہوئے۔مابعد کا کلام ''فاغتسل'' اس پر قرینہ ہے۔**و اُتینـا الخ** مجہول کا صیغہ ہے۔یعنی ہمارے پاس کھانا لایا گیا۔جب کھانے کو دیکھا جو پیٹ بھرنے کیلئے کافی تھا تو نبی اکرم ﷺ کی حالت یاد آئی۔

<u>شبع اورنفی شبع تعارض کا حل:</u> **لـم یشبـع هو واهل بیته الخ،** اس پر ایک اشکال ہے کہ اسی باب میں ابوالہیثمؓ کے ہاں آپ کا پیٹ بھرکر کھانا مذکور ہے۔تو حضرت عبدالرحمٰن بن عوفؓ کیسے نفی فرمار ہے ہیں۔اس کا جواب یہ ہے کہ اس حدیث میں عادت کی نفی ہے یعنی نبی اکرم ﷺ نے اس قسم کا کھانا ہمیشہ کیلئے پیٹ بھرکر نہیں کھایا۔اگر کبھی کبھی کھانے کا موقعہ ملا ہو تو بعید نہیں یا مطلب یہ ہے کہ اپنے گھر میں اس سے پیٹ نہیں بھرا یا پھر یہاں بھی قید مراد ہے کہ لگا تار دو دن روٹی اور گوشت سے پیٹ بھر کر نہیں کھایا۔ **کماجاء فی بعض الروایات.**

فـلاار انااخّرنالماهو خیرلنا، یعنی نبی اکرم ﷺ اوران کے گھر والوں نے تو تنگدستی کی زندگی بتی۔ہم خوشحال زندگی بسر کرر ہے ہیں۔اب ہمیں خطرہ ہے کہ ہماری یہ خوشحالی ہمارے حق میں کوئی بہتر بات نہیں ہے بلکہ بہتر زندگی وہی تھی جو کہ سید الاولین والآخرین ﷺ نے منتخب فرمائی تھی۔ہماری عارضی خوشحالی میں خطرات ہوسکتے ہیں کہ ہماری نیکیوں کا بدلہ دنیا میں ہمیں دیا جارہا ہو اور اخروی سعادتوں میں کمی کا باعث بن رہا ہو جبکہ حضوراقدس ﷺ اور ان کے گھر والوں کے فقر میں یہ خطرات نہیں تھے۔ **اذهبتم طیباتکم فی حیاتکم الدنیا(الآیة)**

خلاصۂ باب

اس باب میں نبی اکرم ﷺ کے گزراوقات کا تذکرہ مقصود ہے۔ نبی اکرم ﷺ کے کھانے پینے، لباس اور رہائش میں تنگی تھی عموماً فاقہ ہوتا تھا کھانا ملتا، تو وہ بھی جو کی روٹی یا کھجور ہوتے تھے۔ کبھی مہینہ بھر گھر میں آگ جلنے کی نوبت نہ آتی۔ بھوک کی شدت محسوس ہوتی تو پیٹ پر پتھر باندھ کر صبر سے برداشت کر لیتے تھے۔ گوشت تو شاذونادر ہی مہیا ہوتا تھا۔

گھر والوں کی بھی یہی حالت تھی جو کی روٹی پیٹ بھر کر میسر نہ تھی۔ عام صحابہؓ کی تنگدستی سے بھی نبی اکرم ﷺ کی حالت کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ اسی لئے شیخین کا واقعہ بھی لایا گیا ہے۔ جب کڑکتی دھوپ میں ان کو بھوک نے ستایا تو آپ ﷺ کے پاس آئے۔ آپ ﷺ کا بھی بھوک سے ان کی طرح براحال تھا چنانچہ ایک مخلص صحابی ابوالہیثمؓ کے پاس تشریف لے گئے۔ اور انہوں نے خاطر تواضع کی۔

اسی طرح حضرت سعد بن ابی وقاصؓ اور عتبہ بن غزوانؓ بھی نبی اکرم ﷺ کے زمانے کی معاشی زبوں حالی کا ذکر کرتے ہیں کہ ہمیں درختوں کے پتوں سے گزارا کرنا پڑتا تھا۔ لیکن ہم پہلے بھی عرض کر چکے ہیں کہ خیر القرون میں معاشی ابتری ایک اختیاری امر تھا وہ دنیا سے بے رغبت تھے زہد ہی نے ان کو اس حالت پر پہنچایا تھا۔ اسی وجہ سے ان کا فقر ایک قابل فخر بات تھی وہ دعا میں بھی مساکین کی مصاحبت مانگا کرتے تھے۔

۵۳. باب ماجاء فی سنّ رسول اللّٰہ ﷺ

حضور اقدس ﷺ کی عمر کے بیان میں

سِن عمر کو کہتے ہیں اور دانت کو بھی سن کہا جاتا ہے شاید اس لئے کہ اس سے انسان کی عمر کا اندازہ لگایا جاتا ہے اس باب میں نبی کریم ﷺ کی عمر کے متعلق احادیث لائے گئے ہیں نیز اس بات کا بیان ہے کہ نبی کریم ﷺ نے مکہ میں اپنی عمر کا کتنا حصہ گزارا ہے اور مدینہ میں کتنے سال تک رہے۔

(۱) حدّثنا احمدبن منیع ثنا روح بن عبادة ثنا زکریا بن إسحاق ثنا عمرو بن دینار عن ابن عبّاس قال مکث النبیّ ﷺ بمکة ثلاث عشرة یوحی إلیه وبالمدینة عشرا وتوفیّ وهو ابن ثلاث وّستین سنة(۱).

ترجمہ: حضرت عبداللہ بن عباسؓ سے روایت ہے کہ نبی اکرم ﷺ مکہ مکرمہ میں تیرہ سال تک رہے جن میں آپ ﷺ پر وحی نازل ہوتی رہی اور مدینہ منورہ میں دس سال تک رہے اور آپ ﷺ نے تریسٹھ برس کی عمر میں وفات پائی۔

ثلاث عشرة سنة یوحی الیه الخ، یہ بات مسلم ہے کہ نبی کریم ﷺ کی عمر بعثت کے وقت چالیس سال تھی اس کے بعد مکہ میں آپ ﷺ تیرہ سال مزید رہے۔ گویا مکہ میں آپ ﷺ اپنی عمر کے ترپین (۵۳) سال گزار چکے تھے اور بقیہ عمر مدینہ میں گزاری۔ نبی اکرم ﷺ کی عمر کے بارے میں صحیح ترین روایت یہی ہے۔

(۲) حدّثنا محمّدبن بشّار ثنا محمّدبن جعفر عن شعبة عن أبی إسحاق عن عامر ابن سعد عن جریر عن معاویة أنّه سمعه یخطب قال مات رسول اللّٰه ﷺ وهو ابن ثلاث وستین و ابوبکر وعمرو انا ابن

---

(۱) صحیح بخاری ۱/۵۵۲ کتاب مناقب الانصار باب هجرة النبی ﷺ واصحابه إلی المدینة، صحیح مسلم ۲/۲۶۰ کتاب الفضائل باب کم اقام النبی ﷺ بمکة الخ، جامع ترمذی ۲/۶۸۴ کتاب المناقب باب محاسن رسول اللّٰه ﷺ کم کان حین مات، مسنداحمد ۱/۳۷۰ (مختار)

ثلاث وّستين سنة(۱).

ترجمہ: جریر بن حازمؒ کہتے ہیں کہ انہوں نے حضرت امیر معاویہؓ سے خطبہ کے دوران سنا کہ نبی اکرم ﷺ تریسٹھ سال کی عمر میں وفات پائے، ابو بکرؓ اور عمرؓ بھی اسی عمر میں وفات پائے، اور میں بھی تریسٹھ برس کا ہوں۔

مات رسول اللّٰہ ﷺ ،حضرت امیر معاویہؓ نبی کریم ﷺ کی عمر کے ساتھ ساتھ اپنے سے قبل ان اکابر صحابہ کی عمریں بھی بیان فرماتے ہیں جو خلافت سے سرفراز ہو چکے تھے۔ فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ اور شیخین کی عمریں تریسٹھ سال تھیں جبکہ حضرت عثمانؓ اور حضرت علیؓ کی عمریں وفات کے وقت تریسٹھ سال نہ تھیں (۲)۔ یہ کہتے وقت گویا آپؓ کی تمنا تھی کہ اسی سال مجھے موت نصیب ہو کیونکہ اس خطبہ کے وقت خود حضرت امیر معاویہؓ کی عمر بھی تریسٹھ سال تھی لیکن آپؓ کو اس عمر میں وفات کی سعادت نہ مل سکی بلکہ آپؓ کی عمر اسّی سال سے بھی بڑھ گئی اگر چہ آپؓ کی نیت اور جذبہ قابل قدر ضرور ہے۔

(۳) حدّثنا حسين بن مهدى البصرى ثنا عبدالرزاق عن ابن جريح عن الزهرىّ عن عروة عن عائشة أنّ النبىّ ﷺ مات وهو ابن ثلاث وّستين سنة(۳).

ترجمہ: حضرت عائشہؓ سے روایت ہے کہ نبی اکرم ﷺ تریسٹھ برس کی عمر میں وفات پائے۔

---

(۱)صحيح مسلم ۲۶۰/۲ كتاب الفضائل باب كم اقام النبى ﷺ بمكة والمدينة ، جامع ترمذى ۶۸۴/۲ كتاب المناقب باب فى سنّ النبى ﷺ كم كان حين مات، السنن الكبرىٰ للنسائى كتاب الوفاة، مسنداحمد ۹۶/۴ (مختار)

(۲) جبکہ علامہ جلال سیوطیؒ نے لکھا ہے علی بن ابی طالب... بوی له بالخلافة يوم قتل عثمان وقتل ليلة الجمعة لثلاث عشرة بقيت من رمضان سنة أربعين بالكوفة وهو ابن ثلاث وستين سنة. (اسعاف المبطّابرجال المؤطأ ۲۹۷)(مختار)

(۳)جامع ترمذى ۶۸۴/۲ كتاب المناقب باب فى سن النبى ﷺ كم كان حين مات، مسنداحمدمصنف عبدالرزاق.(مختار)

ثــــلاث وّستیـــــن، حضرت عائشہؓ کا یہ قول نبی کریم ﷺ کی عمر کے بارے میں صحیح ترین شمار کیا جاتا ہے۔اس لئے حضرت عائشہؓ کی دوسری روایت (۱) جس سے آپ ﷺ کی عمر ساٹھ برس معلوم ہوتی ہے کی تاویل ضروری ہے۔

(۴) حـدّثـنـا احـمـد بن منیع ویعقوب ابن إبراهیم الدورقیّ قالا ثنا اسماعیل بن علیّة عن خالدالحذّاء حدّثنی عمّار مولیٰ بنی هاشم قالت سـمـعـت ابـن عبّـاس یـقـول تـوفیّ رسول اللّٰـه ﷺ وهو ابن خمـس وّستین(۲).

ترجمہ: حضرت ابن عباسؓ کہتے ہیں کہ نبی اکرم ﷺ پینسٹھ (۶۵) برس کے تھے جب وہ وفات پائے۔

خمس وّستین، حضرت ابن عباسؓ کی اس روایت میں آپ ﷺ کی عمر پینسٹھ (۶۵) برس بتائی گئی ہے جبکہ اس سے قبل کی احادیث میں تریسٹھ (۶۳) کا قول آیا ہے اور اس کتاب کی ابتدائی حدیث حضرت انسؓ کی حدیث میں جو اس باب میں آگے بھی آرہی ہے ساٹھ سال کی روایت بھی آئی ہے۔ان تینوں روایات میں سب سے اچھی تطبیق یہ ہے کہ حضرت انسؓ کی روایت میں کسر کو لغو کر کے اس کا اعتبار نہیں کیا گیا جبکہ حضرت ابن عباسؓ کی روایت میں دو سال کا اضافہ کیا گیا ہے۔تا کہ ساتویں دہائی کو نصف تک پورا کیا جا سکے یا اس لئے کہ اس میں ولادت اور وفات کے دو سال زائد شمار کئے گئے ہیں جبکہ حضرت عروہؓ نے تو حضرت ابن عباسؓ کی روایت کو غلطی پر محمول کیا ہے اور اسے مرجوح قرار دیا ہے۔

(۵) حـدّثـنـا محمّدبن بشّار ومحمّد ابن أبانٍ قالا ثنا معاذ بن هشام حـدّثـنـی أبی عن قتادة عن الحسن عن دغفل بن حنظلة أنّ النبیّ ﷺ

---

(۱) عـن عـائشة وابـن عبـاسؓ أنّ الـنبـیّ لبـث بـمـكة عشـر سـنیـن یـنـزل علیه القرآن وبالمدینة عشـراً (بـخـاری ج ۲ ص ۶۴۱) واوّلـوه أنّهـمـا اسـقـطـا مـدة فترة الوحی من لبثه بمكة وكانت نحو ثلاث سنین (اصلاح الدین)

(۲) صـحیـح مسـلـم ۲/۲۶۰ كتـاب الـفـضـائـل بـاب كـم اقـام النبیﷺ بمكة والمدینة، جـامع ترمذی ۲/۶۸۴ كتاب المناقب باب فی سن النبیﷺ كم كان حین مات، مسنداحمد ۱/۲۲۳ (مختار)

قبض وھو ابن خمس وّستین سنة قال أبو عیسیٰ و دغفل لانعرف له سماعا من النبیّ ﷺ وکان فی زمن النبیّ ﷺ رجلا(۱).

ترجمہ: دغفل بن حنظلہؓ سے روایت ہے کہ نبی اکرم ﷺ پینسٹھ برس کی عمر میں (دنیا سے) اٹھائے گئے۔

حضرت دغفل: **وھو ابن خمس وّستین،** اس حدیث میں بھی حضرت ابن عباسؓ کی حدیث کی طرح پینسٹھ سال بتائی گئی ہے اوراس کی وہی توجیہات ہونگیں جو بیان ہو چکی ہیں۔

و دغفل لانعرف له سماعا الخ، دغفل بن حنظلہ سدوسی کے بارے میں اختلاف ہے۔امام حمیدیؒ، نوح بن حبیب، ابن حبان اور احمد بن ہارون البردیجی نے اسے صحابی قرار دیا ہےاور یہ کہا ہے کہ صرف یہی ایک روایت ان سے مروی ہے لیکن امام بخاریؒ اور دیگر محققین کا مذہب ہے کہ دغفل مخضرم تابعی ہیں یعنی نبی اکرم ﷺ کے زمانہ میں آپ موجود تو تھے لیکن ان سے ملاقات کا شرف نہ مل سکا۔امام احمدؒ بھی کہتے ہیں کہ ''من این لہ صحبۃ'' یعنی وہ صحابی کیسے ہوئے؟ جبکہ ایک جگہ کہتے ہیں کہ ''ماادری'' مجھے پتہ نہیں۔

البتہ یہ بات مسلّم ہے کہ دغفل سدوسی کا علم میں ایک بہت بڑا مقام تھا خصوصاً علم النساب اور عرب قبائل کی تاریخ میں انتہائی ماہر تھے حتی کہ اس سلسلے میں ابو بکر صدیقؓ سے بھی آپ کا معارضہ منقول ہے عربیت، انساب اور نجوم میں ان کی مہارت کو دیکھ کر حضرت امیر معاویہؓ نے ان کو یزید کا استاد بنایا تھا کہتے ہیں کہ ۷۰ھ میں خوارج کے ساتھ جنگ دولاب میں وہ پانی میں ڈوب کر وفات پائے بعض حضرات نے ان کا نام حُجر اور لقب دغفل بتایا ہے۔

امام ترمذیؒ بھی ان کے بارے میں جمہور کے قول کے مطابق کہتے ہیں کہ نبی اکرم ﷺ سے ان کا سماع تو ثابت نہیں البتہ ان کے زمانہ میں دغفل آدمی یعنی بالغ تھے۔

(٦) حدّثنا إسحاق بن موسیٰ الأنصاری ثنا معن ثنا مالک بن أنس عن ربیعة بن أبی عبدالرحمٰن عن أنس بن مالک أنّه سمعه یقول

---

(۱)مجمع الزوائد ۱/۷۱، الدلائل للبیھقی ۷/۲۴۰(مختار)

کان رسول اللّٰہﷺ لیس بالطویل البائن ولابالقصیر ولابالأبیض الأمھق ولابالاٰدم ولابالجعد القطط ولابالسبط بعثہ اللّٰہ تعالیٰ علی راس اربعین سنۃ فاقام بمکۃ عشرسنین وبالمدینۃ عشرسنین وتوفاہ اللّٰہ تعالیٰ علی راس ستین سنۃ ولیس فی راسہ ولحیتہ عشرون شعرۃ بیضاء(۱).

ترجمہ: حضرت انسؓ سے روایت ہے کہ نبی اکرمﷺ نہ زیادہ لمبے قد والے تھے نہ پستہ قد تھے نہ بالکل سفید رنگ کے تھے نہ بالکل گندم گون تھے نہ آپﷺ زیادہ گھنگریالے بالوں والے تھے نہ بالکل سیدھے(کھلے) بالوں والے تھے۔ چالیس سال کی عمر میں آپﷺ کواللہ تعالیٰ نے مبعوث فرمایا۔ پھر آپﷺ مکہ میں دس سال رہے اور مدینہ میں بھی دس سال رہے اور ساٹھ سال کی عمر میں وفات پائی اس وقت آپﷺ کے سر اور داڑھی میں بیس سفید بال بھی نہیں تھے۔

(۷) **حدثنا قتیبۃ بن سعید عن مالک بن أنس عن ربیعۃ بن أبی عبدالرحمٰن عن أنس بن مالک ونحوہ.**

امام ترمذیؒ نے دوسری سند مذکورہ حدیث کیلئے بیان کی۔

لیس بالطویل البائن الخ، یہ حدیث شمائل ترمذی کی سب سے پہلی حدیث ہے اور وہاں اس کی مکمل تشریح گزر چکی ہے چونکہ اس میں حضورﷺ کی عمر کا بیان ہے اس لئے اس باب میں بھی اس حدیث کو لایا گیا ہے البتہ عمر جو ساٹھ سال بتائی گئی ہے اس کی توجیہ غالباً یہی کی جاتی ہے کہ حضرت انسؓ نے کسر(اکائی) کا اعتبار نہیں کیا اور عقود یعنی دہائیوں کا ذکر کیا ہے۔

---

(۱)صحیح مسلم ۲/۲۶۰، جامع ترمذی ۲/۶۸۱، مؤطاامام مالک ص ۷۱۱، مسنداحمد ۳/۲۴۰(مختار)

خلاصۂ باب

اس باب میں نبی اکرم ﷺ کی عمر مبارک کے بارے میں احادیث کا ذکر ہے۔ اور تین قسم کی روایات امام ترمذیؒ لائے ہیں یعنی ساٹھ سال، تریسٹھ سال اور پینسٹھ سال کی روایات ہیں۔ اول الذکر اور مؤخر الذکر مؤول ہیں اور صحیح قول تریسٹھ سال کا ہے۔

۵۴. باب ماجاء فی وفات النبی ﷺ

حضور اقدس ﷺ کے وفات کا بیان

حضور نبی کریم ﷺ کی وفات کے بارے میں اکثر محدثین کی رائے یہ ہے کہ یہ سانحہ ۱۲ ربیع الاول ۱۰ھ کو پیش آیا۔ بعض کے نزدیک حضور ﷺ کی وفات کی یہ تاریخ غلط ہے۔ اس اختلاف کا سبب تقویم کے بعض ماہرین کا وہ اعتراض ہے جو وہ اس تاریخ پر کرتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ نو (۹) ذی الحجہ ۱۰ھ ہجری کو حجۃ الوداع کے موقعہ پر بالاتفاق جمعہ شریف کا دن تھا۔ اور اگر یہ صحیح ہے۔ تو کسی صورت میں بھی ۱۲ ربیع الاول ۱۰ھ کو پیر کا دن نہیں پڑتا۔ خواہ بعد کے تین مہینے تیس دن کے ہوں یا انتیس کے۔ یا بعض تیس کے اور بعض انتیس کے۔ جبکہ نبی کریم ﷺ کی رحلت بالاتفاق پیر کے روز ہوئی ہے۔ اس لئے بعض محققین کا کہنا ہے۔ کہ نبی کریم ﷺ کی وفات ۲ ربیع الاول (۱) کو ہوئی تھی۔ جبکہ بعض لوگوں نے ۱۲ ربیع الاول کی تاریخ میں تاویلات کا سہارا لیا ہے۔

<u>آغاز مرض:</u> رسول اللہ ﷺ کے مرض وفات کی ابتداء دردسر سے شروع ہوئی۔ گرمی کا موسم تھا۔ حضور ﷺ ایک جنازے میں شرکت فرمارہے (۲) تھے کہ سر میں درد ہونے لگا۔ پھر بخار نے آلیا۔ اس

---

(۱) وقدروی البیهقی باسناد صحیح الی سلیمان التیمیّ أنّ رسول اللّٰه ﷺ مرض لاثنتین وعشرین لیلة من صفر وکان اول یوم مرض فیه یوم السبت وکانت وفاته الیوم العاشر یوم الاثنین للیلتین خلتامن شهر ربیع الاول (۱۱ھ) واللّٰه أعلم ۱۲ جمع الوسائل ج ۲ ص ۲۵۳)

(۲) علامہ مناویؒ کے بقول بیماری شروع ہونے کے روز آپ ﷺ جنت البقیع میں تشریف لے گئے تھے۔ وہاں اہل مقبرہ کیلئے دعا فرمائی۔ وہاں سے واپسی پر حضرت عائشہؓ کے پاس تشریف لائے ان کو بھی اس روز سردرد کی تکلیف تھی۔ آپ ﷺ گھر پہنچے تو وہ بولیں "وارأساہ" یعنی ہائے میرے سر کا درد۔ آپ ﷺ نے فرمایا "بل اناواللہ وارأساہ" یعنی خدا کی قسم میرے سر میں درد ہے۔ پھر از راہ ملاطفت آپ ﷺ نے فرمایا کہ اگر تو مجھ سے پہلے مرگئی تو میں تیری تجہیز و تکفین اپنے ہاتھ سے کروں۔ تیری نماز جنازہ خود پڑھاؤں اور خود ہی تجھ کو دفن کردوں۔ انہوں نے عرض کیا کہ میں تو آپ ﷺ کو جانتی ہوں۔ اگر تم مجھ سے فارغ ہوگئے تو اسی رات کو کسی نئی دلہن کو میرے حجرے میں لے آؤ گے۔ جس پر آپ ﷺ نے تبسم فرمایا۔ اور اسی دردسر نے طول پکڑا جو بالآخر جان لیوا ثابت ہوا۔ شاید حضرت شیخ مدظلہ نے بقیع میں حاضری کو جنازہ سے تعبیر کیا ہے۔ (مختار)

مرض کی ابتداء حضرت عائشہؓ کے حجرے میں ہوئی۔لیکن حضورﷺ اور ازواج مطہرات کے درمیان عدل اور قسم کا اتنا پاس تھا کہ شدید بیماری کی حالت میں بھی باری باری ازواج مطہرات کے حجروں میں پھروانے کا حکم دیا تا کہ کسی بیوی کی حق تلفی نہ ہو۔ظاہر ہے کہ ازواج مطہرات میں بھی ہر ایک کی خواہش ہوتی تھی۔ کہ بیماری کی حالت میں نبی کریمﷺ ان کے پاس رہیں تا کہ وہ بھی ان کی تیمارداری اور خدمت کا شرف حاصل کرسکیں۔

حضرت میمونہؓ کے گھر میں آپﷺ کی تکلیف میں اضافہ ہوا۔حالت مرض میں ادھر ادھر پھرانے سے نبی کریمﷺ کو بھی تکلیف ہوتی تھی۔نیز ہر روز جگہ اور تیمارداروں کی تبدیلی مرض میں مزید شدت کا باعث بنتی تھی۔لہٰذا تمام ازواج مطہرات نے آپس میں مشورہ کر کے فیصلہ کیا کہ چونکہ قلبی محبت کی وجہ سے نبی کریمﷺ کا دلی اطمینان حضرت عائشہؓ کے حجرے میں زیادہ ہوتا ہے۔اس لئے روز روز قیام گاہ بدلنے کی بجائے رسول اللہﷺ بیماری میں مستقلاً حضرت عائشہؓ کے حجرہ میں رہیں۔چنانچہ آپﷺ نے مرض وفات کے بارہ یا چودہ دن اسی حجرے میں گزارے۔

موت کے دروازے پر بے پناہ صبر واستقامت: ہر شخص کی موت کسی نہ کسی حد تک افسوسناک اور اندوہناک ضرور ہوتی ہے۔مگر نبی کریمﷺ کی موت تو روز اول سے لیکر آج تک امت کیلئے ایک دردناک اور عظیم حادثہ اور سانحہ شمار ہوتا ہے۔اور ظاہر ہے کہ انسان جتنا بھی عظیم ہوتا ہے موت کے وقت اس کی عظمت کے اتنے ہی مظاہر سامنے آتے ہیں۔چنانچہ وہ تحمل،حوصلہ،صبر وشکر اور مصائب وشدائد کی برداشت کا اس نازک ترین موقعہ پر مظاہرہ کر کے اپنی عظمت کا ثبوت دیتا ہے۔حضرت مولانا ابوالکلام آزاد مرحوم نے عظیم شخصیتوں کی وفات کے متعلق الہلال میں ''انسانیت موت کے دروازے پر'' کے عنوان سے ایک سلسلہ شروع کیا تھا۔جس میں عظیم لوگوں کی وفات کے احوال لکھے ہیں۔اس کتاب میں مولانا نے حضورﷺ کے سانحۂ ارتحال کے احوال بہت مؤثر اور دردناک انداز میں لکھے ہیں۔ان کے علاوہ بھی بہت سے لوگوں نے وفات اور مرض وفات کے بارے میں بڑے پُر درد اور پُر سوز پیرائے میں کتابیں لکھی ہیں۔

امام ترمذیؒ بھی اس بارے میں رسول اللہﷺ کی موت،مرض وفات کے شدائد اور اس موقع پر

حضورﷺ کے اطمینان اورصبر وسکون کا ذکر کرتے ہیں۔ پھر وفات کے بعد جنازے اور کفن دفن کے حالات بیان کرتے ہیں۔جس سے یہ بھی واضح ہوجاتا ہے کہ صحابہ کرامؓ کواللہ تعالیٰ نے کیسے صفات سے نوازا تھا۔اور کیسے انہوں نے استقامت سے اس سانحۂ کبریٰ کا سامنا کیا۔اور کتنے لوگ تھے جو فرط غم سے حواس گم کر بیٹھے تھے۔

<u>مرجع امة صدیق اکبر بنے رہے:</u> پھر یہ بھی معلوم ہوگا کہ ابوبکرصدیقؓ کا مقام صحابہ کی نگاہ میں کیسا ہے؟ عموماً جب کوئی آدمی مرجاتا ہے تو لوگ کفن دفن کیلئے اس کے جانشینوں سے رجوع کرتے ہیں۔ مگر حضورﷺ کا معاملہ اور تھا۔آپ کی بیٹی،داماد، چچازاد بھائی اور قوم قبیلہ کے لوگ موجود تھے۔ازواج مطہرات موجود تھیں۔مگر ساری امت کا مرجع ابوبکرصدیقؓ ہی بنتے ہیں۔چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ جب بھی تجہیز وتکفین کے بارے میں کوئی نزاع پیدا ہوتا ہے یا کوئی مسئلہ پیش آتا ہے تو لوگ صدیقؓ کے پاس آتے ہیں اور وہ جو بھی فیصلہ دیتے ہیں لوگوں کی طرف سے ''صدقت'' اور ''قد صدق'' کی صدا سنائی دیتی ہے۔ اس سے اس بات کی طرف بھی اشارہ ملتا ہے کہ خیر القرون میں حکومت ومملکت نسلی اور وراثت کی بنیاد پر نہ تھی بلکہ صحابہ کرامؓ میں سے نبی کریمﷺ سے قریب ترین اور سب سے افضل ترین امیر اور خلیفہ بن جاتا ہے نیز اس سے صحابہؓ کے درمیان ابوبکرصدیقؓ کا مقام بھی بخوبی واضح ہوجاتا ہے۔

(۱) حدثنا أبو عمّار الحسین بن حریث وقتیبة بن سعید وغیر واحد قالوا ثنا سفیان ابن عیینة عن الزهریّ عن أنس بن مالک قال اٰخر نظرة نظرتها إلٰی رسول اللّٰہ ﷺ کشف الستارة یوم الاثنین فنظرت إلٰی وجهه کانّه ورقة مصحف والناس یصلّون خلف أبی بکر فاشار إلٰی النّاس ان اثبتوا وابوبکر یؤمّهم والقی السّجف وتوفیّ من اٰخر ذلک الیوم(۱).

---

(۱)صحیح مسلم ۱/۱۷۹ کتاب الصلوٰة باب استخلاف الامام اذا عرض له عذراً الخ، السنن الصغریٰ للنسائی کتاب الجنائز باب الموت یوم الاثنین، سنن ابن ماجة ص۱۱۶ کتاب الجنائز باب ماجاء فی ذکر مرض رسول اللّٰہ ﷺ(مختار)

ترجمہ: حضرت انسؓ کہتے ہیں کہ نبی اکرم ﷺ کا آخری دیدار میں نے سوموار کے دن اس وقت کیا جب (صبح کی نماز کے دوران) آپ ﷺ نے حجرے کے دروازے سے پردہ ہٹایا۔ میں نے آپ ﷺ کے چہرے کو دیکھا تو وہ (صفائی، انوار اور طمانینت میں) قرآن پاک کے ورق جیسا تھا۔ لوگ اس وقت ابوبکر صدیق کے پیچھے نماز پڑھ رہے تھے۔ آپ ﷺ نے لوگوں کو اشارہ کر کے حکم دیا۔ کہ یونہی جمے رہو۔ ابوبکر صدیقؓ امامت میں مصروف تھے آپ ﷺ نے پردہ واپس ڈال دیا۔ اور اسی دن کے آخر میں آپ ﷺ نے وفات پائی۔

امت کا حالت سجدہ میں آخری مشاہدہ: (۱) آخر نظرة نظرتها الخ، حضرت عائشہؓ کے حجرے کا دروازہ مسجد نبوی ﷺ کی طرف کھلتا تھا۔ آپ ﷺ مرض وفات میں تین دن تک مسجد میں نہ آسکے۔ صحابہ کرام اور خود آپ ﷺ کو ملنے کا اشتیاق تھا۔ زندگی کے سب سے آخری دن صبح کو دروازے سے پردہ اٹھا کر دیکھا۔ کہ تمام صحابہ دربار الٰہی میں دست بستہ ہیں۔ صدیق اکبرؓ امامت فرمارہے ہیں۔ امت کے ساتھ نبی اکرم ﷺ کی یہ آخری ملاقات تھی۔ کتنی عظیم نعمت ہے کہ اللہ تعالیٰ زندگی کے آخری لمحات میں آپ ﷺ کو سکون واطمینان دلانے کیلئے یہ منظر دکھلا رہے ہیں۔ گویا وہ نبی کریم ﷺ کو بتانا چاہتے ہیں۔ کہ آپ ﷺ نے امت کیلئے جتنی قربانیاں دیں جو تکالیف اور مصائب امت کیلئے جھیلیں وہ رائیگاں نہیں گئیں۔ اور توحید کا جو پودا آپ نے تیئیس (۲۳) سال قبل لگایا تھا۔ اسے سینچا اور اس کی نشونما میں جانکاہ مصائب سہے۔ بالآخر وہ ثمر آور ہوا۔ یہی لوگ ہی تو تھے جولات ومنات اور عزیٰ کے قدموں میں پڑے تھے۔ جہالت اور صنم پرستی کے ظلمات میں سرگرداں ٹھوکریں کھا رہے تھے مگر آج اللہ تعالیٰ کے در پر سربسجود ہیں (۲)۔ یہ نظارہ اس لئے بھی دکھایا گیا کہ نبی کریم ﷺ اللہ تعالیٰ کے ہاں آخری گواہی بھی یہی دے سکیں

---

(۱) آخر نظرة الخ، آخر مبتداء ہے۔ اور کشف الستارة خبر کا قائم مقام ہے۔ جبکہ یوم الاثنین ظرف ہے۔ تقدیر عبارت یوں ہوگی۔ آخر نظرة نظرتها الی وجهه حین کشف الستارة یوم الاثنین ۔ (اصلاح الدین)

(۲) اور نبی اکرم ﷺ کیلئے اس سے بڑی خوشی کی بات کوئی تھی ہی نہیں۔ چنانچہ بخاری شریف کی روایت میں ہے کہ ثـم تبسم یضحک، یعنی یہ دیکھ کر آپ ﷺ خوشی سے ہنس پڑے۔ (اصلاح الدین)

کہ اے اللہ میں نے ان لوگوں کو ہر طرف سے کاٹ کر تیری بارگاہ میں جھکا ہوا چھوڑا تھا۔اور وہ سربسجود تھے میں نے اپنا فرض ادا کر دیا ہے۔پھر اس کے بعد اے اللہ تعالیٰ تو ہی ان کا نگران رہا۔

مصحف قرآن سے رُخ زیبا کی تشبیہ: حضرت انسؓ فرماتے ہیں کہ حضور نبی کریم ﷺ نے باہر جھانک کر دیکھا تو چہرۂ انور کو دیکھتے ہوئے یہ احساس ہوا۔"کانہ ورقۃ مصحف" مصحف میم کے ضمہ کے ساتھ اشہر ہے۔فتحہ بھی مشہور ہے اور کسرہ بھی جائز ہے۔یہ بلیغ کلام اور بے نظیر تشبیہ حضرت انسؓ نے قرآن مجید کے نورانی صفحہ کے ساتھ چہرۂ انور کو تشبیہ دی ہے۔گویا جس طرح قرآن مجید کے اوراق میں انوار ہوتے ہیں۔اور ان انوار کا پوری طرح احساس بھی صحابہ ہی کو ہو سکتا ہے۔اس طرح نبی کریم ﷺ کا چہرہ مبارک انوار الٰہی، وقار و بشاشت اور اطمینان وسکون کی وجہ سے دمک رہا تھا یا پھر اس تشبیہ سے غرض حضور ﷺ کے صبر وشکر اور اس طمانینت کی نشاندہی ہے۔جو امت کو ایسی حالت میں دیکھ کر نبی کریم ﷺ کے چہرۂ انور پر عیاں تھی۔نیز مسرت کی اس کیفیت کا پتہ بھی خوب چلتا ہے۔جو رفیق اعلیٰ سے ملنے کے تصور سے نبی کریم ﷺ کو حاصل ہو رہی تھی۔

امامت ابی بکر: **والناس یصلّون خلف أبی بکر الخ** ، نبی کریم ﷺ نے پردہ اٹھایا۔تو صحابہؓ سمجھے کہ شاید نبی کریم ﷺ مسجد میں تشریف لا رہے ہیں۔چنانچہ ان میں کھلبلی مچی، مگر نبی کریم ﷺ نے لوگوں کے اضطراب کو محسوس کر کے اطلاع دی کہ میں نہیں آ رہا۔اس لئے صفوں کو نہ توڑو، اپنی نمازیں پوری کرو، اس بات میں حضرت ابو بکر صدیقؓ کی امامت کی تقریر و تائید بھی ہے اور یہ اشارہ بھی ہے کہ آئندہ کیلئے ان کی اقتداء واتباع میں ثابت قدم رہو۔مخالفین ومعاندین، سازشی اور منافقین ڈگمگاہٹ پیدا کرنے کی بارہا کوشش بھی کریں اور عظمت ابی بکرؓ اور ان کی خلافت کے بارے میں لب کشائی بھی کرتے رہیں لیکن تم لوگ ثابت قدم رہو اور اجتماعیت کو برقرار رکھتے ہوئے ثبات اختیار کرو۔

والقی السجف وتوفیّ الخ ،سجف سین کے فتحہ اور کسرہ دونوں کے ساتھ جائز ہے۔دروازے کے پردے کو کہتے ہیں۔جبکہ بعض لوگوں کے ہاں سجف وہ پردہ ہوتا ہے جو دروازے کے دو طاقوں کی طرح درمیان میں چیرا گیا ہو۔

آخریوم پراشکال کاحل: حدیث سے بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ نبی کریمﷺ اسی روز دن کے آخر میں وفات پا گئے۔مگراس پر اشکال وارد ہوتا ہے کہ قوی روایات کے مطابق نبی کریمﷺ نے چاشت کے وقت رحلت فرمائی تھی۔ بلکہ صاحب جامع الاصول نے اس پر اتفاق نقل کیا ہے۔اس کو مدنظر رکھتے ہوئے آخرالیوم کالفظ درست نہیں بنتا۔اس کا جواب یہ ہے کہ آخر کا اطلاق کبھی دخول فی النصف الثانی پر بھی ہوا ہے اورضحوۂ کبریٰ یعنی چاشت کا وقت بھی زوال کے قریب ہوتا ہے گویاضحوہ کبریٰ کوقرب کی وجہ سے زوال کہا گیا ہے پھر زوال سے آخرالیوم کے لفظ سے تعبیر کی گئی۔دوسرا جواب یہ ہے کہ آخر کا لفظ کبھی مقحم بھی آتا ہے جس طرح عین کالفظ کبھی کبھی مقحم اورزائد مستعمل ہوتا ہے۔

تو یہاں بھی آخر کا معنی مقصود ومراد نہیں ہوگا بلکہ مطلب یہ ہوگا کہ نبی کریمﷺ اسی دن انتقال کرگئے۔تیسرا جواب یہ ہے کہ نبی کریمﷺ چاشت کے وقت انتقال فرما گئے لیکن کسی کوبھی آپﷺ کی وفات کا یقین نہیں آیا۔خصوصاً حضرت عمرؓ تو آپﷺ کی موت کے بارے میں سننے کوتیار نہ تھے۔پھر حضرت ابوبکرصدیقؓ نے یہ عقدہ حل فرمایا مگرآپ کے فیصلے کاعلم اکثر صحابہ کواس وقت ہوا جب دن کا بیشتر حصہ گزر چکا تھا۔یوں لوگ سمجھنے لگے کہ آخرالنہار میں حضورﷺ کی وفات ہوئی تھی۔

(۳) حدّثنا محمّدبن مسعدة البصریّ ثنا سلیم بن احضر عن ابن عون عن إبراهیم عن الأسود عن عائشة قالت کنت مسندة النّبیّﷺ إلٰی صدری اوقالت إلیٰ حجری فدعا بطست لیبول فیه ثمّ بال فماتﷺ(۱).

ترجمہ: حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کہتی ہیں کہ میں نے نبی اکرمﷺ کواپنے سینے پر سہارادے رکھا تھا کہ آپﷺ نے ایک طست منگایا تا کہ اس میں پیشاب کریں پھر اس میں پیشاب کیااس کے بعد آپﷺ وفات پا ئے۔

---

(۱)صحیح بخاری ۱/۳۸۲ کتاب الوصایاباب الوصایاقول النبیّ وصیة الرجل مکتوبة عنده، صحیح مسلم ۲/۴۲ کتاب الوصیة باب ترک الوصیة لمن لیس شئ یوصی به، سنن ابن ماجة ص۱۱۶ کتاب الجنائز باب ماجاء فی ذکر مرض رسول اللهﷺ(مختار)

<u>حالت نزع میں طہارت اور پردے کا اہتمام:</u> **فدعا بطست لیبول فیه** (۱)، **طست** عجمی لفظ ہے۔عربی میں اس کا ہم معنی طشٌ مستعمل ہے کھلے برتن کو کہتے ہیں لیکن چونکہ طست مؤنث ہے اس لئے **لیبول فیه** کے ضمیر میں تاویل کی ضرورت پیش آ گئی۔ چنانچہ ظرف یا مذکورؔ کی تاویل سے اس کی طرف فیہ کا ضمیر راجع ہوگا۔

شدید بیماری اور انتہائی ضعف کے باوجود نبی اکرم ﷺ صفائی اور نظافت کا بہت زیادہ اہتمام فرماتے تھے۔حتی کہ زندگی کے بالکل آخری لمحات میں جب آپ بستر سے اتر نہیں سکتے۔ پھر بھی چلمچی جیسا کوئی برتن منگوایا اور پردہ کرا کر بول کیا۔

ملاعلی قاریؒ نے فبال کا ترجمہ کیا ہے کہ ''**ای فتخلیّ من الدنیا**'' یعنی آپ ﷺ رب کے پاس حاضر ہونے سے قبل دنیا سے مکمل طور پر تجرّد اختیار کرنا چاہتے تھے۔اسی لئے بول کیا تا کہ دنیا سے رہا سہا تعلق ختم ہوجائے۔

فمات اس کا یہ مطلب نہیں کہ نبی کریم ﷺ پیشاب کے فوراً بعد وفات پائے یہاں پر صرف آپ ﷺ کے ضعف کا بیان مقصود ہے۔اسی وجہ سے حالت وفات کے دیگر واقعات کا ذکر یہاں موجود نہیں ہے ورنہ اس کے بعد آپ ﷺ کا مسواک کرنا، اور پانی میں ہاتھ ڈال کر چہرے پر ملنا، حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے باتیں کرنا، اللہ تعالیٰ کی طرف سے دنیا وآخرت میں تخییر اور ''**فی الرفیق الاعلی**'' کہہ کر وصال کا اختیار کرنا وغیرہ صحیح احادیث سے ثابت ہے۔

<u>گود عائشہؓ کی یا علیؓ کی:</u> البتہ یہاں ایک اشکال باقی رہتا ہے کہ امام حاکمؒ اور ابن سعدؒ نے کچھ روایات روایت کی ہیں کہ وفات کے وقت نبی اکرم ﷺ کا سر مبارک حضرت علی کرم اللہ وجہہ کی گود میں تھا۔اس کے دو جواب منقول ہیں اول یہ کہ اس روایت کے جتنے بھی طُرق ہیں کوئی بھی ضعف وطعن سے خالی نہیں ہے اس لئے یہ روایت ان صحیح ترین روایات کا مقابلہ نہیں کر سکتی جو تمام صحاح ستہ میں درجنوں طرق سے مروی ہیں اس لئے راجح یہی ہے کہ حضرت عائشہؓ کے سینے پر سر مبارک رکھ کر آپ ﷺ کا انتقال ہوا تھا۔

---

(۱) علامہ مناویؒ نے اس جملہ سے فقہی مسئلہ کا استنباط کیا ہے **وفیه حل الاستنادللزوجة والبول فی الطست بحضرتها** (مناوی علی هامش جمع الوسائل ۲/ (مختار)

بعض لوگوں نے یہ بھی کہا ہے کہ ممکن ہے کہ وفات سے کچھ دیر قبل حضرت علیؓ نے بھی آپﷺ کو سہارا دیا ہو اس کے بعد عین وفات کے وقت حضرت عائشہؓ نے سہارا دیا ہو لہٰذا دونوں روایات جمع ہو سکتی ہیں۔ بہر حال اس حدیث میں نبی اکرمﷺ کے ضعف کے ساتھ ساتھ حضرت عائشہؓ کے عظیم مرتبہ اور مناقب کی طرف بھی اشارہ موجود ہے۔ کہ نبی کریمﷺ اپنی آخری سانسوں میں آپؓ کی گود کا سہارا لئے ہوئے تھے۔ یہ اعزاز حضرت عائشہؓ کے سوا کسی اور کو حاصل نہیں ہوا۔ بخاری شریف کی ایک روایت میں ان لمحات کا بہترین نقشہ موجود ہے(۱)۔

---

(۱)انّ عائشةؓ كانت تقول من نعم الله علىّ انّ رسول اللهﷺ توفىّ فى بيتى وفى يومى وبين سحرى ونحرى وانّ الله جمع بين ريقى وريقه عند موته دخل علىّ عبدالرحمٰن وبيده السواک وانا مسندة رسول اللهﷺ فرايته ينظر اليه وعرفت انّه يحبّ السواک فقلت آخذه لک؟ فاشار برأسه ان نعم فتناولته فاشتدّ عليه وقلت الیّنه لک فاشاربراسه ان نعم فليّنته فامّره. وبين يديه ركوة او علبة يشک عمر فيها ماء فجعل يدخل يديه فى الماء فيمسح بهما وجهه يقول لااله إلاّالله إنّ للموت سكرات ثم نصب يده فجعل يقول فى الرفيق الاعلىٰ حتّى قبض ومالت يده.(بخارى شريف ج۲ص ۶۴۰) (اصلاح الدين)

اور مشکوٰۃ کی روایت میں اور بھی عجیب اور عمدہ نقشہ کھینچا گیا ہے۔عن جعفر بن محمّد عن أبيه أنّ رجلاً من قريش دخل على أبيه على بن الحسين فقال الاأحدّثک عن رسول اللهﷺ قال بلىٰ حدّثنا عن ابى القاسمﷺ قال لمّامرض رسول اللهﷺ اتاه جبرئيل فقال يا محّمد إنّ الله ارسلنى اليک تكريماً لک وتشريفاً لک خاصة لک يسألک عمّا هواعلم به منک يقول كيف نجدک قال اجدنى ياجبرئيل مغموماً أجدنى يا جبرئيل مكروباً ثمّ جاء اليوم الثانى فقال له ذلک فردّ عليه النبىﷺ كما ردّ اوّل يوم ثمّ جاء ه اليوم الثالث فقال له كما قال اوّل يوم وردّ عليه كما ردّ عليه وجاء معه ملکٌ يقال له اسماعيل على مائة الف ملک كل ملک على مائة الف ملک فاستاذن عليه فساله عنه ثمّ قال جبرئيل هذاملک الموت يستاذن عليک مااستاذن على أدمى قبلک ولايستاذن على ادمى بعدک فقال ائذن له فاذن له فسلّم عليه ثمّ قال يا محمد انّ الله ارسلنى اليک فان امرتنى ان اقبض روحک قبضتُ وان امرتنى ان اتركه تركته فقال وتفعل ياملک الموت قال نعم بذلک امرت وامرت ان اطيعک قال فنظر النبىّﷺ إلىٰ جبرئيل (بقیہ اگلے صفحہ پر)

(۳) حـدّثنا قتیبةثنا اللیث عن ابن الهاد عن موسی بن سرجسٍ عن القاسم بن محمد عن عائشة أنّها قالت رأیت رسول اللّٰہ ﷺ وهو بالموت وعنده قدح فیه ماء وهو یدخل یده فی القدح ثمّ یمسح وجهه بالماء ثمّ یقول اللّٰهمّ اعنیّ علی منکرات الموت اوقال علی سکرات الموت(۱).

ترجمہ: حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ میں نے نبی کریم ﷺ کو دیکھا جب آپ ﷺ وفات فرمارہے تھے آپ ﷺ کے پاس ایک پیالہ تھا جس میں پانی تھا نبی اکرم ﷺ اس میں ہاتھ ڈالتے تھے اور (گیلا ہاتھ) منہ پر پھیرتے تھے۔ پھر یہ دعا فرماتے تھے کہ اے اللہ موت کی سختیوں پر میری مدد فرمائیے۔

عن القاسم بن محمّدالخ، یہ حضرت محمد بن ابی بکر کے بیٹے اور حضرت عائشہؓ کے بھتیجے ہیں۔

وهوبالموت، لفظ بالموت کا متعلق محذوف ہے۔ تقدیر یہ ہے **وهو مشرف بالموت** یعنی آپ ﷺ موت کے قریب تھے۔

ویمسح وجهه بالماء، بعض اوقات جب بخار انتہائی سخت ہوجاتا ہے تو تبرید ٹھنڈے تولیے اور کبھی برف کے ذریعے مریض کو آرام پہنچایا جاتا ہے۔ آج کل بھی بسا اوقات بخار کی حالت میں ڈاکٹر

(بقیه حاشیه ص۸)فقال جبرئیل یامحمّد انّ اللّٰه ﷺ قداشتاق إلی لقائک فقال النبی ﷺ لملک الموت امض لما امرت به فقبض روحه فلمّاتوفّی رسول اللّٰه ﷺ وجاء ت التعزیة سمعواصوتاً من ناحیة البیت السلام علیکم اهل البیت ورحمة اللّٰه وبرکاته انّ فی اللّٰه عزآء من کل مصیبة وخلفاً من کل هالک ودرکاً من کلّ فائت فباللّٰه فاتّقوا وایّاه فارجوافانّماالمصاب من حرم الثواب فقال علیٌّ أتدرون من هذاهوألخضر علیه السلام رواه البیهقی فی دلائل النبوة (مشکوٰة ص ۵۴۹ باب وفاة النبی ﷺ)(مختار)

(۱)جامع ترمذی ۱۹۲/۱ کتاب الجنائز باب ماجاء فی التشدیدعندالموت، سنن ابن ماجة ص۱۱۶ کتاب الجنائز باب ماجاء فی ذکر مرض رسول اللّٰه ﷺ،مسنداحمد۶۴/۶ (مختار)

رکھواتے ہیں۔اس پر عمل کرتے ہیں۔اور خود نبی کریم ﷺ سے یہ مروی بھی ہے۔فرماتے ہیں

إنّ الحمّٰی من فیح جهنم فابردوها بالماء (۱)، یعنی شدید بخار جہنم کے بھڑ اس میں سے ہے اسے پانی سے ٹھنڈا کردیا کرو۔

نیز فرمایا **الحمّٰی فور من النار فابردوها بالماء**(۲)،

<u>نبی کریم ﷺ کے سکرات الموت:</u> **اللّٰهمّ اعنیّ علی منکرات الخ،** منکرات سے وہ ناآشنا اور غیر معروف حالات مراد ہیں۔جو موت کے وقت انسان کو پیش آتے ہیں۔پھر یہ احوال اور اہوال طبعی طور پر بوجھ اور ناپسندیدہ بھی ہوتے ہیں۔مزید براں اس سے قبل انسان کا اس سے واسطہ بھی نہیں پڑا ہوتا۔عموماً ایسی حالت میں آدمی غفلت کا شکار ہوجاتا ہے۔اور جزع وفزع میں آخرت اور رضائے الٰہی کو بھول جاتا ہے۔چنانچہ ایسے سخت ترین اور خطرناک حالت میں نبی کریم ﷺ نے ثبات اور صبر کی توفیق طلب کی۔تاکہ طبعی طور پر نامساعد حالات سے رضا بالقضاء میں فرق نہ آئے اور شوق ملاقات مجروح نہ ہو چنانچہ استقامت کی دعا فرمائی۔کہ اے اللہ اس مرض میں مجھ سے خلاف ادب امور سرزد نہ ہوں اور موت کے وقت یکے بعد دیگرے جو بیہوشی ،غنودگی، غفلت، مدہوشی طاری ہوتا رہتا ہے۔اسے سکرات الموت کہتے ہیں اور یہی منکرات طبعی کی معلوم صورت بھی ہے۔اس لئے اکثر شراح نے منکرات اور سکرات کا مصداق ایک ہی بتایا ہے۔

<u>شدائد موت غیر مقبولیت کی علامت نہیں:</u> اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ موت کے وقت شدائد اور تکالیف سے دوچار ہونا مبغوضیت کی علامت نہیں ہمارے ہاں بسااوقات اس شخص کو بدبخت اور گناہ گار تصور کیا جاتا ہے جس کے سکرات موت سخت اور طویل ہوں مگر یہ غلط ہے بلکہ درحقیقت سیّأت وخطایا کم کرنے، صالحات کی کمی پوری کرنے، درجات کی بلندی اور مقامات عالیہ تک رسائی کی خاطر مقرّبین اور اولیاء اللہ پر یہ تکالیف اور شدائد زیادہ ہوتی ہیں گویا سکرات الموت کی شدت اللہ تعالیٰ کے دربار میں عدم

---

(۱) ترمذی ج۲ص ۲۷

(۲) ایضاً

مقبولیت کی علامت نہیں اور سید المخلوقات رسول اللہ ﷺ کی نسبت اللہ تعالیٰ کو اور کون زیادہ محبوب ہوسکتا ہے۔تو اس لطف ومہربانی کے زیادہ حقدار بھی وہی ہو سکتے تھے۔

آپ ﷺ کا عالمِ نزع بھی امت کے لئے اسوۂ حسنہ: مگر اللہ تعالیٰ نے نبی کریم ﷺ کی رحلت کو اس معاملے میں بھی دنیا کے سامنے ایک قابل تقلید نمونہ بنایا۔کہ شدائد موت میں آہ وفغاں کی بجائے صبر سے کام لینا چاہئے اور تجلّد واستقلال کا دامن مضبوطی سے تھام کر تسہیل وتخفیف کی دعا کرنی چاہئے۔اور یہی وجہ ہے کہ نبی کریم ﷺ نے اچانک آنے والی موت سے پناہ مانگی ہے۔

چنانچہ عمرو بن العاص ؓ کی روایت ہے کہ

إنّ رسـول الـلّٰه ﷺ استعاذ من سبع موتاتٍ.موت الفجاء ة ومن لدغ الـحية ومـن السبـع ومـن الـحـرق ومن الغرق ومن ان اخرّ علی شئی اویخرّ علیه شئی ومن القتل عند فرار الزحف،

ترجمہ: نبی کریم ﷺ نے سات موتوں سے پناہ مانگی،اچانک آنیوالی موت سے، سانپ کے ڈسنے سے، درندوں کی چیر پھاڑ سے، جلنے سے، ڈوبنے سے، کسی چیز پر گرکرمرنے سے یا کسی چیز کا اس پر گرجانے سے، اور جنگ سے بھاگتے ہوئے قتل ہونے سے۔

اور یہ اس لئے کہ عموماً ایسے حالات میں سوچنے،توبہ کرنے ، اللہ تعالیٰ کے حضور گڑگڑانے اور وصایا کرنے کا موقعہ نہیں ملتا۔

واضح رہے کہ بعض حضرات نے یہاں پر منکرات سے منکرات شرعی مراد لی ہیں یعنی شدائد موت کی وجہ سے آپ ﷺ نے منکر اور ناجائز امور کے ارتکاب سے بچنے کی دعا فرمائی۔مگراس ترجمہ پر علامہ ابن حجرؒ،ملاعلی قاریؒ اور دیگر متعدد شراح نے رد کیا ہے۔

(۴) حدّثنـا الـحسـن بـن الـصبّاح البزّارثنا مبشربن إسمٰعيل عن عبـدالرحمٰن بن العلاء عن ابيه عن ابن عمر عن عائشة قالت لا اغبط

احدابھون موت بعد الذی رأیت من شدۃ موت رسول اللّٰہ ﷺ(۱)
قال ابوعیسی سألت اباززعۃ فقلت لہ من عبدالرحمٰن بن العلاء
ھذاقال ھو عبدالرحمٰن بن العلاء بن اللجلّاج.

ترجمہ: حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ میں کسی بھی شخص پر اس کی موت کی آسانی پر رشک نہیں کرتی جب سے میں نے نبی کریم ﷺ کی موت کی شدت دیکھی ہے۔امام ترمذیؒ کہتے ہیں میں نے امام ابوزرعہ سے پوچھا کہ (اس سند میں) یہ عبدالرحمٰن بن العلاء کون ہیں۔انہوں نے بتایا کہ یہ عبدالرحمٰن بن العلاء بن اللجلاج ہیں۔

موت کی آسانی قابل رشک نہیں: **قالت لااغبط احداً بھون الخ** ،مطلب یہ ہے کہ اس سے قبل تو ہم سکرات موت میں تخفیف کی وجہ سے بعض لوگوں پر رشک کرتے تھے۔موت کی آسانی ایک نعمت معلوم ہوتی تھی اس لئے یہ تمنا ہوتی تھی کہ کاش فلاں شخص کی طرح آسان موت نصیب ہومگر نبی اکرم ﷺ کی موت کی سختی،شدائد وآلام نظر آئیں تو کسی کی مرض الموت میں تکلیف نہ ہونے پر رشک وغبطہ نامناسب معلوم ہونے لگا اور آسانی موت کی تمنا نہ رہی(۲)۔

اس حدیث میں بھی نبی اکرم ﷺ کی موت کی شدت کا بیان ہے۔لہٰذا موت کی تہوین وتخفیف کو کرامت سمجھنا خام خیال ہے کیونکہ شدائد گناہوں کی معافی اور رفع درجات کا سبب بن سکتے ہیں۔البتہ حضرت عائشہؓ نے یہ نہیں فرمایا کہ اب موت کی شدت کی تمنا کرتی ہوں۔کیونکہ جس طرح موت کی شدت ناپسندیدہ ہونے کی علامت نہیں۔اسی طرح اس کا ناپسندیدہ ہونا بھی حتمی نہیں ہے۔البتہ نبی اکرم ﷺ جیسے صاحب صبر وعزیمت کیلئے یہ نعمت ہی تھی۔

---

(۱)جامع ترمذی ۱/۱۹۲ کتاب الجنائزباب ماجاء فی التشدیدعندالموت،السنن الکبریٰ للنسائی ۴/۲۶۰ کتاب الوفاۃ باب ذکر قولہ ﷺ حین شخص بصرۃ بأبی ھو وامی، مسند احمد ۶/۶۴(مختار)

(۲) شیخ عبدالجوادؒ الدومی نے لکھا ہے **إنّ الشدۃ قد تکون تکفیراً لبعض السیّات وقدتکون لرفعۃ الدرجات(الاتحافات ۳۹۳)** اورعلامہ مناویؒ نے لکھا ہے **والحاصل أنّ الشدۃ لیست امارۃ علی خیر ولا ضدہ والرفق لیست علامۃ علی سوء ولاضدہ(مناوی علی ھامش جمع الوسائل ۲/۲۵۹)(مختار)**

یہاں یہ بات بھی یادرہے کہ یہ شدت اور پریشانی مقدمات موت کی وجہ سے ہے عین موت کی وجہ سے حضور ﷺ کو کوئی تکلیف و پریشانی نہ تھی بلکہ آپ ﷺ تو رفیق اعلیٰ کیلئے پہلے سے تڑپ رہے تھے۔ موت کے وقت بھی وصال کا تصور کر کے مسرت و بشاشت ظاہر ہو جاتی تھی۔

قال أبوعیسیٰ سألت أبازرعة الخ، چونکہ عبدالرحمٰن بن العلاء متعدد ہیں۔اس لئے امام ترمذیؒ نے اس کے بارے میں امام ابوزرعہؒ سے پوچھا تو انہوں نے اس کی تعیین فرمائی۔اور اسی تعیین کی غرض سے امام ترمذی یہ سوال وجواب نقل کرر ہے ہیں۔

(۵) حدّثنا ابوکریب محمّد بن العلاء ثنا أبومعاویة عن عبدالرحمٰن بن أبی بکرهوابن الملیکی عن ابن أبی ملیکة عن عائشة قالت لمّا قبض رسول اللّٰهﷺ اختلفوا فی دفنه فقال أبوبکر سمعت من رسول اللّٰهﷺ شیئاً مانسیته قال ما قبض اللّٰه نبیّاًإلاّفی الموضع الّذی یحبّ ان یّدفن فیه ادفنوه فی موضع فراشه(۱)۔

ترجمہ: حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ جب نبی اکرم ﷺ وفات پائے۔تو صحابہ کرامؓ نے آپ ﷺ کے دفن کے بارے میں اختلاف کیا۔اس پر ابوبکر صدیقؓ نے فرمایا کہ میں نے نبی اکرم ﷺ سے ایک بات سنی تھی۔ جو میں ابھی تک نہیں بھولا۔(وہ یہ کہ) آپ ﷺ نے فرمایا کہ کسی پیغمبر کی روح کو بھی اللہ تعالیٰ نے قبض نہیں کیا مگر ایسی جگہ پر جہاں اللہ تعالیٰ ان کے دفن کو پسند کرتے ہیں۔لہٰذا تم ان کو ان کے(وصال کے) بستر کی جگہ ہی دفن کردو۔

<u>ابوبکرصدیقؓ:</u> ابوبکر صدیقؓ کا اصلی نام عبداللہ تھا۔والد کا نام عثمان بن عامرؓ تھا والدہ کا نام سلمی بنت صخرؓ تھا۔قریش کے تیم بن مرۃ شاخ سے تعلق تھا۔والدین دونوں اسلام سے مشرف ہو چکے تھے۔ایک

---

(۱) مشکوٰۃ المصابیح ص۵۴۷ باب وفاۃ النبی ﷺ الفصل الثانی ،شرح السنة ۴۸/۴ باب فی مرضه ووفاته ﷺ کتاب الفضائل رقم الحدیث ۳۸۳۲(مختار)

روایت کے مطابق دونوں نے حضرت ابوبکرصدیقؓ سے میراث بھی پائی تھی۔گویاان کی وفات آپ ﷺ کی وفات کے بعد ہوئی تھی۔عام الفیل کے ڈھائی سال بعدابوبکرصدیقؓ کی ولادت ہوئی۔

بعثت نبوی ﷺ سے پہلے ہی نبی اکرم ﷺ سے دوستی کاتعلق تھااور بعثت کے بعد سب سے پہلے آپؓ ہی ان پرایمان لائے تھے۔اس زمانہ میں آپؓ ایک بہترین اورتجربہ کارتاجر تھےاور چالیس ہزاردرہم کے کثیرسرمایہ کے مالک تھے لیکن وفات کے وقت آپؓ نے ایک درہم بھی میراث میں نہیں چھوڑا۔مال کااغلب حصہ اسلام کی خدمت میں صرف ہوا۔اسلام کے بعد نبی اکرم ﷺ کی صحبت وخدمت کاالتزام کیا۔شب وروز آپ ﷺ کی رفاقت کا شرف حاصل ہوا۔مکہ مکرمہ میں، ہجرت میں، غارثور کی اقامت کے دوران، پھرتمام غزوات میں حتی کہ موت تک ساتھ رہے۔

اسلام لانے والے غلام باندیوں کوخریدخریدکرآزادکرتے رہےجن میں حضرت بلالؓ، عامربن فہیرۃؓ، زنیرۃؓ، نہدیہؓ اور ان کی بیٹی، بنی المؤمل کی کنیز اور ام عبیسؓ مشہور ہیں۔ ان کے علاوہ دیگر نادارمسلمانوں کی معاونت بھی فرماتے رہے۔آپؓ کے مناقب اورخدمات کے احاطہ کیلئے کئی جلدیں بھی ناکافی ہیں ویسے آپ کی صحابیت منصوص ہے۔''اذھما فی الغار''اور''اذیقول لصاحبه''میں بالاتفاق آپؓ کا ذکر کیا گیا ہے۔اس لئے آپؓ کی صحابیت کے منکر کوکافرکہا گیا ہے(۱)،آپ کا لقب عتیق تھا۔جوکہ والدین کی طرف سے اورایک قول کے مطابق نبی اکرم ﷺ کی طرف سے دیا گیا تھا۔اس لقب کی متعدد وجوہ بیان کی جاتی ہیں مثلاً

۱) عتیق کامعنی جمیل ہے۔اورآپؓ کوظاہری حسن کی وجہ سے عتیق کہا گیا تھا۔

۲) عتیق قدیم کے معنی میں ہےاورآپؓ قدیم فی الخیر تھے۔یعنی بھلائی میں سب سے آگے تھے۔

۳) عتیق نفیس چیز کو کہتے ہیں اورآپؓ بھی نسب کے لحاظ سے عیوب سے پاک تھے۔

۴) عتیق آزادکوبھی کہتے ہیں اور چونکہ آپؓ کی والدہ کے ہاں اولادزندہ نہیں بچتی تھی۔آپؓ کی ولادت کے بعدانہوں نے دعا کی''اللّھمّ ھذا عتیقک من الموت''اے اللہ یہ بچہ موت سے آزادہو۔

---

(۱)کما صرّح به القاری فی آخر ھذاالباب ،۱۲ اصلاح الدین عفی عنه

مگر اسلام کے بعد آپؓ کو نبی اکرم ﷺ کی طرف سے صدیق کا لقب ملا۔ اور آپؓ کی کنیت ابوبکر اور لقب صدیق آپؓ کے تمام ناموں پر غالب آ گئے۔

اپنے مناقب کی وجہ سے تمام صحابہ پر آپؓ کو تقدم حاصل تھا۔ چنانچہ غزوۂ تبوک میں اسلامی فوج کے علمبردار تھے۔ ۹ھ میں امیر حج مقرر ہوئے۔ اور نبی اکرم ﷺ نے اپنی زندگی میں امامتِ صغریٰ (نماز کی امامت) میں آپؓ کو اپنا نائب مقرر کر دیا تھا۔ چنانچہ وفات نبوی ﷺ کے بعد باتفاق صحابہ آپ ﷺ کو امامۃ کبری خلافت نبوی ﷺ کیلئے منتخب کیا گیا۔

آپؓ کی ایک خصوصیت یہ تھی کہ آپ کو عرب کے انساب کا علم پوری طرح حاصل تھا۔ بالخصوص قریش کے انساب اور مختلف قبیلوں کے خیر وشر کی تاریخ از بر تھی۔ بڑے بڑے نساب بھی اس سلسلے میں آپؓ کی طرف رجوع کرنے سے مستغنی نہیں تھے۔

روایت حدیث کے سلسلے میں آپؓ کے شاگردوں میں اکابر صحابہ اور اکابر تابعین کے نام آتے ہیں۔ خلفائے راشدین، عشرہ مبشرہ اور دیگر صحابہؓ آپؓ سے روایت کرتے ہیں۔

آپؓ کی وفات تریسٹھ برس کی عمر میں جمادی الاولیٰ ۱۳ھ میں ہوئی۔ ایک روایت کے مطابق حارث بن کلدہ رضی اللہ عنہ جو طبیب تھے۔ آپؓ کے ساتھ کھانے میں شریک ہوئے۔ حارث بن کلدہؓ نے جونہی کھانے سے ایک نوالہ لیا تو آپؓ کو کھانے سے منع کرتے ہوئے کہا کہ اے ابوبکرؓ! رکئے اس کھانے میں ایک سال مہلت دینے والا زہر ملا ہے۔ چنانچہ آپؓ اور حارث بن کلدہؓ دونوں کی موت ٹھیک ایک سال بعد ایک ہی دن واقع ہوئی۔ اس روایت کے مطابق آپؓ کی موت زہر خورانی سے ہوئی جیسے کہ نبی اکرم ﷺ کی وفات کا اصل سبب بھی زہر خورانی تھا۔ ایک گونہ شہادت کے اعزاز میں بھی اللہ نے آپؓ کو حضور اقدس ﷺ کے ساتھ شریک کیا۔

<u>تدفین میں اختلاف:</u> اختلفوا فی دفنه الخ، یہ بات ذہن نشین رہے کہ صحابہ کرام عام اور معمولی باتوں میں اختلافات سے گریز کرتے تھے لیکن رحمۃ للعالمین ﷺ کی رحلت عام انسان کی موت نہ تھی نیز بنی اسرائیل میں انبیاء کثرت سے گزرے تھے۔ اور متعدد بار انہوں نے انبیاء کی تدفین اپنے

ہاتھوں سے کی تھی۔اس لئے ان کے ہاں یہ کوئی غیر معمولی واقعہ نہیں ہوتا تھا۔لیکن نبی کریم ﷺ کی بعثت تو امیّین میں ہوئی تھی اور انہوں نے نبی کی موت کے بارے میں سنا بھی نہ تھا وہ اس بات کا تصور بھی نہ کر سکتے تھے کہ ایسی مقدس ہستی پر خاک ڈال دیں وہ حیران تھے کہ نبی کیسے وفات پاتا ہے؟ اور وفات کے بعد اس سے کیا رویہ برتا جاتا ہے؟ اسے دفنایا بھی جاتا ہے یا نہیں؟ اور ہے تو کہاں پر دفنایا جائے گا؟ ان کا جنازہ بھی پڑھایا جائے گا یا نہیں؟ جبکہ جنازہ پڑھانا بھی تو بڑے دل گردے کا کام ہے پھر جنازہ اجتماعی ہوگا یا انفرادی؟ اس قسم کے دیگر سوالات کی وجہ سے وہ ششدر و پریشان تھے اور الجھنوں میں پڑے رہے۔

ایسی حالت میں اللہ تعالیٰ نے صدیق الامت کے دل میں عزم و استقامت کا مادہ پیدا کردیا۔ امت کے اس مونس وغمخوار نے صحابہ کی تسلی اور پریشانی ختم کرنے کا کام اپنے ہاتھ میں لیا۔فقال ابوبکرؓ، جس طرح پہلے گزر چکا ہے کہ اختلاف کی متعدد جہتیں تھیں۔ یہاں صرف تدفین کے مقام پر اختلاف کا ذکر ہے آپ ﷺ کے مدفن کے بارے میں مختلف آراء سامنے آئیں۔کوئی جنت البقیع کا نام لیتا تھا،کوئی آپ ﷺ کے گھر کو ترجیح دیتا تھا،کوئی مسجد میں دفن کرنے پر مصر تھا،کسی کی رائے یہ تھی کہ آپ کو اپنے مولد یعنی مکہ مکرمہ میں مقام ابراہیم یا حطیم میں دفن کرنا چاہیئے۔کوئی کہتا کہ چونکہ آپ ﷺ ملت ابراہیمی کے امام ومجدد ہیں۔اس لئے اپنے جد امجد کے پاس انہیں الخلیل میں دفن ہونا چاہیئے۔ جہاں حضرت ابراہیم علیہ السلام کے علاوہ حضرت اسحٰق علیہ السلام، حضرت یوسف علیہ السلام اور دیگر جلیل القدر انبیاء مدفون ہیں۔ آج کل اس شہر کو حبرون بھی کہا جاتا ہے جو کہ بدقسمتی سے اسرائیل کے جدید مقبوضہ علاقوں میں شامل ہے۔ بعض دوسرے صحابہ کے خیال میں بیت المقدس لے جانا بہتر تھا(۱)۔

الغرض ہر کوئی اپنا خیال پیش کرتا۔ابوبکرؓ تک بات پہونچی تو آپ نے یہ گتھی سلجھادی اور اس سلسلے میں نبی کریم ﷺ کا فرمان پیش کردیا۔کہ نبی کو وہیں دفن کیا جاتا ہے جہاں ان کی موت واقع ہوتی ہے۔

واضح رہے کہ حضرت صدیق اکبرؓ اپنے مزاج اور عادت کی وجہ سے روایت کے سلسلے میں بہت محتاط تھے۔بلا ضرورت روایت کرنے سے کتراتے تھے اور اس کا سبب بظاہر یہ تھا کہ آپؓ احادیث کی بہت

---

(۱)فقیل فی مسجده وقیل بالبقیع وقیل عند جده ابراهیم علیه السلام وقیل بمکة،(جمع الوسائل ج۲ ص ۲۶۱)(اصلاح الدین)

زیادہ تعظیم واحترام کرتے اور ادب ملحوظ رکھتے تھے۔ کہ کہیں بے احتیاطی نہ ہونے پائے۔ تاہم جب ضرورت پڑتی تو خاموش تماشائی بھی نہ بنتے تھے۔خصوصاً امت کے درمیان نزاعی مسائل میں آپ ﷺ کی روایت فیصل اور حکم بنتی تھی۔ محدثین نے ایسی روایات کی نشاندہی کردی ہے۔ جن میں انتہائی ناگفتہ بہ حالات میں آپ کی رہنمائی نے امت محمدی کو سنبھالا دیا۔

مدفن نبی کا انتخاب خدائی ہوتا ہے: ماقبض اللّٰه نبيًا الاّفى الموضع الخ ،یعنی پیغمبر کی روح اللہ تعالیٰ جس جگہ قبض فرماتے ہیں وہی جگہ تدفین کیلئے بھی منتخب فرما چکے ہوتے ہیں۔ گویا نبی کریم ﷺ نے خود ہی اس قول کے ذریعے فیصلہ دے دیا۔ کہ جس حجرہ میں ہیں وہیں دفن کردو۔ اتفاق سے وہ حجرہ سیدۃ عائشہؓ کا تھا اور سب نے اس حکم کے آگے سر تسلیم خم کردیا۔ کسی نے بھی لب کشائی نہ کی۔ یہ بھی نہ کہا کہ حضرت فاطمہؓ کا حجرہ قریب ہے یا حضرت علیؓ کے گھر دفن ہونا چاہئے نیز یہ بدگمانی بھی کسی نے نہیں کی کہ حضرت ابوبکر صدیقؓ نے اپنی بیٹی کو یہ شرف دلوانے کیلئے کوئی بات بنائی ہوگی (والعیاذ باللہ) بعد کے معاندین اہل رفض نے ان ساری باتوں میں الزامات اور بدگمانیوں کا بازار گرم کیا۔ اس موقعہ پر اہل بیت، ازواج مطہراتؓ، حضرت علیؓ، حضرت فاطمہؓ اور دیگر تمام صحابہؓ موجود تھے۔لیکن سب نے اپنے رہبر ورہنما حضرت صدیق اکبرؓ کے قول پر شک تک بھی ظاہر نہیں کیا۔ اگر شیعہ موجود ہوتے تو یہ الزام اس وقت بھی لگاتے۔ کہ صدیقؓ نے یہ سب کچھ اقرباء پروری کیلئے کیا ہے۔ جبکہ حقیقت یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت عائشہؓ کو دیگر تشریفات کے علاوہ اس شرف سے بھی مشرف فرمایا تھا۔ چنانچہ صحابہؓ میں سے کسی نے بھی اس پر انکار نہیں فرمایا۔

یہاں یہ بات بھی بخوبی واضح ہوگئی کہ نبی برحق کو اللہ تعالیٰ کبھی بھی غیر معزز مقام میں وفات نہیں ہونے دیتے ہاں جو جعلی اور بناوٹی نبی ہو اسے ٹٹی (بیت الخلاء) میں مرنا نصیب ہو تو کوئی اچنبھے کی بات نہیں۔ مرزا غلام احمد جیسے دجال کی تکذیب کیلئے یہ حدیث بھی کافی ہے۔ کہ اللہ تعالیٰ کسی نبی کی روح اس جگہ لیتے ہیں۔ جس جگہ اسے دفن کرنا مقصود ہو۔ جب کہ اس کذاب کو ہم دیکھتے ہیں کہ اسے لاہور میں علاج کیلئے لایا گیا تو لاہوری مرزائیوں کی بلڈنگ میں اقامت کے دوران اسے سخت ہیضہ نے آلیا جب قضائے حاجت کیلئے گیا تو بیت الخلاء ہی میں جہنم واصل ہوا۔ چشم دید گواہوں کے مطابق غلاظت اس کے منہ پر بھی

لگی ہوئی تھی اگر وہ معاذ اللہ واقعی نبی ہوتا تو نبی کریم ﷺ کے اس قول کے مطابق تو اسے وہیں بیت الخلاء میں دفن کرنا تھا اور قادیان لیجانے کا کوئی جواز نہیں تھا۔

(۲) حدثنا محمد بن بشّار وعبّاس العنبری وسوار بن عبداللّٰہ وغیر واحد قالوا نا یحییٰ بن سعید عن سفیان الثوریّ عن موسیٰ بن أبی عائشة عن عبیداللّٰہ بن عبداللّٰہ عن ابن عبّاس وعائشة رضی اللّٰہ عنهم أنّ أبابکر قبّل النبیّ ﷺ بعدمامات(۱).

ترجمہ: حضرت ابن عباس اور حضرت عائشہ رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے نبی اکرم ﷺ کو ان کی وفات کے بعد بوسہ دیا تھا۔

ابوبکر صدیقؓ کا بے پناہ صبر واستقامت: نبی کریم ﷺ کی رحلت کے وقت حضرت ابوبکر صدیقؓ موجود نہیں تھے۔ اکثر تو مرض وفات میں آپؓ حاضر رہے۔ لیکن زراعت وغیرہ کی غرض سے انہیں دور جانا پڑتا۔ وفات سے کچھ قبل نبی کریم ﷺ کی طبیعت کچھ بہتر ہوئی آپ اپنی زمین کے انتظام کی خاطر ایک میل دور مقام سُخ کی طرف چلے گئے تھے۔ ادھر نبی کریم ﷺ کی بیماری میں شدت پیدا ہوگئی دوپہر کے وقت جب حضرت ابوبکر صدیقؓ اپنی مسجد میں بیٹھے تھے کہ حضرت سالمؓ نے یہ دلدوز خبر سنائی سب کچھ چھوڑ کر فوراً مسجد نبوی کا رخ کیا۔ وہاں صحابہ کی اشک بار آنکھیں آپ کی منتظر تھی۔

تمام صحابہ غم والم میں ڈوبے ہوئے تھے حضرت عمرؓ تلوار سونپتے ہوئے کھڑے تھے۔ اور کہہ رہے تھے کہ نبی کریم ﷺ کی موت کے بارے میں جس نے لب کشائی کی اس کی گردن اڑا دوں گا اس عظیم سانحہ نے صحابہ کے حواس کو معطل کر کے رکھ دیا تھا۔ حوصلہ اور استقامت صرف صدیقؓ کا کام ہوسکتا تھا۔ **قبل النبیّ ﷺ بعد مامات الخ** (۲)، اگلی حدیث میں آئے گا کہ حضرت ابوبکر صدیقؓ آئے تو نبی کریم ﷺ

(۱) صحیح بخاری کتاب المغازی باب مرض النبیّ ﷺ، السنن الکبریٰ للنسائی ۴/ ۲۶۲ کتاب الوفاة الموضع الذی قبّل من رسول اللّٰہ ﷺ حین توفی، سنن ابن ماجة ص ۱۱۵ کتاب الجنائز باب ماجاء فی تقبیل المیت، مصنف ابن ابی شیبة ۳/ ۲۸۵ کتاب الجنائز (مختار)

(۲) علامہ بیجوریؒ نے لکھا ہے فتقبیل المیت سنة (المواهب الدنیة)(مختار)

پر صحابہ کا ہجوم تھا چھوٹا سا کمرہ کھچا کھچ بھرا ہوا تھا حضرت صدیقؓ کو دیکھتے ہی صحابہ نے راستہ بنا کر صاحب رسول اللہ ﷺ کو آخری دیدار کا موقعہ دیا۔ چنانچہ آپؓ حضور ﷺ کے پاس آئے۔ بے پناہ قوۃ برداشت، حوصلہ اور تحمل کے باوجود اس وقت عشق ووارفتگی سے بے قابو ہو کر پیشانی مبارک کو الوداعی بوسہ دیا اور **وانبیّاہ، واصفیاّہ واخلیلاہ** کے الفاظ منہ سے نکلے۔

ابوبکر صدیقؓ پر فراق نبوی ﷺ کا اثر: مورخین حیران ہیں کہ ابوبکرؓ بے پناہ عشق کے باوجود اتنا ضبط کیونکر کر سکے مگر حقیقت یہ ہے کہ آپؓ کا صبر صرف ظاہری تھا آپؓ کو اس جانکاہ صدمے سے اندر ہی اندر پگھلا کر رکھ دیا اور آپ اس سے جانبر نہ ہو سکے اور دو ڈھائی سال بعد اپنے محبوب سے جا ملے چنانچہ موت کے بارے میں یہی کہا جاتا ہے کہ **مات من کمدٍ لحقه، من هجر رسول الله ﷺ**، یعنی آپؓ نبی اکرم ﷺ کی ہجر کے دکھ سے وفات پائے۔

نبی کریم ﷺ کے ساتھ محبت کا اندازہ اس بات سے بھی لگایا جا سکتا ہے۔ کہ جب نبی کریم ﷺ نے عین حیات میں ایک موقعہ پر خطبہ دیتے ہوئے فرمایا۔ **إنّ عبداً خيّره اللّٰه بين ان يوتيه زهرة الدنيا ماشاء وبين ما عنده فبكىٰ ابوبكر** (۱)، ایک بندے کو اللہ تعالیٰ نے ان دو باتوں میں سے ایک اختیار کرنے کا کہا کہ یا تو وہ اس دنیا کی چمک دمک میں سے جو وہ چاہے دے دیگا یا پھر اسے وہ چیز دے دے گا جو اللہ تعالیٰ کے پاس ہے۔

تمام صحابہؓ بیٹھے تھے اور اس قصہ کو ایک حکایت ہی سمجھ بیٹھے مگر صدیق پر نبی کا عکس پڑتا ہے وہ سمجھ گئے کہ نبی کریم ﷺ کسی دوسرے کی حکایت نہیں بلکہ اپنی بات کر رہے ہیں اس لئے آپ دھاڑیں مار کر رونے لگے اور کہا **فدیناک بآباء نا و اُمهاتنا**، ہمارے ماں باپ تجھ پر قربان ہوں۔ لوگوں نے کہا اس بوڑھے کو دیکھو کہ نبی کریم ﷺ کسی اور کی بات کرتے ہیں اور یہ رونے لگے۔ نبی کریم ﷺ سمجھ گئے کہ صدیق بات کی تہہ تک پہنچ گئے ہیں اس لئے فرمایا "**علی رسلک یا أبابکر**" یعنی اے ابوبکر حوصلہ

---

(۱)صحیح بخاری کتاب المناقب باب هجرة النبی ﷺ وأصحابه إلىٰ المدنية، جامع ترمذی ۲/۶۸۵ مناقب ابی بکرؓ وصحیح مسلم ۲/۲۷۳ کتاب الفضائل، باب مناقب ابی بکرؓ من مناقب ابی بکر رضی الله عنه(مختار)

رکھو، سنبھلو۔اور پھر فرمایا لـو کنت متخذاً خلیلاً لاتّخذت ابابکر خلیلاً الاو انّ صاحبکم خلیل اللّٰہ(۱)

ترجمہ: اگر میں کسی کو دوست چنتا تو ابوبکرؓ ہی ہوتا مگر تمہارا نبی اللہ کا دوست ہے۔

مقام صدیق:

اس والہانہ عشق ومحبت کے باوجود کہ وفات النبی ﷺ کے تصور سے بھی پھوٹ پھوٹ کر رونے لگے۔ یہاں اس موقع پر اللہ تعالیٰ نے آپ کو قوت برداشت اور صبر وتحمل کا مظہر بنا دیا۔ تا کہ دکھی لوگوں کو ایک دلاسہ دینے والا مونس وغم خوار مل جائے اور بلاشبہ نیابت رسالت کا منصب ایسے شخص کے شایان شان ہے جس کے بارے میں خود نبی کریم ﷺ نے فرمایا کہ میں نے ہر شخص کے احسانات کا بدلہ دے دیا ہے صرف ابوبکر کے احسانات کا بدلہ میں نے آخرت کیلئے مؤخر کر دیا ہے۔

اقبال اپنے الہامی کلام میں نبی کریم ﷺ کے نزدیک صدیقؓ کے مرتبے کی یوں تصویر کشی کرتے ہیں ۔ آن امنّ الناس برمولائے ما آن کلیم اوّل سینائے ما

اور حضرت حسان بن ثابتؓ شاعر رسول اللہ ﷺ نے ایک موقعہ پر ابوبکر کی شان میں کیا عجیب مدحیہ اشعار کہے۔فرماتے ہیں کہ

خیر البریة اتقاها واعدلها بعدالنبیّ و اوفاها بما حملا

وثانی اثنین فی الغار المنیف وقل طاف العدویه اذ صعد الجبلا

و کان حِبُّ رسول اللّٰہ قدعلموا من البریة لم یعدل به رجلا

بہر حال صدیقؓ نے نبی کریم ﷺ کو الوداعی بوسہ دیا اور اس میں حضور ﷺ کی اقتداء اور تیمن و تبرک کو بھی ملحوظ رکھا۔ خود نبی کریم ﷺ سے یہ سنت ثابت ہے۔ چنانچہ حضرت عثمان بن مظعونؓ جب وفات پائے تو نبی کریم ﷺ نے ان کی پیشانی کو بوسہ دیا تھا۔

(۷) حدّثنا نصر بن علی الجهضمیّ ثنامرحوم بن عبدالعزیز العطّار عـن أبـی عـمـران الـجونیّ عن یزید ابن بابنوس عن عائشة أنّ ابابکر

(۱) صحیح مسلم

رضی اللّٰہ عنہما دخل علی النبیّ ﷺ بعد وفاته فوضع فمه فاه بین عینیه ووضع یدیه علی ساعدیه وقال وانبیّاه واصفیّاه واخلیلاه(۱).

ترجمہ: حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ حضرت ابوبکر صدیقؓ آپ ﷺ کی وفات کے بعد حجرہ کے اندر تشریف لائے تو اپنا منہ نبی اکرم ﷺ کی آنکھوں کے درمیان رکھا اور اپنے ہاتھ نبی اکرم ﷺ کے بازوں پر رکھ کر کہا ''ہائے نبی، ہائے اللہ کے برگزیدہ، ہائے میرے ساتھی، ہائے میرے دوست''

فوضع فمه بین عینیه الخ، یعنی آپ ﷺ کی پیشانی کو چوما اور ساتھ ساتھ ''**وانبیّاه واصفیّاه** اور **واخلیلاه**(۲) '' پکار کر فراق کا بوجھ ہلکا کر دیا۔ لیکن آپؓ کی یہ پکار نوحہ کے طور پر نہیں تھی۔ اس سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے۔ کہ حقیقی صفات کا لحاظ کر کے میت کو ''وا'' اور ''یا'' سے پکارنا جائز ہے۔ مسند احمد کی روایت میں ہے کہ آپؓ رسول اللہ ﷺ کے سر کی جانب تشریف لائے۔ اور جھک کر پیشانی پر بوسہ دیتے ہوئے کہا ''**وانبیاه**'' پھر دوبارہ منہ جھکا کر پیشانی کو بوسہ دیا اور ''**واخلیلاه**'' کہا(۳)، مزید تفصیل گزشتہ حدیث کے ضمن میں گزر چکی ہے۔

(۸) حدّثنا بشر بن هلال الصوّاف البصریّ ثنا جعفر بن سلیمان عن ثابت عن انس قال لمّا کان الیوم الذی دخل فیه رسول اللّٰه ﷺ المدینة اضاء منها کلّ شئی فلمّا کان الیوم الذی مات فیه أظلم منها

---

(۱) تفرد الامام الترمذی بهذا الحدیث

(۲) علامہ بیجوریؒ حدیث بالا سے استدلال کرتے ہوئے لکھا ہے وهذا یدلّ علی جواز عدّ اوصاف المیت بلا نوع بن ینبغی ان یندب لانّه من سنة الخلفاء الراشدین والأئمة المهتدین وقد صار ذلک عادة فی رثاء العلماء بحضور المحافل العظیمة والمجالس الفخیمة (المواهب الدنیة)(مختار)

(۳) بلکہ مسند احمد کی روایت میں تین بار بوسہ دینے کا ذکر ہے۔ پہلی بار ''وانبیّاه'' دوسری بار ''واصفیّاه'' اور تیسری بار ''واخلیلاه'' کے الفاظ ادا فرمائے۔ لیراجع مسند احمد کتاب باقی مسند الأنصار باب باقی المسند السابق حدیث نمبر ۲۴۶۵۸، ۱۲، (مختار)

کل شئی ومانفضناایدینا عن التّراب وإنّا لفی دفنه ﷺ حتی انکرنا قلوبنا(۱).

ترجمہ: حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ جس دن نبی کریم ﷺ مدینہ میں تشریف لائے (اس روز سے) مدینہ کی ہر چیز روشن ہوگئی۔ پھر جب وہ دن آیا جس میں آپ ﷺ نے وفات پائی تو ہر چیز پر اندھیرا چھا گیا اور ہم نبی اکرم ﷺ کی تدفین میں مصروف تھے ابھی ہاتھ بھی (قبر کی) مٹی سے جھاڑنے نہیں پائے تھے۔ کہ ہم نے اپنے دلوں کو اوپر پایا۔

اضاء منھا کل شئی الخ، یہاں پر انوار اور ظلمات کی تعیین میں شراح کا اختلاف ہے۔ علامہ ابن حجر، علامہ مناوی اور بعض دیگر شراح کا خیال ہے۔ کہ ظاہری نور اور ظلمت جو آنکھوں سے محسوس ہوتی ہوں مراد ہیں۔ گویا یہاں نبی اکرم ﷺ کے ایک معجزہ کا بیان ہے۔ کہ قدوم نبوی سے مدینہ میں انوار اور رحلت سے اندھیرے محسوس ہونے لگے۔ جیسا کہ قرآن کی آیت "**فقدجاء کم من اللّٰہ نورو کتاب مبین**" میں صراحۃً آپ ﷺ کو نور کہا گیا ہے لیکن ملاعلی قاریؒ اور بعض دیگر شراح نے نور وظلمت سے معنوی نور وظلمت مراد لی ہیں مابعد کا کلام اس کیلئے مؤید ہے کیونکہ بعد میں دلوں کا تغیر بیان ہے تو معنوی ظلمت ہی ہے ظاہری نور وظلمت دلوں میں تو نہیں ہوتی۔ چنانچہ نور اس مقام پر ہدایت سے یا خوشی ومسرت سے یا دنیا وآخرت کی صلاح سے کنایہ ہوگا۔ اور ظلمت سے اس کا بالعکس معنی مراد ہوگا۔

<u>نبی کریم ﷺ کی تدفین سے انوار میں کمی:</u> نبی کریم ﷺ جس دن مدینہ طیبہ تشریف لائے تھے۔ تو سارا شہر ظاہری وباطنی خوشیوں کی آماجگاہ بن گیا تھا۔ انوار کی بارش سے یہ چیز ہر ایک کو محسوس ہورہی تھی۔ نبی کریم ﷺ کی آمد سے مدینہ ہی کیا؟ سارا عالم منور ہوگیا۔ اس وقت مدینہ کے چھوٹے بڑے سب مسرور تھے بچے خوشی میں دف بجا بجا کر گاتے

؎ طلع البدر علینا من ثنیات الوداع وجب الشکر علینا مادعاللّٰہ داع

(۱) سنن ابن ماجة ص۱۱۷ کتاب الجنائز باب ذکر وفاته ودفنه ﷺ شرح السنة للبغوی ۱۴/۵۰ باب فی مرضه ووفاته ﷺ کتاب الفضائل رقم الحدیث ۳۸۳۴ (مختار)

اس سے قبل مدینہ کے لوگ دس پندرہ روز تک انتظار کی شدید کیفیتوں سے دوچار رہے تھے۔ چھوٹے بڑے سب ثنیۃ الوداع میں جمع ہوکر نبی کریم ﷺ کا انتظار کرتے۔اور حضور ﷺ کو نہ دیکھتے تو واپس جا کر دوسرے دن استقبال کیلئے نکلتے۔جس روز آپ ﷺ مدینہ پہنچے تو مدینہ میں عید کی سی خوشی منائی گئی۔حضرت انسؓ فرماتے ہیں کہ حضور ﷺ کے قدوم سے سارا مدینہ منور ہوگیا۔ ہر چیز روشن ہوگئی۔پھر جب دس سال بعد وہ مبارک ومقدس ہستی رخصت ہونے لگی۔تو ہم لوگ وصال کے بعد تدفین سے فارغ ہوکر ابھی ہاتھ سے مٹی جھاڑنے بھی نہ پائے تھے۔کہ ہم نے دلوں کو بدلا ہوا پایا۔ ہر چیز اوپری سی لگ رہی تھی۔ یہاں تک کہ ہم نے اپنے دلوں کی کیفیت بھی متغیر محسوس کی۔ جیسے سورج کے ڈوبتے ہی ظلمتوں کا بحر محیط اُمڈ آتا ہے اور ساری کائنات اوپری سی لگتی ہے یونہی نبی کریم ﷺ کی موجودگی کے سبب جوانوار واثرات اوروحی کی برکتیں تھی۔صاحب وحی کے اٹھتے ہی کم ہوگئیں۔حتی انکرنا قلوبنا الخ ، قلوب میں بھی وہ صفائی لطافت،طراوت وحلاوت،اور صحبت نبی کی برکت سے پیدا ہونے والی نورانیت نہ رہی جو اس سے قبل تھی۔مگر انکار قلوب سے مراد تصدیق وایمان میں کمی مراد نہیں ہے ظاہر ہے کہ نبی کریم ﷺ کی صحبت کی وجہ سے جو مشاہدات اور طمانینت حاصل تھی وہ ادھوری ہوگئی۔ بلکہ آپ ﷺ کے بعد ہر لحظہ خیر میں کمی اور شر میں اضافہ ہوتا جاتا ہے یہی اثر نبی کریم ﷺ کی موت کے قریب ترین لمحات میں بھی رہا۔ جسے صحابہؓ کی حساس نظروں نے تاڑلیا۔پھر خیر القرون کے بعد تو ہر گزشتہ کل آج سے بہتر ہونے کا ثبوت ملتا رہتا ہے۔ایک حکایت کے مطابق ایک صوفی شخص نے دکان کھولی جس میں تازہ روٹی ایک روپیہ اور باسی روٹی دوروپے میں بکتی تھی۔مگر لوگ تازہ روٹی چھوڑ کر سوکھی روٹی خریدتے تھے۔کیونکہ وہ نبی کریم ﷺ کے زمانے کے کچھ قریب پکی ہوتی تھی۔

(۹) حدّثنا محمّد بن حاتم ثنا عامر بن صالح عن هشام بن عروة عن أبيه عن عائشة قالت توفيّ رسول الله ﷺ يوم الاثنين(۱).

ترجمہ: حضرت عائشہؓ سے روایت ہے کہ نبی اکرم ﷺ سوموار کے دن وفات پائے۔

(۱)صحیح بخاری ۱۸۶ کتاب الجنائز باب موت یوم الاثنین، مصنف عبدالرزاق(مختار)

توفی رسول اللّٰہﷺ یوم الاثنین الخ ، نبی کریمﷺ کاوصال پیر کے روز ہوا تھا یہ مسئلہ اجماعی ہے۔کسی مورخ نے بھی اس میں اختلاف نہیں کیا۔جس کی تفصیل ابتدائے باب میں گزر چکی ہے۔

(١٠) حدّثنا محمّد بن أبی عمر ثنا سفیان بن عیینة عن جعفر بن محمّد عن ابیه قال قبض رسول اللّٰہﷺ یوم الاثنین فمکث ذلک الیوم ولیلة الثّلثاء ودفن من الّلیل وقال سفیان وقال غیره یسمع صوت المساحی من اٰخر الیل(١).

ترجمہ: محمد بن علی بن الحسینؒ (امام باقرؒ) سے روایت ہے کہ نبی کریمﷺ پیر کے روز وفات پائے اس روز اور منگل کے رات کو یونہی (بغیر دفن کے) رہے۔اور (اگلی رات) یعنی بدھ کی رات کودفن کئے گئے۔حضرت سفیان کہتے ہیں کہ دوسرے راوی کہتے ہیں کہ رات کے آخری حصے میں پھاوڑوں کی آواز سنائی دیتی تھی۔

محمّد بن علیّ بن الحسین ،حدیث کے راوی حضرت حسین بن علیؓ کے پوتے ہیں۔جو امام باقرؒ کے نام سے مشہور ہیں۔تابعی ہیں۔١٢٨ھ میں وفات پائی۔بعض روایات کے مطابق انہیں زہر دے کر شہید کردیا گیا تھا۔جنت البقیع میں دفن ہوئے۔

فمکث ذالک الیوم، نبی اکرمﷺ کا انتقال پیر کے روز ہوا۔لیکن تدفین فوری طور پر نہ ہوسکی بلکہ منگل کی رات اور منگل کا دن بھی گزر گیا اور بدھ کی رات کو کہیں تدفین مکمل ہوسکی۔لہٰذا **دفن من الیل** ،الیل سے معہود رات "**لیلة الاربعاء**" یعنی بدھ کی رات مراد ہے۔گویا اس مقام میں اختصاراً "**یوم الثلاثاء**" یعنی منگل کی دن مذکور نہیں۔حالانکہ وہ دن بھی بغیر تدفین کے گزر چکا تھا۔

<u>تدفین میں تاخیر کا سبب:</u> سنت اور افضل یہ ہے کہ میت کو جلدی دفن کردیا جائے۔لیکن خاص حالات اس سے مستثنٰی ہیں نبی کریمﷺ کی تدفین بھی کوئی معمولی بات نہیں تھی۔بلکہ وہ حالات کچھ ایسے تھے کہ ہر ہر

(١)تفرد الامام الترمذی بهذا الحدیث(مختار)

بات نئی ہونے کی وجہ سے جھگڑا پیدا ہونے کا اندیشہ تھا۔اس لئے غور وفکر اور مشوروں کی ضرورت تھی۔

ادھر نبی کریم ﷺ کے کفن ودفن کے احکامات بھی ہر کسی کو معلوم نہ تھے اور ان معاملات کو حضور ﷺ کی تدفین سے قبل ہی طے کرانا ناگزیر تھا۔تاکہ تجہیز وتدفین میں وحدت واجتماعیت برقرار رہے۔اور تمام صحابہ اس میں شریک ہوں۔

پھر بدقسمتی سے خلافت کے مسئلہ میں ابتداءً اختلاف پیدا ہوا جس کی اہمیت کا احساس صدیق اکبرؓ جیسے نباض امت اور عمر فاروقؓ جیسے صاحب فراست وسیاست ہی کو ہوسکتا تھا چنانچہ اس کٹھن مرحلہ میں امت کو افتراق اور تشتت وانتشار سے بچانے کیلئے ابوبکر صدیقؓ اور دیگر صحابہ نے پہلے اس کی طرف توجہ دینا ضروری سمجھا۔کیونکہ وہ جانتے تھے کہ یہ اختلاف قیامت تک امت کیلئے دردسر بنا رہے گا۔

نبی کریم ﷺ کی رحلت کے فوراً بعد صحابہؓ میں خلیفۃ الرسول کے بارے میں مشورے ہوئے انصار نے سقیفہ بنوساعدہ میں جمع ہو کر یہ مسئلہ چھیڑ دیا ابوبکر صدیقؓ اور عمرؓ کو اس کے بارے میں پتہ چلا اور محسوس کیا کہ اگر انصار اپنے مقصد میں کامیاب ہوگئے تو وحدت واجتماعیت اور یکجہتی ختم ہو کر امت کا شیرازہ بکھر جائے گا چنانچہ وہ بھی اس مسئلہ سے نمٹنے کیلئے سقیفہ بنوساعدہ چلے گئے۔اسی دوران انصار میں سے حضرت حباب بن منذرؓ نے "منّا امیر و منکم امیر" کا نعرہ لگا کر "ادھر ہم ادھر تم" کا نظریہ پیش کر دیا۔مگر صدیقؓ کی فراست نے امت کی وحدت کی لاج رکھ لی۔ چنانچہ آپؓ نے انصار کو ایک مؤثر تقریر کے ذریعے سمجھایا جس پر انصار کے مجمع نے لبیک کہا۔حضرت عمرؓ نے وہیں آپؓ کے ہاتھ پر بیعت کر لی اور پھر دوسرے روز مسجد نبوی ﷺ میں عمومی بیعت کے ذریعے تمام لوگوں نے صدیق اکبرؓ کو خلافت کا فریضہ سونپ دیا۔اس کے بعد ہی تدفین کی طرف توجہ دینے کا موقعہ ملا۔جس کا لازمی نتیجہ یہ نکلا کہ تدفین میں دیر ہوگئی۔

تاخیر کا ایک سبب اور بھی تھا کہ نماز جنازہ اجتماعی طور پر نہیں ہوا تھا۔بلکہ صحابہؓ ٹولیوں کی صورت میں حجرہ میں جاتے اور نماز پڑھتے۔اور حجرہ بھی وہ حجرہ جس میں نبی کریم ﷺ تہجد پڑھتے تو حضرت عائشہؓ کے سونے کیلئے جگہ نہ ہوتی تھی حضور ﷺ سجدے میں جاتے تو حضرت عائشہؓ پاؤں سمیٹ لیتی تھیں تب حضور ﷺ کے سجدے کیلئے جگہ بنتی تھی تو ایسے حجرے میں بیک وقت زیادہ سے زیادہ تین چار آدمی ہی نماز

پڑھ سکتے ہیں اور ظاہر ہے کہ ہزاروں عشاق کے نماز پڑھنے پر بہت دیر لگی ہوگی۔

یسمع صوت المساحی الخ، مساحی مسحاۃ کی جمع ہے۔ یہ میم زائدہ کے ساتھ اسم آلہ ہے جس کا معنی کشف ہوتا ہے۔ پھاوڑے کو کہتے ہیں اور چونکہ رات کا آخری حصہ سکوت اور خاموشی کا وقت ہوتا ہے۔ اس وجہ سے یہ آواز دور سے بھی صاف سنائی دیتی تھی۔ اس دوسری روایت میں یہ تصریح ہے کہ تدفین رات کے آخری حصے تک جاری رہی۔ گویا حضرت سفیانؒ امام باقرؒ کی روایت کی تشریح کرتے ہیں کہ رات سے مراد رات کا آخری حصہ ہے۔

(۱۱) حدّثنا قتیبة بن سعید ثنا عبدالعزیز بن محمّد عن شریک ابن عبدالله بن أبی نمر عن أبی سلمة بن عبدالرحمٰن بن عوف قال توفیّ رسول الله ﷺ یوم الاثنین ودفن یوم الثلثاء (۱) قال ابوعیسیٰ هذاحدیث غریب.

ترجمہ: حضرت ابوسلمہ بن عبدالرحمٰن بن عوف سے روایت ہے کہ نبی اکرم ﷺ پیر کے دن وفات پائے اور منگل کو آپ ﷺ کی تدفین ہوئی۔

<u>ابوسلمۃ</u>: ابوسلمہ بن عبدالرحمٰن، حضرت ابوسلمہ مدنی تابعی ہیں حضرت عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ کے بیٹے ہیں ۲۰ھ کے بعد ولادت ہوئی ان کا نام عبداللہ اور ایک قول کے مطابق اسماعیل تھا مکثر فی الحدیث ہیں ۹۴ھ اور ایک قول کے مطابق ۱۰۴ھ میں وفات پائی۔

ودفن یوم الثلاثاء الخ، دراصل منگل اور بدھ کی درمیانی شب کو حضور ﷺ کی تدفین ہوئی تھی جس کو مجازاً یوم الثلاثاء یعنی منگل کا دن بھی کہا جاسکتا ہے اور یوم الاربعاء بھی۔ یا یوں کہئے کہ منگل کی شام کو تدفین کا کام وغیرہ امور کو شروع کیا گیا اور رات کے آخری حصہ تک تکمیل ہوئی یوں تدفین کی نسبت منگل کے روز کو ہوگئی۔ جبکہ بعض شراح نے یہ کہا ہے کہ شریک بن عبداللہ نے خطأً اس دن کا ذکر کیا ہے خود امام ترمذیؒ نے بھی اس حدیث کو غریب کہا ہے۔

---

(۱) تفرد لامام الترمذی بهذاالحدیث (مختار)

(۱۲) حدّثنا نصربن علی الجهضمیّ انا عبداللّٰہ بن داؤد قال ثنا سلمة بن نبیط أخبرنا عن نعیم بن أبی هند عن نبیط بن شریط عن سالم بن عبید وکانت له صحبة قال اغمی علی رسول اللّٰہﷺ فی مرضه فافاق فقال حضرت الصلوة فقالوا نعم فقال مروا بلالا فلیؤذّن ومروا أبابکر فلیصلّ للنّاس اوقال بالنّاس ثم اغمی علیه فافاق فقال حضرت الصلوة قالوا نعم فقال مروا بلالا فلیؤذّن ومروا أبابکر فلیصلّ بالنّاس فقالت عائشة إنّ ابی رجل اسیف اذا قام ذلک المقام بکیٰ فلایستطیع فلوامرت غیره قال ثمّ اغمی علیه فافاق فقال مروا بلالا فلیؤذّن ومروا أبابکر فلیصلّ بالناس فانّ کنّ صواحب اوصواحبات یوسف قال فامر بلال فاذّن وامر ابوبکرفصلّیٰ بالنّاس ثمّ انّ رسول اللّٰہﷺ وجدخفّة فقال انظروإلی من اتّکئی علیه فجاء ت بریرة ورجل اٰخر فاتّکأ علیهما فلمّاراٰه أبوبکر ذهب لینکص فاومأالیه ان یثبت مکانه حتّٰی قضیٰ أبوبکر صلوته ثمّ أنّ رسول اللّٰہﷺ قبض فقال عمرواللّٰہ لااسمع احدایذکرأنّ رسول اللّٰہﷺ قبض إلاّضربته بسیفی هذا قال وکان النّاس امیّین لم یکن فیهم نبیّ قبله فامسک النّاس قالوا یاسالم انطلق إلیٰ صاحب رسول اللّٰہ ﷺفادعه فاتیت أبابکر وهو فی المسجد فاتیته ابکی دهشًافلمّا رانی قال لی أقبض رسول اللّٰہﷺ قلت أنّ عمر یقول لا اسمع احدًایذکرأنّ رسول اللّٰہﷺ قبض إلاّضربته بسیفی هذا فقال لی انطلق فانطلقت معه فجاء هو والنّاس قددخلوا علی رسول اللّٰہﷺ فقال یا ایّهاالنّاس افرجوا لی فافرجواله فجاء حتی اکبّ علیه ومسّه فقال إنّک میت

وإنّهم میتون ثمّ قالوا یا صاحب رسول اللّٰہﷺ أقبض رسول اللّٰہﷺ قال نعم فعلموا انّہ قدصدق قالوا یاصاحب رسول اللّٰہﷺ أنصلی علی رسول اللّٰہﷺ قال نعم قالوا وکیف قال یدخل قوم فیکبّرون ویدعون ویصلّون ثمّ یخرجون ثمّ یدخل قوم فیکبّرون ویصلّون ویدعون ثمّ یخرجون حتیّ یدخل الناس قالوا یاصاحب رسول اللّٰہﷺ أیدفن رسول اللّٰہﷺ قال نعم قالوا این قال فی المکان الذی قبض اللّٰہ فیہ روحہ فإنّ اللّٰہ لم یقبض روحہ إلاّفی مکان طیب فعلموا أنّہ قدصدق ثمّ امرهم ان یغسلہ بنوابیہ واجتمع المهاجرون یتشاورون فقالوا انطلق بنا اخواننا من الانصار ندخلهم معنا فی هذا الامر فقالت الانصار منّا امیر ومنکم امیرفقال عمر بن الخطاب رضی اللّٰہ عنہ من لہ مثل هذہ الثّلٰث ثانی اثنین اذهما فی الغار اذ یقول لصاحبہ لاتحزن إنّ اللّٰہ معنا من هما قال ثمّ بسط یدہ فبایعہ وبایعہ النّاس بیعةً حسنةً جمیلةً(۱).

حدیث سالم میں تفصیلات:

ترجمہ: حضرت سالم بن عبیدرضی اللہ عنہ سے روایت ہے جوصحابی ہیں کہ نبی اکرمﷺ پرمرض وفات میں غشی طاری ہوئی۔ پھرافاقہ ہواتو پوچھا کہ کیانماز کاوقت ہوچکا ہےصحابہ کرامؓ نے کہا کہ ہاں۔تو آپﷺ نے فرمایا کہ بلالؓ سے کہوکہ وہ اذان دیں اورابوبکرؓ سے کہوکہ وہ لوگوں کونماز پڑھائیں۔پھرآپﷺ بیہوش ہوگئے۔ پھرہوش آیا۔ تودریافت کیا کہ کیا نماز کا وقت ہوچکا ہے لوگوں نے کہا کہ

(۱)سنن ابن ماجة ص۸۶کتاب اقامة الصلوٰة والسنة فیها باب ماجاء فی صلوٰة رسول اللّٰہﷺ فی مرضہ، السنن الکبریٰ للنسائی ۲۶۴/۴ کتاب الوفاة ذکرکفن النبیﷺوفی کم کفن(مختار)

ہاں۔ پھر فرمایا کہ بلالؓ سے کہو کہ وہ آذان دیں اور ابوبکر صدیقؓ سے کہو کہ وہ نماز پڑھائیں۔(کئی بار ایسا ہوا تو) حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے عرض کیا کہ (میرے والد) ابوبکر رضی اللہ عنہ غم سے نڈھال ہونے والے(نرم دل) انسان ہیں۔ جب اس جگہ (جہاں آپ کھڑے ہوئے تھے) کھڑے ہونگے۔ تو رونے لگیں گے اور نماز پڑھانے کی استطاعت نہیں ہوگی۔ لہٰذا اگر آپ ﷺ کسی اور (مثلاً حضرت عمرؓ) کو (نماز پڑھانے کا) حکم دیں تو بہتر ہوگا۔ پھر آپ ﷺ پر غشی طاری ہوگئی پھر ہوش آیا تو فرمایا کہ بلالؓ سے کہو کہ وہ آذان دیں اور ابوبکر صدیقؓ سے کہو کہ وہ لوگوں کو نماز پڑھائیں۔ تم تو یوسف علیہ السلام کے قصے (میں مذکور مصر) کی عورتوں جیسی ہو۔ حضرت سالمؓ کہتے ہیں کہ پھر بلالؓ کو حکم دیا گیا کہ تو انہوں نے آذان دی اور ابوبکر صدیقؓ کو حکم دیا گیا تو انہوں نے (جمعہ کی رات کو عشاء کی) نماز پڑھائی۔ (اسی طرح سترہ نمازیں آپؓ نے پڑھائیں) پھر آپ ﷺ کی حالت (پیر کی صبح کو قدرے) سنبھل گئی۔ تو حکم دیا کہ دیکھو کوئی مجھے سہارا دینے والا ہو تو حضرت بریرہ رضی اللہ عنہا اور ایک اور شخص آیا آپ ﷺ ان کا سہارا لے کر (باہر آئے) جب ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے آپ ﷺ کو دیکھا تو پیچھے ہٹنے لگے۔ تو نبی اکرم ﷺ نے اشارہ فرمایا۔ کہ اپنی جگہ کھڑے رہو۔ یہاں تک کہ ابوبکر صدیقؓ نے نماز پوری فرمائی۔ پھر نبی اکرم ﷺ (پیر کے دن ہی) وفات پائے تو حضرت عمرؓ نے (تلوار نکال کر) کہا کہ خدا کی قسم جس کسی کو بھی یہ کہتے ہوئے میں نے سنا کہ رسول اللہ ﷺ وفات پائے ہیں میں اس تلوار سے اس کا کام تمام کردوں گا۔ حضرت سالمؓ کہتے ہیں کہ عرب کے لوگ ناخواندہ تھے نبی اکرم ﷺ سے پہلے ان کے ہاں نبی نہیں آیا تھا (اس لئے وہ بھی وفات نبی میں متردد ہوئے۔ لوگ نبی اکرم ﷺ کو وفات شدہ کہنے سے رک گئے۔ (البتہ مجھے) انہوں نے حکم دیا کہ اے سالم رسول اللہ ﷺ کے ساتھی کے پاس

جاؤ ان کو بلاؤ، میں ابوبکر صدیقؓ کے پاس آیا وہ اس وقت مسجد میں تھے میں دہشت کے مارے روتا ہوا ان سے ملا جب انہوں نے مجھے (روتا ہوا) دیکھا تو پوچھا کہ کیا رسول اللہ ﷺ وفات پا چکے؟ میں نے کہا کہ حضرت عمرؓ کہتے ہیں کہ جس کسی کو بھی یہ کہتے ہوئے میں نے سنا کہ رسول اللہ ﷺ وفات پائے ہیں میں اس تلوار سے اس کا کام تمام کردوں گا۔ ابوبکر صدیقؓ نے مجھے حکم دیا کہ آؤ میں ان کے ساتھ گیا آپؓ آئے اس حال میں کہ دوسرے (کچھ) لوگ بھی نبی اکرم ﷺ کے ہاں آچکے تھے آپؓ نے لوگوں سے کہا کہ اے لوگوں میرے لئے جگہ بناؤ (لوگ ہٹے) تو آپؓ آئے نبی اکرم ﷺ پر جھک گئے ان کو ہاتھ لگا کر (بوسہ دے کر) یہ آیت پڑھی ''انک میّت و انھم میّتون ''(اے نبی ﷺ تم بھی وفات پانے والے ہواور وہ بھی مرنے والے ہیں) اس کے بعد صحابہ کرامؓ نے ابوبکر صدیقؓ سے پوچھا کہ اے رفیق رسول کیا نبی اکرم ﷺ وفات پا چکے ہیں آپؓ نے فرمایا ''ہاں'' صحابہ کو یقین ہوگیا کہ ابوبکر صدیقؓ سچ کہہ رہے ہیں انہوں نے پوچھا اے رفیق رسول ,کیا ہم رسول اللہ ﷺ کی نماز جنازہ پڑھیں گے فرمایا ہاں، انہوں نے پوچھا کس طرح پڑھیں گے آپؓ نے کہا کہ ایک جماعت حجرہ کے اندر جائے۔ وہ (چار) تکبیریں پڑھے اور اس کے اندر دعا اور درود بھی پڑھے پھر نکلے اس کے بعد دوسری جماعت اندر آئے اور تکبیریں اور درود اور دعا پڑھے پھر وہ نکل جائے یہاں تک سب لوگ حجرے میں آ کر نماز پڑھ لیں صحابہ کرام نے پوچھا کہ اے رفیق رسول کیا رسول اللہ ﷺ دفن کئے جائیں گے فرمایا ہاں انہوں نے پوچھا کہاں؟ فرمایا اس جگہ پر جہاں پر اللہ تعالیٰ نے ان کی روح قبض کی ہو۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ نے ان کی روح کو پاک (اور مبارک) جگہ پر ہی قبض کیا ہوتا ہے۔ صحابہ کو یقین ہوگیا کہ صدیق نے سچ بولا ہے اس کے بعد ابوبکر صدیقؓ نے حکم دیا کہ نبی اکرم ﷺ کے دادا کی اولاد ان کو غسل دیدیں۔

ادھر مہاجرین آپس میں (امارت وخلافت کے سلسلے میں) مشورہ کرنے کیلئے جمع ہو گئے کچھ لوگوں نے کہا کہ آئیں اپنے انصار بھائیوں کو خلیفہ کے تقرر کے کام میں اپنے ساتھ شریک کرلیں (انصار سے مشورہ کے بعد) انصار نے کہا کہ ایک امیر ہم انصار میں سے اور ایک امیر تم مہاجرین میں سے ہو۔ حضرت عمرؓ (اس مجلس میں) بولے کون ہے جس کیلئے ان تین فضیلتوں کی طرح فضیلتیں حاصل ہوں۔ (اول) **ثانی اثنین اذھما فی الغار** ،یعنی ابوبکر ان دو میں سے دوسرے ہیں جب وہ غار ثور میں تنہا تھے۔(یہ منقبت نبی اکرم ﷺ کے ساتھ انتہائی گہرے ربط کی غماز ہے) دوم، **اذیقول لصاحبه** یعنی جب نبی اکرم ﷺ نے اپنے رفیق سے فرمایا (یہ منقبت خداوند تعالیٰ کی جانب سے ابوبکر صدیقؓ کی صحابیت اور نبی کریم ﷺ کی رفاقت کی تنصیص ہے) سوم، **لاتحزن إنّ اللّٰه معنا** ، یعنی غم نہ کر اللہ تعالیٰ ہمارے ساتھ ہے (اس خبر وآیت میں اللہ تعالیٰ کی معیت ونصرت کا بیان ہے کہ جس طرح وہ نبی اکرم ﷺ کے ساتھ تھی ویسے ابوبکر صدیقؓ کے ساتھ بھی تھی) بتاؤ وہ دو (غار ثور کے ساتھی) کون تھے (یعنی نبی اکرم ﷺ اور اس کے ساتھی ابوبکر صدیقؓ) اس کے بعد عمر فاروقؓ نے ہاتھ بڑھایا اور صدیق اکبرؓ سے خلافت پر بیعت کرلی اور (عمرؓ کی متابعت میں) دیگر لوگوں نے بھی ان کے ہاتھ پر برضا ورغبت بہت سچی بیعت کرلی۔

سالم بن عبیدؓ: حضرت سالم بن عبید اشجعی رضی اللہ عنہ اہل صفّہ میں سے تھے۔ بعد میں کوفہ میں رہائش پذیر ہوئے اصحاب سنن نے ان سے دو حدیثیں روایت کی ہیں۔ ایک حدیث امام ترمذیؒ اور ابوداؤدؒ نے کتاب الادب باب ماجاء فی تشمیت العاطس میں روایت کی ہے اور دوسری زیرنظر حدیث ہے۔

اغمی علی رسول اللّٰه ﷺ فی مرضه فافاق، مرض سے مرض وفات مراد ہے۔ اور افاقہ سے مراد یہ ہے کہ کمزوری کی بناء پر آپ جس بے خودی کا شکار ہوئے۔ یا جس طرح آپ ملکوت

بالا کے مشاہدے میں مشغول ہوئے تھے وہ حالت ختم ہوگئی اور دوبارہ عالم ناسوت میں رجوع کر گئے۔

اغماء نبوت کے منافی نہیں: اغمی علی رسول اللہ ﷺ نبی اکرم ﷺ کو مرض وفات میں بار بار غشی ہوتی تھی۔اور جب ہوش آتا تو پوچھتے کہ نماز کا وقت ہوگیا ہے یا نہیں؟ جواب ملنے پر فرماتے کہ بلال ؓ کو آذان کہنے اور ابوبکر صدیق ؓ کو نماز پڑھنے کا حکم دو۔اس جملے میں انبیاء پر بیہوشی طاری ہونے کا ذکر ہے اور یہ جائز ہے کیونکہ بیہوشی ایک جسمانی بیماری ہے جو انبیاء کے حق میں ممتنع نہیں لیکن علامہ سبکیؒ کہتے ہیں کہ انبیاء کا اغماء بھی معمولی بیخودی ہوتی ہے مکمل طور پر بے شعوری سے وہ محفوظ ہوتے ہیں جیسے کہ ان کی نیند بھی مکمل بے شعوری کا سبب نہیں بنتی البتہ انبیاء کے حق میں جنون ممتنع ہے بلکہ دیوانگی سے محفوظیت پر قرآن کریم ناطق ہے۔

اقامۃ صلوٰۃ اور حاکم وقت کی ذمہ داری: مروا ابلالاً ان یؤذّن ، آپ ﷺ نے بستر مرگ پر بھی اقامت نماز کی فکر فرمائی کیونکہ حاکم وقت کی ذمہ داری ہے کہ وہ واجبات وشرائع دین کی اقامت کا انتظام کرے۔یہی اس کی حقیقی ذمہ داری ہے دنیوی امور میں اصلاحات وسیاست کی حیثیت ثانوی ہے بلکہ وہ بھی اسلئے ہے کہ لوگوں کو طمانینت کے ساتھ حق عبدیت کا موقعہ ملے۔لہٰذا حکمران کو چاہئے کہ نماز کی اہمیت کے پیش نظر نظام صلوٰۃ نافذ کرے۔مسجد اس کے ڈول، پانی، کوزہ، بجلی چٹائی جائے نماز، لاؤڈ سپیکر، گھڑی، اوقات صلوٰۃ کا اعلان وغیرہ کا بندوبست سب نظام صلوٰۃ کا جزو اور حکومت وقت کے فرائض میں داخل ہیں۔اور نبی کریم ﷺ نے مرض الوفات میں بھی اس کا اہتمام رکھا۔اسی طرح آپ ﷺ نے امام کا تقرر بھی فرمایا۔ إنّ أبی رجل اسیف الخ، اسیف لغۃً سخت غمزدہ، سریع الحزن، نیز نرم دل اور رحیم کو کہتے ہیں۔یہاں سے ظاہر ہوتا ہے کہ اگر صحابہ عزت وجاہ کے طالب ہوتے تو ان میں سے ہر ایک یہ سفارش کرتا کہ میرا باپ یا میرے بھائی بندوں میں سے کوئی امامت کرے۔لیکن صحابہؓ کا طبقہ اخلاص وللّٰہیت کا طبقہ تھا۔خود حضرت عائشہؓ نبی اکرم ﷺ سے ان کے والد کی امامت کروانے کا حکم واپس لینے کی درخواست کرتی ہیں حالانکہ وہ یہ بھی سمجھتی تھی کہ اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ نے جسے ہمارے دین کی امامت کیلئے منتخب فرمایا ہے وہی دنیا کے امور میں بھی امامت وقیادت کا حقدار ہوگا۔گویا یہ امامت امارت

دنیوی اور خلافت کی بنیاد بننے والی تھی مگر بایں ہمہ وہ خود کہتی ہیں کہ میرے والد رقیق القلب ہیں۔ بہت زیادہ غمگین ہونے والے اور نرم دل ہیں۔ اور رسول اللہ ﷺ کے ساتھ ان کی عشق و محبت بھی کوئی ڈھکی چھپی بات نہیں۔ لہٰذا واضح ہے کہ آپ ﷺ کی جگہ خالی دیکھ کر دل پارہ پارہ ہو جائیگا۔ اور آہ و بکاء اس کی نماز میں حائل ہو جائے گی اس لئے ان کی جگہ کسی دوسرے کا تقرر کروائیے۔

<u>صواحبات یوسف سے تشبیہ:</u> فإنّ کنّ صواحب یوسف الخ، نبی کریم ﷺ کو کچھ افاقہ ہوا۔ تو حضرت عائشہؓ کے اصرار کا جواب دیتے ہوئے اس کے عذر کرنے پر خفگی کا اظہار فرمایا۔ حاصل یہ کہ میں نے ایک حکم دیا ہے اب اس میں چون و چرا اور اس پر نکتہ سنجیوں کی کوئی ضرورت نہیں۔ تم عورتیں تو وہ لوگ ہو جنہوں نے حضرت یوسفؑ کو بھی مصائب میں ڈالا تھا اور غلط مشورے دیئے اسی طرح تم بھی مجھے غلط مشورے دیکر پریشان کر رہی ہو۔

یہاں پر نبی کریم ﷺ نے صرف عائشہؓ کیلئے جمع کا صیغہ استعمال کیا جو یا تو صرف اعزاز و تشریف کیلئے ہے۔ اور معزز و مہذب لوگوں کا طریقہ یہ ہے کہ وہ مخاطب کو جمع کے صیغے سے مخاطب کر کے پکارتے ہیں۔ خواہ وہ مخاطب اس کے بیوی بچوں میں سے کیوں نہ ہو۔ مثلاً حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ہمراہ سفر میں ان کی بیوی جارہی ہیں۔ مگر وہ کہتے ہیں۔ امکثوا إنّی آنست ناراً لعلّی آتیکم منها بخبر الآیۃ، تو نبی کریم ﷺ نے اعزازاً و تشریفاً جمع کا صیغہ استعمال کیا۔ یا اس وجہ سے جمع کا صیغہ لائے۔ کہ حضرت عائشہؓ کی تائید دیگر ازواج مطہرات نے بھی کی تھی۔ خصوصاً حضرت حفصہؓ تو اکثر باتوں میں حضرت عائشہؓ کے ہمراہ ہوا کرتی تھیں اور بخاری اور ترمذی (باب مناقب ابی بکرؓ) میں یہ تصریح ہے کہ حضرت عائشہؓ نے حضرت حفصہؓ کے ذریعے بھی یہ بات کہلوائی تھی۔

<u>وجہ تشبیہ:</u> یہاں پر تشبیہ ایک بے موقعہ بات کہنے اور اس پر اصرار کرنے میں ہے یعنی صواحبات (۱) یوسف علیہ السلام نے بھی یوسف علیہ السلام کے سامنے عجیب چال چلی اور بے جا مطالبے میں زلیخا کی

(۱) صواحبات یوسف سے اگر مصر کی عورتیں مراد ہوں تو یہ تشبیہ درست ہے لیکن ملا علی قاریؒ نے صواحب یوسف سے زلیخا مراد لیکر وجہ شبہ یہ بیان کی ہے کہ جیسے زلیخا نے بظاہر تو دعوت کا بہانہ کر کے مصر کی عورتوں کو اکٹھا کر لیا تھا مگر در پردہ وہ اپنی محبت میں مجبوری اور عذر خواہی کا ارادہ کر چکی تھی۔ (اصلاح الدین)

سفارش کردی اسی طرح حضرت عائشہؓ نے بھی گویا بے محل بات کہہ کر اصرار کیا۔ یا تشبیہ اس میں ہے کہ جس طرح زلیخا نے دعوت کا بہانہ بنایا مگر درحقیقت وہ اپنی سہیلیوں کی طعن وتشنیع کے جواب میں اعتزار اور اپنی مجبوری کا اظہار چاہتی تھی۔ اسی طرح حضرت عائشہ بھی بظاہر رقت قلبی کا بہانہ کرتی ہیں مگر حقیقت میں انہیں اس بات کا اندیشہ ہے کہ نبی کریم ﷺ کی جگہ کھڑا دیکھ کر لوگ ان کے والد کو منحوس سمجھیں گے۔ جیسا کہ بخاری ومسلم کی روایات میں تصریحات ہیں۔

اقتداء ابوبکر اور امامت ابی بکر کی تاکید: نبی کریم ﷺ کی تاکید پر حضرت ابوبکرؓ ہی نے نماز پڑھانی شروع کردی ادھر نبی کریم ﷺ نے خود یہ منظر دیکھنے کیلئے حضرت بریرہؓ اور ایک اور صحابی کا سہارا لیا اور مسجد تک تشریف لائے حضرت ابوبکر صدیقؓ نے سوچا کہ اب تو افضل ترین امام آچکے ہیں اس لئے فذهب لينكص ،ينكص کاف کے ضمہ کے ساتھ ینصر کے وزن پر اور کسرہ کے ساتھ یضرب کے وزن پر آتا ہے مؤخر الذکر قرآن میں بھی موجود ہے۔ یعنی نماز میں پیچھے ہٹنے لگے۔ مگر نبی کریم ﷺ نے اشارہ کیا کہ ٹھہرو اور نماز پڑھاؤ۔ میں تیری اقتداء میں نماز پڑھنے کا منظر دیکھنا چاہتا ہوں۔ ابوبکر صدیقؓ نے نماز مکمل کرلی۔ اور رسول اللہ ﷺ نے گویا زبان حال سے اعلان کردیا کہ میں نے تمہارے لئے امام اور خلیفہ کو مقرر کردیا ہے۔

حتّی فصلّی ابوبکر صلواة ،علامہ مناویؒ لکھتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے آکر ابوبکر صدیقؓ کی اقتداء میں نماز پڑھی بلکہ بیہقی کی روایت میں اس کی تصریح منقول ہے۔ جبکہ ملاعلی قاریؒ نے اس کو ترجیح دی ہے کہ نبی اکرم ﷺ ابوبکر صدیقؓ کو دیکھنے کے بعد واپس ہوگئے۔ دوسری روایات میں اس کی تصریح ہے(۱) جس دن آپ ﷺ کی وفات ہوئی تھی اسی روز صبح کی نماز میں بھی آپ ﷺ نے حجرے کے دروازے میں کھڑے ہو کر وحدت امت اور امامت ابی بکرؓ سے آنکھیں ٹھنڈی فرمائیں۔ اور پھر واپس حجرے میں تشریف لے آئے۔ اگر یہاں پر اسی نماز کا ذکر ہو پھر تو ملاعلی قاریؒ کی بات راجح ہے۔ اور اگر یہ کسی اور نماز کا ذکر ہو تو پھر نبی اکرم ﷺ کا مسجد میں تشریف لانا۔ اور ابوبکر صدیقؓ کے پہلو میں بیٹھ کر نماز پڑھانا بھی ثابت ہے۔

---

(۱) کماسبق فی الروایة الاولیٰ من هذاالباب ۱۲، اصلاح الدین عفی عنه

بہر حال واقعات کے تعدد سے یہ گتھی بھی سلجھ سکتی ہے اسی طرح نبی اکرم ﷺ جن دو شخصوں کا سہارا لیکر مسجد میں تشریف لائے تھے۔ان کی تعیین میں بھی مختلف ناموں کا ذکر آتا ہے۔مثلاً حضرت عباسؓ، فضل بن عباسؓ، حضرت علیؓ، حضرت اسامہ بن زیدؓ، حضرت ثوبانؓ، حضرت نوبہؓ اور حضرت بریرۃ بنت صفوانؓ، اگر واقعات متعدد ہوں تو پھر اس اختلاف کی توجیہہ میں بھی آسانی ہو جاتی ہے۔

ثمّ أنّ رسول اللّٰہ ﷺ قبض ، یہ مطلب نہیں کہ اسی جمعرات کو جس میں امامت ابی بکرؓ کی ابتداء ہوئی تھی آپ ﷺ وفات پائے بلکہ مراد یہ ہے کہ امامت کے انتظام کے بعد آپ ﷺ کی وفات واقع ہوئی جو تین دن بعد پیر کی دوپہر واقع ہے۔اس وقت ابوبکر صدیقؓ عوالئ مدینہ میں سنخ کے مقام پر تھے جہاں ان کا اپنا گھر تھا۔

<u>حضرت عمرؓ حواس گم کر بیٹھے:</u> **فقال عمرؓ لااسمع احداً الخ** ،عشق ومحبت اور دل میں محبوب کی عظمت انتہاء کو پہنچ جائے تو انسان کی سمجھ میں محبوب کی موت ناممکن نظر آنے لگتی ہے وہ ہکا بکا اور حیران ہوتا ہے نبی کریم ﷺ کی حیثیت تو بڑی اونچی ہے ان سے کم تر لوگ بھی مر جائیں تو عقیدتمندوں کو ان کی موت کا اعتبار نہیں آتا اور اس کی قریب ترین مثال امیر المجاہدین سید احمد شہیدؒ کی شہادت کے وقت نظر آتی ہے۔جب اس کے کفن بردوش سپاہی اولوالعزمی، عالی ہمتی، جفاکشی اور وفاشعاری کا پیکر بن کر مشرقی ہندوستان کے دور دراز علاقوں سے درہ بولان کے راستے افغانستان چلے جاتے ہیں۔پھر وہاں سے بے سروسامانی کی حالت میں درہ خیبر کے ذریعے پشاور آکر اسے فتح کر لیتے ہیں۔اس کے بعد یہ قافلہ مجاہدین پیش قدمی کر کے اکوڑہ خٹک آتا ہے اور یہاں پر سکھ حکومت سے ٹکر ہوتی ہے۔

<u>سید صاحبؒ کی شہادت کا جان نثاروں پر اثر:</u> مولانا ابوالحسن علی ندوی مدظلہم نے یہاں دارالعلوم حقانیہ آمد کے موقع پر ایک تقریر میں فرمایا تھا کہ مجھے بہت استقراء وتتبع اور تاریخ کو کھنگالنے کے بعد یہ معلوم ہو گیا کہ گزری ہوئی چار پانچ صدیوں سے صحیح اسلامی اصولوں کیمطابق جہاد پوری قواعد شرعی کو ملحوظ رکھتے ہوئے یہاں اکوڑہ خٹک سے شروع ہوا اتنی طویل مدت کے بعد سید احمد شہیدؒ نے اسلامی قوانین کی پاسداری کرتے ہوئے پہلے دشمن کو دعوت اسلام دی ورنہ جزیہ یا پھر تلوار سے جہاد کیلئے تیار ہو جانے کی اطلاع دی۔

اور جہاد کے تمام مقدمات کی تکمیل کے بعد اکوڑہ خٹک کے مقام پر حملہ کر کے شہداء نے اپنا خون بہایا۔

جنگ اکوڑہ خٹک: اس کے بعد سید صاحب اور اس کے ساتھی اکوڑہ خٹک کے مقام پر شب خون کے بعد قریبی گاؤں شیدو آتے ہیں اور وہاں باقاعدہ کافر افواج سے آمنا سامنا ہوتا ہے جنگ کی رات شیدو سے لے کر یہاں اکوڑہ خٹک اور نوشہرہ تک میدانوں میں تقریباً ایک لاکھ فوج خیمہ زن تھی ہائے اللہ چشم فلک نے کیسا منظر اس وادیٔ غیر ذی ذرع میں دیکھا ہوگا۔(حضرت شیخ الحدیثؒ تو اس وقت کے اکوڑہ خٹک کے بے شجر بے آب و گیاہ زمینوں اور اس میں دارالعلوم کے قیام کو مکہ کے وادی غیر ذی زرع سے تشبیہ دیا کرتے تھے۔) رات بھر اللہ اکبر کی گونج اور جہاد کے غلغلوں سے کیا سماں رہا ہوگا یہ جہاں ہم اور آپ بیٹھے ہیں اور اس کے اردگرد اطراف میں سب میدان تھے اور اس چپہ چپہ پر اس رات مجاہدین سر بسجود ہو کر گرگڑائے ہونگے صبح عین میدان جنگ میں غداری ہو جاتی ہے سید صاحب کو جنگ کی رات زہر دلوایا جاتا ہے وہ بیمار مگر پھر بھی جنگ میں شریک ہیں۔ بڑی مشکل سے انہیں بچا کر شیدو سے دریائے کابل کے اس پار لے جایا جاتا ہے صحت یاب ہو کر بکھرے ہوئے مجاہدین کو آپ پھر سے جمع کر لیتے ہیں اور اللہ تعالیٰ پر توکل کر کے پھر سے مجاہدانہ کارروائیاں شروع کر دیتے ہیں یہ تحریک بالآخر آپ کو مشہد بالاکوٹ پر لے جاتی ہے جہاں آپ کا محاصرہ ہو جاتا ہے اور اسی مقام پر سید صاحب، شاہ اسماعیل شہیدؒ اور ان کے اکثر جیالے ساتھی جام شہادت نوش فرماتے ہیں۔

مگر سید صاحبؒ اس افراتفری کے عالم میں غائب ہو جاتے ہیں ممکن ہے دشمنوں نے ان کی لاش دریا برد کر دی ہو یا کسی مجاہد نے مزید بے حرمتی سے بچانے کیلئے وہیں کہیں دفن کر دی ہو مگر آپ کے باقی ماندہ ساتھیوں میں سے کچھ لوگوں نے آپ کی شہادت سے انکار کر دیا بلکہ بعض جید علماء اور صاحب فراست لوگوں تک نے آپ کے متعلق غیبوبت کا عقیدہ اپنایا۔ اور کہہ دیا کہ سید صاحب مرے نہیں بلکہ بادلوں میں گئے ہیں عنقریب واپس آ کر ہماری قیادت فرمائیں گے۔ اور کفار کو شکست دیں گے۔ دردؔ جیسے مشہور شاعر نے اسی جذبے کے تحت ہی سید صاحب کے بارہ میں کہا ؎

اتنا پیغام درد کا کہنا جب صبا کوئے یار سے گزرے کونسی رات آپ آئیں گے دن بڑے انتظار سے گزرے

بہر حال ایسی حالت میں انسان ہکا بکا رہ جاتا ہے صبر کا دامن ہاتھ سے چھوٹتا ہوا نظر آتا ہے ہوش

وحواس مفقود ہوجاتے ہیں اور عقل حقائق واقعیہ کو ناممکن سمجھنے لگتی ہے تو یہاں حضرت عمرؓ بھی جذبات سے مغلوب تھے۔ حواس کھو بیٹھے تھے اور حیرت زدگی کی کیفیت سے دوچار تھے ان کے خیال میں ساری دنیا کو اسلام کے جھنڈے تلے لانے سے قبل نبی کریم ﷺ کی موت ناممکن سی بات تھی۔ یہی وجہ تھی کہ حضرت عمرؓ نبی کریم ﷺ کی رحلت کی خبر کو منافقین کی اڑائی ہوئی افواہ سمجھ بیٹھے۔ اور اعلان کردیا کہ جس نے حضور ﷺ کی موت کے بارے میں زبان کھولی۔ اس کی گردن اڑادوں گا۔ نبی کریم ﷺ وفات نہیں ہوئے بلکہ اپنے رب سے مناجات کیلئے گئے ہیں اور عنقریب واپس آکر ان منافقین کے سرقلم کریں گے جنھوں نے آپ کی موت کی خبر پھیلائی ہے آپؓ کی تقریر سن کر بعض لوگ آپؓ کے ہمنوا بن گئے اور بعض خاموش ہوگئے۔

<u>صحابہ کا وفات انبیاء سے پہلا واسطہ:</u> **قال وکان الناس امیین** ،حضرت سالمؓ اس کی وجہ بیان فرماتے ہیں کہ صحابہ پر یہ دہشت کیوں طاری ہوئی۔ وہ بتاتے ہیں کہ لوگ ان پڑھ تھے پیغمبروں اور انبیاء کی حیات وموت کا اس سے قبل دیکھنے کا اتفاق پیش نہیں ہوا تھا۔ لہٰذا وہ ناواقفیت کی وجہ سے پریشان تھے مگر بعض ذی ہوش صحابہؓ نے جب دیکھا کہ نبی کریم ﷺ کی رحلت کا مسئلہ الجھتا جارہا ہے تو ان کو ابوبکر صدیقؓ کا خیال آیا۔ کہ وہی امت کو اندھیروں کے اس منجدھار سے نکال سکتے ہیں۔ اس لئے انہوں نے حضرت سالمؓ کو آپؓ کے پاس بھیجا۔ **انطلق إلىٰ صاحب رسول الله ﷺ الخ** ،یہاں پر صحابہؓ نے بیک زبان صدیق اکبرؓ کو "صاحب رسول اللہ" کہا ہے عقل وہوش کا ماتم کرنے والوں کیلئے مقام فکر ہے کہ وہ کیسے اس شخص کی صحبت سے انکار کررہے ہیں جن کی صحبت پر خیر القرون کے چھوٹے بڑے متفق ہیں۔ اور اسی نام ہی سے انہیں پکار رہے ہیں اور صرف "صاحب رسول اللہ ﷺ" کے الفاظ سے ذکر کئے جاتے ہیں۔

فاتیت ابابکرؓ وھو فی المسجد ،پہلے گزر چکا ہے کہ ابوبکر صدیقؓ رحلت کے روز سُنح گئے تھے وہاں ایک چھوٹی سی مسجد میں آپ بیٹھے ہوئے تھے(۱)، حضرت سالمؓ کہتے ہیں کہ میں ان کے پاس روتا

---

(۱) اکثر شراح نے اسی چھوٹی مسجد کا ذکر کیا ہے مگر بعض دیگر روایات میں ہے کہ حضرت ابوبکر صدیقؓ اس سے پہلے حضور ﷺ کی خیریت معلوم کرنے کیلئے اپنے ایک غلام کو مدینہ بھیج چکے تھے۔ اس نے نبی کریم ﷺ کی موت کی خبر لاکردی تھی اور آپؓ سنح سے مسجد نبوی آئے تھے۔ اور شاید وہیں پر حضرت سالمؓ کی ان سے ملاقات ہوئی اور وہیں انہوں نے ابوبکرؓ سے بات کی۔ مولانا زکریاؒ نے بھی اس احتمال کو ترجیح دی ہے۔ واللہ اعلم بالصواب ۱۲، اصلاح الدین حقانی

ہوا آیا۔آپؓ نے دور سے دیکھا تو سمجھ گئے اور سوال کیا کہ کیا حضور ﷺ وفات پا گئے۔حضرت سالمؓ نے کہا کہ مجھے تو یونہی لگ رہا ہے مگر زبان سے کہہ نہیں سکتا کیونکہ ادھر حضرت عمرؓ کی تلوار کا خوف ہے۔جو کہہ رہے ہیں کہ جس نے کہا کہ حضور ﷺ وفات پا چکے ہیں اس کا سر اڑا دوں گا۔

ابوبکر صدیقؓ کیلئے صدمۂ اولیٰ: حضرت ابوبکرؓ حضرت سالمؓ کو لے کر مدینہ آئے نبی کریم ﷺ کی جسد مبارک جان نثاروں میں گھری ہوئی تھی کہا راستہ دو تو راستہ بناتے ہوئے نبی کریم ﷺ تک پہنچ گئے۔ جبین اطہر کو بوسہ دیا اور یہ آیت پڑھی إنّک میّت و إنهم میّتون ، بیشک تم بھی مرنے والے ہو اور وہ بھی مرنے والے ہیں۔

اس جملہ کے استحضار اور برمحل بیان کی وجہ سے صدیقؓ نے ایک بڑے مخمصے کو ختم کر دیا۔حضرت ابوبکر صدیقؓ نے وفات کی تصدیق فرمائی۔تو صحابی کے بقول

صدیق کی صداقت اور صحابیت مسلّم تھی: فعلموا ان قدصدق، یعنی لوگوں کو یقین آیا کہ وہ سچ فرماتے ہیں۔یہ جملہ بار بار آئے گا کہ جب بھی ابوبکر صدیقؓ نے اس سلسلے میں کوئی فیصلہ دیا۔تو صحابہؓ کو یقین ہو گیا۔اور ہر بات پر اطمینان کا اظہار کرتے ہوئے فرماتے کہ بیشک ابوبکر صدیقؓ نے سچ فرمایا۔ اور پھر نبی کریم ﷺ کے نماز جنازہ کی بابت دریافت کیا۔تو آپؓ نے فرمایا کہ ایک ایک جماعت اندر جا کر آپ ﷺ پر بلا جماعت نماز پڑھ کر باہر آئے اس طرح سب لوگ نماز پڑھیں گے۔پھر پوچھا کہ کیا آپ ﷺ دفن کئے جائیں گے فرمایا ہاں پوچھا گیا کہ کہاں؟ فرمایا جہاں وفات ہوئی ہے وہی آپ ﷺ کا مدفن ہوگا۔پھر حضرت ابوبکر صدیقؓ نے حضور کے قریبی رشتہ داروں کو تجہیز و تکفین پر مامور کیا۔اس وقت صحابہ کی حالت بہت ہی ابتر تھی۔حضرت عبداللہ بن انیسؓ اپاہج ہو گئے حضرت عثمانؓ کی سماعت اور قوت گویائی جواب دے گئی دیگر صحابہ کو یقین نہیں آ رہا تھا کہ حضور ﷺ کی وفات ہوئی ہے۔سب سے پہلے حضرت اسماء بنت عمیسؓ نے حضور ﷺ کی پیٹھ پر ہاتھ پھیر کر بتایا۔کہ مہر نبوت غائب ہو چکی ہے اسلئے حضور ﷺ کا وصال ہو چکا ہے۔حضرت عمرؓ جب آپ ﷺ کے پاس آئے اور حالت دیکھی تو ہوش و حواس کھو بیٹھے۔اور حضور ﷺ کی موت سے انکار کر دیا انکا خیال تھا کہ نبی اکرم ﷺ بیہوش ہو چکے ہیں۔اور

ہوش میں آکر منافقین کو سزادیں گے۔ خود ابوبکر صدیقؓ جب حاضر ہوئے تو آنسو بہہ رہے تھے۔ ہچکیاں جاری تھیں اور اگرچہ بظاہر حوصلہ مند معلوم ہورہے تھے۔ مگر صدمے نے اندر ہی سے کھوکھلا کر دیا تھا جسکی وجہ سے جلد ہی ان کا بھی وصال ہوا۔ آپؓ کی تسلی نے دیگر صحابہ کرام کی ڈھارس بندھائی۔ چنانچہ حجرے میں صحابہ کے سوالات کا جواب دینے کے بعد آپ مسجد میں آئے۔ حضرت عمرؓ سے کہا'' **ایھا الحالف اجلس** ''اے قسم کھانے والے بیٹھو۔ وہ ویسے ہی کھڑے رہے۔ آپؓ کو دیکھ کر لوگ حضرت عمرؓ کو چھوڑ کر آپؓ کی طرف آئے آپؓ نے فرمایا۔ خبر دار جو محمد ﷺ کی عبادت کرتا تھا تو وہ تو وفات پا گئے ہیں۔ اور جو خدا کی عبادت کرتا تھا ان کا معبود اللہ تعالیٰ زندہ اور غیر فانی ہے پھر یہ آیت پڑھی۔ **وما محمد الاّ رسول قد خلت من قبله الرسل أفإن مات اوقتل انقلبتم على أعقابكم الخ،** (ترجمہ اور محمد اللہ کے رسول ہی تو ہیں۔ ان سے پہلے بھی رسول گزرے ہیں اگر وہ وفات پائیں یا ان کو قتل کر دیا جائے تو کیا تم پیٹھ پیچھے پھر جاؤ گے؟) تب لوگوں کی چیخیں نکل گئیں اور سب لوگ اس آیت کو پڑھنے لگے گویا ابھی نازل ہوئی ہو۔

<u>انفرادی جنازہ کیوں؟</u> **يدخل قوم فيكبّرون** ، نبی اکرم ﷺ کی وفات کے بعد ان پر اجتماعی نماز جنازہ کیوں نہیں پڑھا گیا؟ اس کے جواب میں بعض لوگوں نے تو یہ کہا ہے کہ چونکہ ابھی تک لوگ کسی خلیفہ کو مقرر نہیں کر سکے تھے۔ اس لئے انفرادی طور پر جنازہ پڑھا گیا۔ حضرت علیؓ سے ایک اور وجہ بھی منقول ہے۔ وہ یہ کہ آپؓ نے لوگوں سے کہا:

لايؤمّ احدكم عليه لانّه امامكم حال حياته وحال مماته

ترجمہ: تم میں سے کوئی نماز جنازہ کی امامت نہ کرے کیونکہ آپ ﷺ زندہ اور مردہ دونوں حالتوں میں تمہارے امام ہیں۔

تیسری وجہ یہ بیان کی گئی ہے کہ نبی اکرم ﷺ نے اس بات کی وصیت فرمائی تھی۔ کہ یونہی میرا جنازہ پڑھو جیسا کہ مستدرک حاکم میں حضرت عائشہؓ کی روایت سے یہ بات ثابت ہے(۱)،

<u>غسل کس نے دیا:</u> **ثمّ امرهم ان يغسله بنو ابيه،** بنوابیہ سے مراد آپ ﷺ کے چچا اور چچازاد بھائی ہیں۔

---

(۱) مناوی ج۲ ص۲۷۲

آپ ﷺ کے غسل میں حضرت عباسؓ، حضرت علیؓ، حضرت فضل بن عباسؓ اور قثم بن عباسؓ کے علاوہ حضرت اسامہ بن زیدؓ، صالح الحبشیؓ اور شقران (نبی اکرم ﷺ کے آزاد کردہ غلام) کا نام آتا ہے۔

حضرت بزارؒ کی ایک روایت میں ہے کہ نبی اکرم ﷺ نے حضرت علیؓ سے فرمایا کہ **لایغسلنی الّا انت فانّہ لا یریٰ احدعورتی الّا طمست عیناہ**(۱)، تیرے سوا کوئی مجھے غسل نہ دے کیونکہ (تیرے سوا) کوئی بھی میرا پردہ دیکھے گا تو اس کی آنکھیں اندھی ہو جائیں گی۔

چنانچہ اصل غسل دینے والے تو علیؓ تھے۔ البتہ مذکورہ دیگر حضرات غسل دینے میں مدد فرما رہے تھے پھر بھی علیؓ کے سوا تمام حضرات کی آنکھوں پر پٹیاں بندھی ہوئی تھیں۔ حضرت عائشہؓ کی روایت کے مطابق غسل دینے والوں کے درمیان اس بات میں اختلاف ہوا کہ آپ ﷺ کو برہنہ کر کے غسل دیا جائے یا کپڑوں میں۔۔؟ کہ اچانک سب لوگوں پر نیند طاری ہوگئی اور حجرے کے کونے سے ایک غیبی آواز سنائی دی کہ آپ ﷺ کو کپڑوں ہی میں غسل دے دیں(۲)۔ چنانچہ ایسا ہی کیا گیا۔

تکفین: غسل کے بعد آپ ﷺ کو تین کپڑوں میں کفن دیا گیا۔ جیسا کہ حضرت عائشہؓ، حضرت علیؓ، حضرت ابن عباسؓ، حضرت ابن عمرؓ، حضرت جابرؓ اور حضرت عبداللہ بن مغفلؓ کی احادیث سے ثابت ہے۔ یہ تین کپڑے ازار، رداء اور قمیص تھے۔ جہاں تک حضرت عائشہؓ وغیرہ کی روایت میں ہے کہ "**لیس فیھا قمیص**" تو اس کا معنی یا تو یہ ہے کہ ان میں متعارف قمیص نہیں تھا جن میں آستینیں، گریبان اور بعض دیگر اجزاء ہوتے ہیں۔ اور یا یہ تاویل ہوگی کہ وہ قمیص جو غسل دیتے وقت آپ ﷺ پہنے ہوئے تھے۔ تبدیل کر کے دوسری قمیص پہنائی گئی۔

---

(۱) جمع الوسائل ج۲ ص۲۷۳

(۲) ماروا ہ البیھقی فی الدلائل عن عائشۃ انّھم لمّا ارادوا غسلہ ﷺ قالوا لاندری أنجردہ من ثیابہ کما نجرد موتانا ای بالاکتفاء بالازار اوبما یستر الغلیظتین ام نغسلہ وعلیہ ثیابہ ای من القمیص وغیرہ فلمّا اختلفوا القی اللّٰہ علیھم النوم حتی مامنھم رجل إلاّ ذقنہ فی صدرہ ثمّ کلّھم متکلم من ناحیۃ البیت لایدرون من ھواغسلوا النبیّ ﷺ وعلیہ ثیابہ فغسلوہ وعلیہ قمیصہ یصبون الماء فوق القمیص(جمع الوسائل ۲/ ۲۷۳)(مختار)

<u>تدفین:</u> بدھ کی رات کو صحابہ کرام جنازہ وغیرہ امور سے فارغ ہوگئے تو حضرت ابوطلحہ رضی اللہ عنہ نے آپ ﷺ کے بستر ے کی جگہ قبر کھود ڈالی اور اس میں لحد بنالی۔ پھر اس میں علیؓ، عباسؓ اور ان کے دونوں بیٹے فضلؓ اور قثمؓ اترے اور نبی اکرم ﷺ کو اس عالم کے بہترین مقام میں رکھ دیا قبر سے سب سے آخر میں قثم بن عباسؓ نکلے۔ لحد پر کچی اینٹیں رکھ دی گئیں پھر خاک ڈال دی گئی قبر کو ماہی پشت بنایا گیا۔ اور حضرت بلالؓ نے قبر پر پانی چھڑکا۔

<u>خلافتِ صدیقی پر اجماع:</u> واجتمع المهاجرون الخ ، اکثر مہاجرین حضرت ابوبکر صدیقؓ کے حکم سے خلافت پر مشورہ کیلئے جمع ہوگئے۔ کیونکہ یہ اہم ترین مرحلہ تھا مہاجرین میں سے حضرت عمرؓ اور دیگر ذی رائے لوگوں نے مشورہ دیا کہ خلیفہ کے انتخاب میں انصار کو بھی اعتماد میں لینا چاہئے تا کہ جاہلیت کے دور کی طرح پھر سے سرداری نظام اور طوائف الملوکی کا دور شروع نہ ہو۔

دوسری طرف انصار بھی اسی سلسلے میں سقیفہ بنو ساعدہ میں جمع تھے۔ چنانچہ شیخینؓ خود ان کے پاس چلے گئے تا کہ کہیں وہ ازخود کسی کے ہاتھ بیعت کی غلطی نہ کر بیٹھیں۔ چنانچہ انہوں نے ''منا امیر و منکم امیر '' کی بات کہی تو ابوبکر صدیقؓ نے حدیث ''الائمة من قریش '' سنائی اور انصارؓ خلافت سے دستبردار ہوگئے تو حضرت عمرؓ نے اٹھ کر فرمایا۔ کہ ہم سب میں سے کون ہے جس میں بیک وقت تین فضیلتیں جمع ہوگئی ہوں اور وہ منصوص ہوں۔ ایک تو ''ثانی اثنین اذهما فی الغار ''یعنی نبی کریم ﷺ کے ساتھ اتحاد ومعیت اور بالکل تنہائی کی رفاقت ہے۔ دوسری ''اذیقول لصاحبه الخ '' ہے۔ یعنی خود اللہ تبارک وتعالیٰ ابوبکر کو حضور ﷺ کا ساتھی اور صحابی فرمارہے ہیں۔ تیسری ''ان اللّٰه معنا '' ہے۔ یعنی اللہ تعالیٰ کی ابوبکرؓ کے ساتھ بھی معیت ہے کہ اللہ تعالیٰ ہمارے ساتھ ہے۔

حضرت عمرؓ نے اس موقعہ پر صحابہؓ سے کہا کہ تم ہی بتاؤ کہ وہ دو کون تھے جن کا ثانی اثنین میں ذکر ہے پھر اور بھی گفتگو ہوتی رہی جس کی تفصیلات دیگر روایات سے معلوم ہوتی ہیں مثلاً حضرت عمرؓ نے فرمایا اے انصار مدینہ کیا نبی کریم ﷺ نے ابوبکرؓ کو اپنے مصلّے پر کھڑا کر کے علالت کے دوران نماز نہیں پڑھوائی تھی۔ کیا تم میں سے کوئی یہ گوارا کر سکے گا۔ کہ نبی کریم ﷺ کے کھڑے کئے ہوئے شخص کو امامت سے ہٹادو۔

انصار نے فرمایا ''معاذ اللہ ہم یہ جرأت کب کر سکتے ہیں'' پھر حضرت عمرؓ نے ہاتھ بڑھایا اور حضرت ابوبکرؓ سے بیعت کی۔ اس کے بعد سقیفہ بنو ساعدہ میں جمع لوگوں نے بڑی محبت وعقیدت سے بیعت کی۔ بعض روایات کے مطابق حضرت ابوبکر صدیقؓ نے حضرت عمرؓ کے ہاتھ پر بیعت کا ارادہ ظاہر کیا مگر حضرت عمرؓ نے انکار کردیا۔ **وبایعہ الناس بیعة حسنة جمیلة**، یہ ابتدائی بیعت تھی جو مجلس انصار میں ہوئی۔ دوسرے روز مسجد نبوی میں عمومی بیعت ہوئی جس میں حضرت عمرؓ نے افتتاحی خطاب فرمایا۔ پھر حضرت ابوبکر صدیقؓ نے اپنا شہرۂ آفاق خطبہ دیا۔ اور تمام لوگوں نے ان کی خلافت تسلیم کر کے ان کے ہاتھ پر بیعت کی۔

(۱۳) حدّثنا نصر بن علیّ ثنا عبداللّٰہ بن الزبیر شیخ باھلیّ قدیم بصریّ ثنا ثابت البنانیّ عن أنس بن مالک قال لمّا وجد رسول اللّٰہ ﷺ من کرب الموت ما وجد فقالت فاطمةؓ واکرباہ فقال النبیّ ﷺ لاکرب علی ابیک بعد الیوم انّہ قد حضر من ابیک مالیس بتارک منہ احدا الوفاة یوم القیٰمة(۱).

فاطمہؓ کا درد وکرب:

ترجمہ: حضرت انسؓ سے روایت ہے کہ جب نبی اکرم ﷺ کو (مرض وفات میں) سخت تکلیف ہوئی۔ تو حضرت فاطمہ پکار اٹھیں ''ہائے تکلیف کی سختی'' اس پر نبی اکرم ﷺ نے فرمایا کہ تیرے باپ پر آج کے بعد کوئی تکلیف نہیں رہے گی۔ بیشک آج تیرے باپ پر وہ چیز نازل ہوئی ہے۔ جس کو اللہ تعالیٰ کسی سے قیامت کے دن تک نہیں ٹالتے۔ وہ ہے موت۔

واکرباہ، کرب اس غم کو کہتے ہیں جس کی شدت جان لیوا ہو۔ فاطمہ الزہراء رضی اللہ عنہا نے اپنے محبوب والد کی تکلیفیں اور موت کی شدائد دیکھیں تو ضبط وتحمل کا دامن چھوٹ گیا اور غم اور تحسر کا اظہار کرتے ہوئے کہا ''ہائے یہ تکلیفیں''۔

---

(۱) سنن ابن ماجة ص۱۱۷ کتاب الجنائز باب ذکر وفاتہ ودفنہ ﷺ، السنن الکبریٰ للبیھقی ۳/۱۷، دارمی ۱/۴۰، مسنداحمد ۳/۱۴۱ (مختار)

تسلی کا انداز: لاکرب علی ابیک بعد الیوم، نبی اکرم ﷺ نے پیاری بیٹی کوتسلی دی کہ یہ شدائدان نعمتوں کے مقابلے میں ہیچ ہیں۔ جن کا وعدہ اللہ تعالیٰ نے بہت پہلے "ولسوف یعطیک ربک فترضی" میں فرمایا ہے۔ اب تو اس دارالمحن سے رخصت ہوکر مقام محمود پر فائز ہونا ہے اور رفیق اعلیٰ سے ملنا ہے۔ اس لئے آج کے بعد تیرے والد کی تکلیفوں کا خاتمہ ہونے والا ہے۔ اب تو وہ اٹل چیز جودائمی نعمتوں کیلئے پل کا کام دیتی ہے نازل ہورہی ہے۔

أنّه قدحضر من ابیک ما، حضر کے معنی قرب اور ما کا معنی ہے شئی عظیم، لیس بتارک منه، لیس کا اسم اللہ ہے اور منہ کی ضمیر "ما" کوراجح ہے۔ الوفاة ما کا بیان ہے۔ اور یوم القیامة منصوب ہے بنزع الخافض۔ یعنی الیٰ کوحذف کر کے منصوب کردیا گیا ہے۔ اس جملے کی ترکیب میں دیگر اقوال بھی ہیں۔ لیکن سب سے ظاہر ترکیب یہی ہے۔ جوذکر کی گئی ہے اس جملے میں بھی تسلی کا سامان موجود ہے۔ یعنی جس چیز سے چھٹکارا نہیں وہ اٹل چیز نازل ہوئی تو کیا ہوا ایک دن تو اسے آنا تھا۔

(۱۴) حدّثنا ابوالخطاب زیاد بن یحییٰ البصریّ ونصربن علیّ قالاحدّثنا عبدربّه بن بارق الحنفیّ قال سمعت جدی أبا أمیّ سماک بن ولید یحدّث أنّه سمع ابن عبّاس یحدّث أنّه سمع رسول اللّٰه ﷺ یقول من کان له فرطان من امّتی أدخله اللّٰه تعالیٰ بهما الجنّة فقالت له عائشة فمن کان له فرط من امّتک قال ومن کان له فرط یا موفّقة قالت فمن لم یکن له فرط من أمّتک قال فانا فرط لامّتی لن یّصابوابمثلی(۱).

ترجمہ: حضرت عبداللہ بن عباسؓ کہتے ہیں کہ انہوں نے نبی کریم ﷺ سے سنا وہ فرمارہے تھے کہ میرے جس امتی کے دو بچے (مرکر) آخرت میں اس کے لئے پیشرو

(۱) جامع ترمذی ۱/۲۰۴ کتاب الجنائز باب ماجاء فی ثواب من قدم ولد، السنن الکبریٰ للبیهقی ۴/۶۷ کتاب الجنائز، مسنداحمد ۱/۳۳۴ (مختار)

بن جائیں تو اللہ تعالیٰ اس کے بدلے اس کو جنت میں داخل فرمائیں گے۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے پوچھا کہ جس کا ایک ہی بچہ ذخیرہ آخرت بنا ہو (اس کا کیا ہوگا) آپ ﷺ نے فرمایا کہ جس کا ایک فرط ہو وہ بھی جنت میں جائیگا اے خیر کی توفیق دی گئی عائشہ۔ انہوں نے پھر عرض کیا کہ جس کا کوئی فرط پیشرو ہی نہ ہو (کوئی نہیں مرا ہو) آپ ﷺ نے فرمایا کہ ان کیلئے میں ذخیرہ آخرت بنوں گا۔ اس لئے کہ میری فراق کی مصیبت جیسی بڑی کوئی مصیبت ان پر نازل نہیں ہوئی۔

صدمہ عظمیٰ میں غمگساروں کیلئے تسلی کا سامان: من کان لہ فرطان الخ ، اس حدیث کا بظاہر وفات النبی ﷺ سے تعلق معلوم نہیں ہوتا لیکن اس باب سے مناسبت ضرور ہے اور وہ یہ کہ اس حدیث میں امت کو یہ تسلی دلائی ہے کہ جب رحلت النبی ﷺ کی وجہ سے کوئی دکھی ہوتا ہے تو اس درد کا بدلہ بصورت جنت ملے گا اور یہی کیفیت ہوئی کہ صحابہؓ نے اس دکھ کو عمر بھر سینے سے لگائے رکھا وہ جس میت کی تعزیت کیلئے جاتے تو اس کی موت پر تعزیت سے پہلے نبی کریم ﷺ کے فراق پر تعزیت فرماتے۔ تو وفات النبی ﷺ کے بیان کے بعد اس حدیث میں عشاق کے غمزدہ دلوں کیلئے تسلی کا سامان بھی موجود ہے۔

گویا امام ترمذیؒ یہ بتانا چاہتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ کی رحلت بڑا المیہ، عظیم حادثہ اور سانحہ کبریٰ ہے جس طرح خود نبی کریم ﷺ فرماتے ہیں۔ ''لن یصابوا بمثلی'' یعنی میری امت کو بہت سے مصائب پیش آئیں گے، بہت سی محبوب اشیاء سے بھی ہاتھ دھونا پڑتا ہے مگر میرے فراق جیسا عظیم غم اور میری رحلت جیسی مصیبت کبھی بھی نازل نہیں ہوسکتی۔ ہاں میری امت کیلئے یہ حادثہ ناقابل برداشت دکھ کے ساتھ ساتھ رحمت کا ایک ذریعہ بھی ہے۔ وہ یوں کہ جس طرح باپ کو بیٹے کی موت پر صبر کا بدلہ جنت کی صورت میں ملتا ہے یونہی نبی کریم ﷺ بھی غمزدہ امتیوں کی شفاعت کر کے نجات دلوائیں گے۔

من کان لہ فرطان الخ ، فرط قافلے کے اس پیشرو کو کہتے ہیں جو پہلے جا کر بعد کے آنے والوں کیلئے جگہ، پانی اور سامان اقامت کا انتظام کرتا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ جس کے دو بچے داغ جدائی دے کر ذخیرہ آخرت بن جائیں۔

یا ایک بچہ بھی تو اللہ تعالیٰ اس کے بدلے والدین کو ضرور جنت میں داخل فرمائینگے۔

قال ومن کان لہ فرط، یعنی کذالک، مطلب یہ ہے کہ ایک فرط والا بھی اسی طرح جنت میں جائیگا۔

یاموفقہ، یعنی تجھے خیر کی توفیق دی گئی ہے۔اسی وجہ سے مناسب سوال کر بیٹھی ہو اور چونکہ حضرت عائشہؓ کی اپنی اولاد کوئی نہ تھی۔اس لئے یہ سوال بھی کردیا "**فمن لم یکن لہ فرطٌ من امتک؟**" کہ جس کا کوئی بچہ نہ مرا ہو اس کا کیا ہوگا؟ نبی کریم ﷺ نے جواب میں فرمایا کہ "**فانا فرط لامتی لن یصابوا بمثلی**"، یعنی جس کا کوئی بچہ نہیں مرا ہو تو میں خود اس کیلئے ذخیرہ آخرت اور فرط بنوں گا کیونکہ میری جدائی اور وفات کا صدمہ اور رنج والم تو سب سے زیادہ ہوگا۔

یہاں امت سے امت اجابت مراد ہے اور "**لن یصابوا بمثلی**" جملہ مستانفہ بمنزلۃ التعلیل ہے۔یعنی ماقبل کیلئے وجہ بیان کرنا مقصود ہے کہ صدمہ ہونے میں میری جدائی اور بچوں کی جدائی ایک جیسے ہیں بلکہ حضور ﷺ کی جدائی کا صدمہ بڑھ کر ہے۔ایک شاعر نے کیا خوب کہا ہے ؎

والصبر یحمد فی المواطن کلھا الاّعلیک فانہ مذموم

یعنی صبر تو ہر جگہ قابل تعریف صفت ہے سوائے تجھ پر کہ تجھ پر صبر مذموم ہے۔

ملاعلی قاریؒ نے بڑی پیاری بات کہی ہے کہ یہ بشارت نبی کریم ﷺ کے اہل زمانہ مؤمنین اور بعد کے آنیوالوں کیلئے ہے "**فاللّٰھم اجعل النبیّ ﷺ لنا فرطاً**"

وصلی اللہ علی سیّدنا وحبیبنا محمّد وآلہ وصحبہ وسلم

خلاصہ باب

ربیع الاول ۱۱ھ اپنے ساتھ وہ فاجعہ کبریٰ بھی لایا۔

جس نے اس عالم فانی کی روشنی چھین لی۔اور صحابہ کرامؓ بلکہ ساری امت کے دل ودماغ پر غم کا انمٹ داغ ثبت کردیا۔اخیر صفر میں نبی کریم ﷺ کو سخت دردسر کا سامنا کرنا پڑا۔جو رفتہ رفتہ بیہوشی اور پھر وفات پر منتج ہوا۔

حکمت الٰہیہ کے تحت آپ ﷺ کا مرض وفات شدید تکلیف اور ناقابل برداشت کرب والم پر مشتمل تھا۔یہاں تک حضرت فاطمہؓ پکاراٹھیں''واکــــربــاہ''اور حضرت عائشہؓ کو موت کی شدائد سے نفرت نامناسب معلوم ہونے لگی اور سہولت موت پر رشک چھوڑ دیا خود نبی اکرم ﷺ سخت تکلیف میں پانی سے ہاتھ بھگو کر بار بار منہ پر پھیر لیا کرتے تھے اور دعا کرتے تھے''**اللّھمّ اعنیّ علی سکرات الموت**'' مگر ساتھ ساتھ پس ماندگان کو تسلی بھی دیا کرتے تھے کہ بس آخری تکالیف ہیں۔پھر اللہ تعالیٰ سے وصال کے مزے ہیں۔

وفات کا یقین ہوجانے کے بعد امت کی وحدت کی فکر دامنگیر ہوئی تو ابوبکر صدیقؓ کو امامت کا حکم دیا اور حضرت عائشہؓ اور حفصہؓ کے مشوروں کے باوجود آپ ﷺ نے کسی اور کی امامت برداشت نہیں کی۔ پھر ابوبکر صدیقؓ کی امامت میں ان کے پیچھے امت کی اقتداء کا نظارہ کرنے کیلئے انتہائی تکلیف کے باوصف دوسروں کا سہارا لیکر مسجد تشریف لے گئے تاکہ اس منظر سے دل خوش اور آنکھیں ٹھنڈی کرسکیں۔جس روز آپ ﷺ کی وفات ہوئی اسی دن صبح کی نماز میں بھی حجرے کے دروازے سے یہ منظر دیکھا اور عشاق کو اپنا آخری دیدار کروایا پھر اسی روز یعنی پیر کے دن ۱۲ یا ۲ ربیع الاول کو واصل بحق ہوئے۔

وفات کے بعد صحابہؓ جو وفات الانبیاء سے ناواقف اور ذہنی طور پر اس حادثہ عظمیٰ کے لئے تیار نہیں تھے آپ ﷺ کی وفات سے انکار کر بیٹھے۔اکثر کو اس میں تردد ہوا۔بہت سے غم کی وجہ سے بدحواس۔بلکہ مفقود الحواس ہوگئے عمرؓ جیسے مضبوط اعصاب کے مالک کو بھی حقیقت تک رسائی نہ ہوئی اور نبی ﷺ کی موت کا نام لینے والوں کو واجب القتل سمجھنے لگے۔

ایسی حالت میں محسن امت صدیق اکبرؓ کے ہاتھوں امت کی ڈھارس بندھی۔ وہ ہی بلائے گئے تو آئے اور نبی ﷺ کی بازؤں پر ہاتھ رکھ کر پیشانی کو بوسہ دیا "وانبیّاہ" "واخلیلاہ" کہہ کر درد غم کا اظہار کیا۔ اور وفات نبی ﷺ کے سلسلے میں صحابہ کرامؓ کے اضطراب کو ختم کردیا۔ صدیقؓ کا حوصلہ دیدنی تھا۔ صحابہ کرام نے وفات، تدفین، اس کی جگہ، نماز جنازہ وغیرہ امور میں آپؓ سے سوالات کئے اور تشفی بخش جوابات پائے۔ تو تردد ختم ہوا۔ آپؓ کے حکم سے حضرت علیؓ اور ان کے معاونین نے حضور ﷺ کے غسل اور تکفین کا انتظام کیا۔ تدفین کی جگہ میں اختلاف پیدا ہوا تو آپؓ نے حدیث سنا کر ان کی تشفی فرمائی اور حضرت عائشہؓ کا حجرہ اس سعادت سے سرفراز ہوا۔ مگر اس سے قبل جنازہ پڑھنا تھا جو مصلحت اور وصیت نبوی کے مطابق انفرادی طور پر پڑھی گئی۔

اسی دوران نباض امت نے اہم ترین مسئلہ یعنی مسئلہ خلافت پر توجہ مبذول کروائی۔ مہاجرین کا شوریٰ طلب کیا ان کی نشاندہی پر انصار کو اپنا ہمنوا بنانے کیلئے حضرت عمرؓ کو ساتھ لیکر سقیفہ بنوساعدہ تشریف لے گئے۔ ان کو مطمئن کروایا کہ خلافت بحکم نص قریش میں ہوگی اور حضرت عمرؓ کی تجویز پر وہیں صدیقؓ کے ہاتھ پر بیعت کا مرحلہ طے ہوا جو اگلے مرحلے میں مسجد نبوی ﷺ میں تکمیل پذیر ہوا۔

اس کے بعد نبی اکرم ﷺ کی تدفین کا مرحلہ آیا تو منگل اور بدھ کی درمیانی رات کو حجرہ عائشہؓ میں ابوطلحہؓ کی کھودی ہوئی قبر میں طے ہوا۔ حضرت عباسؓ، ان کے دو فرزند، حضرت علیؓ اور بعض دیگر صحابہؓ رات گئے تک اس میں مصروف رہے اور نبوت کا سراج منیر سپرد خاک ہوا۔ آپ ﷺ کی وفات سے مدینے کی ہر چیز پر تاریکی چھا گئی بلکہ بقول حضرت انسؓ اس کا اثر دلوں میں بھی پایا گیا جو کہ انجان سے لگ رہے تھے۔ صحابہ کرامؓ بلکہ ساری امت کیلئے اس سے بڑا صدمہ ہو نہیں سکتا۔ اور اسی وجہ سے ایمان والوں کیلئے اس کے اجر کی توقع بھی رکھنی چاہئے۔ کیونکہ آپ ﷺ ہی آخرت میں ان کا فرط، پیشرو اور سہارا ہونگے اللہ تبارک وتعالیٰ ہمیں اس اجر سے محروم نہ فرمائے۔ آمین

انتخاب خلیفہ، تکفین وتدفین، نیز حالت وفات کے بارے میں بعض دیگر تفاصیل بھی اور کتابوں میں موجود ہیں یہاں صرف باب میں مذکور امور کا تذکرہ بطور خلاصہ کیا گیا ہے۔

۵۵. باب ماجاء فی میراث رسول اللہ ﷺ

رسول اللہ ﷺ کے میراث کے بارے میں

میراث مثال واوی ہے اصل میں موراث تھا۔میم کے کسرہ کے سبب واو، یاء سے بدل کر میراث بنا۔ یہ مصدر کا صیغہ ہے لیکن موروث اور اس مال پر بولا جاتا ہے جو میّت اپنے پیچھے چھوڑتا ہے۔اس باب میں آپ ﷺ سے مالی میراث کی نفی اور علمی میراث کا اثبات مقصود ہے۔سابقہ باب سے مناسبت اس بات میں ہے کہ وفات کے بعد میت کی میراث کا مسئلہ پیش آتا ہے۔

<u>رسول اللہ ﷺ نے مالی وراثت نہیں چھوڑی:</u> مصنفؒ اس باب میں جو احادیث لائے ہیں وہ اہل سنت والجماعت کے مسلک کے لئے واضح براہین ہیں۔جمہور صحابہ کا اس پر اجماع ہے کہ آپ ﷺ کی کوئی مالی وارثت نہیں۔آپ ﷺ کا چھوڑا ہوا مال اور ترکہ رشتہ داروں کو نہیں ملے گا۔

حضرت شاہ ولی اللہؒ فرماتے ہیں کہ تقریباً دس صحابہؓ سے یہ مسئلہ روایۃً منقول ہے اور اس میں صحابہ اور اہلسنت والجماعت کا کوئی اختلاف نہیں تھا۔لیکن بعد میں آل سبا شیعوں نے اس بات کو خوب اچھالا۔ اور بدتمیزی کا طوفان کھڑا کر کے خلفاء راشدین خصوصاً شیخینؓ پر یہ الزام لگایا کہ انہوں نے ظالمانہ طریقوں سے آپ ﷺ کی میراث سے آپ ﷺ کی اولاد کو محروم کر دیا۔حضرت فاطمہؓ اور آپ ﷺ کے دیگر ورثاء کو میراث نہیں دیا۔

<u>رسول اللہ ﷺ کی ذخیرہ اندوزی سے نفرت:</u> زندگی میں نبی کریم ﷺ کا معمول تھا کہ کوئی چیز اپنے پاس بطور ذخیرہ نہیں رکھتے تھے۔جو آتا اللہ تعالیٰ کے راستے میں خرچ کر دیتے تھے۔زیادہ کوشش یہ ہوتی تھی کہ میری ملکیت میں کوئی چیز نہ رہ جائے۔لیکن بعض چیزیں ایسی تھیں جن کو آپ ﷺ نے بعض مصالح کی وجہ سے مجبوراً محفوظ کر کے اپنی تحویل میں چھوڑ دیا تھا۔ان میں سے وہ صفایا بھی تھیں جو کہ آپ ﷺ نے اجتماعی مفادات کی خاطر اپنے پاس رکھی تھیں۔ان میں فدک کی آدھی زمین، وادی القریٰ کا ایک تہائی، خیبر کی خمس کا ایک حصہ، اور بنو نضیر کی کچھ زمینیں تھیں جو اسلامی حکومت کی سربراہ کی حیثیت سے آپ ﷺ کی

تحویل میں تھیں کیونکہ جہانبانی میں بہت سے مسائل ایسے ابھرتے ہیں جو کسی فوری فنڈ کا تقاضا کرتی ہیں۔ ایسے مواقع پر آپ ﷺ کی زندگی میں بھی ان زمینوں کے محاصل امت اسلامیہ کے اجتماعی مصالح میں صرف ہوئے تھے۔اوران کے بارے میں رسول اللہ ﷺ نے وفات کے بعد کے لئے بھی واضح احکام بیان کئے۔

آپ ﷺ نے فرمایا(نحن معشر الانبیاء)لانورث ماتر کناصدقة(۱)

ہم انبیاء سے میراث نہیں پائی جاتی ہم جو بھی چھوڑتے ہیں وہ عامۃ المسلمین پرصدقہ ہوتا ہے۔

نیزفرمایا إنّ الانبیاء لم یوّرثوا دینارا أو لا درهما انّما ورثوا العلم(۲)

بیشک انبیاءؑ کی میراث دینار اور درہم نہیں ہوتی۔وہ تو علم میراث میں چھوڑتے ہیں۔

اوراس حکم میں بہت بڑی حکمتیں پوشیدہ ہیں۔انبیاء کے عدم ارث کی بنیادی وجہ تو یہ ہے کہ پیغمبر کی تمام کوششیں،مساعی اور جدوجہد خالصۃً لوجہ اللہ ہوتی ہیں۔وہ تمام قربانیاں کسی لالچ یا غرض کے بغیر کرتا ہے تاکہ کوئی یہ نہ کہے کہ اس شخص نے انقلاب کی دعوت دے کر تحریک اس لئے چلائی تھی کہ آخر میں گھر کے لئے ثمرات حاصل ہوں۔آپ ﷺ کی زبان سے بلکہ تمام پیغمبروں کی طرف سے قرآن نے اعلان کیا کہ

ماأسئکم علیه من اجرٍ ان اجری الاّعلی رب العالمین (شعراء۱۰۹)

میں اس پر تم سے کوئی صلہ نہیں مانگتا۔میرا صلہ نہیں ہے مگر رب العالمین پر ہے۔

نیزفرمایاام تسئلهم اجراً فهم من مغرمٍ مثقلون (طور ۴۰)

کیاتم ان لوگوں سے کچھ معاوضہ مانگتے ہو کہ وہ تاوان ان لوگوں پر گراں ہو۔

اس کے برعکس دنیا میں بڑے بڑے انقلابی اور نام نہاد رہنما ابتداء میں تو بڑی تکلیفیں جھیلتے ہیں۔ قیدوبند کی صعوبتیں برداشت کرتے رہے ہیں۔لیکن جب سربراہی اور حکومت ملتی ہے تو ساری مملکت کو اپنی جاگیر سمجھ لیتے ہیں۔اسی طرح بڑے پیر اور مصلحین جفاکشی کی زندگی گزار لیتے ہیں تاکہ لوگ ان کی اولاد

---

(۱)صحیح بخاری شریف ۲/۱۰۸۵ کتاب الاعتصام بالکتاب والسنة باب مایکره من التعمق والتنازع فی العلم(مختار)

(۲)جامع ترمذی ۲/۵۵۴ کتاب العلم باب ماجاء فی فضل الفقه علی العبادة(مختار)

کوسر پر اٹھائے پھرتے رہیں اور جاگیریں ان کے نام لکھتے رہیں۔اس لئے یہ بھی دنیاداری اور چالاکی کا ایک طریقہ بن سکتا ہے کہ پچاس ساٹھ سال تک تکلیفیں جھیل کراولادوخاندان کے لئے طویل المیعاد رعائتیں اورعنایتیں حاصل کرلی جائیں۔اکثرنام نہادقومی یاعلاقائی مصلحین نے ایسا ہی کیا ہے۔

جبکہ نبی کریم ﷺ نے اپنی زندگی میں یہ اعلان کیا کہ میں تم سے کوئی اجرت نہیں مانگوں گا۔اوروہ امکانات جوآل واولاد کے لئے ہوسکتی تھیں ختم کردیئے۔مثلاً زکوٰۃ آمدنی کا بڑاذریعہ تھا۔تمام امت کے مستحقین محتاج فقراء اور مساکین کے لئے اس کا لینا جائز ہے۔لیکن آپ ﷺ نے اپنی اولاد واقارب پراسے حرام قراردیا۔تاکہ خاندان کو یہ عام مادی فائدہ پہنچنے کی تہمت بھی نہ لگائی جاسکے۔اورکوئی یہ نہ کہے کہ شکرانوں کاایک بڑادروازہ اہل بیت کے لئے کھول دیا ہے۔آج ہمارے ہاں پیرحضرات کروڑپتی بھی ہوں لیکن لوگ کسی بزرگ کے ساتھ نسبت ہونے کی بناء پراسے شکرانے دیتے ہیں۔آپ ﷺ نے یہ شکرانے بھی اپنی اولادپربند کردیئے(۱)۔اوراسی وجہ سے آپ ﷺ میراث کے مسئلہ میں بھی تصریح فرماتے ہیں کہ مجھ سے اگرتھوڑابہت باقی رہ جائے تومیری اولادکونہ دیاجائے بلکہ وہ تمام ملت اسلامیہ کامال اوربیت المال کاحق ہے۔

<u>ترکہ میراث نہ بننے کی حکمتیں:</u> آج بھی مستشرقین اعدائے اسلام اوراعدائے رسول ہرقسم کی کرتوتیں کرتے ہیں۔ لیکن کسی کو یہ انگلی اٹھانے کی جرأت نہیں کہ نبی کریم ﷺ نے جاہ،منصب،عہدے اورمادی مفادات کیلئے یہ جدوجہدکی تھی۔کیونکہ ابھی **باب عیش رسول اللہ ﷺ** اورکتاب کےاوائل میں تم نے نبی کریم ﷺ کے گھرکی حالت کے بارے میں پڑھا۔کپڑوں،کھانے پینے اورسامان رہائش کی حالت پڑھی کہ ہفتوں اورمہینوں پیٹ بھرکرکھانے کونہیں ملتا تھا۔گھروالے بھی بھوکے،کپڑوں میں پیوند درپیونداورحجرے کاچھت یوں کہ آدمی سیدھاکھڑانہیں ہوسکے۔بلکہ حضرت حسن بصریؒ فرماتے ہیں کہ میں ابھی بالغ بھی نہیں ہواتھا۔کہ نبی کریم ﷺ کے حجرۂ مبارکہ میں داخل ہوااس حالت میں بھی سرحجرے کی

---

(۱) عن ابی ھریرۃؓ قال اخذ الحسن بن علیؓ تمرۃ من تمر الصدقۃ فجعلھا فی فیہ فقال النبی ﷺ کخ کخ لیطرحھا، ثمّ قال اماشعرت انّالانأکل الصدقۃ (بخاری شریف ج ۱ ص ۲۰۲) (اصلاح الدین حقانی)

چھت سے لگ رہا تھا۔ تنگ اتنا تھا کہ دو آدمی اس میں بمشکل سو سکتے تھے۔ بارش میں چھت بہنے لگتی تھی۔ دروازوں کی بجائے چادر اور ٹاٹ لٹکائے گئے تھے۔ چھت کھجوروں کی شاخوں سے بنی ہوئی تھی۔ یہ زندگی گزارنے کی حالت تھی اور زندگی کے بعد بھی آپ نے دیکھا کہ میراث اور صدقہ زکوٰۃ کا راستہ اہل خانہ پر بند کر دیا۔ حالانکہ میراث تو خود انسان کے ذاتی مال میں جاری ہوتا ہے۔ یہ سب کچھ اس لئے تا کہ یہ بات خوب واضح ہو جائے کہ آپ ﷺ نے خالص اللہ تعالیٰ کے لئے یہ کوششیں فرمائی تھیں۔ نہ اپنی ذات کیلئے نہ اپنے خاندان کے لئے۔

علاوہ ازیں آپ ﷺ ساری امت کے روحانی باپ بھی ہیں بعض قراءت میں **النبی اولیٰ بالمؤمنین من انفسهم و ازواجه امّهٰتهم** کے ساتھ یہ بھی آیا ہے کہ **وهو ابٌ لهم** اور اگر یہ تصریح نہ ہو تو بھی **وازواجه امّهٰتهم** سے دلالت النص کے طور پر آپ ﷺ کی ابوّت ثابت ہوتی ہے۔ نیز امت کیلئے ازواج مطہرات کے ساتھ نکاح کی حرمت کی ایک وجہ یہ بھی بتائی گئی ہے کہ آپ ﷺ امت کے باپ ہیں۔ بہر حال آپ ﷺ کی ابوّت تمام امت کیلئے ہو تو میراث بھی تمام امت کو ملے گی نہ کہ بعض افراد کو۔

تیسری وجہ عدم ارث کی یہ بھی ہے کہ انبیاء کی حیات برزخی دوسرے اموات کی نسبت زیادہ قوی ہوتا ہے وہ حیات جیسے بھی ہو لیکن دنیوی حیات کے قریب تر ہے۔ اور زندوں کی میراث تقسیم نہیں کی جاتی۔

چوتھی وجہ یہ ہے کہ نبی کے ہاتھ میں جو مال ہوتا ہے وہ خود کو اس مال کا مالک شمار نہیں کرتا تھا۔ بلکہ خود کو اللہ تعالیٰ کا نائب اور خلیفہ شمار کرتا تھا۔ اور نیابت کی حیثیت سے ملا ہوا مال ذاتی ملک نہیں ہوتا۔ بلکہ درحقیقت وہ مخلوف عنہ کا ہوتا ہے۔ خلیفہ تو زیادہ سے زیادہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس قومی اور اجتماعی امانت میں متولّی ہوتا ہے۔ اور واضح ہے کہ مخلوف عنہ کا مال متولّی کے ورثاء میں تقسیم نہیں ہوتا۔ کیونکہ وہ اس کا ہوتا نہیں۔ نبی کریم ﷺ نے بھی عملاً یہ ثابت کر دیا کہ فدک اور خیبر کی جائیداد انہوں نے اجتماعی مفادات اور مصالح کیلئے چھوڑ رکھی ہے اور اس لئے آپ ﷺ نے کسی کو اس میں حق تملیک نہیں دی بلکہ ملک خداوندی میں خلیفۃ اللہ کی حیثیت سے تصرف کرتے رہے۔

اس کے علاوہ عدم ارث میں ایک حکمت یہ بھی ہے کہ اگر بالفرض آپ ﷺ کی وراثت جائز ہوتی

تو بہت سے ورثاء شاید ایسے بھی ہوں جن کے دل میں یہ تمنا آئے کہ نبی کریم ﷺ اب مر جائیں۔تا کہ ہمیں ان کا میراث مل جائے۔جس طرح کہ خوانین اور نوابوں کی اولا دان کی موت کے انتظار میں ہوتے ہیں تا کہ مال حاصل ہو کر عیش وعشرت کا موقع مل سکے بلکہ کئی ظالم وارث تو ایسے بھی دیکھنے میں آئے ہیں جو اپنے مورث کو ٹھکانے لگا دیتے ہیں تو اگر چہ آپ ﷺ کے ورثاء میں کوئی یہ جرأت نہ بھی کر سکتا۔لیکن آپ ﷺ کی موت کی تمنا یا موت کے بعد میراث پا کر آپ ﷺ کی موت پر خوش ہونے کا خطرہ تھا۔اور ان دونوں صورتوں میں اس وارث کا کفر لازم تھا۔اب عدم ارث کی صورت میں سرے سے یہ امکان ہی جاتا رہا(۱)۔

بہر حال آپ ﷺ نے یہ مسئلہ قبل از وفات ظاہر کیا تھا۔تمام جلیل القدر صحابہ کو یہ معلوم تھا لیکن جب نبی کریم ﷺ وفات پائے اس وقت بعض صحابہ کو پتہ نہ تھا۔ساتھ ساتھ منافقین وسازشی لوگ ہر وقت انکے کان بھرتے رہے کہ نعوذ باللہ ابو بکرؓ وعمرؓ ظالم ہیں۔اور نبی کریم ﷺ کی میراث کو غصب کر رہے ہیں۔ اور اسی کو بنیاد بنا کر شیعوں نے اپنے علم کلام کی روح کو بعض صحابہ سے بھر دیا۔نیز ابتدائی ایام میں بعض صحابہ کی طرف سے شیخین کے اس عمل پر ناراضگی کو خوب بڑھا چڑھا کر بطور استدلال بیان کیا۔

حالانکہ یہ خالص بکواس ہے۔کیونکہ اول تو یہ سوچنا چاہئے کہ حضرت صدیق اکبرؓ جب خلیفہ ہوئے تو محض نبی کریم ﷺ کے احکامات کی تعمیل کرتے رہے۔نظام مملکت اور حکومت کی تشکیل میں آپؓ کا کوئی ہاتھ نہ تھا۔جو ورثہ میں ملا وہی نافذ کیا۔اموال وریاست کے احکام میں محض تابع تھے۔اس مملکت کے بانی تو نبی کریم ﷺ خود تھے۔اب اگر وہ الزام لگائیں تو نعوذ باللہ نبی کریم ﷺ پر لگائیں کہ یہ سب کچھ اسی کا کیا دھرا ہے۔اور حقیقت بھی یہی ہے کہ دل میں یہ لوگ یہی عناد اور یہی بغض وخبث لئے پھرتے ہیں۔اس یہود نواز ٹولے کا مقصد ابتداء ہی سے نبی کریم ﷺ کے دین کی مخالفت تھی اور ہے۔لیکن اپنے تقیہ اور خوف

---

(۱) ملا علی قاریؒ نے دو اور حکمتیں بھی بیان کی ہیں۔اول یہ کہ انبیاء سے اقرباء کی وراثت کو دیکھ کر لوگ دنیا اور اس کو جمع کرنے کی طرف راغب ہونگے۔دوم یہ کہ لوگ یہ سوچیں گے کہ انبیاء کا فقر اختیاری نہیں تھا۔ورنہ وہ بھی ہماری طرح مال جمع کر کے وارثوں کیلئے چھوڑنے کی فکر میں نہ ہوتے۔اور دونوں باتیں شریعت کے مزاج کے منافی ہیں۔دیکھیں جمع الوسائل ج۲ص۲۴۸۔(اصلاح الدین)

کی وجہ سے اس کا برملا اظہار نہیں کرتے۔اور اس بات کی دلیل یہ ہے کہ کبھی کبھی جوش میں آ کر یہ عناد اور خبائث ظاہر بھی کر دیتے ہیں۔

خمینی کی ملحدانہ باتیں: جس طرح کہ آج کے خمینی کو دیکھ لیں۔کہ اس کی تحریر وتقریر اس پر شاہد ہے اور ہم تو اس بات پر اس کے شکر گزار ہیں کہ اس سے مزید تقیہ نہ ہوسکا اور ملت اسلامیہ کو مزید دھوکہ نہیں دے سکا۔اس نے ایک بڑے جلسہ میں جس میں اس کی مملکت کے سارے صنادید بھی موجود تھے کہا کہ ''مجھے سب سے بڑا صدمہ اس بات پر ہے کہ جو اسلامی حکومت اور نظام مطلوب تھا وہ صدر اسلام سے آج تک قائم نہ ہوسکا۔

خود نبی کریم ﷺ کو بھی کچھ مخصوص حالات کے پیش نظر مکمل اسلامی نظام قائم کرنے کا موقعہ نہ مل سکا(۱)''

گویا اس ظالم کے خیال میں نبی کریم ﷺ اپنے مشن میں ناکام ہو چکے ہیں اور اسلامی مملکت قائم نہیں کر سکے۔پھر اس تقریر میں شیخین ؓ کو تو بالکل ہی گول کر دیا۔لیکن آخر میں حضرت علیؓ پر بھی ہاتھ صاف کر کے کہہ دیا ہے کہ ''ان کے زمانے میں بھی بدقسمتی یہ تھی کہ سازشوں کی بدولت وہ لوگ جو (نعوذ باللہ) کفار سے بھی بدتر تھے۔حضرت علیؓ کے لئے رکاوٹ بنے اور وہ بھی اسلامی حکومت تشکیل نہ دے سکے''۔بعد کے ائمہ اور بعد کے دور کے بادشاہوں کو تو وہ کب معاف کر سکتے ہیں۔دراصل یہ ساری چال اس دعوے کیلئے ہے کہ مجھے اللہ تعالیٰ نے اس کام کے لئے جو اس کا پیغمبر بھی نہ کر سکا پیدا کیا ہے۔نیز وہ یہ بھی کہہ چکا ہے کہ قرآن کے معانی کو صحابہؓ میں سے کوئی بھی نہ سمجھ سکا۔گویا اب تک کے ساری تفاسیر بھی غلط ہیں۔بقول اس کے قرآن کی تفسیر صرف حضرت علیؓ کو معلوم تھی۔لیکن اس کو بھی وفات تک کوئی ایسا شخص نہ مل سکا۔جسے وہ یہ راز بتا سکے۔لیکن سب سے زیادہ عجیب بات یہ ہے کہ وہ علوم خمینی تک کیسے پہنچ گئے؟

ایرانی انقلاب صیہونی انقلاب تھی: درحقیقت ایران کا انقلاب شیعہ انقلاب بھی نہیں بلکہ یہ صیہونی انقلاب ہے اور سیاسی منظر پر یہ بات پایۂ ثبوت کو پہنچ چکی ہے۔مثلاً حال ہی میں روسی علاقہ میں ایران

(۱) اس کے مزید تفصیلات کیلئے مولانا محمد منظور نعمانیؒ کی کتاب انقلاب ایران وغیرہ دیکھئے۔

جانیوالا اسلحہ سے بھرا ہوا ایک جہاز گر گیا۔اس اسلحہ پر اسرائیلی مہر لگے ہوئے تھے۔دراصل عرب ممالک کو کمزور کرنے کے لئے ایسے لوگوں کی پشت پناہی امریکہ سمیت ساری صیہونی دنیا کررہی ہے۔تاریخ اسلام کے حوالہ سے شیعیت روازاوّل سے اسلام کے لئے دردسر ہے۔اورتاریخ شاہد ہے کہ اسلامی دنیا میں جہاں بھی کوئی غداری اور سازش ہوئی اس میں اہل رفض کا ہاتھ ضرور ہوتا تھا۔

میراث کے سلسلے میں شیعوں کا موقف: میراث کے سلسلے میں شیعوں کا موقف یہ ہے کہ خلفاء راشدین نے فاطمہؓ پر ظلم کیا۔لیکن کیا نبی کریم ﷺ کے وارثوں میں فقط وہ تھیں۔نہیں بلکہ آپ ﷺ کے ورثاء میں تو صدیق اکبرؓ کی اپنی چہیتی بیٹی عائشہ صدیقہؓ بھی تھیں۔اسی طرح حضرت عمرؓ کی بیٹی حضرت حفصہؓ بھی تو وارث تھیں۔علاوہ ازیں دیگر ازواج مطہرات بھی زندہ تھیں۔علاوہ ازیں قوانین میراث کے مطابق حضرت علیؓ کا تو میراث میں حق بھی نہیں بنتا تھا۔

تو سوال یہ ہے کہ کیا شیخینؓ اپنی اپنی بیٹیوں پر بھی ظلم کررہے تھے۔اور کیا ایک وسیع سلطنت میں غصب اور ظلم کے لئے صرف نبی کریم ﷺ کی وراثت ہی نظر آئی۔واضح بات ہے کہ ایسا نہیں بلکہ یہ سب کچھ خود نبی کریم ﷺ کے فرمان کا نتیجہ تھا جس کی حکمتیں ہم پہلے بیان کرچکے ہیں۔حضرت عائشہؓ خود بھی ورثاء میں سے تھیں مگر جب دوسری امہات المؤمنینؓ نے ان کے پاس آکر پوچھا کہ ہمیں میراث سے حصہ کیوں نہیں دیا جاتا۔تو آپؓ نے جواب میں یہی کہا کہ کیا میں نبی کریم ﷺ کی بیوی نہیں۔لیکن کیا تم کو نبی کریم ﷺ کی وہ بات یاد نہیں کہ میری میراث تقسیم نہیں ہوگی۔تو تمام ازواج مطہرات نے اس کا اعتراف کیا۔اور دعویٰ سے رُک گئیں(۱)۔

یہاں یہ تو ہم ضروری ہوتا ہے کہ یہ ازواج اپنا حصہ مانگنے کیوں آئی تھیں۔حالانکہ انہوں نے نبی کریم ﷺ کے فرمان کو سنا بھی تھا۔تو اس کا جواب یہ ہے کہ یا تو ازواج وہ حدیث بھول چکی ہونگیں اور پھر

---

(۱) قال عروۃ انا سمعت عائشۃؓ زوج النبی ﷺ تقول ارسل ازواج النبی ﷺ عثمانؓ الی ابی بکرؓ یسئلنہ ثمنھن ممّا افاء اللّٰہ علی رسولہ ﷺ فکنت انااردّھن فقلت لھن الاتتقین اللّٰہ الم تعلم ان النبی ﷺ کان یقول لانورث ماترکناہ صدقۃ....فانتھی ازواج النبی ﷺ الی مااخبرتھنّ الخ. (بخاری ۵۷۶/۳ کتاب المغازی حدیث بنی النضیر) (اصلاح الدین)

حضرت عائشہؓ نے انہیں یاددلایا۔اور یا یہ کہ ان ازواج مطہرات کا خیال تھا کہ نبی کریم ﷺ کا یہ فیصلہ منقول اشیاء کے بارے میں ہے۔اور شاید غیر منقولہ اشیاء میں یہ بات نہ ہو۔جبکہ فدک اور خیبر وغیرہ زمینیں تو غیر منقولہ جائداد ہیں۔اور جب پوچھا تو حضرت عائشہؓ نے اس حدیث کی تعمیم کی طرف اشارہ کردیا۔

شیعوں کا ایک استدلال یہ بھی ہے کہ حضرت علیؓ اور حضرت عباسؓ دونوں بعد میں بھی بار بار حضرت عمرؓ کے پاس مذکورہ زمینوں کے سلسلے میں آ کر مطالبات پیش کرتے ہیں۔جس طرح اس باب اور بخاری شریف کی احادیث سے معلوم ہوتا ہے۔اس سے پتہ چلتا ہے کہ یہ دونوں عدم ارث کی بات پر مطمئن نہیں تھے۔لیکن اس کا جواب یہ ہے کہ محققین کی تحقیق کے مطابق حضرت علیؓ اور حضرت عباسؓ کا شیخینؓ کے پاس دعویٰ یہ نہ تھا کہ وہ ہمیں ملکیت کے طور پر یہ علاقہ دے دیں۔ بلکہ سب سے پہلے مطالبے کے بعد ہی صدیق اکبرؓ نے یہ بات واضح کردی تھی کہ یہ سرکاری زمین ہے اور سرکاری زمین مختلف لوگوں کی تحویل میں عموماً ولایت کے طور پر دی جاتی ہے۔ یہ متولّی صرف اس کا انتظام چلاتے ہیں۔ نہ یہ کہ ان کی ملکیت ہوجائے۔تو یہ دونوں حضرات بھی انتظام اپنے اپنے ہاتھ میں لینے آئے تھے۔اور حضرت عمرؓ نے بھی بخوشی یہ زمین (۱) ان کی تحویل میں دی تھی۔ پھر جب تولّی کے سلسلے میں دونوں میں اختلاف ہوگیا تو وہ دونوں پھر سے ولایت کے سلسلے میں آئے۔شیعہ لوگ پہلے کی طرح اس بار بھی یہ سمجھ بیٹھے کہ یہ ملکیت کا نیا دعویٰ کر رہے ہیں۔ حالانکہ جب دونوں صدیق اکبرؓ کے سامنے اور پھر حضرت عمرؓ کے سامنے ایک بار اعتراف کر چکے تھے۔ کہ یہ زمین ہماری نہیں ہے تو کیا وہ دیوانے تھے کہ وہی دعویٰ پھر سے کرتے۔لہٰذا حضرت عمرؓ کے زمانے میں دراصل ان کا دعویٰ ملکیت کا نہ تھا بلکہ حضرت علیؓ اور حضرت عباسؓ چونکہ مشترکہ طور پر ان اراضی کا انتظام نہیں چلا سکے۔تو یہ مطالبہ لے کر آئے کہ ہمارے درمیان یہ زمین انتظام کے لئے تقسیم کردیں۔ حضرت عمرؓ نے وہ دعویٰ اس لئے مسترد کردیا کہ اس طرح اگر تقسیم در تقسیم شروع ہوجائے تو لوگ اس غلط فہمی میں مبتلا ہونگے کہ یہ شاید نبی کریم ﷺ کی وراثت تھی۔ جو ورثاء کے درمیان تقسیم ہوچکی ہے۔حضرت عمرؓ کی حساس نظر نے اس خطرہ کو محسوس کیا کہ لوگ تولیت کی بجائے اسے تملیک سمجھیں گے۔لہٰذا حضرت عمرؓ نے

---

(۱) بخاری شریف وغیرہ کتب حدیث کی روایات میں تصریح ہے کہ صرف مدینہ میں بنونضیر کی زمین کی تولیت ان حضرات کو ملی تھی جہاں تک فدک اور خیبر کی زمین تھی وہ خود امیر المؤمنینؓ کے تصرف میں تھی۔(اصلاح الدین)

ان کو وہی حدیث پیش کر کے واپس کر دیا۔

پھر ہم یہ کہتے ہیں کہ چلو بالفرض شیخینؓ اور حضرت عثمانؓ نے تو ظلم کر دیا ہوگا تو حضرت علیؓ کو بھی تو خلافت ملی تھی انہوں نے اس غلط فیصلے کو کیوں برقرار رکھا۔ کیا وہ تینوں ظالم ہے اور حضرت علیؓ ظالم نہ ہوئے۔ پھر چھ مہینے خود حضرت حسنؓ کو بھی خلافت ملی تھی کیا وہ بھی اپنی ماں کی میراث حاصل نہ کر سکے۔ جبکہ ہم دیکھتے ہیں کہ یہ اراضی حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ کے دور تک اسی طرح بیت المال کے تصرف میں رہیں (۱)۔

شیعوں کا ایک اور الزام یہ ہے کہ حضرت فاطمہؓ ابوبکرؓ سے ناراض تھیں۔ لیکن اول تو یہ مسلّم نہیں کہ وہ خفا تھیں اور بالفرض اگر وہ خفا تھیں تو کیا ہوا۔ شریعت کا حکم ان کی رضا جوئی کے لئے نہ شیخینؓ توڑ سکتے ہیں نہ عثمانؓ نہ علیؓ اور نہ کوئی اور۔ ناراضگی کی ثبوت میں یہ لوگ کہتے ہیں کہ حضرت فاطمہؓ نے چھ مہینے تک حضرت ابوبکر صدیقؓ سے ملاقات تک نہیں کی۔

لیکن اوّل تو یہ بات ہے غلط۔ کیونکہ اس باب میں ملاقات کا ذکر ہے۔ دوسری یہ کہ حضرت فاطمہؓ تو بتول ہیں۔ مجسمہ حیاء ہیں۔ وہ کیسے ایک غیر مرد سے ملاقات کرتی۔ ابوبکر صدیقؓ ان کا کیا لگتا تھا؟ لوگوں سے کنارہ کشی اور پردے کا زیادہ اہتمام کرنے کے سبب ہی تو حضرت فاطمہؓ کو بتول کہتے ہیں۔

نیز یہ لوگ کہتے ہیں کہ حضرت ابوبکر صدیقؓ نے حضرت فاطمہؓ کی نماز جنازہ میں بھی شرکت نہیں کی۔ نہ حضرت علیؓ نے ان کو اطلاع دی تھی۔ لیکن یہ بھی دراصل ایک شرارت ہے۔ کیونکہ حضرت فاطمۃ الزہراءؓ رات کے وقت وفات پائی تھیں۔ جو کمال حیاء کے سبب ان کی خواہش تھی کہ میرے جنازے پر بھی کسی کی نظر نہ پڑے۔ اس زمانے میں جنازے پر پردہ لگانے کا رواج نہ تھا۔ تو اس لئے آپؓ کو اس بات کی فکر ہوتی تھی۔ پھر کسی نے بتایا کہ اس طرح جنازے پر پردے کا بھی ایک طریقہ ہوسکتا ہے۔ یہ سن کر آپؓ خوشی سے ہنس پڑی۔ کہتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ کی وفات کے بعد یہ پہلا موقعہ تھا جب آپ ہنسی تھیں۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے آپؓ کی حیا کی لاج رکھتے ہوئے آپؓ کو رات کے وقت موت دے دی۔ اور اس زمانہ

---

(۱) قال (عروةؓ) فکانت هذه الصدقه بیدعلیؓ منعها علیؓ فغلبه علیها. ثم کان بید حسن بن علیؓ ثم بید حسین بن علیؓ وحسن بن حسنؓ کلاهما کان یتداولانها. ثم بیدزیدبن حسن وهی صدقة رسول اللّٰه ﷺ حقًا (بخاری ۵۷۶/۲ کتاب المغازی. حدیث بنی النضیر) (اصلاح الدین)

میں مرنے والوں کی موت کا ڈھنڈورا پیٹنے اور اعلانات کا رواج نہ تھا۔ تو اگر حضرت ابوبکر صدیقؓ کو تکلفات سے کنارہ کشی کی خاطر اطلاع نہیں دی گئی تو اس میں کیا قباحت ہے۔ خصوصاً جبکہ حضرت علیؓ نے راتوں رات خود ہی تکفین وتدفین کے مراحل طے کر دیئے۔ اور یہی امر حضرت فاطمہؓ کے منشاء کے مطابق تھا۔

(۱) حدثنا احمد بن منیع ثنا حسین بن محمد ثنا اسرائیل عن ابی اسحاق عن عمرو بن الحارث اخی جویریة له صحبة قال ماترک رسول اللہ ﷺ الاسلاحه وبغلته وارضا جعلها صدقة(۱)۔

ترجمہ: عمرو بن الحارثؓ جو صحابی اور ام المؤمنین جویریہؓ کے بھائی ہیں۔ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے اپنے پیچھے نہیں چھوڑا مگر اسلحہ خچر اور کچھ زمین جسے آپ ﷺ نے اللہ تعالیٰ کی راہ میں وقف کر دیا تھا۔

عمرو بن الحارثؓ بن ابی ضرار، یہ حضرت جویریہ بنت الحارثؓ کے بھائی ہیں۔ جو امہات المؤمنین میں سے ہیں۔ قلیل الحدیث صحابی ہیں۔ خود رسول اللہ ﷺ سے اور کبھی اپنی بہن حضرت جویریہؓ سے روایت کرتے ہیں۔ اسی طرح حضرت ابن مسعودؓ اور ان کی بیوی زینبؓ سے بھی روایات کرتے ہیں ۵۰ھ کے بعد تک زندہ رہے۔ البتہ تاریخ وفات معلوم نہیں ہے۔ ان کا تعلق بنوالمصطلق سے ہے۔

الاسلاحه مثلاً آپ ﷺ نے تلوار، نیزہ، زرہ، خود اور حربہ چھوڑا تھا۔ **وارضا** زمین میں آپ ﷺ نے فدک، وادی القریٰ کا تہائی حصہ، خیبر کے خمس کا حصہ اور بنی نضیر کی زمین چھوڑی تھی۔

جعلها صدقة الخ، جعلها کی ضمیر میں اختلاف ہے۔ کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ یہ ضمیر صرف ارض یعنی زمین کو راجع ہے۔ یعنی آپ ﷺ نے زمین کو صدقہ کر دیا تھا۔ اور مطلب یہ ہے کہ زمین کے بارے میں آپ ﷺ نے زندگی میں یہ بتایا تھا کہ یہ صدقہ ہے۔ یعنی وقف مال کی طرح اس کی منفعت عام لوگوں کے لئے ہے۔ جبکہ اسلحہ وغیرہ چیزیں صرف آپ ﷺ استعمال کرتے تھے۔ ملا علی قاریؒ نے اسی کو ترجیح دی ہے۔ جبکہ علامہ کرمانیؒ کہتے ہیں کہ ضمیر تینوں اشیاء یعنی اسلحہ، خچر اور زمین کو راجع ہے۔

(۱) صحیح بخاری ۱/۳۸۲ کتاب الوصایا باب الوصایا وقول النبی ﷺ، سنن الدارقنی ۴/۱۸۵، مسند احمد ۴/۲۷۹ (مختار)

نبی اکرم ﷺ کا دیگر ترکہ: بعض اہل سیر نے مذکورہ تین چیزوں کے سوا اور چیزیں بھی آپ ﷺ کے ترکہ کے طور پر ذکر کی ہیں۔ مثلاً آپ ﷺ کے استعمال میں بیس اونٹنیوں کا ذکر ہوتا ہے۔ جن کا دودھ آپ ﷺ کے پاس لایا جاتا تھا۔ اسی طرح سات بکریوں کا ذکر بھی ملتا ہے۔ جوام ایمنؓ چرایا کرتی تھیں۔

علامہ مناویؒ نے ان اونٹوں اور بکریوں میں سے ایک ایک کا نام ذکر کیا ہے۔ بلکہ وہ کہتے ہیں کہ آپ ﷺ کے پاس سو بکریاں تھیں(۱)۔ اسی طرح بعض برتنوں اور کپڑوں کا بھی ذکر ملتا ہے۔

ملاعلی قاریؒ کہتے ہیں کہ اس حدیث میں جو حصر مذکور ہے کہ ان تین چیزوں کے سوا اور کوئی چیز آپ ﷺ نے نہیں چھوڑی تو یہ حصر اضافی یا ادّعائی ہے۔ اور یا پھر دیگر اشیاء کا اعتبار قلّت کی وجہ سے نہیں کیا گیا ہے۔ جہاں تک جانوروں کا تعلق ہے تو وہ یا تو صدقہ کے اونٹ تھے یا پھر منائح تھیں۔ یعنی ایسے جانور جو دودھ حاصل کرنے کیلئے لوگوں نے عاریتاً آپ ﷺ کو دی تھیں۔

(۲) حدثنا محمدبن المثنی ثناابو الولید ثناحماد بن سلمة عن محمد بن عمرو عن ابی سلمة عن ابی ہریرةؓ قال جاء ت فاطمة الی ابی بکرؓ فقالت من یرثک فقال اہلی وولدی فقالت مالی لاارث ابی فقال ابوبکر سمعت رسول اللہ ﷺ یقول لانورث ولکنی اعول من کان رسول اللہ ﷺ یعولہ وانفق علی من کان رسول اللہ ﷺ ینفق علیہ(۲).

ترجمہ: حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ حضرت فاطمہؓ ابوبکر صدیقؓ کے پاس تشریف لائیں اور پوچھا کہ تمہارا وارث کون ہوگا۔ انہوں نے فرمایا کہ میرے گھر

(۱) مناوی ج۲ ص۲۸۹ علامہ بیجوریؒ نے لکھا ہے کہ آپ ﷺ نے ایک جوڑا (چادروں کا) ایک عمانی تہہ بند، دو صحاری کپڑے ایک صحاری اور ایک سحولی قمیص ایک یمنی جبہ ایک خمیصہ ایک سفید کمبل تین یا چار چھوٹی ٹوپیاں، ایک ورس سے رنگی ہوئی اوڑھنی اپنے ترکہ میں چھوڑ دی تھیں۔ دیکھیں المواہب اللدنیہ ص۲۹۵۔ (اصلاح الدین)

(۲) مسنداحمد ۱/۱۰، جامع ترمذی ۲/۲۲۲ کتاب السیر باب ماجاء فی ترکة رسول اللہ ﷺ (مختار)

والے اور میری اولاد۔ اس پر حضرت فاطمہؓ نے پوچھا کہ پھر کیوں میں اپنے والد کی وارث نہیں بنتی؟ ابوبکر صدیقؓ نے کہا کہ میں نے نبی اکرم ﷺ سے سنا وہ فرمارہے تھے کہ ''ہم (انبیاء) سے کوئی شخص (مالی) وارث نہیں پاتا'' البتہ میں (وقف مال سے) ان لوگوں کی کفالت کروں گا۔ جن کی کفالت نبی اکرم ﷺ فرماتے تھے اور جن لوگوں پر آپ ﷺ مال خرچ کرتے تھے۔ میں بھی ان پر مال خرچ کروں گا۔

فقالت من یرثک حضرت فاطمہؓ حضرت ابوبکرؓ سے ان کے وارثوں کے بارے میں اس لئے پوچھتی ہیں تا کہ ان کے اقرار کے بعد ان پر الزام کرسکیں۔ **فقال اھلی وولدی** صدیقؓ بھی مداہنت سے کام نہیں لیتے تھے۔ نہ کسی چالاکی سے حضرت فاطمہؓ کو ٹالنے کی کوشش کی۔ بلکہ صاف صاف کہہ دیا کہ میری اولاد اور گھر والے وارث ہونگے۔ اور جب حضرت فاطمہؓ نے یہ کہہ دیا کہ پھر مجھے میرے باپ کی میراث سے کیوں محروم کیا جاتا ہے تو فرمایا کہ میرا اور نبی کریم ﷺ کا حکم الگ ہے۔ مسئلہ یہ ہے کہ میری میراث میری اولاد کو ملے گی۔ اور نبی کریم ﷺ کی میراث خود ان کی ہدایت کے مطابق بیت المال کو جائے گی۔ یہ تو حکم تھا۔ جو وہ بیان کر چکے۔ لیکن نفس الامر میں ابوبکر صدیقؓ کا مال بھی ان کے ورثاء نہیں لے سکے کیونکہ آپؓ بیت المال سے جو تھوڑا سا وظیفہ زمانہ خلافت میں لیتے رہے۔ اخیر عمر میں اپنے بیٹوں کو وصیت کی کہ جو تنخواہ میں نے اب تک حکومت سے لی ہے وہ ساری واپس کردو۔ لہٰذا مرنے کے بعد اولاد کو کوئی فائدہ نہیں پہنچا۔ بلکہ میراث تو کجا انہوں نے اپنے مال سے باپ کا قرضہ چکایا۔ اور وصیت کے مطابق آپؓ کا سارا مال بھی بیت المال میں داخل کردیا۔

لکنّی اعول الخ، حضرت ابوبکر صدیقؓ تو نبی کریم ﷺ کے بھائی دوست اور دست راست تھے۔ فرمایا کہ میں تمہیں میراث کے طور پر نبی کریم ﷺ کے مال سے شرعی موانع کے سبب کچھ نہیں دے سکتا۔ لیکن تمہاری ساری ضرورتوں کی کفالت مجھ پر ہے۔ بلکہ نبی کریم ﷺ اپنے خاندان میں جن لوگوں کے متکفّل تھے وہ بیویاں ہوں یا غلام اور خدّام ہوں ہم ان سب کا لحاظ کریں گے۔ اور ان کے اخراجات کو برداشت کریں گے۔ جس طرح خود نبی کریم ﷺ ان کی کفالت کیا کرتے تھے۔

وانفق علی من الخ ، یہ اعول کے لئے تفسیر بھی ہوسکتا ہے۔ اور بعض لوگوں نے دونوں کے

درمیان فرق بیان کیا ہے کہ اعول علی من الخ سے مراد اہل بیت پر خرچ کرنا اور انفق علی من الخ سے مراد ان کے سوا دیگر متعلقین پر خرچ کرنا ہے۔

ابوبکر صدیقؓ کے جواب کا خلاصہ یہ ہوا کہ قانون وراثت اگر چہ قرآن میں موجود ہے۔لیکن اس حدیث کی وجہ سے جو کہ مشہور بلکہ متواتر ہے انبیاء اس قانون سے مستثنیٰ ہیں۔یا مطلب یہ ہے کہ انبیاء کا ملک ہی ان کی وصیت کے مطابق ان کے مال سے زائل ہو چکا ہوتا ہے۔لہٰذا ان کے مال میں وراثت جاری نہ ہوگی۔جبکہ حضرت فاطمہؓ کے خیال میں وراثت کے حق میں نبی اور غیر نبی میں فرق نہیں تھا۔اس لئے انہوں نے اطمینان کے لئے حضرت ابوبکر صدیقؓ سے مطالبہ کردیا۔

(۳) حدثنا محمدبن المثنیٰ ثنایحییٰ بن کثیر العنبری ابوغسان ثناشعبة عن عمرو بن مُرّة عن البختری ان العباس وعلیا جآء الی عمر یختصمان یقول کل واحدمنهمالصاحبه انت کذا انت کذا فقال عمر لطلحة والزبیر وعبدالرحمٰن بن عوف وسعد نشدتکم باللّٰه اسمعتم رسول اللّٰه ﷺ یقول کل مال نبیّ صدقة الاما اطعمه اللّٰه انالانورث وفی الحدیث قصة(۱).

ترجمہ: ابوالبختری سے روایت ہے کہ حضرت عباسؓ اور حضرت علیؓ حضرت عمرؓ کے پاس (ان کی خلافت کے زمانے میں) جھگڑا لے کر آئے۔ایک دوسرے کو کہتا تھا کہ تم ایسے ہو دوسرا کہتا تھا کہ تم ایسے ہو۔حضرت عمرؓ نے (حاضرین حضرات) طلحہ، زبیر، عبدالرحمٰن بن عوف اور سعد (بن ابی وقاص رضی اللہ عنہم) سے کہا کہ میں تم لوگوں کو خدا کی قسم دیتا ہوں کیا تم لوگوں نے نبی اکرم ﷺ کو یہ کہتے ہوئے سنا ہے کہ نبی کا سارا ترکہ صدقہ (وقف) ہوتا ہے۔سوائے اس مال کے جو وہ اپنے اہل وعیال کو کھلائے۔ہم انبیاء سے کوئی وراثت نہیں پاتا۔اس حدیث میں (مفصّل) قصہ مروی ہے۔

---

(۱)سنن ابی داؤد ۲/۵۹ کتاب الخراج والامارة والفیٔ باب فی صفایارسول اللہ ﷺ من الاموال السنن البیهقی ۶/۲۹۹،مسنداحمد ۱/۴،ابوداؤد الطیالسی رقم الحدیث ۶۱ (مختار)

عن ابی البختریؒ، **ابو البختریؒ**، سعید بن فیروز تابعی ہیں۔ان کے نام کے ضبط کے بارے میں علامہ ابن حجرؒ(۱) سے چوک ہوئی ہے۔کیونکہ انہوں نے اسے حاء مہملہ کے ساتھ ذکر کیا ہے۔حالانکہ یہاں باء کے بعد خاء معجمہ (نقطہ والی) ہے۔پھر خود علامہ ابن حجر نے یہ بھی کہا ہے کہ یہ بختر سے ہے۔جس کا معنی خوش رفتاری ہے۔چنانچہ علامہ ملاعلی قاریؒ اور علامہ بیجوریؒ کے مطابق ابن حجرؒ کی غلطی ظاہر ہے۔لیکن یہ غلطی ابن حجرؒ نے شاید شمائل کی شرح میں کی ہو کیونکہ تقریب میں وہ لکھتے ہیں "**بفتح الموحّدة و المثنّاة بينهما معجمةٌ ساكنةٌ**"(۲)

یہ بات بھی یاد رہے کہ ابوالبختری خود اس واقعے کے چشم دید نہیں ہیں۔ بلکہ ابوداؤدؒ کی روایات کے مطابق وہ یہ روایت حضرت مالک بن اوس بن حدثان (المتوفی ۹۲ھ) سے روایت کرتے ہیں۔(کذا فی جمع الوسائل ج۲ص۲۸۶) مالک بن اوسؓ کی روایت امام بخاریؒ نے مفصّل ذکر کی ہے۔

یختصمان ہم پہلے کہہ چکے ہیں کہ حضرت عمرؓ کے پاس وہ دونوں کوئی نیا دعویٰ لے کر نہیں آئے تھے۔جائیداد کا دعویٰ تو پہلے ہی مسترد ہو چکا تھا بلکہ دراصل دونوں حضرات میں انتظامی امور میں اختلاف پیدا ہو چکا تھا۔چونکہ بنی نضیر کی زمین کی ولایت حضرت عمرؓ نے دونوں کو دی تھی۔اب اگر کہیں کوئی خرابی پیش آتی تو ایک کہتا کہ تمہاری وجہ سے یوں ہو گیا۔دوسرا کہتا کہ نہیں بلکہ غلطی تمہاری تھی۔اس نزاع کو نمٹانے کے لئے دونوں نے تقسیم یعنی ولایت کی تقسیم کا مطالبہ کر دیا۔

انت کذاانت کذا، ملاعلی قاریؒ اور علامہ بیجوریؒ نے لکھا ہے کہ **انت کذا** سے مراد جھگڑنے والوں کے درمیان تلخ کلامی اور تیز الفاظ مراد ہیں۔جو وہ ایک دوسرے کے بارے میں کہتے تھے اور جیسا کہ بعض شارحین نے لکھا ہے کہ یہاں گالیاں مراد ہیں۔تو وہ دونوں کی شان کے خلاف معلوم ہوتا ہے۔لیکن بخاری کی شرح میں علامہ ابن حجرؒ نے لکھا ہے کہ بعض روایات میں یہ لفظ مروی ہیں "**اقض بيني وبين هذا الظالم استبّا**" اور ایک روایت میں ہے "**اقض بيني وبين هذاالكاذب الآثم الغادر الخائن**"

(۱)علامہ مناویؒ نے بھی ابن حجرؒ کی تقلید میں یہی خطا کی ہے۔(اصلاح الدین)

(۲)تقریب التہذیب ج۲ص۳۶۰، دیکھیں فتح الباری باب فرض الخمس، اسی طرح بخاری شریف کتاب المغازی میں یہ حدیث تفصیل کے ساتھ ذکر ہے وہاں الفاظ یہ ہیں فاستبّ علیؓ و عباسؓ دیکھیں بخاری ص۵۷۵،(اصلاح الدین)

تو اگر یہ الفاظ ثابت ہوں تو بقول ابن حجر یہ حضرت عباسؓ نے بولے ہوں گے۔ کیونکہ وہ علیؓ کے لئے باپ کے مرتبے پر ہیں۔ حضرت علیؓ سے ایسے الفاظ چچا کے بارے میں مستبعد معلوم ہوتے ہیں۔

فقال عمر لطلحة الخ ،یعنی حضرت عمرؓ نے خود فیصلہ نہیں کیا بلکہ ان کو مطمئن رکھنے کے لئے ان کا مطالبہ شوریٰ میں پیش کیا۔ جو کہ تمام اہم معاملات نمٹاتی تھی۔ اس دن شوریٰ میں حضرت عثمانؓ، حضرت طلحہؓ، حضرت زبیر بن العوامؓ، حضرت عبدالرحمٰن بن عوفؓ اور حضرت سعد بن ابی وقاصؓ جیسے جلیل القدر صحابہ بیٹھے تھے۔ یہ تمام صحابہ اور خود عمرؓ عشرہ مبشرہ میں سے ہیں۔

وفی الحدیث قصہ یہ واقعہ تفصیل کے ساتھ بخاری اور حدیث کی دیگر کتابوں میں نقل کیا گیا ہے۔ اور شراح حدیث نے اس کی تفاصیل بیان کی ہیں جس کا خلاصہ یہ ہے کہ حضرت عباسؓ اور حضرت علیؓ حضرت عمرؓ کے پاس آئے۔ دونوں بنی نضیر کی اس زمین پر جو کہ نبی کریم ﷺ کو اللہ تعالیٰ نے بطور فئی دی تھی جھگڑ رہے تھے۔ حضرت عباسؓ نے کہا کہ اے امیر المؤمنین ہمارے درمیان آپ فیصلہ کر دیں۔ حضرت عمرؓ نے اپنے پاس کے حاضرین سے کہا کہ میں تم کو اس اللہ کی ذات کی قسم دلاتا ہوں جس کے حکم سے زمین و آسمان قائم ہیں کہ کیا تم کو اس بات کا علم ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے "**لانورث ماتر كناه صدقة**" (یعنی ہماری میراث نہیں لی جاتی ہم جو کچھ چھوڑ دیتے ہیں وہ صدقہ ہوتا ہے) حاضرین نے کہا کہ ہاں نبی کریم ﷺ نے یہ کہا ہے۔ اس کے بعد حضرت عمرؓ، حضرت عباسؓ اور حضرت علیؓ کی طرف متوجہ ہو کر کہنے لگے کہ میں تم دونوں کو اللہ تعالیٰ کی قسم دلاتا ہوں کہ کیا نبی کریم ﷺ نے یہ بات کہی تھی۔ انہوں نے کہا کہ ہاں آپ ﷺ نے یہ کہا تھا۔ حضرت عمرؓ نے فرمایا پس میں اس امر کے بارے میں تمہیں بتاتا ہوں۔ بیشک نبی کریم ﷺ کو اللہ تعالیٰ نے اس فئی میں ایک یمنی چادر، ایک عمانی تہہ بند، دو صحاری کپڑے، ایک صحاری قمیص، ایک سحولی قمیص، ایک یمنی جبہ، ایک سیاہ مربع کپڑا، ایک سفید چادر اور کچھ ٹوپیاں بھی دی تھیں۔ خدا کی قسم نبی کریم ﷺ نے تمہارے سوا وہ چیزیں کسی کو نہیں دیں۔ نہ کسی اور کو آپ ﷺ پر ترجیح دی بلکہ وہ چیزیں تمہیں دیں اور تمہارے درمیان تقسیم کر دیں (جہاں تک زمین کا قضیہ ہے) تو نبی اکرم ﷺ اس میں سے اپنے گھر والوں کا سالانہ نفقہ دیا کرتے تھے۔ اور جو کچھ اللہ جانتا ہے کہ میں اس میں سچا، صالح، ہدایت یافتہ اور حق کا اتباع کرنے والا ہوں۔

پھر تم دونوں اس سے قبل بھی میرے پاس آئے تھے۔تم دونوں کی بات اور مدعا ایک تھا۔اے عباسؓ تم میرے پاس آئے تھے اپنے بھتیجے کی میراث سے اپنا حصہ مانگنے اور یہ میرے پاس آیا۔آپ ﷺ کی بیٹی (فاطمہؓ) کا حصہ مانگنے۔تو میں نے تم سے یہی کہا کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا ہے کہ ''لانورث ما ترکناہ صدقۃ'' پھر جب مجھے یہ مناسب لگا کہ میں یہ زمین تم دونوں کو دوں۔تو میں نے اس شرط پر یہ زمین تمہیں دی کہ تم اللہ تعالیٰ کے ساتھ عہد و میثاق کرو۔کہ اس میں تم بھی ویسے ہی تصرف کرو گے۔جیسے کہ نبی کریم ﷺ، ابوبکرؓ اور میں نے اس میں اس وقت سے کیا جب سے یہ میری ولایت میں آئی تھی۔یہ کہہ کر حضرت عمرؓ نے حاضرین سے کہا کہ میں تم کو خدا کی قسم دلاتا ہوں۔کہ کیا میں نے یہ زمین ان دونوں کو اسی شرط پر دی تھی۔انہوں نے کہا کہ ہاں اس کے بعد حضرت عباسؓ اور حضرت علیؓ کی طرف متوجہ ہو کر کہنے لگا۔میں تم دونوں کو قسم دلاتا ہوں کہ کیا میں نے یہ زمین تم کو اس شرط پر دی تھی۔دونوں نے کہا ہاں۔

حضرت عمرؓ نے کہا تو اب تم مجھ سے اس فیصلے کے سوا کوئی دوسرا فیصلہ چاہتے ہو۔پس اس اللہ کی قسم جس کے حکم پر زمین و آسمان قائم ہیں۔میں اس کے بارے میں کوئی دوسرا فیصلہ قیامت تک نہیں کروں گا۔اور اگر تم اس کے تصرف سے عاجز آ چکے ہو تو یہ زمین مجھے واپس کر دو۔میں تم دونوں کی جگہ لے سکتا ہوں پھر اس کے بعد یہ صدقہ (یعنی اوقاف) حضرت علیؓ کے ہاتھ میں رہیں۔جو حضرت عباسؓ پر غالب آئے۔ان کے بعد حضرت حسنؓ کے ہاتھ میں۔ ان کے بعد حسینؓ اور ان کے بعد حضرت علی ابن الحسینؓ کے ہاتھ میں رہیں۔الحدیث(۱)۔

(۴) حدثنا محمدبن المثنی ثناصفوان بن عیسیٰ عن اسامة بن زید عن الزھری عن عروة عن عائشة ان رسول اللہ ﷺ قال لانورث ماترکنا فھو صدقة(۲).

---

(۱)بخاری شریف ۲/۱۰۸۵ کتاب الاعتصام بالکتاب باب مایکرہ من التّعمق والتنازع فی العلم وبخاری شریف ۱/۴۳۶باب فرض الخمس، وبخاری شریف ۲/۱۲۰ کتاب المغازی باب حدیث بنی النضیر (مختار) (۲)صحیح بخاری ۲/۵۷۵کتاب المغازی باب حدیث بنی نظیر، سنن ابی داؤد ۲/۶۰کتاب الخراج والامارة والفیٔ باب فی وصایارسول اللہ ﷺ من الاقوال، صحیح مسلم ۲/۱۲۰کتاب الجهاد والسیر باب قول النبیّ ﷺ لانورث ماترکناصدقة(مختار)

ترجمہ: حضرت عائشہؓ سے روایت ہے کہ نبی اکرم ﷺ نے فرمایا کہ ہم سے کوئی وراثت نہیں پاتا۔ہم جو مال چھوڑتے ہیں وہ صدقہ ہوتا ہے۔

فھو صدقۃ،یعنی ہمارا ترکہ بیت المال میں جائے گا اور عامۃ المسلمین کیلئے وقف ہوگا۔

(۵)حدثنا محمدبن بشارثناعبدالرحمٰن بن مھدی ثناسفیان عن ابی الزناد عن الاعرج عن ابی ھریرۃؓ عن النبی ﷺ قال لایقسم ورثتی دینارا و لادرھما ماترکت بعد نفقۃ نسائی ومؤنۃ عاملی فھو صدقۃ.

ترجمہ: حضرت ابو ہریرہؓ نبی اکرم ﷺ سے روایت کرتے ہیں فرمایا کہ میرے پسماندگان (میرے ترکہ میں سے دینار اور درہم تقسیم نہ کریں۔ میری بیبیوں اور میرے عامل کا خرچہ نکال کریں جو کچھ چھوڑتا ہوں وہ صدقہ ہے۔

لایقسم ورثتی، یہ نفی یا نہی کا صیغہ ہے دونوں صورتوں میں مآل ایک ہی ہے۔یعنی میرے ورثہ تقسیم مال کے مستحق نہیں ہیں۔پھر اپنے عزیز واقارب کو ''ورثہ'' بھی مجازاً کہا ہے۔یعنی جو بالقوۃ وراثت کے اہل ہیں۔ورنہ شرعاً وہ وارث نہیں ہیں۔

دیناراً و لادرھما ، چونکہ غالباً ترکہ نقد کی شکل میں ہوتا ہے اور پھر تقسیم کے وقت تو سارے مال کی قیمت نقد سے لگائی جاتی ہے۔اس لئے ان دونوں کا ذکر کیا ورنہ کسی بھی مال کی تقسیم وہ نہیں کرسکتے۔

بعدنفقۃ نسآئی یعنی ازواج مطہرات کا نفقہ میرے ترکہ سے دیا جائے گا۔کیونکہ نبی زندہ ہوتا ہے تو ان کی بیبیوں کا نفقہ پہلے کی طرح جاری ہوگا۔دوم یہ کہ ان کے لئے دوسری جگہ نکاح ناجائز ہے۔تو وہ معتدات کی طرح اپنے خاوند کے حق میں محبوس ہیں۔سوم یہ کہ وہ مؤمنین کی مائیں ہیں تو مؤمنین کے لئے چھوڑے ہوئے مال میں سے ان کا نفقہ دیا جائے گا۔کیونکہ ان کا نفقہ مؤمنین پر واجب ہے۔

---

(۱)صحیح بخاری ۳۸۹/۱کتاب الوصایاباب نفقۃ القیم للوقف،صحیح مسلم ۸۹/۲،۹۰کتاب الجھادوالسیر باب قول النبی ﷺ لانورث ماترکنا فھوصدقۃ، سنن ابی داؤد ۵۸/۲کتاب الخراج والامارۃ والفیٔ باب فی وصایا رسول اللہ ﷺ من الاموال ، السنن الکبریٰ للبیھقی ۳۰۲/۶،مسنداحمد ۲۴۲/۲ (مختار)

ومؤنة عاملی، عامل سے مراد بعض شراح کے نزدیک خلیفہ اور امیر المؤمنین ہیں۔ بعض کے ہاں اس سے مراد جائیداد کا انتظام چلانے والا، بعض کے خیال میں اس سے مراد صدقات کا عامل ہے۔ اور بعض نے مسلمانوں کے اجتماعی امور میں مصروف ہر کارندہ مراد لیا ہے۔

(۲) حدثنا الحسن بن علی الخلال ثنا بشر بن عمر قال سمعت مالک بن انس عن الزهری عن مالک بن اوس بن الحدثان قال دخلت علی عمر فدخل علیه عبدالرحمٰن بن عوف وطلحة وسعد وجاء علی والعباس یختصمان فقال لهم عمر انشدکم بالذی باذنه تقوم السّماء والارض أتعلمون ان رسول اللّٰہ ﷺ قال لانورث ماترکنا صدقة فقالوا اللّهمّ نعم وفی الحدیث قصة طویلة(۱).

ترجمہ: مالک بن اوس بن الحدثانؓ کہتے ہیں کہ میں حضرت عمرؓ کے پاس آیا تو ان کے پاس عبدالرحمٰن بن عوف، طلحہ اور سعد رضی اللہ عنہم تشریف لائے۔ ان کے بعد علیؓ اور عباسؓ جھگڑتے ہوئے آئے۔ حضرت عمرؓ نے حاضرین صحابہؓ کو کہا کہ میں تم کو اس ذات کی قسم دلواتا ہوں جس کے حکم سے آسمان اور زمین قائم ہیں۔ کیا تم کو علم ہے کہ نبی اکرم ﷺ نے فرمایا ''ہم (انبیاء) سے کوئی وراثت نہیں پاتا۔ ہم جو مال چھوڑتے ہیں وہ صدقہ ہوتا ہے۔ تمام حضرات نے کہا کہ بیشک ہم نے سنا ہے۔ اس حدیث میں طویل قصہ ہے۔

مالک بن اوس بن الحدثانؓ، النصری کی کنیت ابوسعید تھی۔ صالح المرّی اور بعض اکابر کے بقول وہ صحابی ہیں۔ تقریب میں ابن حجرؒ نے بھی اسے صحابی کہا ہے۔ بلکہ نبی کریم ﷺ سے ان کی روایت بھی

(۱) صحیح بخاری ۲/۴۳۶ کتاب فرض الخمس باب فرض الخمس، صحیح مسلم ۲/۹۰ کتاب الجهاد والسیر باب حکم الفئ، سنن ابی داؤد ۲/۵۶ کتاب الخراج والامارة والفئ باب صفایا رسول اللّٰہ ﷺ من الاقوال، جامع ترمذی کتاب السیر باب ماجاء فی ترک رسول اللّٰہ ﷺ، السنن الکبریٰ للبیهقی ۶/۲۹۷ (مختار)

بعض کتب میں موجود ہے۔لیکن اکثر روایات عشرہ مبشرہ اور دیگر اکابر صحابہ سے کرتے ہیں۔دوسری طرف ابن سعدؒ امام بخاریؒ اور بعض دیگر اکابر نے ان کو تابعی کہا ہے۔ابن حبانؒ اور ابن مندہ کہتے ہیں کہ ان کو صحابی سمجھنا وہم ہے۔اتنی بات ثابت ہے کہ نبی اکرم ﷺ کے زمانہ میں وہ بالغ آدمی بلکہ شہسوار تھے۔ لیکن صحابیت میں تردد موجود ہے۔حضرت عمرؓ نے ان کو اپنی قوم میں عریف اور معتمد مقرر کیا تھا۔اموال کی تقسیم اور دیگر امور میں ان سے تعاون لیا کرتے تھے۔۹۲ھ یا ۹۱ھ میں وفات پائی۔

فقالوا اللّٰھمّ نعم ،ان حضرات نے جواب کی ابتداء اللّٰھم سے محض تاکید کے لئے یا خطا سے بچنے کے لئے احتیاطاً کی ہے۔جبکہ بعض شراح کے مطابق یہ کلمہ شہادت کے مرتبہ میں ہے۔یعنی ہم اس کی گواہی دیتے ہیں۔

وفی الحدیث قصة طویلة ،یہ طویل قصہ ہم ذکر کر چکے ہیں۔البتہ مصنف نے اسے ذکر نہیں کیا۔شاید اس لئے کہ اس میں اشکالات اور اہل بدعت کے اوہام ہیں۔لہٰذا اسے قابل ذکر نہیں سمجھا۔

(۷) حدثنا محمد بن بشار ثنا عبدالرحمٰن بن مهدی ثنا سفیان عن عاصم بن بهدلة عن زر بن حبیش عن عائشةؓ قالت ما ترک رسول اللّٰه ﷺ دینارا ولا درهما ولا شاةً ولا بعیراً قال واشک فی العبد والامة(۱).

ترجمہ: حضرت عائشہؓ فرماتی ہے کہ نبی کریم ﷺ نے نہ کوئی دینار چھوڑا اور نہ درہم نہ کوئی بکری چھوڑی اور نہ اونٹ۔راوی کہتا ہے کہ مجھے اس بات میں شک ہے کہ آپؐ نے غلام اور باندی کا ذکر کیا یا نہ۔

تشریح: اس روایت میں راوی کو غلام اور باندی کے ذکر میں شک ہے۔مگر دوسری روایت صراحت کے ساتھ مذکور ہے کہ نہ غلام چھوڑا اور نہ باندی۔گویا انبیاء کرامؑ مال و دولت کے وارث نہیں بناتے ان کا ترکہ علم ہوتا ہے۔

---

(۱)مصنف ابن ابی شیبة ۲۰۶/۱، السنن الکبریٰ للبیهقی ۲۶۶/۶، شرح السنة للبغوی رقم الحدیث ۳۸۳۶ ۵۱/۱۴ باب تزکیة النبی ﷺ کتاب الفضائل صحیح ابن حبان رقم الحدیث ۲۱۶۴(مختار)

۵۶. باب ماجاء فی رؤیۃ النبی ﷺ فی المنام

رسول اللہ ﷺ کو خواب میں دیکھنا

رؤیا اور رؤیہ دونوں مصدر ہیں۔ جیسے یُسریٰ اور عُسرۃ۔ عموماً رؤیا خواب دیکھنے کیلئے اور رؤیۃ جاگتے ہوئے دیکھنے کیلئے مستعمل ہوتا ہے لیکن ایک دوسرے کی جگہ ان کا استعمال جائز ہے۔ پھر رویا اگرچہ مصدر ہے لیکن اس کا اطلاق "مایراہ الرجل فی منامہ" یعنی خواب میں دیکھی ہوئی چیز پر بھی ہوتا ہے۔ اس وقت یہ مصدریت سے نکل کر اسم بن جاتا ہے۔

زندگی کا مکمل نقشہ کھینچنے کے بعد مصنفؒ اس باب میں وہ احادیث لاتے ہیں جو خواب میں نبی اکرم ﷺ کی زیارت سے متعلق ہیں۔

خواب کیا ہے؟ خواب کی حقیقت کے بارے میں علماء ظاہر و باطن، حکماء نیز جدید دور کے ڈاکٹروں نے مختلف قسم کے خیالات ظاہر کئے ہیں مثلاً بعض حکماء کہتے ہیں کہ واقعات وحوادث کی صورتیں عالم بالا میں موجود ہوتی ہیں جب نیند میں روح کا محاذات ان نقوش میں سے بعض کے ساتھ ہوجاتا ہے۔ تو وہ صورتیں جو کہ پہلے سے خزانہ میں جمع ہوچکی ہیں نفس میں منعکس ہوتی ہیں(۱)، اور بعض اہل طب کا خیال ہے کہ سارے خواب جسم کے اخلاط کے اثرات سے ظاہر ہوتے ہیں۔ یعنی خوابوں میں انسانی بدن میں موجود مادوں کے ہیجان ایک دوسرے پر غلبہ، مزاج کی گرمی، سردی، خشکی اور رطوبت وغیرہ کا عمل دخل ہوتا ہے گویا ان کا سبب اندرونی عوامل ہوتے ہیں۔ مثلاً بعض گرم مزاج کے لوگ خود کو آگ میں جلتا ہوا دیکھتے ہیں۔ اور ٹھنڈے مزاج کے لوگوں کو پانی، برف اور دیگر سرد اشیاء دکھائی دیتی ہیں۔ اس طرح صفراوی، سوداوی اور بلغمی مزاج کے لوگوں کے خوابوں میں اختلاف ہوتا ہے(۲)۔

جبکہ علماء شریعت میں اکثریت کی رائے یہ ہے کہ جس طرح جاگتے ہوئے بھی دل میں خیالات واعتقادات اترتے ہیں اور اللہ تعالیٰ دل میں ادراکات پیدا کرتے ہیں اس طرح نیند کی حالت میں بھی اللہ

(۱)قال ابن حجرؒ وھذا اشدّ فساداً لکونہ تحکماً لابرھان علیہ(از کوکب الدری)(اصلاح الدین)

(۲)قال صاحب المواقف اما الرؤیا فخیال باطلٌ عندالمتکلمین(جمع الوسائل ج۲ ص۲۹۰)(اصلاح الدین)

تعالیٰ کی تخلیق سے دل میں خواب پیدا ہوتے ہیں البتہ ان خوابوں کی تخلیق کبھی کسی فرشتے کی وساطت سے ہوتی ہے یہ الہامی خواب اور مبشّرات کہلاتے ہیں اور کبھی اس کا واسطہ شیطانی وساوس ہوتے ہیں کیونکہ شیطان کو بھی نفس انسانی میں داخل ہونے اور رگوں میں تیرنے کی قوت دی گئی ہے اس صورت میں خواب شیطانی ہوتا ہے اسے **تحزین الشیطان یاحلم** کہاجاتا ہے اور کبھی انسان کی نفسانی ترجیحات اور اس کے اپنے خیالات وتصورات ان خوابوں کیلئے اساس بن جاتے ہیں اس صورت میں اسے حدیث النفس کہاجاتا ہے اور اضغاث احلام بھی کہا گیا ہے(۱)۔

البتہ اس میں علماء کا اختلاف ہے کہ یہ مرئیٰ امر ادراک کے قبیلے سے ہے جیسا کہ علامہ ابن عربیؒ کی رائے ہے یا یہ محض تصوّرات ہیں جو خلاف حقیقت بھی ہوسکتی ہے جیسا کہ علامہ مازریؒ وغیرہ علماء کا خیال ہے۔ بہرحال اکثر اہل مذہب کے نزدیک خواب اللہ تعالیٰ اور نفس وشیطان کے تصرفات کا نتیجہ ہوتی ہیں اور وہ تصورات جو کہ حق تعالیٰ شانہ کی طرف سے قلب میں ڈال دی جاتی ہیں سچے خواب ہوتے ہیں اور جو شیطان کے وسوسہ سے ظاہر ہوں وہ شیطانی خواب ہوتے ہیں گویا خواب بیرونی عوامل سے بھی اثر پذیر ہوتے ہیں۔ کچھ نفس کے خواطر اور افکار بھی مختلف اشکال میں متشکل ہوکر کبھی کبھی نظر آتی ہیں۔

<u>رویۃ نبی سچا خواب ہے:</u> جو کچھ بھی ہو امتی کا خواب غیر یقینی تصورات وخیالات کا ایک سلسلہ ہوتا ہے جس میں الہام، حدیث نفس اور شیطانی وسوسے کا احتمال ہوسکتا ہے البتہ پیغمبر کا خواب وحی ہوتا ہے یونہی اگر کسی کو نبی کریم ﷺ خواب میں دکھائی دیں تو اس میں بھی کسی شک کی گنجائش نہیں ہوتی یہ سچا اور الہامی خواب ہے اور دکھائی دینے والے نبی اکرم ﷺ ہی ہونگے خود نبی اکرم ﷺ اس بات کی ہمیں بشارت دیتے ہیں اور اس کا سبب بھی بتادیا ہے جس طرح اللہ تعالیٰ نے پیغمبر کی زندگی میں شیطان سے یہ قوتیں سلب کردی ہیں کہ وہ کسی پیغمبر کی شکل میں متشکل ہو یا نبی کی آواز میں آواز ملا کر وحی میں اختلاط کا سبب بنے۔ اس طرح آپ ﷺ کی وفات کے بعد بھی آپ ﷺ کی شکل میں شیطان متشکل نہیں ہوسکتا۔

---

(۱)عن أبی هریرةؓ قال الرؤیا ثلٰث الحنسة بشریٰ من اللّٰه والرؤیایُحدّث بهاالرجل نفسه والرؤیا من تحزین الشیطان الخ(ترمذی ابواب الرؤیا، باب ماجاء فی رؤیاالنبی ﷺ فی المیزان والدلو.)۱۲(اصلاح الدین)

(۱) حدّثنا محمّد بن بشّار ثناعبدالرحمٰن بن مهدیّ ثنا سفیان عن أبی إسحاق عن أبی الأحوص عن عبداللّٰہ عن النبیّﷺ قال من رانی فی المنام فقدرانی فانّ الشیطان لا یتمثّل بی(۱).

ترجمہ: حضرت عبداللہ بن مسعودؓ نبی اکرمﷺ سے روایت کرتے ہیں انہوں نے فرمایا کہ جس شخص نے مجھے خواب میں دیکھا اس نے حقیقۃً مجھ ہی کو دیکھا اس لئے کہ شیطان میری صورت میں نہیں ڈھل سکتا۔

فقدرأنی اس حدیث کی تاویل میں مختلف اقوال ہیں۔

اول مطلب یہ کہ جس نے مجھے خواب میں دیکھا وہ جاگتے میں مجھے دیکھ لے گا۔(بخاری) اور مسلم شریف کی ایک روایت میں بھی یہی الفاظ آتے ہیں(۲)

دوسرا معنی یہ ہے کہ جو خواب میں مجھے دیکھے گا گویا اس نے مجھے جاگتے ہوئے دیکھا ہے گویا اس شخص کا بھی صحابہ کی طرح بڑا عظیم مرتبہ ہے۔

تیسرا اور مشہور معنی یہ ہے کہ اس شخص کا خواب سچا خواب ہے اوہام نہیں ہیں یعنی اس نے حقیقۃً مجھے دیکھ لیا اور یہ پراگندہ خیالی اور شیطانی تصرفات نہیں ہونگے۔

<u>اصل صورت میں نہ دیکھنے کی وجہ:</u> اب اگر کسی نے نبی کریمﷺ کو ایسی حالت میں دیکھا ہو جو کہ مناسب شان نبویﷺ نہیں تو اس میں دراصل خواب دیکھنے والے کو یہ تنبیہ ہوتی ہے کہ اسی نوعیت کی خامیاں تم میں خود موجود ہیں جس طرح کہ نبیﷺ میں دیکھ رہے ہو۔مثلاً کسی شخص پر انگریزی تمدن غالب

---

(۱)جامع ترمذی ۲/۱۰۵ کتاب الرؤیا باب ماجاء فی قول النبیّ من رأنی فی المنام فقدرأنی، سنن ابن ماجة ص۲۸۷ ابواب کتاب تعبیر الرؤیا باب رویة النبیّﷺ ،مصنف ابن ابی شیبة ۱۱/۵۵،(مختار)

(۲)من رأنی فی المنام فسیرانی فی الیقظة. بخاری ۲/۱۰۳۵ کتاب التعبیر باب من رأی النبیﷺ فی المنام. مسلم ۲/۲۵۰ کتاب الرویاء باب قول النبیﷺمن رأنی فی المنام فقدرانی ابوداؤد ۲/۳۳۷ کتاب الادب باب ماجاء فی جاء فی الرؤیا. ۱۲(اصلاح الدین)

ہے یا وہ اس کی طرف مائل ہے تو وہ دیکھ سکتا ہے کہ نبی کریمﷺ انگریزی لباس میں ملبوس ہوں تو حقیقتاً یہ خواب دیکھنے والے کے خیالات اور اس کی نفسیات کا اثر ہوتا ہے وہ اپنے ظرف اور دل کے آئینے میں نبی کریمﷺ کو دیکھتا ہے اور آئینہ ٹیڑھا ہو تو اس میں نظر آنے والی صورت بھی ٹیڑھی ہوتی ہے۔ جس طرح کوئی شخص شفاف عینک لگائے تو ہر چیز اصل رنگ میں نظر آتی ہے لیکن سبز عینک لگائے تو چیز بھی سبز نظر آتی ہے اگرچہ وہ چیز نفس الامر میں سفید ہو تو اصلی حالت اور صورت میں موجود ہوتے ہوئے بھی نبی کریمﷺ کی ہیئت اسے اس لئے متغیر نظر آتی ہے کہ اس شخص کی آنکھوں پر مختلف رنگ کے خول چڑھے ہوئے ہوتے ہیں(۱) اور یہی وجہ ہے کہ نیک لوگوں کے خوابوں میں نبی کریمﷺ عموماً ویسے دکھائی دیتے ہیں جیسے شمائل میں ذکر ہے۔

لہٰذا اب یہ اعتراض بھی نہیں ہوگا کہ ممکن ہے کہ کوئی خواب میں نبی کریمﷺ کو اپنی اصل صورت میں نہ دیکھے تو یہ کیسی حقیقت ہے۔ نیز یہ اعتراض بھی مندفع ہے کہ دنیا کے مختلف گوشوں میں بیک وقت کیسے آپﷺ حقیقتاً دکھائی دیتے ہیں کیونکہ ہم کہہ چکے ہیں کہ ذات تو حقیقۃً مرئی جبکہ صفات متخیل ہیں ہوسکتا کہ ان کے ادراک میں خطا واقع ہو یہاں یہ بات بھی واضح ہوگئی کہ جب شیطان ظاہری صورت کے لحاظ نبی اکرمﷺ کے ساتھ تشبہ سے عاجز ہے تو باطنی صفات میں تشبہ کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

(۲) حدّثنا محمّد بن بشّار ومحمّد بن المثنیٰ قالا ثنا محمّد ابن جعفر ثنا شعبة عن أبی حصین عن أبی صالح عن أبی هریرة قال قال رسول اللّٰهﷺ من رأنی فی المنام فقدرأنی فانّ الشیطان لایتصوّر اوقال لایتشبّه بی(۲).

---

(۱)فرؤیاه فی صورة حسنة دلیل حسن دین الراء ی وعکسه عکسه لاز کالمرأة الصقیلة ینطع فیها مایقابلها . ۱۲ جمع ج۲ ص ۲۹۲ ۹ (اصلاح الدین)

(۲)صحیح بخاری ۱/ ۲۱ کتاب العلم باب آثم من کذب علی النبیﷺ،جامع ترمذی ۲/ ۵۰۱ مسنداحمد۵/ ۳۰۶ (مختار)

ترجمہ: حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جس نے مجھے خواب میں دیکھا اس نے حقیقۃً مجھ ہی کو دیکھا کیونکہ شیطان میری صورت میں ظاہر نہیں ہوسکتا یا یہ فرمایا کہ مجھ جیسا نہیں بن سکتا۔

<u>شیطانی تصرف سے تحفظ کی وجہ:</u> لایتصور اوقال لا یتشبۃ بی الخ ،اس حدیث میں یتمثل کی بجائے دیگر الفاظ آئے ہیں معنی تینوں لفظوں کا ایک ہے یعنی میری صورت، تمثیل اور شبیہ وہ پیش نہیں کرسکتا۔ بلکہ آواز بھی نبی کریم ﷺ جیسی نہیں نکال سکتا اور جو بعض روایات میں یہ آیا ہے کہ آپ ﷺ تلاوت فرمارہے تھے کہ آپ ﷺ کی زبان مبارک پرشیطانی تصرف سے یہ الفاظ ادا ہوئے کہ ''تلک الغرانیق العلیٰ وإنّ شفاعتھنّ لترتجی ''تو محققین اور ائمہ حدیث نے اس پر روایۃً اور درایۃً بڑی تنقید کی ہے۔اور اس کی تردید کی ہے دراصل یہ روایت جلالین میں مروی ہے اور چونکہ صاحب جلالین نے نوعمری کے زمانہ میں تفسیر لکھی تھی۔اس لئے کئی مقامات پر ان سے غلطیاں بھی سرزد ہوئیں۔اور کچھ رطب ویابس کو نقل کیا۔عقلاً یہ اس لئے بعید ہے کہ شیطان کو اگر اس تصرف کا حق دیا جائے پھر تو ساری وحی غیر محفوظ اور نا قابل اعتماد ہوجائیگی حالانکہ وحی کی حفاظت عرش سے فرش تک خود اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں۔

اسی طرح بعد از وفات بھی اگر یہ اختیار شیطان کو دیا جائے تو بڑے بڑے بزرگ بھی دھوکے میں پڑے رہیں گے۔حاصل یہ کہ نبی کریم ﷺ کی شکل میں شیطان کا آنا عقلاً و نقلاً محال ہے(۱)۔

اب یہ زیارت بعض محققین کے نزدیک عین ذات کی ہوتی ہے گویا راءی (خواب دیکھنے والے) اور (مرئی) نبی کریم ﷺ کے درمیان تمام حجابات ہٹ جاتے ہیں اور آپ ﷺ دکھائی دیتے ہیں۔اور بعض کے نزدیک یہ ایک مثالی صورت ہوتی ہے جو کہ ذات سے حکایت ہوتی ہے دونوں قسم کی رؤیت کا امکان ہے اور جس درجہ میں بھی ہو آپ ﷺ کی زیارت عظیم سعادت ہے۔اللّھمّ ارزقناہ

---

(۱)قال المناوی واذاتنوّر العالم بنورہ ووجودہ رحمت الشیاین لمیلادہ وھدمت بنیان الکھنۃ فکیف یتصوّر ان یتمثل الشیطان بصورتہ ولوقدران یتمثل بصورتہ تمثّل فی الحارج کذالک(المناوی علی ھامش جمع الوسائل ۲/ ۲۹۱) (مختار)

(۳) حدّثنا قتیبه ثناخلف بن خلیفة عن ابی مالک الأشجعیّ عن ابیہ قال قال رسول اللّٰہﷺ من رأنی فی المنام فقدرأنی (۱) قال ابوعیسیٰ وابومالک ھذاھوسعد بن طارق بن أشیم وطارق بن اشیم ھو من أصحاب النبیّﷺ وقدروی عن النبیّﷺ احادیث وسمعت علّی بن حجر یقول قال خلف بن خلیفة رأیت عمرو بن حریث صاحب النبیّﷺوأناغلام صغیر(۱).

ترجمہ: طارق بن اشیم رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ نبی اکرمﷺ نے فرمایا جس نے خواب میں مجھے دیکھا اس نے حقیقۃً مجھے دیکھا۔امام ترمذیؒ کہتے ہیں کہ یہ ابومالک سعد بن طارق بن اشیم ہیں اور(ان کے والد) طارق بن اشیمؓ صحابہ میں سے ہیں۔ انہوں نے نبی اکرمﷺ سے متعدد احادیث روایت کی ہیں۔میں نے اپنے شیخ علی ابن حجرؒ کو یہ کہتے ہوئے سنا کہ خلف بن خلیفہؒ(تابعی) نے فرمایا کہ میں نے صحابی رسول عمرو بن حریثؓ کو دیکھا تھا جبکہ میں چھوٹا تھا۔

طارق بن اشیمؓ: حضرت طارق بن اشیم بن مسعود الاشجعیؓ کوفہ میں رہنے والے صحابہ میں سے ہیں۔امام مسلمؒ کہتے ہیں کہ ان سے ان کے بیٹے ہی کی روایات ملتی ہیں۔امام ترمذیؒ کہتے ہیں کہ وہ نبی اکرمﷺ سے متعدد روایات روایت کر چکے ہیں بلکہ ترمذی باب ماجاء فی ترک القنوت میں تصریح ہے کہ وہ نبی اکرمﷺ کے پیچھے نمازیں پڑھ چکے ہیں۔اس لئے خطیبؒ کا یہ قول درست نہیں ہے کہ ان کی صحابیت مشکوک ہے۔

من رآنی فی المنام فقدرآنی ملاعلی قاریؒ نے مشکوٰۃ المصابیح کے بعض شارحین اور امام بغویؒ کے حوالے سے لکھا ہے کہ شیطان جس طرح نبی اکرمﷺ کی صورت میں ظاہر نہیں ہوسکتا اس طرح دیگر انبیاء کرام،ملائکہ،سورج،چاند،بادل اور بارش کی صورت میں بھی ظاہر ہونے سے قاصر ہے۔واللہ اعلم

قال ابوعیسیٰؒ وابومالکؓ الخ، امام ترمذیؒ یہاں یہ بیان کرنا چاہتے ہیں کہ ابومالکؒ تابعی

(۱)مصنف ابن ابی شیبة ۱۱/۵۵، مجمع الزوائد۷/۱۸۱، مسنداحمد۳/۴۷۲(مختار)

اوران کے والد صحابی ہیں۔طارق بن اشیمؓ جب نبی اکرم ﷺ سے متعدد احادیث کے راوی ہیں۔تو ان کی صحابیت میں شک باقی نہیں رہا۔

وسمعت علی بن حجر الخ، اس کلام سے امام ترمذیؒ کا مقصد یہ ہے کہ خلف بن خلیفہؒ تابعی ہیں ان کی ملاقات صحابی عمرو بن حریثؓ سے ثابت ہے۔لہٰذا زیرنظر روایت میں ایک تابعی دوسرے تابعی سے روایت کرتے ہیں۔

(۴) حدّثناقتیبه هوابن سعید ثنا عبدالواحد بن زیادعن عاصم بن کلیب حدّثنی ابی أنّه سمع أباهریرة یقول قال رسول اللّٰه ﷺ من رأنی فی المنام فقدرأنی فانّ الشیطان لا یتمثّلنی قال ابی فحدّثت به ابن عبّاس فقلت قدرأیته فذکرت الحسن بن علی فقلت شبّهته به فقال ابن عبّاس إنّه کان یشبهه(۱).

ترجمہ: عاصم بن کلیب کہتے ہیں کہ مجھے میرے والد نے بتایا کہ میں نے ابو ہریرہؓ کو یہ کہتے ہوئے سنا کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جس نے مجھے خواب میں دیکھا اس نے مجھے حقیقۃً دیکھا کیونکہ شیطان میری مشابہت نہیں کرسکتا۔میرے والد کلیبؒ نے یہ حدیث عبداللہ بن عباسؓ کو سنائی اور یہ بھی بتایا کہ میں نے نبی اکرم ﷺ کو خواب میں دیکھا تو صورت دیکھ کر مجھے (حضور اقدس ﷺ کے نواسے) حسن بن علیؓ کی صورت یاد آئی اور کہا میں نے نبی اکرم ﷺ کو حضرت حسنؓ کے مشابہ پایا تو حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ بے شک آپ ﷺ حضرت حسنؓ سے ملتے جلتے تھے۔

حضور اقدس ﷺ سے حسنؓ اور حسینؓ کی مشابہت: **فذکرت الحسن بن علی الخ،** حضرت کلیب فرماتے ہیں کہ خواب میں جب نبی اکرم ﷺ کی زیارت ہوئی تو مجھے حضرت حسن بن علیؓ (جن کو انہوں نے دیکھا تھا) یاد آئے کیونکہ نظر آنے والی صورت مبارکہ حضرت حسنؓ کی صورت سے ملتی

(۱)المستدرک للحاکم، مسنداحمد ۲/۲۳۲(مختار)

جلتی تھی اور جب انہوں نے حضرت ابن عباسؓ سے خواب بیان کیا اور بتایا کہ نبی اکرمﷺ کی نظر آنے والی صورت کو حضرت حسنؓ سے مشابہ پایا تو انہوں نے تصدیق کی کہ آپﷺ ایسے ہی تھے۔ بعض محققین کے بیان کے مطابق نبی اکرمﷺ کا نصف اعلیٰ یعنی سر، سینہ اور چہرۂ انور حضرت حسنؓ سے زیادہ مشابہ تھا اور نصف اسفل یعنی پاؤں، پنڈلیاں، قدم اور انگلیاں حضرت حسینؓ سے زیادہ مشابہت رکھتا تھا(۱)، اس طرح گویا اللہ تعالیٰ نے نبی اکرمﷺ کی شبیہ کو کچھ عرصہ تک امت کیلئے زندہ شکل میں بھی باقی رکھا تھا۔

آثار کچھ حسن کو ملے کچھ حسین کو یوں کھچ گیا مرقع ہمارے رسولﷺ کا

(۵) حدّثنا محمّد بن بشّار ثنا ابن ابی عدیّ ومحمّد بن جعفر قال ثنا عوف بن أبی جمیلة عن یزید الفارسیّ وکان یکتب المصاحف قال رأیت النبیّﷺ فی المنام زمن ابن عبّاس فقلت لابن عبّاس انّی رأیت رسول اللهﷺ فی النوم فقال ابن عبّاس إنّ رسول اللّٰهﷺ کان یقول إنّ الشیطان لایستطیع ان یتشبّه بی فمن رآنی فی النّوم فقدرأنی هل تستطیع ان تنعت هذاالرجل الذی رأیته فی النّوم قال نعم انعت لک رجلاً بین الرّجلین جسمه ولحمه اسمرإلٰی البیاض اکحل العینین حسن الضحک جمیل دوائرالوجه قدملأت لحیته مابین هذه إلٰی هذه قدملاء ت نحره قال عوف ولاادری ما کان مع هذا النعت فقال ابن عبّاس لورأیته فی الیقظة ما استطعت ان تنعته فوق (۲) هذا قال ابوعیسیٰ ویزید الفارسیّ هو یزید بن هرمزوهواقدم من یزید الرقاشیّ وروی یزید الفارسیّ عن ابن عبّاس رضی اللّٰه عنهما احادیث ویزید الرقاشیّ لم

(۱)وعن علیؓ کرم اللّٰه وجهه أنّ الحسن اشبه رسول اللّٰهﷺ مابین الصدرالی الرأس والحسین اشبه رسول اللّٰهﷺ ماکان اسفل من ذٰلک(جمع ج۲ ص۲۹۵)۱۲ اصلاح الدین

(۲)مجمع الزوائد۸/۲۷۲،مصنف ابن ابی شیبة ۱۱/۵۶،مسنداحمد ۱/۳۶۱(مختار)

یدرک ابن عباس وھو یزید بن ابان الرقاشیّ وھویروی عن انس بن مالک ویزید الفارسیّ ویزید الرقاشیّ کلاھما من اھل البصرة وعوف بن أبی جمیلة ھو عوف الأعرابی.

ترجمہ: یزید فارسیؒ جومصحف نویس تھے کہتے ہیں کہ عبداللہ بن عباسؓ کی زندگی میں مجھےخواب میں نبی اکرم ﷺ کی زیارت نصیب ہوئی۔میں نے عبداللہ بن عباسؓ سے کہا کہ میں نے خواب میں نبی اکرم ﷺ کی زیارت کی ہےتو ابن عباسؓ نے کہا کہ رسول اللہ ﷺ فرماتے تھے کہ شیطان میری شبیہ نہیں بنا سکتا۔اس لئے جس نے مجھے خواب میں دیکھا اس نے حقیقۃً مجھے دیکھا۔(اور) کیاتم اس شخص کا حلیہ بیان کر سکتے ہوجس کوتم نے خواب میں دیکھا تھا میں نے کہا کہ ہاں میں تیرے سامنے درمیانی انداز کے شخص کی صفات بیان کرونگا۔جوجسم اور گوشت میں(نہ زیادہ موٹا، پرگوشت نہ نحیف ونزار بلکہ)معتدل تھا۔گندم گوں رنگ سفیدی مائل تھا۔سرگین آنکھوں والا تھا۔عوف بن ابی جمیلہؒ کہتے ہیں کہ میں نہیں جانتا کہ ان صفات کے ساتھ مزید کیا صفات تھیں(جو یزید فارسی بیان کر چکے تھے) تو عبداللہ بن عباسؓ نے (یزید فارسی سے) کہا کہ اگرتم نبی اکرم ﷺ کو(زندگی میں)اپنی بیداری کی حالت میں دیکھتے تو بھی حلیہ کے بیان میں ان صفات پر مزید اضافہ نہیں کر سکتے تھے۔امام ترمذیؒ کہتے ہیں کہ یزید فارسی یزید بن ہرمز ہیں جو یزید الرقاشی سے بڑے ہیں۔یزید فارسی عبداللہ بن عباسؓ سے کئی احادیث کے راوی ہیں جبکہ یزید الرقاشی کی ملاقات ابن عباسؓ سے نہیں ہوئی ہے۔یہ یزید بن ابان الرقاشی ہیں جو حضرت انسؓ سے روایات کرتے ہیں۔یزید فارسی اور یزید الرقاشی دونوں کاتعلق بصرہ سے ہے(جس کی وجہ سے دونوں کے ایک ہونے کا توہم کیاجاتا ہے) اورعوف بن ابی جمیلہ عوف الاعرابی ہیں(امام ترمذیؒ نضر بن شمیل سے روایت کرتے ہیں) کہ عوف اعرابی کہا کرتے تھے کہ میں

حضرت قتادہؒ سے عمر میں بڑا ہوں۔

<u>معتدل متوازن سراپا:</u> انعت لک رجلاً بین الرجلین الخ، یعنی میں نے جو دیکھاوہ کچھ یوں تھا کہ آپﷺ قد میں میانہ قد تھے نہ پتلے تھے نہ موٹے۔

جسمہ ولحمہ یہ مبتداء ہے اور بین الرجلین اس کی خبر مقدم ہے یعنی ان کا جسم اور گوشت درمیانی تھا اور یہ بھی ممکن ہے کہ جسمہ ولحمہُ "بین الرجلین" کیلئے باعتبار متعلق فاعل بن جائے یعنی ثبت اووقع بین الرجلین جسمہ ولحمہ دونوں صورتوں یہ جملہ رجلاً کیلئے صفت بنے گا۔ گویا وہی نقشہ ہے جو ہم اس کتاب میں پڑھ چکے ہیں کہ نبی اکرمﷺ معتدل الخلق تھے۔ قد میں "ربعة من القوم" یعنی میانہ قد تھے بال بھی درمیانی تھے نہ زیادہ گھنگریالے اور نہ بالکل کھلے ہوئے۔ اسمر یعنی گندم گون تھے لیکن سفیدی مائل تھے اور کھلی صاف رنگت تھی اکحل العینین سرگین آنکھیں تھیں قدرتی سیاہی ایسی لگتی تھی جیسے کہ آنکھوں میں سرمہ ڈالا ہو۔

حسن الضحک، یعنی دانتوں کی سفیدی کے سبب خوبصورت مسکراہٹ تھی۔

جمیل دوائر الوجہ، چہرے کے نقش ونگار بہت حسین اور اعضاء متوازن تھے۔ چہرے کی گولائی کی وجہ سے اس کے ہر جز کو الگ دائرہ بنا کر دوائر جمع لایا گیا ہے یعنی چہرے کا ہر ہر جزء خوبصورت تھا۔

قدملأت لحیتہ الخ، یعنی خوب گھنی داڑھی تھی۔ ان کی داڑھی نے اس کان سے اس کان تک چہرہ ڈھانپ لیا تھا (یعنی گنجان داڑھی تھی) اور بالائی سینہ بھی چھپا دیا تھا۔

قال وما کان یدری الخ، اس جملہ کا ظاہر ومتبادر معنی ملاعلی قاریؒ نے یہ بیان کیا ہے کہ بقول یزید فارسی کے شاگرد کے مجھے صحیح یاد نہیں کہ میرے استاد یزید نے مذکورہ صفات کے ساتھ اور کیا کیا تفصیلات بیان کیں۔ لورأیتہ الخ ،حضرت ابن عباسؓ نے یزید فارسی کی تائید کرتے ہوئے فرمایا کہ اگر حین حیات میں بھی تم نے نبی اکرمﷺ کو دیکھا ہوتا تو اس سے زیادہ صحیح صحیح بیان کرنے کی استطاعت نہ ہوتی گویا یہ صحابہ اور تابعین کے دور میں ان احادیث کی تائید ہے کہ شیطان کو نبی اکرمﷺ کی شکل میں متشکل ہونے کی استطاعت نہیں ہے اور خواب میں نبی اکرمﷺ کی حقیقی شکل وصورت ہی نظر آتی ہے۔

سندی بحث: قال ابوعیسیٰ ویزیدالفارسی هویزید بن هرمز، امام ترمذیؒ اس عبارت میں دو باتیں بیان کرر ہے ہیں اول یزید فارسی کا تعارف کہ ان کا نام یزید بن ہرمز ہے لیکن ان کے اس دعوے میں محققین اختلاف کرتے ہیں کیونکہ یزید بن ہرمز متوفی ۱۰۰ھ ایک دوسرے شخص ہیں جو مدنی ہیں اور متوسط درجہ کے تابعین میں سے ہیں جبکہ یزید فارسی بصری راوی ہیں جن کا شمار چھوٹے تابعین میں ہوتا ہے(۱)۔

دوم یہ کہ یزید فارسی اور یزید رقاشی الگ الگ راوی ہیں اگر چہ دونون بصری ہیں دونوں کا نام بھی ایک ہے اسی وجہ سے بعض لوگوں کو ایک ہی راوی ہونے کا وہم ہوا ہے۔

لیکن امام ترمذیؒ کے ہاں یہ قابل تسلیم نہیں اور ان کی یہ بات درست ہے کیونکہ یزید بن ابان الرقاشی (متوفی ۱۲۰ تقریباً) کا تعلق بصرہ سے ہے۔زاہد وعابد واعظ (۲) تھے مگر ان کا سماع عبداللہ بن عباسؓ سے ثابت نہیں ہے جبکہ اس حدیث میں یزید فارسی کا ان سے سماع مذکور ہے(قال عوف الاعرابی انا اکبر من قتادہ ،اس روایت سے تین باتیں معلوم ہوئیں ایک یہ کہ عوف بن ابی جمیلہ ہی عوف الاعرابی ہیں جیسے کہ پہلے امام ترمذی دعویٰ کر چکے ہیں۔

دوسری یہ کہ عوف اعرابی یعنی عوف بن ابی جمیلہ یزید فارسی کے شاگرد ہیں۔قتادہؓ سے عمر میں بڑے ہیں تو ان کی طرح وہ بھی ابن عباس سے مل چکے ہوں گے۔تو اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کے استاد یزید فارسی کی ملاقات ابن عباسؓ سے ضرور ثابت ہوگی۔تیسری بات اس بات پر تنبیہ ہے کہ یہاں ایک تابعی (عوف) دوسرے تابعی (یزید فارسی) سے روایت کرتے ہیں۔

(۲) حدّثنا عبداللّٰه بن أبی زیادثنا یعقوب بن إبراهیم بن سعد ثنا أبی اخی ابن شهاب الزهریّ عن عمه قال قال أبوسلمة قال أبوقتادة قال رسول اللّٰهﷺ من رأنی فی النوم فقدرأی الحق(۳).

---

(۱)لیراجع التقریب ج۲ ص۳۳۳ (عدد ۷۸۱۸) ج۲ ص۳۳۵(عدد ۷۸۲۴) ۱۲ اصلاح الدین

(۲)صحیح بخاری ۱۰۳۶/۲ کتاب التعبیر باب من رأی النبیّﷺ فی المنام، صحیح مسلم ۲۵۰/۲ کتاب الرؤیا باب قول النبیّﷺ من رأنی فی المنام ،مسنداحمد ۳۰۶/۵(مختار)

ترجمہ: حضرت ابوقتادہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ نبی اکرم ﷺ نے فرمایا جس نے مجھے دیکھا یعنی خواب میں پس اس نے صحیح اور سچا خواب دیکھا۔

یعنی فی النوم، یہ جملہ کسی راوی نے بطور تشریح حدیث میں داخل کیا ہے۔

فقد رأی الحق: فقدرأی الحق، بعض شراح کے نزدیک الحق صفت ہے۔مفعول مطلق کے لئے۔یعنی فقدرأی الرؤیة الحق ، گویا یہ خواب شیطانی خواب نہیں بلکہ اس نے سچا خواب دیکھا ہے۔جو مبشرات میں سے ہے۔بعض شراح نے ''الحق'' کا معنی ''الامر الثابت'' سے کیا ہے اور اسے مفعول بہ قرار دیا ہے یعنی اس نے ایک نفس الامری اور حقیقی خواب دیکھا ہے۔اس کا خواب پراگندہ خاطری اور شیطانی دھوکہ نہیں ہے۔

بعض حضرات نے زیرنظر حدیث میں ''الحق'' سے مراد اللہ جل وعلا شانہ لیا ہے۔اس صورت میں حدیث کا ترجمہ یہ ہے کہ جس نے مجھے خواب میں دیکھا ہے۔وہ اللہ تعالیٰ کو خواب میں دیکھے گا۔یا مطلب یہ ہے کہ یہ اس شخص کی جنتی ہونے کی نشانی ہے۔اور وہ جنت میں اللہ تعالیٰ کا دیدار کرے گا۔

بہرصورت حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ دیدار رسول ایک بڑی سعادت ہے اور دنیا وآخرت میں عنداللہ مقبولیت کی علامت ہے البتہ امام بغوی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ جو شخص نبی اکرم ﷺ کا دیدار خواب میں بکثرت کریگا وہ دنیا میں ضرورت سے زائد مال رکھنے سے کترائے گا۔بلکہ عموماً قلیل المال رہیگا(۱)۔

(۷) حدّثنا عبداللّٰہ بن عبدالرحمٰن انامعلیٰ بن اسدثنا عبدالعزیز بن المختارثنا ثابت عن أنس أنّ رسول اللّٰہ ﷺ قال من رأنی فی المنام فقدرانی فإنّ الشیطان لایتخیّل بی قال ورؤیا المؤمن جزء من ستة واربعین جزءً من النبوة(۲)۔

ترجمہ: حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی اکرم ﷺ نے فرمایا جس

---

(۱) مناوی ج۲ص۲۹۳، (اصلاح الدین)

(۲) صحیح بخاری ۲/ ۱۰۳۶ کتاب التعبیر باب من رأی النبیّ ﷺ فی المنام، مسند احمد۳/ ۲۶۹، مصنف ابن ابی شیبة ۱۱/ ۵۶ (مختار)

نے مجھے خواب میں دیکھا۔اس نے حقیقۃً مجھے دیکھا۔کیونکہ شیطان میرے مشابہ نہیں ہوسکتا نیز فرمایا کہ مؤمن کا خواب نبوت کے چھیالیس اجزاء میں سے ایک جزء ہے۔

لایتخیل بی شیطان میری صورت خیالی کسی کے سامنے پیش نہیں کرسکتا۔

رویائے صادقہ اور جزئیت نبوت: **رؤیا المؤمن جزء من الخ،** یعنی مومن کے رویائے صادقہ نبوت اور وحی کا چھیالیسواں حصہ ہے۔گویا وحی کی طرح وہ بھی صادق ہیں ان میں کذب کا احتمال نہیں۔لیکن اس حصہ کی ماہیت اور حقیقت سمجھ میں نہیں آسکتی کیونکہ اس کی حقیقت تب سمجھ میں آئیگی جب کل یعنی نبوت اور وحی کی حقیقت سمجھ میں آئیگی اور وحی کی حقیقت تو صرف اللہ جل شانہ اور اس کے رسول ﷺ کو معلوم ہے۔ کیونکہ یہ خالص ایک وہبی امر ہے۔کسب کا اس میں ذرہ بھر دخل نہیں۔اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے **ولکن اللّٰہ یجتبی من رسلہ من یشآء**(آل عمران ۱۷۹) لیکن اللہ تعالیٰ جن کو چاہے انبیاء منتخب کرتا ہے۔

نیز فرمایا **اللّٰہ اعلم حیث یجعل رسالتہ**(انعام ۱۲۴) اللہ تعالیٰ خوب جانتے ہیں کہ کہاں رسالت کو رکھے۔کس کو رسالت سے نوازدے۔

ملاعلی قاریؒ فرماتے ہیں کہ جس طرح نبوت کی حقیقت ہمارے لئے ایسی ہے کہ '**من لم یذق لم یدر**' اسی طرح اس کے جزء کی حقیقت بھی ہمارے لئے مجہول ہے لیکن بایں ہمہ یہ بات مؤمن کیلئے ایک درجہ میں بڑی بشارت ہے کہ جس طرح وحی اور نبی کریم ﷺ کے فرامین سچے ہیں اسی مناسبت کی وجہ سے رویائے مومن بھی سچے ہونگے۔اسی لئے بعض حضرات نے یہ کہا ہے کہ یہاں علوم نبوت کا حصہ مراد ہے۔ نہ کہ نبوت کا کیونکہ نبوت متجزی نہیں ہے۔

بعض دیگر روایات میں پینتالیسواں اور بعض میں چالیسواں جزء بعض میں سترواں، بعض میں چہترواں، بعض میں چھبیسواں، بعض میں پچاسواں بعض میں چوالیسواں اور بعض میں انچاسواں حصہ بتایا گیا ہے(۱)، جو کہ بظاہر تعارض معلوم ہوتا ہے لیکن اس کی توجیہ یہ ہوگی کہ یہاں نبی کریم ﷺ کا مقصد تحدید نہیں بلکہ تکثیر ہے کہ نبوت کے بہت سے اجزء قریبی ہیں اور ان رؤیاء کا بھی وحی اور نبوت سے

(۱) فتح الباری ج۱۲ص۳۸۰

قریبی مناسبت ہے۔ نیز علامہ بیجوری نے ایک اور توجیہ بھی کی ہے وہ کہتے ہیں کہ راءی کے بھی مرتبے ہوتے ہیں۔ وہ جس درجے کا ہوگا اور اس کا اپنا ظرف جتنا پاکیزہ ہوگا اتنا ہی اس کے خواب کا درجہ بڑھا ہوا ہوگا۔ مثلاً صفائی باطن زیادہ ہوگی تو اس کے خواب وحی کا چالیسواں حصہ ہونگے اور اگر دوسرے درجہ میں ہوگی تو پینتالیسواں حصہ اور اگر تیسرے درجہ میں ہوگی تو اس کے خواب بھی نبوت کے چھیالیسواں حصہ شمار ہونگے گویا جتنا راوی صداقت، زہد وتقویٰ کے قریب ہوگا۔ یا پھر اچھے مقام یا بہتر زمانہ میں ہوگا اس کا خواب بھی اسی قدر نبوت کے قریب تر ہوگا اور بعض کے (۱) خیال میں یہ حدیث دراصل مبشرات نبوی ﷺ کی مدت سے صرف تعبیر ہے وہ یوں کہ نبی اکرم ﷺ کی مدت نبوت تیئس سال ہے۔ جس کا چھیالیسواں حصہ چھ مہینے بنتے ہیں گویا نبی کریم ﷺ کی بعثت سے قبل چھ مہینے تک مبشرات یعنی سچے خوابوں کا دور تھا یہ وہ زمانہ تھا جب غار حرا میں آپ ﷺ تبتل اور تخلی الی اللہ کیا کرتے تھے نبوت سے قبل کے ان چھ مہینوں میں آپ ﷺ وحی کے انداز کے عجیب سچے خواب دیکھا کرتے تھے۔

---

(۱) ذکرہ النووی ناقلاً عن الجزری وقدزیف المحققون ھذاالقول کما فی جمع الوسائل۔ ۲ ۱/اصلاح الدین عفی عنه

خلاصہ باب

کتاب کے سب سے آخری باب میں نبی اکرمﷺ کی دیدار کا شرف پانے کی سعادت کا ذکر ہے۔ صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم نے آپﷺ کو دیکھا اور حلیہ مبارکہ کی تفصیل ہم تک پہنچائی۔ اب آپﷺ کی ملاقات خواب میں ممکن ہے اور اس باب کا سب سے بڑا مقصد یہی معلوم ہوتا ہے کہ خواب میں آپﷺ کی زیارت کرنے والوں کا خواب سچا ہوتا ہے اور دکھائی دینے والی صورت نبی اکرمﷺ ہی کی ہوتی ہے۔ کیونکہ آپﷺ کی صورت میں تشکل شیطان کی بساط سے باہر ہے۔

ساتھ ساتھ اس بات کا بھی بیان ہے کہ آپﷺ کی صورت حضرت حسنؓ (اور کچھ حضرت حسینؓ) سے ملتی تھی نیز کسی حد تک آپﷺ کا حلیہ خواب میں دیکھنے والے کی زبانی مذکور ہے آخر میں مؤمن کے الہامی خوابوں کی قدر و قیمت کا ذکر ہے کہ وہ نبوت کا چھیالیسواں حصہ، قابل اعتماد اور مقبولیت کی علامت ہے۔ اس میں حضور اقدسﷺ کے وفات سے غمزدہ اور فراق وہجر میں تڑپنے والے عشاق کو تسلی اور تسکین کا بھی کسی حد تک سامان ہے کہ خواب میں آپﷺ کی زیارت سچی زیارت ہوگی اور پس ماندگان کو خواب سے بھی بڑی تسلی ہوجاتی ہے۔

خاتمہ

(۱)حدّثنا محمّد بن عليّ قال سمعت أبي يقول قال عبدالله ابن المبارك اذابتليت بالقضاء فعليك بالاثر(۱).

ترجمہ: عبداللہ بن مبارکؒ فرماتے ہیں کہ اگر قضاء کی ذمہ داری گلے پڑجائے تو آثار کا اتباع کرو۔

<u>عبداللہ بن مبارکؒ:</u> عبداللہ بن المبارکؒ، ابوعبدالرحمٰن عبداللہ بن المبارک بن واضح الحنظلی مرو(خراسان) کے رہنے والے تھے۔اسی وجہ سے ان کو مروزی کہتے ہیں۔۱۱۸ھ یا ۱۱۹ھ میں ولادت ہوئی۔اصل میں ترکی النسل تھے۔مرواس زمانہ میں اہل علم سے بھراپڑا تھا۔ابتدائی تعلیم وہیں حاصل کی۔پھرشام،حجاز،مصر،یمن اورعراق کے مختلف شہروں میں جاکرعلم حاصل کیا۔امام احمد کے بقول ان سے زیادہ سفرکرنے والا کوئی نہیں ہے۔بہت سے تابعین سے ملاقات ہوئی۔امام مالک،امام ابوحنیفہ،امام اوزاعی، سفیان ثوری رحمہم اللہ وغیرہ بہت سے دیگراکابر سے تلمذ کا شرف حاصل ہوا۔ان کے ایک معاصر کا قول ہے کہ ان کے آٹھ سو اساتذہ سے تو مجھے ملاقات کا موقع ملا۔اللہ تعالیٰ نے آپ کو بے پناہ حافظہ، ذہانت اور تقویٰ سے نوازا تھا۔

تبع تابعین میں آپ کو سرخیل کا درجہ حاصل ہے بالخصوص علم حدیث میں آپؒ کو امیر المؤمنین سمجھا جاتا تھا۔حدیث کی کوئی بھی کتاب آپ کی روایات سے خالی نہیں ہوگی۔امام ابوحنیفہؒ سے ان کو انتہائی عقیدت تھی۔فرمایا کرتے تھے"لولا اعانني الله بابي حنيفة و سفيان لكنت بدعيا"یعنی اگر اللہ تعالیٰ میری مدد ابوحنیفہؒ اور سفیان سے نہ فرماتے تو میں آج بدعتی ہوتا۔اسی وجہ سے آپ کو فقہاء میں بھی بڑا درجہ حاصل ہے۔امام مالک ان کو"فقیہہ خراسان"یعنی خراسان کے فقیہ کے لقب سے پکارا کرتے تھے۔ عملی طور پر جہاد میں شرکت فرماتے تھے۔رومیوں کے خلاف آپ نے جس جرأت وبہادری کا مظاہرہ کیا اس کے کئی حیران کن واقعات کتابوں میں موجود ہیں۔۱۸۱ھ کو تریسٹھ برس کی عمر میں وفات پائی۔

---

(۱)تفرد الامام الترمذی بھذاالاثر

قضاءاورمراحل زندگی میں وحی اورآثارکااتباع: **اذاابتلیت بالقضاء فعلیک بالاثر**
حضرت ابن مبارکؒ عظیم اورجلیل القدرامام ہیں۔امام ترمذیؒ ان کا اثر کتاب کے آخر میں ذکر کرتے ہیں۔ جواس بات پر تنبیہ ہے کہ جب ہم نے احادیث اور نبی کریم ﷺ کے اقوال پڑھ لئے تو اب اس پر عمل بھی چاہیئے۔اوراس کے بعد صحابی کا قول اورائمہ سلف کے فیصلے اورآثار ہیں۔جن کا اتباع چاہیئے۔نیز اس میں اس بات پر بھی تنبیہ ہے کہ قضاء اورعہدہ کے پیچھے نہ پڑو۔کیونکہ یہ ایک امتحان اورمصیبت ہے۔اسی وجہ سے امام ابوحنیفہؒ اوردیگر اکابر نے اسے قبول نہ کیا۔اوراگر گلے پڑجائے اورمجبوراًانصاف کے مسند پر بیٹھنا پڑے یا اسی طرح کوئی علمی مسئلہ یافتویٰ پوچھا گیا تو اثر سے استمساک کرواپنی رائے اورعقل کو دوسرے مرتبہ میں رکھو۔

تعبیرخواب میں اتباع آثار: حضرت ابن مبارکؒ کے اس قول کی بظاہر ترجمۃ الباب سے واضح مطابقت نہیں مگر شراح کہتے ہیں کہ مناسبت یہ ہے کہ اگر کسی نے تعبیر پوچھی تو شیطانی خیالات اور تخمینوں کے ساتھ رائے مت قام کرو۔بلکہ خواب کی تعبیر میں بھی قرآن وحدیث اورآثارالصالحین کی تتبع کر کے جواب دو۔مثلاً کوئی خواب دیکھتا ہے کہ میں سمندر میں تیر رہاہوں اورتم سے اس کی تعبیر پوچھے تو قرآن سے یوں تمسک کر سکتے ہو کہ وہ کہتا ہے **وجعلنا من الماء کل شئی حیّ. (انبیاء ۳۰)** اورہم نے ہر چیز کو پانی سے پیدا کیا۔

اس لئے تم بھی خواب کی تعبیر طویل زندگی سے کرو تو بعید نہیں ہوگا۔

زبیدہ خاتون نے خواب دیکھا کہ دنیا بھر سے لوگ آکر میرے ساتھ زنا کررہے ہیں۔لوگوں سے تعبیر پوچھی لیکن کوئی ان کو مطمئن نہ کرسکا۔بالآخرایک بزرگ سے پوچھا تو انہوں نے کہا کہ یہ تو بہت اچھا خواب ہے۔تم سے اللہ تعالیٰ ایک فیض جاری کرے گا جس سے تمام عالم مستفیض ہوگا۔چنانچہ نہر زبیدہ انہوں نے کھدوائی ہے جس سے حجاز مقدس میں پانی مہیا کیا جانے لگا۔عرفات،منیٰ اورمکہ والوں کو پانی کی تکلیف ہوتی تھی۔جو اس نہر کے سبب دور ہوگئی اوراس طرح حرمین کے واسطے سے تمام عالم کے لوگ مستفیض ہونے لگے۔مشرق ومغرب سے لوگ آکر اس کا پانی استعمال کرنے لگے۔

لیکن اس سے بھی مناسبت بہتر یہ ہے کہ خاتمہ میں جو دو آثار منقول ہیں۔ان کا تعلق سارے کتاب سے ہے۔ نہ کہ صرف آخری باب سے۔ کتاب میں ہم قرآن اور حدیث پڑھ چکے ہیں اب آخر میں دو باتوں کی تنبیہ کی جاتی ہے اول یہ کہ چونکہ قضاء نبوت کا کام اور اسے نبی کی خلافت کے طور پر نبھایا جاتا ہے ۔اس لئے یہ تنبیہ مقصود ہے۔ اگر کسی کو ملے تو نبی اور ان کے نائبین کی اقتداء کرے۔ اور حضوراقدس ﷺ کا نائب بننے کیلئے آپ ﷺ کی زندگی کا نقشہ اپنانا پڑتا ہے۔ جو کہ کتاب شمائل کی صورت میں ہمارے سامنے ہے۔ چنانچہ یہاں پر اثر سے مراد اصطلاح فقہاء مراد نہیں بلکہ محدثین کی اصطلاح کے مطابق مرفوع موقوف مرسل احادیث اور اقوال سلف سب اس کے زمرے میں آتے ہیں۔دوسری تنبیہ علم حدیث کے اہتمام شان سے متعلق ہے۔ جو آئندہ اثر میں آرہی ہے۔

<u>سند کی اہمیت:</u>

(۲) حدّثنا محمّد بن علیّ ثنا النضر أخبرنا ابن عوف عن ابن سیرین قال هذا الحدیث دین فانظروا عمّن تاخذون دینکم (۱).

ترجمہ: محمد بن سیرین کہتے ہیں کہ یہ علم حدیث دین ہے۔لہٰذا یہ دیکھو کہ تم اپنا دین کس سے حاصل کررہے ہو۔

إنّ هذا الحدیث دین، یہ جملہ باب سابق سے مربوط ہوسکتا ہے کیونکہ خواب کی تعبیر کے بھی آداب ہیں۔اور سب سے بڑا ادب یہ ہے کہ اس کی تعبیر معتمد متقی عالم سے پوچھنی چاہئے اور اسی کو اس کی تعبیر نکالنے کا حق ہے۔ ہر کس وناکس کو خواب کی تعبیر میں عقل نہیں لڑانا چاہئے۔

امام مالکؒ سے کسی نے پوچھا کہ ''أیعبّر الرویا کل احد ''یعنی کیا ہر کسی کو خواب کی تعبیر نکالنی چاہئے تو انہوں نے کہا ''أبالنبوة تلعب'' کیا نبوت کے ساتھ کھیلا جاتا ہے۔

<u>اساتذہ ومشائخ کے انتخاب میں احتیاط:</u> لیکن اس کا تعلق سارے کتاب بلکہ علوم الحدیث سے زیادہ بہتر طریقے سے بنتا ہے کیونکہ یہ جملہ مسلم شریف میں بھی ابن سیرین کے حوالے سے مروی ہے۔

---

(۱)مقدمة صحیح مسلم ۱/۱۱ باب بیان الاسناد من الدین، دارمی ۱/۱۱۲، الحلیلة الاولیاء لابی نعیم ۲/۲۷۸ (مختار)

وہاں پراس کے الفاظ ہیں۔

إنّ ھذاالعلم دین فانظروا عمّن تاخذون دینکم(۱)،یعنی یہ علم حدیث دین ہے۔لہٰذا اسے دیکھاجائے کہ کس سے یہ علم حاصل کررہے ہو۔

بلکہ امام دیلمیؒ نے حضرت ابن عمرؓ سے مرفوع حدیث روایت کی ہے۔وہاں الفاظ یہ ہیں کہ **العلم دین والصلوٰۃ دین فانظروا عمّن تاخذون ھذاالعلم. الخ**

ان تمام روایات کا خلاصہ یہ ہے کہ دینی عقائد، اعمال، احکام وغیرہ کا علم قابل اعتماد شیوخ واساتذہ سے حاصل کرنا ضروری ہے۔کیونکہ جوعلم غیرمستند طریقے سے حاصل ہو یا ایسے اساتذہ سے ملے جن کاتعلق،علم تقویٰ اور دیانت سے برائے نام ہو۔تو ظاہر ہے کہ وہ بے برکت ہوتااور قابل اعتمادنہیں رہتا۔بلکہ علم کے ساتھ ساتھ بداعتقادی،خیانت اور بدعملی بھی ساتھ ساتھ ملے گی۔خواہ وہ دانستہ طور پر ہو یا نادانستہ طور پر۔

جیسے آج کل ہم دیکھ رہے ہیں کہ مغربی یونیورسٹیوں میں ڈاکٹر بننے والے یا مطالعوں کے زور پر مفسر اور محدث بننے والے بالآخر الحادوبدعت کا شکار ہوجاتے ہیں اور معتزلہ وخوارج بلکہ یہودونصاریٰ کی بداعتقادیاں ان میں سرائیت کر جاتی ہیں۔رفتہ رفتہ خودکوامام، مجتہد بلکہ نبی سمجھنے لگتے ہیں۔پھران سے استفادہ کرنے والے بالعموم صراط مستقیم سے ہٹ کر صحابہ اور سلف صالحین پر انگشت نمائی کا کام دین کا اصل کام سمجھ لیتے ہیں۔تقلید سلف چھوڑ دیتے ہیں۔حدیث کے منکر بن جاتے ہیں۔قرآن کو زمانے کے تقاضوں کے مطابق نئے نئے سانچوں میں ڈھالنے لگتے ہیں۔

اسی طرح تصوف کے طالبین گمراہ قسم کے پیروں کے ساتھ لگ کر مشرکانہ رسوم کے داعی بن جاتے ہیں بے نمازاساتذہ کے شاگرد قابل بھی ہوں مگران کے دلوں میں نماز کی کوئی وقعت باقی نہیں رہتی یہی وجہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انسانیت کی ہدایت کیلئے صرف کتابوں پر اکتفاءنہیں کیا بلکہ انبیاء کی صورت میں رجال اللہ کا ایک سلسلہ بھی ساتھ ساتھ چلادیا ہے اور کسی مبعوث نبی کے راستے ہی کو ہدایت کا معیار ٹھہرایا ہے۔

---

(۱)مسلم شریف مقدمة ۱/۱۱ (مختار)

الحمدللہ اس سلسلے میں ہم یہ دعویٰ بڑے فخر کے ساتھ کر سکتے ہیں کہ ہم تک پہنچنے والے علوم ہم تک سونے کے موتیوں بھری زنجیر سلسلہ الذہب کے ذریعہ پہنچے ہیں۔ ہمارے شیوخ کا تقویٰ، زہد، علم، دینی تصلب کسی پر بھی مخفی نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ ان کو بلند ترین درجات سے نوازے جن کی تعلیم وتربیت نے ہمیں اس مقام پر پہنچا دیا ہے۔ مناسب ہے کہ کم از کم ان کا تذکرہ ہو جائے۔

<u>میرا اسلسلہ سند:</u> میری سند حضرت شیخ الحدیث سیدی ووالدی مولانا عبدالحق رحمۃ اللہ کے وساطت سے اور کئی دیگر مشائخ عرب وعجم اجلّہ اکابر حرمین الشریفین کے اجازت سے حضور اقدس ﷺ تک پہونچتی ہے جس کی تفصیل اس سندالاجازۃ میں ہے۔

فہرست روات احادیث

شرح شمائل میں جن راویوں کے حالات ذکر کئے گئے ہیں۔ان کے اسماء گرامی حروف تہجی کی ترتیب کے ساتھ باب اور حدیث نمبر کے حوالے کے ساتھ پیش کئے جاتے ہیں۔میری تتبع کے مطابق کسی بھی حدیث کا آخری راوی تذکرے کے بغیر نہیں رہا۔البتہ شرح میں اس کا ذکر صرف ایک بار کیا گیا ہے۔

اصلاح الدین عفی عنہ

الف			
نمبر شمار	نام راوی	باب نمبر	حدیث نمبر
۱	ابن سیرین	۱۴	۴
۲	ابواسید	۲۶	۷
۳	ابوالطفیلؓ	۱	۱۳
۴	ابوالھیثم بن التیھان	۵۱	۴
۵	ابوامامۃ باہلی	۲۵	۲
۶	ابوایوب الانصاریؓ	۲۸	۱
۷	ابوالبختریؒ	۵۴	۳
۸	ابوبردہ	۸	۱
۹	ابوبکرالصدیقؓ	۵۳	۵
۱۰	ابوجحیفۃ وھب بن عامر	۵	۶
۱۱	ابوذرالغفاریؓ	۳۵	۴
۱۲	ابورمثۃ التیمی	۵	۷

۱۳	ابوسعید الخدریؓ	۲	۸
۱۴	ابوسلمۃ بن عبدالرحمٰن	۵۳	۱۱
۱۵	ابوطلحۃ	۵	۲
۱۶	ابوعبیدؓ	۲۶	۱۸
۱۷	ابوعمیرؓ	۳۶	۲
۱۸	ابوقتادہؓ	۳۹	۷
۱۹	ابوموسیٰ الاشعریؓ	۳۶	۲
۲۰	ابوھریرہؓ	۱	۱۱
۲۱	اسامۃ بن زید	۸	۶
۲۲	اسماء بنت یزید	۸	۴
۲۳	اصمعیؒ	۱	۶
۲۴	انس بن مالک	۱	۱
۲۵	ام المنذر سلمیٰ	۲۶	۳۰
۲۶	ام سلمۃ	۸	۱
۲۷	ام سلیم	۳۲	۹
۲۸	ام ہانی	۵	۳
	ب		
۲۹	باقر (الامام)	۵۳	۱۰
۳۰	بشر بن الفضل	۷	۳
۳۱	براء بن عاذب	۱	۳
۳۲	بریدہ بن الحُصیف	۲	۶
۳۳	بلال بن رباح	۲۶	۱۵

	ش		
۷۰	شریدبن سوید الثقفیؓ	۳۷	۹
	ص		
۷۱	صفیۃ بنت حُیَیؓ	۲۶	۲۶
	ط		
۷۲	طارق بن اشیمؓ	۵۵	۳
۷۳	طلحۃ بن عبیداللہ	۱۵	۲
	ع		
۷۴	عائشہؓ بنت ابی بکر	۲۶	۳۴
		۳	۲
۷۵	عازبؓ	۱	۳
۷۶	عبداللہ بن الحارثؓ	۲۶	۱۴
۷۷	عبداللہ بن المبارک	خاتمہ	۱
۷۸	عبداللہ بن ثابت، ابی اسیدؓ	۲۶	۶
۷۹	عبداللہ بن جعفرؓ	۱۳	۲
۸۰	عبداللہ بن رواحۃ	۳۷	۱
۸۱	عبداللہ بن سرجس	۲	۸
۸۲	عبداللہ بن سعد	۴۱	۱
۸۳	عبداللہ بن سلامؓ	۲۶	۳۲
۸۴	عبداللہ بن عباسؓ	۱	۱۴
۸۵	عبداللہ بن عثمان بن عامر، ابوبکر صدیقؓ	۵۳	۵
۸۶	عبداللہ بن عمرؓ	۵	۳

٨٧	عبداللہ بن عمرو بن العاصؓ	٣٢	٢
٨٨	عبداللہ بن قیس،ابوموسیٰ اشعریؓ	١٦	۴
٨٩	عبداللہ بن مسعودؓ	٢٦	١٧
٩٠	عبداللہ بن مغفّل	۴٣	٦
٩١	عبدالرحمٰن بن ابی لیلیٰ	۴٠	٣
٩٢	عبدالرحمٰن بن عوف	۵١	٩
٩٣	عتبۃ بن غزوان	۵١	٦
٩۴	عروۃ بن مسعودؓ	١	١٢
٩۵	عطاء بن مسلم الخفاف	٢٣	٢
٩٦	علی بن ابی طالب	١	۵
٩٧	عمر بن ابی سلمۃ	٢٨	٣
٩٨	عمر بن الخطاب	٢٦	٨
٩٩	عمرو بن الاخطب	٢	۴
١٠٠	عمرو بن الحارث	۵۴	١
١٠١	عمرو بن العاص	۴٧	٢
١٠٢	عمرو بن حریث	١١	٦
١٠٣	عوف بن مالکؓ	۴٢	١٦
	ف		
١٠۴	فضل بن عباس	٢٣	٢
	ق		
١٠۵	قتادۃ بن عامر	۴٣	٧
١٠٦	قرۃ بن ایاس	٨	۵

		و	
۱۲۴	وہب بن عامر، ابوجحیفۃ	۵	۶
		ھ	
۱۲۵	ہند بن ابی ہالہ	۱	۷
		ی	
۱۲۶	یحییٰ بن معین	۸	۶
۱۲۷	یزید الرشک	۴۰	۱
۱۲۸	یزید الفارسی	۵۵	۵
۱۲۹	یوسف بن عبداللہ بن سلام	۲۶	۳۲